جلد ۱۱ نمبر ۱

فہرست مضامین

بابت ماہ جنوری سنہ ۱۹۲۳ء مطابق جمادی الثانی سنہ ۱۳۴۱ ہجری

صلائے عام

میر تقی کا شعر ہے ؎ سخن تو ہے ہی کرو لطفِ زباں بھی پیدا ❊ میر کو دیکھو کہ سب لوگ بھلا کہتے ہیں

صلائے عام کی تمنا ہے کہ جس طرح ہندوستان اپنی خوبیوں میں سارے جہان میں مشہور ہے اِس کی زبان بھی اگر اور زبانوں سے بازی نہ لے جائے تو کسی سے کم نہ رہے - یہہ آرزو میں بہت زبان دبا کر کر رہا ہوں ورنہ میرے دعوے کے مواقق مجھے تو کوئی زبان اس سے برابری کرتی نظر نہیں آتی ❊ زبان کی خوبی خیال پر ہے اور خیال کی پاکیزگی کا معیار شاعری ہے ہندوستان کی شاعری تمام دنیا سے بہتر سمجھنی چاہیے کہ یہاں کی آب و ہوا نازک خیالی و پاکیزہ بیانی کے لئے نہایت موزوں ہے ؎

نہ جائے کیوں دلِ مرغِ چمن کہ سیکھ گئی ❊ بہار وضع ترے مسکرا کے آنے کی ❊

دورِ ساغر کی کیطرح ہندوستان نے ہزار گردشیں دیکھیں تب کہیں اس کی زبان کو یہہ بات نصیب ہوئی کہ ہر زبان سے ملکر عطر مجموعہ بن گئی - اِس میں بادۂ کہن اور حسنِ ماہ یک شبہ دونوں کا لطف ہے - یعنی قدیم و جدید - تازہ و زمانہ دیدہ ہر طرح کے مضمون کی گنجایش ہے ❊ سکنتلا سے لیکر امانت کی اندر سبھا تک اس میں موجود ہے - اب اور اور طرز بھی جمع ہو رہے ہیں - ؎

دیکھکر تجھکو مٹے جاتے ہیں دنیا کے حسیں ؛ مجمع ہوتا ہے سالہ تری یکتائی کا

اِس میں شک نہیں کہ اپنی زبان سے زیادہ کوئی زبان عزیز نہیں ہو سکتی۔ جس طرح عورتوں میں مثل مشہور ہے کہ ماں سے زیادہ بچّو چاہے۔ تو پھاپھا کُٹنی: انسان کو مادری زبان سے بڑھ کر کوئی زبان پیاری نہیں ؛ لیکن جسطرح ہر کام میں حفظِ مراتب کی ضرورت ہے زبان کے بھی مرتبے ہیں۔ بچّوں کی اور زباں ہے اہلِ علم کی اور ہے۔ خاص کی زبان اور ہے عام کی اور۔ بازار کی زبان اور ہے دربار کی اور۔ مکتب میں قاعدہ بغدادی بھی پڑھایا جاتا ہے اور شاہنامہ و سکندر نامہ بھی۔ گلستاں میں حمد و نعت بڑے زور کی ہے اور باب پنجم "در عشقِ جوانی" بھی۔ اسی طرح مُلک و قوم کی عظمت کی زبان خاص ہونی چاہیئے۔ اور معمولی علیحدہ ؛

اَب جو پوچھے کوئی زباں کیا ہے؟ ؛ اُس سے ہم کیا کریں بیاں کیا ہے؟

زبان وہ جو فنا نہ ہو سکے۔ مُلک و قومیں فنا ہو جائیں زبان ہی رہے: سنسکرت کے بولنے والے مرٹ گئے زبان ابتک باقی ہے۔ قدیم یونانی و لاطینی قوموںکا پتہ نہیں اُنکی زبانیں باقی ہیں ؛ قومیں اور نسلیں فنا ہو جاتی ہیں اُن کی یادگار اُنکی زبان رہ جاتی ہے۔ یا دور دراز کے باشندے کسی مُلک و قوم کے مرتبے کی نسبت قیاس دوڑائیں تو ہماری زبان کی لٹریچر سے اندازہ کر سکتے ہیں ؛ قوم کی زندگی کا مدار لٹریچر پر ہے۔ ہم نہیں تو ہماری لٹریچر سے ہمارا پتہ لگ جائیگا۔ ہماری زبان ہی ہماری بڑی یادگار رہے گی ؛ سبعہ معلقہ سے اہلِ عرب کی شاعری یادگار ہے۔ ہومر سے قدیم یونان کی۔ شاہنامہ سے اہلِ عجم کی ؛ کوئی قوم قیامت تک دنیا میں نہیں رہ سکتی۔ جن قوموں کی لٹریچر باقی ہے۔ اُن کا نام قیامت تک بنا رہے گا ؛ لیکن اب یہاں یہہ خیال ضرور ہے کہ اپنی لٹریچر اِس لایق کس طرح کیجائے جس سے دوسروں کی نگاہ میں وقار پیدا ہو۔ بازاری عامیانہ زبان سے وقار پیدا ہونا مشکل ہے: یادگار کے لایق اساتذہ کی زبان ہوتی

ہے ٭ میں سنے دیکھا ہے کہ اساتذہ میں جو لفظ جہاں بندھ گیا اسکی جگہہ دوسرا لفظ اگر لگایا جائے تو وہ بات پیدا نہیں ہوتی جو اُستادوں کی زبان سے نکل گئی ٭ اپنا مطلب تو میں بھی کہہ لیتا ہوں مگر خوبیٔ بیان جو اُستادوں کے کلام میں ہے وہ پیدا نہیں ہوتی ؎ ہو گئی کچھ اور آکر خانۂ صیاد میں ٭ یہہ مزہ آگے نہ تھا بلبل تری فریاد میں ٭

اگلی گھرگرہستی کی بڑی بوڑھیاں کہا کرتی تھیں کہ مرد عورت کا جوڑہ پہلے آسماں پر قرار پا جاتا ہے پھر دُنیا میں آکر ظہور میں آتا ہے۔ میرا عقیدہ بھی یہی ہے کہ ہر خیال کے لئے ازل سے ایک لفظ مقرّر ہے۔ وہی اس جگہہ کام دیتا ہے۔ دوسرے لفظ سے وہ بات پیدا نہیں ہوتی ٭ جس طرح حضرت آدم کے لئے صرف حضرت حوّا پیدا ہوئیں دوسری عورت ناممکن سمجھی گئی ٭ اہلِ کمال سے پوچھئے کہ ایک ایک لفظ کے لئے پہروں ماتھے پر ہاتھ رکھّے بیٹھے رہنا پڑتا ہے پھر بھی وہ لفظ جسکی تلاش ہے مشکل سے ذہن میں آتا ہے اور وہ بھی کبھی خواب میں یا محض الہام سے جسے ہاتف غیبی کہتے ہیں ٭ لیلےٰ کا اگر آپ خیال باندھیں تو تمام دنیا کی عورتوں کی طرف سے آنکھ بند کرلیں۔ اُس کی آنکھ دیدۂ نرگس اور چشمِ آہو سے اچھی نظر آئے۔ اُس کا سانولا پن تمام عالم کے مہ جبینوں سے زیادہ دِل کش معلوم ہو ؎ اب تک آتی ہے صدا تربتِ لیلےٰ سے **امیر** ٭ ساربان تو خدا کے لئے محمل ٹھیرا۔ جو بات آپ بیان کیا چاہیں سمجھ لیں کہ اس کے لئے ازل سے ایک ہی لفظ مقرّر ہے۔ ایک ہی نام سے وہ پکارا جا سکتا ہے۔ ایک ہی مصدر سے اُسکا کام نکلے گا اور ایک ہی صفت سے اُس کی تعریف ہو سکتی ہے۔ اُس نام اور اُس صفت کی تلاش میں اگر ایک عمر بسر ہو جائے تو تھوڑی ہے اور جب تک یہہ بات مُیسر نہ ہو کمال میں نقص سمجھئے ؎ امیر ایسے ویسے تو مضموں ہیں لاکھوں ٭ نئی بات کوئی کبھی سوجھتی ہے

جناب **میر تقی** کا شعر ہے۔ ؎

ناصح مرے جنوں سے آگہ نہ تھا تو ناحق ٭ گو دڑ کیا گریباں سارا سلا سلا کر ٭

[illegible]

اس میں "گودڑ" کی جگہہ کسی اور لفظ کا آنا مضمون کی خرابی ہے ؎

دل سے آنکھوں میں لہو آیا ہے شاید رات کو ؎ کشمکش میں بیقراری کے یہہ پھوڑا اچھل گیا

بیقراری میں "پھوڑے کا اچھل جانا" جناب **میر** کا حصہ تھا ؎

کہاں تک بھلا روؤگے میر صاحب ؎ اب آنکھوں کے گرد اک ورم دیکھتے ہیں

نرے **میر** سے یہاں کام نہیں نکلتا۔ "میر صاحب" کہنا ضرور تھا۔ اور مضمون کتنا بے مبالغہ ہے کہ میر صاحب تمہیں خبر بھی ہے کہ آنکھوں کے گرد اک ورم سا ہو رہا ہے ؎

نشے کا مضمون کیا خوب باندھا ہے ؎ یا ہاتھوں ہاتھ لو مجھے مانند جام مے ؎ یا تھوڑی دور ساتھ چلو میں نشے میں ہوں

مضمون کی شان کے موافق جناب **منیر** کو بہت اچھے اچھے لفظ مل جاتے ہیں۔ فرماتے ہیں ؎

کفن صبح وطن کا بھی جو ملتا تو غنیمت تھا ؎ بچھائے یا کوئی اوڑھے گلیم شام غربت کو

منیر ان سے سر محفل لپٹ جائیں گے ہم کچھ ہو ؎ سلام آخری ہے آج سے آداب صحبت کو

حضرت **آتش** کے کلام میں بہت برمحل موقع کے لفظ ہوتے ہیں۔ ؎

ٹھیک آئی اپنے تن پہ قبائے برہنگی ؎ باقی لباس چھوٹے ہوئے یا بڑے ہوئے

کہتے ہیں ذکر لیلی و مجنوں نہ چھیڑئے ؎ چپ رہئے بس نہ گور کے مردے اکھیڑئے

تدبیر سے تو کام نہ تقدیر کا ہوا ؎ تکیہ خدا پہ کیجئے دروازہ بھیڑئے

اگلے اُستادوں کو جانے دیجئے۔ ان کے ادائے بیان کو آپ کیا اور میں کیا کوئی نہیں پہونچ سکتا۔ متاخرین میں **امیر** و **داغ** کے کلام کا کیا کہنا: جو مضمون جس طرز پر انہوں نے باندھا دوسرے سے ناممکن ہے ؎

جناب **امیر** ؎ شب غم کیسی ہی چھوٹی ہو واعظ ؎ مگر تیری قیامت سے بڑی ہے۔

شیخ نے مے خانہ میں پی یا نہ پی ؎ دختر رز کو تو رسوا کر چلے ؎

پیری میں چاہئے نہ جوانی کی آرزو ؎ بے عقل ہے جو دن کو کرے رات کی تلاش

نیا افسانہ کہہ واعظ تو شاید گرم محفل ہو ؎ قیامت تو پُرانا حال ہے روز جدائی کا۔۔

[illegible]

خود انصاف کریں کہ جو لفظ جہاں استادوں نے باندھا ہے دوسرا ممکن نہیں ؎ میں چاہتا ہوں کہ نثر میں بھی اگر یہہ خوبی پیدا ہو سکے تو کیا کہنا ؎ آں میم باید کہ چوں ریزم بجام ؎ ننور سے در گردش آرد جام را ؎

سیرِ کوہِ طور

کیا فرض ہے کہ سب کو ملے ایک سا جواب * آؤ نہ ہم بھی سیر کریں کوہِ طور کی *

اہلِ کتاب میں یعنی۔ توریت و انجیل و قرآن مجید پر ایمان رکھنے والوں میں کوہِ طور کا عقیدہ بڑے معرکہ کا ہے۔ دنیا میں شریعت و ضوابط و قانون کا مدار اسی عقیدہ پر ہے کہ احکامِ الٰہی جو حضرت موسےٰ پر نازل ہوئے وہ کوہ طور پر خدا نے اپنی زبان سے ارشاد فرمائے۔ خدائے ذوالجلال کی تجلی جس شان سے کوہ طور پر نظر آئی پھر کبھی دیکھنے میں نہ آئی ؎

آئی یہی ہے سوختۂ طور سے صدا * نظارۂ جمال غضب ہے جلال میں

طور پر حضرتِ موسےٰ کو خدا کے دیکھنے کی ہوس ہوئی جو پوری نہ ہوئی۔ خدا کے دیکھنے کی آرزو کو ہوس میں نے اس لئے کہا کہ ناممکن کی آرزو ہوس نہیں تو اور کیا ہے؟ ؎

جستجو اور پھر کمر کی جستجو * کوشش اور پھر غیر ممکن کیلئے * یا بہ اندازِ شطحیاتِ اہلِ تصوف ؎

کون موسےٰ تھا کہاں طور تجلی کیسی * ایک یہ بھی تھی مرِی جان شرارت تیری

اخبار پائنیر کے نامہ نگار نے (دیکم دسمبر سنہ ۱۹۲۲ء کے پائنیر میں) کوہ طور اور وادیٔ سینا کے سفر کا حال جو لکھا ہے اُس میں سے چند باتیں اقتباس کر کے یہاں عرض کرنیکو جی چاہتا ہے ؛

مصر سے نکل کر بنی اسرائیل کو چالیس برس طور و سینا کے نواح میں پھرنا پڑا۔ صُحفِ حضرتِ موسیٰ میں اِس دشت نوردی کا حال بہت مفصل ہے - اور گو بعض غیر معتقد محقق کوہ طور و سینا کی صحت کے قائل نہیں مگر جمہور اہل کتاب کا عقیدہ یہی ہے کہ کوہِ طور خدا کا پہاڑ ہے - اِس پہاڑ کو جبلِ موسےٰ کہتے ہیں ؛ جبلِ موسےٰ کی سب سے اونچی چوٹی پر ابتک دو مذہبوں یعنی عیسائی مذہب اور اسلام کی یادگار موجود ہیں - ایک گرجا اور ایک مسجد : یہہ دونوں آجکل بے چراغ اور شکستہ ہو رہے ہیں ؛

یہہ گرجا خاص اُس جگہہ ہے جسکا ذکر توریت کے "خروج" نامی صحیفہ کے ۳۳ ویں باب میں حضرت موسےٰ کی زبانی ہے کہ حضرت نے خدا کو دیکھنا چاہا مگر وہاں سے انکار ہوا۔ حضرت موسیٰ کو شعرا "ارنی گوئے طور" کہتے ہیں اور اسکا جواب لن ترانی زباں زدِ خلائق توریت میں ہے کہ خدا نے اپنے تئیں دکھایا تو نہیں مگر پاس سے ایک طرف بجلی سی کوند گئی اور حضرت موسےٰ خوف سے دہل گئے - حضرت کی پیٹھ کا نشان پہاڑ پر گرجا کے نیچے بطور زیارت دکھایا جاتا ہے ؛ یہہ مضمون حضرت عزیز لکھنوی نے نہایت نازک خیالی سے باندھا ہے کہ "ارنی گوئے طور" ایک سنہری لکیر پر غش کر گئے - شعر مجھے یاد نہیں رہا مگر بجلی کے لئے "سنہری لکیر" غضب کی سوجھی ؛ وہ "سنہری لکیر" اسطرح بھی بیان کی جا سکتی ہے - ع - تجلی میری پنہاں ہے چراغِ زیرِ داماں ہے ؛ لیکن سب سے پاکیزہ مضمون "ارنی" و "لن ترانی" کا اس شعر میں پایا جاتا ہے ؎ کر کے خوں ایک کا جا بیٹھے ہیں گھر میں اور پھر ؛ پوچھتے ہیں کہ مرے در پہ ہے غوغا کیسا

مسجد اُس غار کے اوپر ہے جہاں حضرت موسےٰ نے کوہ طور پر چالیس دن اور

چالیس رات بسر کئے ۔ یہہ باتیں ہزاروں برس کی ہیں اور یہہ یادگاریں کئی صدیوں کی ہیں
ان یادگاروں کا قایم رکھنا عیسائیوں اور مسلمانوں پر فرض ہے ؛
اس مقام سے اُتر کر حضرت الیاسؑ کا تسبیح خانہ ہے جہاں حضرت عبادتِ الٰہی میں
معتکف رہتے تھے ۔ آگے چل کر وہ کنواں ہے جہاں حضرت موسےؑ نے اپنے خسر
کے لئے بھیڑیں چرائیں تھیں ؛

خانقاہ سینٹ کیتھرائین پندرہ سو برس سے پہلے کی ہے ۔ یہہ عیسائی
خانقاہ وادی الدیر میں واقع ہے ۔ "دیر" غیر اسلام کے عبادت گاہوں کو کہتے ہیں ؛
اس میں تمام مسیحی راہب اور کاہن جمع رہتے تھے ۔ اسکی شکل بہت مضبوط قلعہ
کی سی ہے کہ راہبوں اور گوشہ نشینوں کو تنہا بغیر محافظت کے دیکھ کر گرد و نواح
کے غارت گروں نے لوٹ مار شروع کر دی ۔ انکے روکنے اور خانقاہ نشینوں
کی حفاظت کے لئے قیصر روم جسٹینین بادشاہ نے خانقاہ کی چار دیواری اور عمارت
قلعہ کی طرح مضبوط تعمیر کرائی ۔ اور ایک دستہ فوج کا خانقاہ کی حفاظت کیلئے
مقرر کر دیا ؛ یہہ دستہ فوج کا یونانی مذہب رکھتا تھا لیکن عرصہ کی رسم و راہ اور
عرب سے میل جول کی وجہہ سے آخر کو ان کی اولاد مسلمان ہو گئی اور اب مسلمان ہے ؛

گرجے اور مسجد کا یکجا ایسے مقدس مقام میں ساتھ ساتھ ہونا دونوں مذہبوں
مذہب عیسائی اور اسلام کے اتفاق کے ثبوت میں کافی دلیل ہے ؛ وادی ایمن
میں جو حضرت موسیٰؑ کو جوتیاں اُتارنے کا حکم ہوا تھا اُسکی پابندی یہاں کیجاتی ہے کہ
عیسائیوں کو بھی تسبیح خانہ میں جوتیاں اُتار کے جانا ہوتا ہے ؛

گرجا کے دروازہ پر ایک مسجد ہے جس میں گو اب نماز نہیں پڑھی جاتی ہے
مگر اسکے متعلق ایک پاکیزہ روایت ہے ؛ کہا جاتا ہے کہ حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ
علیہ وسلم کا جب اسطرف سے گذر ہوا تھا تو خانقاہ کے راہبوں نے حضرت صلی اللہ

مضمون پریشان

حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا ارشاد ہے کہ عرفت ربی بفسخ العزایم۔ انسان نے خدا کو اس وجہہ سے پہچانا کہ انسان کے ارادے اسکی خواہش کے موافق پورے نہین ہوتے ؛ اس میں شک نہیں کہ یہہ دلیل خدا کی شناخت کے لئے بہت پاکیزہ ہے کہ انسان کی آرزوئیں اُسکی خواہش کے موافق جب پوری نہوئیں تو اُسے اپنے سے ہرطرح ایک بڑے قادر کے وجود کا ماننا ضرور ہوا۔ لیکن فسخ عزایم کے ساتھ آپ یہہ بھی دیکھ رہے ہیں کہ ہمارے ارادوں کے پورا ہونے میں (ایسے ارادے جنکے پورا ہونیکا کوئی سامان نہ تھا اور پورے ہوگئے) تائید ایزدی ہی کام آتی ہے : اس سے ظاہر ہے کہ فسخ کے ساتھ تائید بھی اُسکی طرف سے ہے۔ مایوسی سے زیادہ اُمید کا سہارا ہے ؛ جس طرح فرد کا ابرہ استر سے زیادہ خوشنما ہوتا ہے ہماری زندگی کا مدار مایوسی سے زیادہ اُمید پر ہے ؛ جناب ناظم (نواب رام پور خلد آشیاں) کا شعر ہے ؎

کیوں نہ خواہش کے مطابق دے مراد ؛ جسنے بے خواہش ہمیں پیدا کیا ؛

ہر شخص اپنی زندگی کے واقعات کو انصاف کی نظر سے دیکھ جائے تو شکایت سے زیادہ شکر کرنے کے موقعے نکلیں گے۔ یہہ مجھ پر گذری ہے کہ کوئی صورت بچنے کی نہ تھی اور کارساز حقیقی نے بڑی بڑی آفتوں سے بچا لیا ؛ اگر آپ اچھی طرح غور

کریں تو مصیبت میں بھی شکایت کی چنداں ضرورت نہیں۔ جتنی مصیبتیں ہیں کم وبیش ایک سی ہوتی ہیں جہاں ایک مصیبت برداشت کرلی باقی سب آسان ہوجاتی ہیں۔ دنیا میں کوئی مصیبت نئی نہیں نہ کوئی مصیبت کسی کے لئے فرمائشی تیار ہو کر آسمان سے اُتری ہے ؂

مصیبت جتنی گذری ہے وہی ہر پھر کے آتی ہے ✽ گذشتہ دن کو بھی ہم داخلِ فردا سمجھتے ہیں

ہمارے روزمرہ میں جو دن گذر گیا کل تھا جو آئیگا وہ بھی کل ہے۔ جسطرح کل کا دن گذر گیا جو آئیگا وہ بھی گذر جائیگا: اس میں اگر آپ ذرا رعنائی خیال سے کام لیں تو مصیبت بھی لطف سے خالی نہیں۔ دیدۂ گریاں کو ابرِ گہربار سے تشبیہہ دینی کیا بُری ہے؟ چشمِ پُرخوں کو اگر ساغرِ صہبا سے تشبیہہ دی جائے تو محتسب کا خوف کیوں کیا جائے؟ جگرِ خستہ کو گلِ خنداں کہنے سے کون روکتا ہے؟ چشمِ بیمار کو شاعر فسوں ساز کہیں تو آپ خفا کیوں ہوں؟ ؂ دودِ سودائی تتق بست آسمان نامید شد ✽ [illegible]

جلوۂ حسنِ بتاں کی ہے نمایش لیی ✽ اے دل اس باغ کا ہوگا چمن آرا کیسا

باغ سے باغباں کا قیاس کرلینا گناہ نہیں۔ محفل سے صاحبِ محفل کا ذہن میں آنا تعجب نہیں: برات سے دولہا کا اور دولہا سے برات کا پتہ لگانا مشکل نہیں ✽ ہم اگر خوش ہیں تو اور کو بھی خوش کرسکتے ہیں۔ اگر ہم خوش نہیں تو دوسرے کو کیا خاک خوش کریں گے؟ جو چیز ہمارے پاس نہیں وہ ہم دوسرے کو کیونکر دے سکتے ہیں۔ پہلے ہم آپ خوش ہولیں پھر اور کو بھی خوش کرسکیں گے ✽ اس گفتگو کے بعد اگر میں یہہ کہوں کہ اپنی جان کا خوش کرنا عبادت میں داخل ہے تو آپ تعجب نکریں اگر آپ عبادت نہ سمجھیں تو لغمت میں شک نہیں ✽ ؂

دوزخ میں نہ دیکھا کہیں جنت میں نہ پایا ✽ دُنیا نہ ملی پھر مجھے محشر سے نکل کر ✽

یہہ سمجھکر آپ۔ پریشانی کو عیب نہ سمجھیں۔ کیونکہ بقولِ قدیم۔

ع پریشانی اگر عیب است زلفِ یار ہم دارد - یار کی کوئی بات عیب میں داخل نہیں:
جب آپ نے عیب جانا تو محبت کو سلام کیجئے ؛ بکھرے ہوئے بال جو پریشانی میں
سنبل سے مشابہ ہیں اگر جعد کی صورت اختیار کریں یعنی سر کے بالوں کا جوڑا بندھ جائے
تو بھی آپ نسبت میں جمعیت خاطر سے زیادہ پریشانی میں لطف سمجھیں ؏

زلف نے جعد کی صورت پائی ؛ پھر بھی ہے حال پریشاں میرا

دنیا میں عیش و غم دونوں برابر ہیں - دونوں ہم آواز اور ایک ہی اُستاد یعنی عالمِ اسباب کے شاگرد ہیں - سُننے والوں کے کانوں میں فرق ہے : کسی کو ترانے کسی کو نالے سُنائی دیتے ہیں ؛ مطرب خوش نوا اور مشاق ہے - یہہ تصور سُننے والوں کا ہے کہ شام کی راگنیوں اور صبح کی راگنیوں میں مغالطہ کرتے ہیں ؛ حسینوں کی صدائے پا میں وہی اثر ہے جو تم باذنی میں ہے - فرق ہے زمانہ اور حالت کا ؛ ۱۹۲۳ برس پہلے ذرا زبان ہلانے سے مُردے زندہ ہوجاتے تھے اور اب زندہ مُردہ دل دیکھ لیجیے -

گلدستے بلور کے سہی مگر پھول نہ ہوں تو بیکار ہیں ؛ زندگی کا وہ زمانہ کہاں جب ہم کسی کو چاہتے تھے تو اُدھر سے بھی چاہنے کا خیال تھا - صبح فراق کے ساتھ شام وصال کی اُمید تھی : اور خوبی یہہ کہ ذہن میں تھا کہ اسی اُمید و خیال میں تمام عمر گذر جائیگی ؛ وہ کون انسان ہے جسنے عروسِ دہر کو وفادار نہ جانا - گو اگلے پچھلے سب اسی بیوفا کہتے آئے : کون ہے جو اسکے وعدوں پر ایمان نہ لایا گو کوئی وعدہ پورا نہوا ؛ یہہ زمانہ کی خوبی ہے کہ نغمہ کبھی نوحہ اور نوحہ کبھی افسانہ ہوجاتا ہے - کسی کو زندگی کے لالے ہیں کہیں مرنے کا ارمان - رفتارِ یار کہیں محشر بپا کرتی ہے کہیں نقش پائے یار جاوۂ عمر ابد سمجھا جاتا ہے ؛

لیکن زندگی بُری یا بھلی جیسی تھی جسطرح گذر گئی غنیمت ہے - اسکے بڑھنے کی خواہش کچھ ایسی بڑی عقلمندی نہیں : عمر کو بڑھا کر کیا کیجئے گا ؟ اگر بری گذری تو اس کا خیال ہی چھوڑیے - بھلی گذری تو بھلی چیز بھی زیادہ اور متواتر ہونے کی وجہہ سے اجیرن

اسی طرح مضمون پریشان اگر دلکش نہیں تو اسکا چھوڑنا مناسب نہیں۔ اگر دلکش ہے تو متواتر اسی کا ذکر اجیرن سمجھئے ؛ اگر اجیرن بھی نہوا تو کیا اسکے بعد صلائے عام نہ نکلیگا ؟ حضرت صابر فرماتے ہیں ؎

فصل پھر کیا نہیں آنے کی جنوں کی صابر ٭ آپ کئے دن کو چلے شہر میں ویرانے سے
اوک سے ہم کو پلا مے تو مدام اے ساقی ٭ تا یقیں شیخ کو آئے یہ قسم کھانے سے
پاؤں ٹوٹیں جو گئے ہوں کبھی خم کے نزدیک
ہاتھ جل جائیں لگائے ہوں جو پیمانے سے

جناب صفدر مرزاپوری

اسے بھی ساتھ لیتے جاؤ جاتے ہو جو گلشن سے ٭ بہار باغ بھی لپٹی چلی آتی ہے دامن سے
متانت کہہ رہی ہے شوخیاں رخصت ہوں چتون سے ٭ گلے ملنے جوانی آتی ہے اُن کے لڑکپن سے
جہاں ملجاؤگے یہ بھی لپٹ جائیگی دامن سے ٭ تمہیں کو بوئے گل اب ڈھونڈنے نکلی ہے گلشن سے
عرق آلودہ پیشانی ہوئی کیوں ذکرِ دشمن سے ٭ خجل کیوں ہو پسینہ پونچھ لو تم میرے دامن سے
لئے جاتا ہے مجھکو بیاباں کر صبا گلشن سے ٭ مرے بدلے مرے پر اُڑ رہے ہیں اب نشیمن سے
دلِ خوں گشتہ میں قطرے ہیں کچھ خونِ تمنا کے ٭ ضرورت ہو جنہیں لے جائیں خوشے میرے خرمن سے
خبر کیا تھی کہ وہ گورِ غریباں میں بھی آئیں گے ٭ قیامت آئیگی اُٹھنا پڑے گا ہم کو مدفن سے
ہمیں تو دور ہی سے دیکھکر آنکھیں دکھاتے ہو ٭ عتاب ان پر نہیں یہ ہار کیوں لپٹے ہیں گردن سے
صدا ناقوس بھی دینے لگا اللہ اکبر کی ٭ مسلماں کر کے نکلے سب کو ہم دیر برہمن سے
چراغِ مہر بھی ٹھنڈا ہوا گورِ غریباں میں ٭ اُٹھے تم سانس ٹھنڈی بھر کے کس بے کس کے مدفن سے
نشیمن پھونکنے والے ہماری زندگی یہ ہے ٭ کبھی تالے کئے لپٹے کبھی خاکِ نشیمن سے
یہی نہ دیکھ کر کچھ اور بھی مشتاق ہو جائیں ٭ نتیجہ اسکا کیا ہے کیوں لگے بیٹھے ہو چلمن سے

(از مشرق)

مثنوی بمقابلۂ ڈراما

مسلمانوں کی شاعری میں شروع سے ڈراما کی طرف توجہ نہیں ہوئی۔ حالانکہ قدیم زبانوں میں ڈراما پر بہت زور دیا گیا: یونانی زبان کے اکثر علوم وفنون کا ترجمہ مسلمانوں نے اپنی زبان میں کیا مگر غیر ملکوں کی شاعری کی طرف متوجہ نہ ہوئے۔ سبب یہہ کہ انہیں اپنی زبان کی شاعری پر اسقدر ناز تھا کہ غیروں کی شاعری بیکار سمجھے۔ خاصکر ڈراما کی طرف نظر اٹھاکر نہ دیکھا کہ مسلمانوں میں پردہ کا حکم ہے اور ڈراما و تھیٹر میں پردہ کا نباہنا مشکل ہے۔ محض حسن کی طرف توجہ کرنا کافی سمجھا گیا۔ حسن چاہے خیال میں ہو چاہے بیان میں۔ پھول میں ہو چاہے پتی میں۔ عمارت میں ہو چاہے عبارت میں۔ تحریر میں ہو یا تقریر میں۔ کوہ میں ہو یا بیابان میں۔ زمین میں ہو یا آسمان میں۔ غرض حسن صورت اور حسن سیرت سے کام لیا۔ ڈراما کے عوض مثنوی ایجاد کی اور اسقدر مثنویاں لکھ ڈالیں کہ شاید ہی کسی اور زبان میں ہوں۔ مسلمانوں کی لٹریچر میں اردو فارسی کی مثنویاں اگر جمع کی جائیں تو ایک کتب خانہ علیحدہ جمع ہو سکتا ہے۔ انکی تعداد لکھنی

شکل ہے ٭ ہمارے ہاں کی مثنویاں شاعری کی جان ہیں اور نازک خیالی اور پاکیزہ بیانی میں یورپ کی اعلےٰ درجہ کی شاعری سے کسی طرح کم نہیں۔ یورپ کی رئیل اسٹک (Realistic) لٹریچر خاصکر فرنچ اور انگریزی زبان کی ہماری زبان کی مثنویوں کی ہر دلعزیزی کو نہیں پہونچتی ٭

مثنوی سے یہہ فائدہ ہوا کہ پردہ کی تعمیل میں فرق نہ آیا اور کمال فن بھی ظاہر ہوگیا۔ جتنے پرانے افسانے عشق و محبت کے تھے اساتذہ نے ایک ایک کرکے اپنے اپنے کمال کے اظہار میں علیحدہ علیحدہ لکھے: لیلےٰ مجنوں۔ یوسف زلیخا۔ شیریں و فرہاد۔ نلدمن۔ ہیر رانجہ وغیرہ۔ کے عالمیں اتنی مثنویاں ہیں کہ شاید ہی کسی کی نظر سے ساری کی ساری گذری ہوں ٭ یہہ سب از روے شاعری اپنی اپنی وضع میں لاجواب ہیں۔ ایک ہی مضمون پر مختلف اساتذہ کا کلام دیکھنے سے اُنکی سخنوری اور اپنی شعر فہمی کا اندازہ معلوم ہو جاتا ہے۔ کہ ایک مقرّرہ معاملہ کو نظامیؒ نے اسطرح اور جامیؒ نے اسطرح ہاتفی نے اس طرز پر اور ناظم ہروی نے اس طرز پر ادا کیا اور ہر طرز اپنی اپنی وضع میں بے مثل ہے ٭ یہہ حال تو ٹکسالی مثنویوں کا ہے۔ غیر معمولی مثنویاں بھی از روے شاعری ڈراما کے مرتبہ سے کسی طرح گری ہوئی نہیں ٭

شعر سمجھنے کی فکر میں ایکدفعہ میں نے اردو کی مثنویاں جمع کیں۔ معلوم ہوا کہ دلّی کے شاعروں میں متقدّمین نے اسطرف کم توجہ کی یا اُنکا کلام اس طرز کا نایاب ہوگیا اور مجھے مل نہ سکا۔ متاخرین میں بھی شعراء دہلی نے اس طرف توجہ بہت کم کی: شعراء لکھنؤ نے مثنویاں زیادہ لکھیں اور بہت اچھی لکھیں ٭ مشہور مثنویوں کو چھوڑ کر بہت سی ایسی مثنویاں اور دیکھنے میں آئیں جو از روے شاعری اور خوش بیانی ڈراما کا جواب کیا بلکہ اکثر ڈراما کی شاعری سے بہتر نکلیں گی ٭ ان غیر مشہور مثنویوں میں جناب عروج کی مثنوی میں سے میں چند اشعار جابجا سے نقل کرتا ہوں جس سے ظاہر ہو جائیگا کہ اس طرزِ بیان کے سامنے ڈراما کی ضرورت

ہیں

نہیں۔ اس طرز میں پردہ بھی بنا رہا اور شاعری کا لطف بھی آگیا ؛

سین[1] یہہ ہے کہ حضرت ہیرو[2] حسینوں میں گنے جاتے ہیں جنکے حُسن کی قدرشناس مہ جبین مشتاق رہتے تھے :۔ ع

شرمگیں پردے والیاں چُھپ کر ؛ بھیجتی تھیں گلوریاں اکثر
اُن کی ماما پیام دے جاتی ؛ سر سے پا تک بلائیں لے جاتی
گھر سے پست تمام ماہ جبیں ؛ میٹھی نظروں سے دیکھا کرتی تھیں
منہہ میں پانی بھر آتا تھا سب کے ؛ کرتی تھیں چھیڑ چھاڑ مطلب سے
پھینکتی تھیں یہ بعضی آوازے ؛ بیمروّت کوحق حسیں نہ کرے
ایک کہتی تھی ایک سے اے لو ؛ گھورتے تک نہیں ہیں یہ ہم کو
ہمسے رغبت ذرا نہیں کرتے ؛ اُونہہ کھلونے ہیں گویا مٹی کے
دیکھنے ہی کا ہے یہہ حُسن یہ سِن ؛ جسطرح سے پھلوں میں اندراین × × ×

حضرت ہیرو کی پارسائی دیکھئے۔ ع

سب یہہ ہم ایک کان سے سُنکے ؛ دوسرے کان سے اُڑاتے تھے
سُنکے ہم ان سبھوں کے آوازے ؛ شرم کے مارے کانپ جاتے تھے
غزلوں کو سمجھتے تھے ہذیاں ؛ لغو مہمل تھا شاعروں کا بیاں
تھوڑا سُننا بھی بیٹھکر بہ خدا ؛ دلپہ بارِ گراں گذرتا تھا
ہجر کا مارا گر کوئی شیدا ؛ اپنی بپتی کبھی جو دوہراتا
اُس گھڑی دیکھکر اُسے مُضطر ؛ ہنسنے لگتے تھے اُسکے رونے پر
کہتے تھے خبط ہوگیا ہے انہیں ؛ خفقاں مالیخولیا ہے انہیں
لذّتِ وصل ہجر کا صدما ؛ کونسی چیز ہے خداوندا
جسکے مارے ہزاروں ماہ جبیں ؛ خاک میں مل گئے بروئے زمیں

(نوٹ) [1] سین سے مُراد واقعہ یا معاملہ ۱۲ [2] ہیرو سے مُراد جسکا ذکر ہے۔ ۱۲

اور جو جیتے بھی ہیں وہ بد انجام ٭ زندہ در گور ہو رہے ہیں تمام
اپنی عزت کے وہ پڑے پیچھے ٭ آبرو خاک میں ملا بیٹھے
جو کہ چاہِ ذقن میں گرتے ہیں ٭ نرے دیوانے ہیں وہ اندھے ہیں
حلقۂ گیسوئے پریشاں کیا ٭ دل اُلجھتا ہے جس میں انسان کا
تیرِ مژگانِ دلربا کیا ہے ٭ جو کلیجہ دو سار کرتا ہے
چلتا ہے ناوکِ مژہ کیونکر ٭ کہ جگر دوز ہے زبانوں پہ
شبِ غم کی بساط ہی کیا ہے ٭ جسکا کٹنا پہاڑ ہوتا ہے ×××××

ہیرو اِئن[1] کے بچ پن یعنی کم سنی کے ذکر میں ہے۔ ۵

ہاں سراپا کا اُسکے حسن و ادا ٭ ہوتے یوسف تو اُن کو دکھلاتا
ابھی تو دس برس کا ہے سن و سال ٭ وہ پہونچا نہیں ہے تا بہ کمال[2]
مگر اس کم سنی میں بھی اُسکے ٭ پیارے انداز و ناز کے صدقے
کان کی تازہ بیہیں دُکھنے پہ ٭ ہاتھ رکھتی ہے سسکیاں لیکر
جست کی بالیوں کی گونجوں میں ٭ موم چپکا ہوا کہ چبھ نہ سکیں
نیم کا جو ہرا ہرا تنکا ٭ ناک کے تازے چھید میں تھا پڑا
کیا کہوں فرطِ نازکی اُس کی ٭ ہونٹھ ہل جانے سے بھی دُکھتی تھی
سادگی سے نشیلے پن کا نباہ ٭ اُسکی چھب پر تھا لاکھ لاکھ بناؤ
پنچھیاں ریشمی سیاہ حسیں ٭ گوری گوری کلائیوں میں پڑیں
پیاری گردن میں نیلے ڈورے بندھے ٭ بد نگاہوں کی تا نظر نہ لگے
مینڈھیاں گو گندھی ہوئی تھیں مگر ٭ بال تھے بکھرے بکھرے ماتھے پر
کم سنی میں وہ رہروی کی ادا ٭ لوٹنا وہ زمیں پہ پائنچوں کا
جس طرف سے گذر گئی وہ پری ٭ بسی خوشبو سے بس گئی وہ گلی ××××

نوٹ [1] ہیرو آئن۔ یعنی جس پریوش کا قبضہ ہے " [2] ماہ کامل مہ نو دونو حسیں ہیں لیکن ٭ ایک ذرا سن ہے جو کم اس سے ہلال اچھا ہے۔

اس کم سن لڑکی کی بدنصیبی کہ اسکی ماں کو ایک میراثی بھگا لایا تھا۔ عورت کا پہلا شوہر کوی عالی خاندان شریف تہا۔ یہہ لڑکی اُس شریف سے پیدا ہوی لڑکی اور لڑکی کی ماں کی بدنصیبی کہ لڑکی کا باپ مرگیا۔ گردش روزگار کرشمہ کے جلوہ میں ایک میراثی اُس شریف عورت کو فریب کرکے گھر سے نکال لایا۔ یہہ لڑکی بھی ساتھ آئی ٭ لڑکی کو ماں کی اس حرکت سے بہت رنج رہتا تھا اور یہہ ذکر سنکر رویا کرتی ؎

بس نہ چلتا تھا اُس گھڑی کوئی ٭ مارے غیرت کے رونے لگتی تھی
کبھی پوچھا سبب جو رونے کا ٭ کیوں گُڑہیں کچھ کسی نے تم سے کہا
کہتی تھی کیا بتائیں حال اس کا ٭ شکوہ تم سے کروں میں کس کس کا
باپ کی ہے خطا نہ ماں کا قصور ٭ اپنی تقدیر نے کیا مجبور
کہتی تھی ٹھنڈی سانسیں بھر بھر کے ٭ دُکھڑے کیا روئیں ہم مُقدر کے
دیکھیئگا فلک کی کم ظرفی ٭ پھوٹی قسمت ہمیں کو دینی تھی
یہہ خمیر اپنا خاکِ عصمت کا ٭ کیسا برباد کر رہا ہے کہ ہمارا!
اری بادِ فنا اُڑا کے مجھے ٭ تو لگا دے عدم کے رستے سے
تا نہ ساعت بُری بھلی دیکھوں ٭ کھو کے حُرمت گلی گلی دیکھوں ×××

ـــئے جیں کر ایک نازک معاملہ ہے کہ کسی بات پر آپس میں شکر رنجی سی جو ہوی تو حضرت نے اُٹھکر وہاں سے چلنے کا ارادہ کیا اور خدا حافظ کہکر کھڑے ہو گئے اسکو کس خوبی سے بیان کیا ہے ؎

کہہ کے یہہ (خدا حافظ) جو ہی پاؤں سرکایا ٭ اپنا دامن دبا ہوا پایا
دیکھا کیا جھک کے پاؤں کے نیچے ٭ بیٹھی ہیں زور سے دبائے ہوئے
جب کہا میں نے چھوڑیئے بس بس ٭ دیکھ لی آپ کی ہوا و ہوس
خاصداں لیکے ہاتھ میں اکبار ٭ نیچی نظروں سے دیکھکر وہ نگار

بولیں میں روکتی نہیں جاؤ ٭ اچھا اے لوگوری تو کھاؤ × × × × ×

اس سے زیادہ ڈراما و تھیئٹر کسی معمولی یا غیر معمولی سین کا نقشہ کیا دکھائیں گے؟ اس پر یہہ کتنی بڑی خوبی ہے کہ شاعری غضب کی اور پردہ کی بھی پابندی ٭ مسلمانوں نے ہر طرز میں کمال پیدا کیا مگر شعارِ اسلام کے ساتھ کہ پردہ کی تاکید میں فرق نہ آئے ڈراما میں پردہ کی دقت تھی اس لئے ڈراما کی جگہہ مثنویوں سے کام لیا ٭

یہہ مثنوی؎ جس میں سے میں نے چند اشعار لکھے ہیں ڈراما سے بازی لیگئی ہے اسکی شاعری کی داد دینے کے لئے اُردو میں نہایت اعلےٰ درجہ کی لیاقت درکار ہے: معمولی لیاقت کے لوگ اسکی سخن گستری کی داد نہیں دے سکتے ٭ لیکن اسی مثنوی پر کیا مدار ہے۔ ہماری زبان کی مثنویاں دیکھنے کے قابل ہیں ٭

جناب وسیم خیرآبادی

نکالے کیا کوئی دل سے کسی کافر کا پیکاں ہوں ٭ نکل سکتا نہیں یارب کسی بے کس کا ارماں ہوں

کوئی جوشِ جنونِ عشق میں حالت مری دیکھے ٭ جو خنداں ہوں تو خنداں ہوں جو گریاں ہوں تو گریاں ہوں

کسی کا عیب ہوں جو خاک سب نے ڈالدی مجھپر ٭ کسی کا جرم ہوں کیا میں جو زیرِ خاک پنہاں ہوں

پسند آجائے اسکو مجھ پریشاں کی پریشانی ٭ پریشاں ہوں تو زلفِ یار کی صورت پریشاں ہوں

دلِ پُر درد میں آکر رہے یوں مل کے یہہ دونوں ٭ یہ کہہ سکتا نہیں کوئی میں پیکاں ہوں میں ارماں ہوں

مرا داغِ دلِ روشن مرے سینے میں کہتا ہے ٭ تجلی میری پنہاں ہے چراغِ زیرِ داماں ہوں

ٹھہرنے کا نہیں اک دم عدم میں جاکے دم لونگا ٭ جہاں سے میں گریزاں صورتِ عمرِ گریزاں ہوں

یہی بزمِ جہاں میں حسنِ روئے یار کہتا ہے ٭ شبستاں مجھ سے ہے پُر نور میں شمعِ شبستاں ہوں

یہ رنگِ لاغری ہے تو وہ زورِ بے قراری ہے ٭ کہ بجلی ہوں فلک پر باغ میں خارِ گلستاں ہوں

بلند آواز سے یوں آسیا ہر وقت کہتی ہے ٭ بھرے منہہ رزق سے میں اس لئے دن رات گرداں ہوں

(از مشرق)

نوٹ۔ ؎ مثنوی عروج الفت نامی۔ مطبوعہ نامی پریس کانپور ٭

تصوف و اعتزال

مسلمانوں کے علم وفضل کی تحقیق میں علمار معتزلہ وصوفیار کرام کا ذکر بھی ضروری سمجھنا چاہیئے۔ اعتزال کا مذہب تو شروع میں زیادہ زور پر رہا پھر اسکا زور گھٹ گیا۔ سبب یہہ کہ اعتزال کا مدار علوم معقول پر تھا اور عقائد مذہبی میں عقل کو دخل نہیں۔ جو بات جسقدر معمولی سمجھ سے باہر ہو اُسی قدر عقائد میں مضبوط سمجھی جاتی ہے ؛ تصوف کا انحصار زیادہ تر رموز و اسرار پہ ہے اور وہ بھی سینہ بسینہ خاص خاص بزرگوں کی تلقین کے موافق بے چون و چرا چلے آئے ہوں ؛ علمار معتزلہ کو دماغ سے اور صوفیائے کرام کو دل سے تعلق سمجھئے ؛ تصوف کی مشق کو دل سے تعلق ہے کہ جسقدر تصوف کے ذکر اذکار ہیں اُن میں دل سے کام لیا جاتا ہے اور اعتزال کو محض عقل کی ضرورت ہے ؛

معتزلہ کی نسبت مقریضی کا بیان ہے کہ اعتزال نے حکما کے عقائد اور مسائل کو اسلام میں زیادہ دخل دیا۔ اس وجہ سے دوسری صدی کے دو معرکتہ الارا مسئلے بہت بحث اور تحقیق کا باعث ہوگئے۔ ایک جبر و اختیار کا مسئلہ دوسرا کلام مجید کا ازلی ہونا ؛ اسکے بعد صفات الٰہی کی بحث اور دیدار الٰہی کا عقیدہ کہ کلام الٰہی میں دیدار الٰہی کا وعدہ ہے ؛ دیدار الٰہی

کہ عقیدہ کی نسبت مذہب عیسائی کے علمار اسلام سے پہلے بحث کر چکے تھے۔ اُنکے دیکھا دیکھی مسلمانوں میں بھی اس طرف توجہ ہوئی ؛ واصل بن عطا کا عقیدہ تھا کہ جو دو چیزیں ازلی مانے تو اُسنے گویا دو خدا مانے۔ لیکن یہہ وقت تو صفات آلہی کی صفت میں پیدا ہو سکتی ہے ؛ واصل کے بعد ابوالہذیل العلاف ساکن بصرہ سے اعتزال کی دوسری پشت ۲۲۶ھ ہجری میں شروع ہوئی۔ یہہ وہ زمانہ تھا جب کہ حکمار یونان اور یونانی فلاسفی کا بہت زور ہوا۔ علاف بصری کے بعد ابراہیم بن سیار النظام نے بھی فلاسفہ یونان ہی پہ زور دیا ؛ یہہ شخص فلسفۂ یونانی کا بڑا عالم اور زبردست لکھنے والا تھا۔ اسکے بعد بشیر بن معتمر نے مسائل فلاسفہ کو اسلام کے عقائد سے مطابق کرنے میں بہت کوشش کی۔ جبر و اختیار کے مسئلہ میں اسکی رائے تھی کہ اختیار میں صورتِ حال کو دخل ہے۔ معصوم بچوں کو ابدی سزا کس طرح ہو سکتی ہے جو ابھی نیک و بد سے واقف نہیں۔ ہاں بالغ عقل سے خدار واحد کو پہچان سکتے ہیں اور پہچاننا چاہئے ؛ معمار بن عباد السلیمی پر فلسفہ یونان کا اس قدر اثر تھا کہ اُسکی رائے میں خدائے واحد کی معرفت انسان سے ناممکن ہے۔ اسکا عقیدہ قریب قریب وحدت فی الکثرت کی طرف مائل تھا ؛ اسکے شاگرد ثمامہ بن العشرس نے اس عقیدہ پر بہت محنت کی۔ اس نے صاف صاف عالم کو ازلی مانا ؛ یہہ بنیاد قریب قریب تصوف کی سمجھئے۔ یہانتک کہ ارواح کا حلول بھی بعض کے ذہن پر آیا کہ جو ارواح ہر طرح نیک نہیں ہیں یا جو ہر طرح بد نہیں تناسخ کے بعد جزا و سزا کے مستحق سمجھے جائینگے ؛ رہا عاقبت میں دیدارِ آلہی کا مسئلہ اس میں احمد اور فضل دونوں کو انکار ہے ؛ اگر انصاف سے دیکھا جائے تو معتزلہ نے علم و فضل کی تحقیق میں بہت محنت کی اور زیادہ علمی کتابیں معتزلہ کی تصنیف ہیں ؛

معتزلہ کے اخیر دور میں اعتزال کے دو فریق ہو گئے۔ ایک بصرہ کے نام سے دوسرا بغداد کے نام سے مشہور ہوا ؛ انکے آپس میں بڑے معرکے رہے ؛ لیکن جب

فساد عقائد یونانی فلسفہ کی تعلیم اور رواج کا نتیجہ سمجھئے۔ کیونکہ شروع شروع میں تو ارسطو کی تصانیف کے سرسری ترجموں سے پہلے کچھ ذہن میں آیا پھر جب زیادہ معتبر ترجمے ہاتھ لگے یونان کی فلاسفی رفتہ رفتہ اچھی طرح سمجھ میں آنے لگی ؛

راقم کی نگاہ میں یہہ دقتیں عقاید کی اس وجہہ سے پیدا ہوئیں کہ دوسری صدی میں اس بات کی کوشش ہوئی کہ عقائد اسلامی کو جنکا مدار قرآن مجید پر ہے ارسطو کی فلاسفی سے ملائیں۔ یہہ غلطی علماء عیسائی اور علماء اسلام دونوں نے کی۔ عقائد مذہبی کو فلاسفی سے بالکل علیحدہ رکھنا تھا ؛ عقائد مذہبی میں عقل کو دخل دینے کا نتیجہ یہہ ہوا کہ چوتھی صدی ہجری میں اعتزال کا خاتمہ ہوگیا ؛

عالم اسباب کا قاعدہ ہے کہ جب عقل پر غایت درجہ زور دیا جائے تو پھر انسان کی طبیعت اُس صورت کی طرف رجوع کرتی ہے جو ظاہرا عقل سے باہر ہو۔ اعتزال کے زوال کے ساتھ ہی تیسری صدی ہجری میں عقائد صوفیہ کا رواج ہوا۔ تصوف سے غرض خاص تزکیہ نفس ہے۔ یہہ غرض شروع میں عیسائی مذہب سے ایجاد ہوئی جس میں سب سے بڑا ثواب تارک الدنیا ہونے کا ہے۔ راہب اور خانقاہ اسی عقیدہ کے نتیجے ہیں ؛ تصوف کا بڑا عقیدہ بھی ترک دُنیا کا ہے۔ اور ترک دُنیا میں سب سے بڑا ممبر بودہ مذہب کا ہے۔ بودھ عقیدوں کا رواج اسلام سے پہلے ایران میں پہونچ چکا تھا۔ اور بلخ میں بودہ مذہب کے مندر موجود تھے بودہ مذہب کا عقیدہ نروان کا مشہور ہے۔ یہہ مسئلہ فنا سے بہت ملتا ہے۔ ایسے عقیدوں کا اثر انسان کی طبیعت پر ممکن ہے کہ دُنیا سے نفرت پیدا کردے ؛ لیکن جہانتک تحقیق ہوسکتا ہے۔ تصوف بھی فلاسفی کا نتیجہ اور خاص ارسطو کی فلاسفی کا اثر معلوم ہوتا ہے ؛ انسان کی طبیعت میں سب سے زبردست اثر عشق ومحبت کا سمجھنا چاہیئے۔ اسے عشق مجازی کہتے ہیں۔ یہہ محبت خدا سے کی

تو عشق حقیقی سمجھا جاتا ہے ۔ مجازی کا تعلق نفس سے اور حقیقی کا روح سے سمجھتے ہیں ۔
عرصہ تک جمہورِ اسلام کو عقائدِ صوفیہ سے بہت تکرار رہی۔ حضرت منصور حلاج کی شہادت اس تکرار کا اثر تھا ۔ حضرت امام غزالیؒ نے تصوف میں جان ڈالی اور چھٹی صدی ہجری میں اہلِ سُنت جماعت میں عقائدِ صوفیہ معتبر قرار پائے ۔
ساتویں صدی ہجری میں تصوف اسپین میں پہونچا۔ لیکن وہاں سے جب مسلمان نکلے تو تصوف بھی نکل گیا ۔

عقائدِ صوفیہ کا آغاز حضرت ذالنون مصریؒ سے سمجھنا چاہیے اور خاتمہ حضرت جلال الدین رومیؒ پر۔ باقی کم و بیش ترمیم و ترتیب ہوتی رہی ۔ عقائدِ صوفیہ گو اسلام میں بہت مقبول سمجھے گئے لیکن تصوف سے اختلاف بھی بہت زور سے ہوتا رہا۔ حضرت امام حنبلؒ کے شاگردوں میں ۷۲۸ھ میں ابن طیمہ نے تصوف کے خلاف بہت اعتراض کیئے۔ اِنہیں اعتراضوں کے سہارے وہابی مذہب کے بانی عبدالوہاب نے سر اُٹھایا ۔ اور گو اعتزال کا نام باقی نہیں تصوف کو ترقی ہے ۔

میرا ماخذ ان معلومات کا ڈاکٹر ڈی لیسی اولیری کی تصنیف ہے جسکا نام ہے

Arabic Thought and its place in History.

Trubner's oriental Series.

مزہ گناہ کا جب تھا کہ با وضو کرتے ۔ بتوں کو سجدہ بھی کرتے تو قبلہ رو کرتے ۔ کبھی نہ پرورشِ نخلِ آرزو کرتے ۔ نمو سے پہلے جو اندیشۂ نمو کرتے
نہیں نہ دیتے تو پھر کیا پڑی تھی خاطر نکو ۔ کہ تم کو محرمِ انجام ننگ ہو کہتے ۔ گناہ تھا ہی تو کیسا گناہ بے لذت ۔ قفس میں بیٹھے گیا یادِ رنگ و بو کہتے
بہانہ چاہتی تھی موت بس نہ تھا اپنا ۔ کہ میزبانیٔ مہمانِ حیلہ جو کرتے ۔ دلیلِ راہ دلِ شب چراغ تھا تنہا ۔ بلند و پست میں گزری ہے جستجو کرتے
ازل سے جو کشش مرکزی کے تھے پابند ۔ ہوا کی طرح وہ کیا سیر چار سو کرتے ۔ پناہ ملتی نہ امید میں وفا کو کہیں ۔ ہوس نصیب اگر ترک آرزو کرتے
فلک نے بھول بھلیاں ڈال رکھا تھا ۔ ہم انکو ڈھونڈتے یا اپنی جستجو کرتے ۔ ازالہ اُن کی نجاست کا اور کیا ہوتا ۔ جلا کے خاک نہ کرتے تو کیا لہو کرتے
مزارِ یاس پہ کرتے ہیں شکر کے سجدے ۔ دعائے خیر کیا اہلِ لکھنؤ کرتے

ابوالمعانی مرزا یاس ۔ لکھنوی ۔

کوہ کندن موش برآوردن

چوں خدا خواہد کہ پردہ کس درد ❊ میلش اندر طعنۂ پاکاں برد

حسنِ اتفاق سے انجمن ترقی اردو کا سہ ماہی رسالہ بابت اکتوبر ۱۹۲۲ء خاکسار کی نظر سے گزرا۔ میری غرض رسالۂ مذکور پر کسی ریمارک کرنے کی نہیں ہے۔ کیونکہ فی زمانہ رسالوں میں بہترین رسالہ ہے جو بڑی قابلیت اور عرق ریزی سے ترتیب دیا جاتا ہے جس کے مضامین اعلےٰ درجے کے ہوتے ہیں اور کیوں نہ ہوں کہ قوم کے سربرآوردہ ماہ و نامی گرامی اربابِ علم و دانش کی قلم سے مترشح ہوتے ہیں اور انہیں سلجھے ہوئے دماغوں کا نچوڑ ہیں۔

اس رسالے کے مضامین پر البتہ مجھے کچھ عرض کرنا ہے جس کیلئے میں خواہانِ معافی ہوں۔ میری غرض کسی پر تعریض یا بے جا حملہ کرنا نہیں ہے۔ میں خود اس طرزِ عمل کی ناپسندیدگی پر یہ چند سطریں لکھ رہا ہوں تو پھر کیسے ہو سکتا ہے کہ یک بام و دو ہوا یا خود را فضیحت و دیگراں را نصیحت کا ہدفِ ملامت بنوں۔ بہرحال میری عذر خواہی کا منشا یہ ہے کہ جو کچھ عرض کرتا ہوں صاف دلی او نیک نیتی سے نہ کہ تو تو میں میں اور ناحق کی بدمزگی کیلئے

روئے سخن کسی کی طرف ہو تو روسیاہ ❊ سودا نہیں جنوں نہیں وحشت نہیں مجھے

اس رسالے کے صفحات ۵۳۳ تا ۵۸۳ پر جناب مولوی حافظ محمود خاں صاحب شیرانی نے (جن کے نام نامی اور اسم گرامی سے یہ ہیچ میرز بدقسمتی سے نابلد ہے) مولینا شبلی نعمانی مرحوم و مغفور کے مشہور روزگار سلسلہ شعر العجم کی جلد اول کے مضامین متعلق بہ رودکی و دقیقی کی دھجیاں بڑی قابلیت اور پُرزور نیش زن تقریر سے بکھیری ہیں۔ علامہ شبلی کی ناقابلیت اور کوتہ نظری کو جس شد و مد سے بیان فرمایا ہے اور ان کی اغلاط کا خاکہ اڑایا ہے او تیل کا بیل بنایا ہے۔ ہم بلا رد و کد بلا دلیل و حجت ماننے کو نہ صرف طیار ہیں بلکہ ساتھ ہی اس کے صاحب تبصرہ کی نازک خیالی۔ فنِ تاریخ پر عبور کے بھی معترف ہیں اور کھلے خزانے ہم کو کہنا پڑتا ہے کہ ع این کار از تو آید و مرداں چنیں کنند۔ آج تک ہم عجب غلط خیال میں غلطاں پیچاں تھے۔ ہم تو اپنے حسنِ ظن سے شبلی کو بڑا کامل بڑا عالم۔ بڑا ماہرِ تاریخ جانتے اور سمجھتے تھے مگر جناب شیرانی

صاحب نے تو اُنکا کچا چٹھا کھول کر دھر دیا۔ اب ہماری بھی آنکھیں کھلیں اور ہم خواب غفلت سے چونکے اور جان گئے کہ "دور کے ڈھول سہاؤنے" شبلی وبلی نرا ڈھکوسلا ہی ڈھکوسلا تھا۔ ہم کو گیا دُنیا بھر کو جناب شیرانی کا شکر گزار ہونا چاہئے کہ ہمکو ایک بڑی غلطی سے نکال کر راہ راست پر لائے اور اس کار خیر کا سہرا اُن کے سر رہا۔ اِس تنقید کی اصلی غرض جو تھی وہ بھی ظاہرہ باہر ہو گئی کہ جناب شیرانی بڑے محقق۔ تاریخ قدیم وجدید کے مبصر۔ بڑے ذی علم۔ بڑے عالم متبحر اور فاضل اجل ہیں۔ جب تو انہوں نے اِتنی جرأت کی اور ہاتھی کے ساتھ گنے کھائے۔ مولٰنا شبلی سے لغزشیں ضرور ہوئی ہیں جو عین اِقتضائے بشریت ہے اور کس سے نہیں ہوتیں اور جو اِس کے خلاف دعویٰ کرے وہ انسان تو نہیں شاید فرشتہ ہوگا۔ مولٰنائے مرحوم نے کہیں دعویٰ نہیں کیا کہ اُن کی اتنی بڑی کتاب سہو و اغلاط سے بالکل پاک ہے اور نہ ایسا دعویٰ کوئی کر سکتا ہے اب رہی موشگافی اور اعتراض اِن سب کا مختصر اور جامع و مانع جواب یہ ہے کہ مَنْ صَنَّفَ اُسْتُهْدِفَ[1] قابل مضمون نگار صاحب نے بڑی محنت و عرق ریزی سے ایڑی چوٹی کا زور لگا کر چند غلطیاں شبلی صاحب کی اگر گرفت کیں تو کیا کمال کیا۔ کمال تو جب تھا کہ کوئی کتاب شعر العجم سے بہتر تو کیا لکھتے۔ خیر اُسکے برابر ہی لکھ کر میدان میں آتے۔ میں کہتا ہوں کہ اگر ایسی عیب چین نظر سے کسی کی تحریر کو بھی دیکھا جائے تو دس پانچ اعتراض نکال کھڑے کرنا کچھ بھی مشکل نہیں۔ ابھی تو مضمون ادھورا ہے اور شعر العجم کے حصہ اوّل بلکہ اُس کے بھی صرف دو عنوانوں پر نشانہ بازی کی گئی ہے اور باقی آئندہ کا دھڑکا لگا ہوا ہے خدا جانے آگے چل کر کیا گولہ باری کی جائیگی یا کونسی شرنگ اُڑائی جائیگی جس سے بیچارے شبلی کی ساری کی کرائی محنت خاک میں اُسی طرح ملجائے گی جیسے کہ وہ خود مل گئے۔ ممکن ہے کہ کوئی ایسا گراب اعتراضوں کا آئے کہ شبلی کی روح قبر میں دہل جائے۔ یہہ ہم نے مانا کہ شبلی سے بعض بعض جگہہ چوک ہو گئی لیکن اس سے بدرجہا زاید فرو گزاشتیں شیرانی صاحب اپنی جودت طبع اور طلاقت لسانی سے ناظرین کے سامنے پیش کردیں تو بھی علاّمۂ مرحوم کے علمی تبحر اور ایک عالم باعمل اور مستند صاحب فضل و کمال ہونے میں رتی برابر بھی فرق نہیں آسکتا۔ نہ شبلی کا مرتبہ گھٹ سکتا ہے نہ جناب شیرانی صاحب کا بڑھ سکتا ہے۔ شبلی کو دنیا جانتی ہے۔ اُن کا لوہا سب مانے ہوئے ہیں لیکن حافظ جی صاحب کو علمی دُنیا میں

غالباً

[1] جس نے تصنیف کی وہ نشانہ (ملامت ضرور) بنا۔ ۱۲

غالباً بہت کم لوگ جانتے ہیں لیکن ہاں اب لوگ ضرور کان کھڑے کریں گے اور جان جائیں گے کہ وہ ہوا یہی وہ فاضل شخص اور یہی وہ ادیب کامل یکتائے روزگار ہے جس نے شبلی جیسے علامہ کو نیچا دکھایا اور یہی غرض اس تبصرے کی ہے ۔ شبلی مرگئے اُن کی طرف سے جواب کون دے ۔ یہہ تو یکطرفہ لڑائی ہے ۔ میدان جناب شیرانی صاحب کے ہاتھ ہے ع ولیکن قلم در کفِ دشمن است ۔

دنیا میں اپنی روشناسی کرانے اور ناموری حاصل کرنے میں بہت سے ذریعوں میں سے ایک بہت سستا نسخہ کسی نامور پر منہ آنا ہے کہ ہلدی لگے نہ پھٹکری رنگ چوکھا ہو ۔ لوگ جو کلمہ بھرتے تھے وہ چوکنا ہو جاتے ہیں اور اُدبدا کر دیکھنا چاہتے ہیں کہ کیا کیا خامیاں اور نقائص ایک ایسے عالم کے نکالے جاتے ہیں جس کی نسبت بجز حُسنِ ظن کے کسی قسم کا سوءِ ظن نہ تھا ۔ وہ اعتراض واجبی ہوں یا ناواجبی ۔ جا رہے ہوں یا بے جا ۔ نتیجہ نکلے یا نہ نکلے ۔ نشانہ لگے یا نہ لگے مگر معترض علیہ تو جیوں تو مرنگا ۔ اب کسے اتنی فرصت ہے جو ان مزخرفات میں پڑکر اپنی اوقات ضایع کرے کہ شیر شاہ کی ڈاڑھی بڑی تھی یا سلیم شاہ کی ۔ ہ

بلبل چہ گفت و گل چہ شنید و صبا چہ کرد ⁂ اکنوں کرا دماغ کہ پرسد ز باغبان

جناب معترض اگر اس بے ضرورت اور لاحاصل کام پر اپنی اوقاتِ عزیز ضایع کرنا ہی پسند فرماتے تھے تو نیک نیتی اور نرم الفاظ میں بھی فرما سکتے تھے ۔ یہ درشتی اور طعن کا لہجہ کب زیبا تھا ۔ زبان سے وہی نکلتا ہے جو انسان کے دل میں ہوتا ہے ۔ اس سے تو صاحب تحریر کے ظرف کی حالت معلوم ہوتی ہے ۔ شبلی مرحوم کا شہرہ مثل ماہ چہاردہم کے ہے وہ کسی مزید شہرت کا محتاج نہیں نہ چاند پر خاک ڈالنے سے چاند دھندلا پڑ سکتا ہے ۔ جس کو خدا سنوارے اُسے کون بگاڑ سکتا ہے ۔ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيهِ مَنْ يَّشَاءُ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيمِ[۱] ۔ جناب شیرانی صاحب کی چوٹوں کا کلہ بکلہ جواب دینا میری بساط سے باہر ہے نہ مجھ میں اتنی قابلیت کہ ما لہٗ و ما علیہ پر بحث کرسکوں اور نہ ایسی بحث سے کچھ نتیجہ ۔ شیرانی صاحب کو اس خامہ فرسائی سے جو ملا وہی مجھے ملے گا ۔ مجھے تو صرف یہہ دکھلانا ہے کہ اعتراضات کرنے سے کچھ مفاد نہیں ۔ لکھنے والا لکھ گیا ۔ کتاب پھیل گئی اور وہ دنیا سے

[۱] یہ اللہ کا فضل ہے جس کو چاہے عنایت کرے اور اللہ کا فضل (بہت) بڑا ہے ۔ ۱۴۰

چلا بھی گیا اب مرے پر سو دُرّے کونسی جوانمردی ہے۔ پھر طبیعت کے جوش۔ اپنے غصّے اور ساتھ ہی اپنی اظہار قابلیت میں شال میں لپیٹ کر جوتیاں مارنا تو کوئی فعل مستحسن نہیں ہے۔ شیرانی صاحب مضمون کے خاتمے پر فرماتے ہیں کہ وہ "خطائے بزرگاں گرفتن خطاست" کے قائل نہیں۔ جب ہی تو انہوں نے ایسی بیباکانہ جسارت سے کام لیا ورنہ یہی باتیں سیدھے سبھاؤ بھی کہی جا سکتی تھیں کہ مدعا بھی حاصل ہوتا اور لوگوں کا دل بھی نہ دکھتا۔ جب یہی لیل و نہار ہے اور شترِ قلم بے مہار ہے تو شبلی بیچارہ کس شمار قطار میں ہے۔ جس کو چاہیں نیچا دکھا دیں۔ سہ

عالم ہے مکدّر کوئی دل صاف نہیں ہے ؛ اس عہد میں سب کچھ ہے پر انصاف نہیں ہے

سچ پوچھیے تو شکارِ مُردہ ہی پر زور آزمائی کا مزہ ہے۔ زندہ سے مقابلہ کار سے دارد۔ اب ہم جناب شیرانی صاحب کے مضمون کے وہ دلخراش فقرے نقل کرتے ہیں کہ نقلِ کفر کفر نباشد۔ شاید اُذکرو اموتکم بالخیر[1] پر اسی طرح عمل کرنا کارِ ثواب ہے۔ سہ انہیں کیلیے ہے زمانے کی تلخی ؛ بڑے رنج شیریں زباں کھینچتے ہیں

(۱) "شعر العجم کے مطالعہ کے بعد میری ذاتی رائے یہ قایم ہوئی ہے کہ علامہ شبلی اس تصنیف کے دوران میں مؤرخانہ و محققانہ فرائض کی نگہداشت سے ایک بڑی حد تک غافل رہے ہیں اور رطب و یابس جو کچھ اُن کے مطالعہ میں آجاتا ہے۔ بشرطیکہ دلچسپ ہو حوالۂ قلم کر دیتے ہیں"۔

(۲) "بعض وقت دیکھا جاتا ہے کہ مولانا اپنے پچھلے بیانات کی آگے جا کر خود ہی تردید کر جاتے ہیں پہلے کچھ رائے قایم کی بعد میں جا کر کوئی اور نظریہ قایم کر لیا"۔

(۳) "شعرائے عجم کے حالات میں ان کے طاقتور قلم نے بہت لغزشیں کی ہیں۔ اس خاص دائرے میں ان کی معلومات تاریخی نہایت محدود ہے نہ تمام سلسلۂ شعرا اُن کے دواوین اور مآثر پر کافی عبور ہے۔ سن و تاریخ جو فنِ تاریخ کا ایک شاندار و قیع پہلو ہے اس پر اول تو پوری توجہ نہیں کی اور ضرورتاً کہیں ایسا کیا بھی تو غلطیوں سے خالی نہیں"۔

(۴) "جب کسی واقعہ کی نسبت دو مختلف روایتیں آگئی ہیں شبلی اُس خوش خلق حاکم کی طرح جو مدعی اور مدعا علیہ دونوں کو خوش کرنے کی بے سود کوشش میں مصروف ہے تم بھی سچے اور تم بھی سچے

[1] مرے ہوئے لوگوں کا ذکر بھلائی سے کیا کرو۔ ۱۲

کہہ کر بغیر کسی جرح و تعدیل کے آگے بڑھ جاتے ہیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک یہ روایات بڑے بوڑھوں کی باقیات الصالحات ہیں۔ ان کے متعلق ردّ و قدح کرنا یا اُن کو غلط ثابت کرنا ہماری شانِ اخلاق کے خلاف ہے۔

(۵) رودکی کا افسانہ ایک دلفریب اور دلکش سراب کے منظر سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا بقولِ انشاء ع۔ بحرِ رجز میں ڈال کے بحرِ رمل چلے۔

(۶) ان کے سمندِ قلم نے اس قدر بدلگامیاں کیں کہ منزلِ مقصود سے بھٹک کر کہیں کے کہیں جا نکلے۔

(۷) اس عبارت میں علامۂ شبلی کو دو مغالطے پیش آئے

(۸) شبلیانہ اجتہاد مانا جا سکتا ہے۔

(۹) اکثر حالات میں غلط لکھتے ہیں۔

(۱۰) اپنے اجتہاد پر بھروسہ کر کے ایک فاش غلطی کے مرتکب ہوئے۔

(۱۱) مولٰنا نے اپنی طرف سے جدّت آفرینی کی ہے۔

(۱۲) میں شبلی کے اس کُلّیہ کی تائید نہیں کر سکتا۔

(۱۳) اپنے نظریہ کی تردید میں خود ہی مساعی ہیں۔

(۱۴) اگر اس عبارت کو بھی مولانا قلم انداز کر دیتے تو شاید شعر العجم کے ناظرین پر زیادہ احسان فرماتے۔

(۱۵) خدا جانے قبلہ مولانا نے یہ نکتہ آفرینی کیوں کی۔

(۱۶) اس قسم کے مخالف اور تضاد شعر العجم کے پایہ کی کتاب کے بدنما خط و خال ہیں۔

(۱۷) میں دیکھتا ہوں مولانا کی تحقیق کا یہ پہلو نہایت کم زور ہے۔

(۱۸) جو پہلے روایت ان کے سامنے آتی ہے اُسکو نہایت فیاض دلی کے ساتھ تسلیم کر لینے کو مستعد ہیں۔

(۱۹) چنانچہ اس غلطی بالاغلطی نے ایسی مضحکہ خیز صورت اختیار کر لی جس کا جواب یہ شعر ہو سکتا ہے۔ ؎

چہ خوش گفت است سعدی در زلیخا ؛ الا یا ایہا الساقی ادر کاساً و ناولہا۔

(۲۰) مولانا بلا کسی تلاش و تفحص کے وہ قصہ دونوں کے لئے تسلیم کرنے میں اگرچہ مولانا نے اپنے اعتقاد

کی وسیع المشربی کا ثبوت دے دیا لیکن تنقید کے فرائض قضا کر دئے۔

(۲۱) مولانا کی خوش اعتقادی قابلِ رشک ہو جاتی ہے۔

شیرانی صاحب کا انوکھا قول

"خطائے بزرگاں گرفتن خطاست" ہمارے پرانے معتقدات سے ہے لیکن افسوس انہیں غلط اصولوں کی پیروی کا نتیجہ ہے کہ آج ہماری تاریخیں رطب و یابس غث و ثمین اور دروغ و راست کا مجموعہ بن رہی ہیں۔ ہماری جرح و تعدیل کے پرانے ہتھیار پڑے پڑے زنگ آلود ہو گئے ہیں لیکن اس خوش اعتقادی کا روسیاہ جس نے ہمیں ان کے استعمال سے روک رکھا ہے"

مولنا شبلی اگر زندہ بھی ہوتے اور مضمون اُن کی نظر سے گزرتا تو وہ یہہ کہکر چُپ ہو رہتے۔ ؎

بدم گفتی و خورسندم عفاک اللہ نکو گفتی ⁂ جواب تلخ می زیبد لب لعل شکر خارا

گالی کا جواب گالی نہیں ہے۔ مہذب لوگ ایسی لغویات کا خیال نہیں کرتے۔ بلکہ ایسوں سے خطاب بھی کرنا اپنی کسرِ شان سمجھتے ہیں۔

تصویر کا دوسرا رُخ

علامہ شبلی کا بلند پایہ کون نہیں جانتا ابھی تو اُن کا کفن بھی میلا نہیں ہوا ہزاروں اُن کے نام لیوا موجود ہیں۔ میں ان کا شاگرد نہیں۔ کبھی اُن سے پڑھا نہیں مگر اُن سے ملا کئی بار ہوں اُن کی بیش بہا مستعد تصانیف کو بہت شوق سے بار بار پڑھا ہے۔ مجھ کو ایسے بزرگ پر اس قسم کے اعتراضات سے تکلیف ضرور پہونچی۔ میں اس خیال کا آدمی ہوں کہ پردہ داری کو پردہ دری پر ترجیح دیتا ہوں۔ ایک عینک کے دو تال ہیں شیرانی صاحب کی تاریک پہلو پر نظر ہے۔ بمصداق ؎ چشم بد اندیش کہ بر کندہ باد ⁂ عیب نماید ہنرش در نظر۔ اور جناب مولوی حبیب الرحمٰن خان صاحب شروانی جو خود ایک جید عالم اور صاحبِ تصانیف کثیرہ ہیں اُن کا مسلک یہ ہے کہ ؎ گر ہنرے داری و صد گونہ عیب ⁂ دوست نہ بیند بجز آں یک ہنر۔ یہہ عینک کے دوسرے تال کی رویت ہے۔ مقصود بالذات

ابلاغ

ایک ہی شخص ہے وہ شیرانی ہیں یہ شروانی تجنیس خطی بھی ہے مگر فوکس (شعاعوں کا مرکز) جدا جدا ہے کسی کو اچھا نظر آتا ہے تو کسی کو برا مگر چیز ہے ایک ہی۔ ع ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بکجا۔ انہیں شبلی کی نسبت مولانا شروانی کیا فرماتے ہیں ملاحظہ ہو اور اب فیصلہ ناظرین کے ہاتھ ہے شبلی کو برا سمجھیں یا اچھا سے

چشم ہنر بیں بود از عیب پاک ٭ بے ہنر از عیب بجوید چہ باک۔

" اس تمام تجربے کے بعد میں وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ علامۂ مرحوم سچے اور با اخلاص دوست تھے۔ اس زمانے کی سوسائیٹی کی بہت سی کمزوریوں سے پاک اور صاف تھے۔ اُن کے اخلاق کا معیار بہت بلند تھا۔ نظر میں بلندی تھی۔ مزاج میں استغنا، حوصلے میں عزم تھا۔ مزاج میں نفاست تھی۔ دوستی اور مخالفت دونوں شدید تھیں لیکن دوستوں کی مروت کبھی اُن کو رسمی تملق اور چاپلوسی پر آمادہ نہیں کرتی تھی۔ عزیز سے عزیز دوست کی خاطر وہ اپنی رائے سے نہیں ہٹتے تھے۔ مخالفین کی مخالفت سے روبرو نہیں رُکتے تھے۔ مگر اُن کے پسِ پشت بیانِ اختلاف میں بھی اُن کی زبان سے ایسے الفاظ نہیں نکلتے تھے جو نفسانیت اور معاندانہ عیب جوئی پر دلالت کرتے۔ مخالف کی رائے کی تردید سختی کے ساتھ کرتے تھے۔ اپنی رائے کے دلائل کا زور شور سے اظہار کرتے باوجود اسکے یہ کبھی نہیں ہوتا تھا کہ مخالف کے ذاتی یا صفاتی عیوب پیش کر کے اُس کو ذلیل اور رسوا کرتے۔

صحبت نہایت پاکیزہ اور شگفتہ تھی۔ انسان خواہ کسی درجے کا ہو اُن کی باتوں سے محظوظ ہوتا تھا۔ جس مسئلے پر گفتگو کرتے اُن کے کمال کی خوبیاں نظر آتیں۔ عقلی پیرایہ۔ مورخانہ انداز شاعرانہ نکتہ سنجی اُن کے بیان کی رفیق وہمدم تھی۔ جب کسی علمی مسئلے پر گفتگو ہوئی بعض نادر اور نازک پہلو ضرور بیان کئے۔ فضول باتیں میں نے اُن کی زبان سے کبھی نہیں سنیں..... مولانا نے علومِ مشرقی میں خاص استعداد و قابلیت حاصل کی خصوصاً تاریخ اور فلسفے سے اُن کو ابتدا سے دلچسپی رہی۔ علوم اسلامی سے فراغت پانے کے بعد اُنہوں نے یونانی خیالات اور جدید فلسفۂ یورپ پر نظر ڈالی۔ فرانسیسی زبان سے بھی بعد میں کسی قدر واقفیت حاصل

کرلی تھی۔ مگر انگریزی بہت کم جانتے تھے۔ مطالعہ کا بے حد شوق تھا..... اس میں شک نہیں ہے کہ اُنکے انتقال سے قوم کو ایک ناقابلِ تلافی نقصان ہوا ہے اور ایک ایسی جگہ خالی ہوگئی ہے جس کو قوم کی کئی بہترین افراد مل کر بھی پورا نہیں کرسکیں گی کیونکہ مولانا کے کے انتقال سے قوم نے نہ صرف ایک فاضل ضایع کردیا بلکہ ایک زبردست مؤرخ بھی کھو دیا اور نہ صرف ایک زبردست مؤرخ ہی بلکہ آپ کے انتقال سے ایک اعلےٰ درجہ کا ادیب بھی کم ہوگیا اور نہ صرف یہی بلکہ ایک نہایت فصیح البیان قومی شاعر بھی جاتا رہا اور سب سے آخر مگر سب سے مقدم قوم کا ایک عظیم الشان رکن اور اُسکا ایک قابلِ احترام بہی خواہ بھی اس کے درمیان سے غائب ہوگیا۔ وما کان قیس هلكه هلك واحدٍ ٭ ولكنه بنيانُ قومٍ تهدّما[۱]۔ مولانا کی خدمات کسی ایک دائرہ میں محدود نہیں ہیں۔ تاریخی۔ ادبی۔ مذہبی۔ قومی اور حتّٰی کہ سیاسی اعتبار سے بھی اُن کی خدمات مسلّمہ ہیں ان کا طرز بیان اس قدر سادہ مگر زوردار اور مدلّل تھا کہ وہ بہت آسانی سے اپنا ہم رائے بنانے میں کامیاب ہوجاتے تھے۔ اُن کی تحریر فلسفیانہ اور محققانہ طرز کی ہے جس میں تاریخ و واقعات کے بجائے رنگ آمیزی کو دخل نہیں ہے۔"

(۲) یک لشد دو شد

بنیا ہے رقومات ہنر چاہیے اس کو ٭ سودا ہے جواہر کا نظر چاہیے اس کو

شبلی پر جو گزری سو گزری اس سے بڑھ کر اور لیجئے اسی رسالہ میں ایک دوسرے فخر روزگار غالب مرحوم مغفور کی بے طرح خبر لی گئی ہے۔ ؎

نوازشہائے بے جا دیکھتا ہوں ٭ شکایت ہائے رنگیں کا گلا کیا (غالب)

غالب نے ۱۵ فروری ۱۸۶۹ء کو تہتر برس کی عمر میں دہلی میں انتقال فرمایا۔ اس بڈھے بے چارے کی ہڈیاں آج ترپن برس کے بعد اُکھاڑی گئیں۔ لکھنؤ کے ایک صاحب جناب

---

[۱] قیس کی موت کچھ شخص واحد کی ہی موت نہ تھی بلکہ (اس کی موت نے) قوم کی جڑ بنیاد تک ہلادی۔

سید علی حیدر صاحب طباطبائی[۱] لکھنوی نے یہ ثواب سمیٹا ہے۔ غالب کی قبر کہنہ سے یہ صدا آرہی ہے۔ ؎ شدیم خاک ولیکن زبوئے تربت ما ٭ تواں شناخت کزیں خاک مرد می‌خیزد۔ اور وہی زبان حال سے یہ بھی فرما رہے ہیں۔ ؎

غالب بُرا نہ مان جو واعظ بُرا کہے ٭ ایسا بھی کوئی ہے کہ سب اچھا کہیں جسے۔

جناب مضمون نگار صاحب کو محض بہ نظر مراحم خسروانہ پیشگاہ حضور پرنور سرکار عالی نظام دام اقبالہم سے اگرچہ نواب حیدر یار جنگ بہادر کا خطاب مل گیا مگر اس میں فوقیت کیا ہوئی مرزا اسد اللہ خاں عرف مرزا نوشہ کو بھی سلاطین مغلیہ کے دربار دُربار سے جنگی کے علاوہ دولائی اور مُلکی کا خطاب نجم الدولہ دبیر الملک نظام جنگ تھا۔ مگر عالمگیر شہرت جو اقلیم سخن میں غالب کو تھی سید صاحب کو اُس کا پاسنگ بھی نہیں۔ ؎

ایں سعادت بزور بازو نیست ٭ تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

وہ نہ صرف نام کے شیر تھے بلکہ بیشۂ سخن کے شیر ببر یعنی اسد اللہ غالب تھے۔ ؎

گر نہ بیند بروز شپرہ چشم ٭ چشمۂ آفتاب را چہ گناہ

زمانۂ حال کے نواب صاحب کے اعتراضات کو یہاں دہرانے کی ضرورت نہیں جو کچھ اس بارے میں نہایت انصاف سے جناب سید ہاشمی صاحب عثمانیہ یونیورسٹی نے صفحہ (۶۹۴) سے صفحہ (۷۰۳) تک مدلل اور مسکت جوابات دئے ہیں اُن کا اقتباس ناظرین کی دلچسپی کے لئے بالکل کافی ہے۔ کیا اچھا ہوتا کہ نئے نواب زمانۂ گزشتہ کے ایک مرے ہوئے

---

[۱] طباطبا لقب اسمٰعیل بن ابراہیم بن حسن بن علی علیہم السّلام زیرا کہ در زبان لکنت داشت و بجائے قاف۔ طا می‌گفت۔ آوردہ اندکہ در ایام خرد سالی بروز عید والد بزرگوار او بلو فرمود کہ چہ نوع جامہ برائے تو مہیا کنم او گفت طباطبا یعنی قبا قبا ازاں روز اسمٰعیل بلقب طباطبا مشہور گشت و اولاد او را سادات طباطبائی گویند۔ از غیاث اللغات ۱۲۔ اگرچہ میں کئی برس (۲۵) برس تا اور اعلیٰ طبقے میں باریاب تھا لیکن اس مضمون کے پڑھنے کے بعد اب مجھے بھی افسوس آتا ہے کہ جناب طباطبائی صاحب سے کبھی شرف ملازمت حاصل نہوا اور میں کبھی اس سعادت عظمیٰ سے محروم رہا۔ اُس زمانہ میں جناب معزز خانہ تعمیر رشتہ تعلیم میں ملازم تھے۔ نام نامی تو بیشک ضرور سنا تھا مگر کوئی خاص کشش مجھ و دولت تک نہ

نواب پر اعتراضات فرمانے کی بجائے خود مردِ میدان بن کر کچھ کر کے دکھلاتے اور اپنا لوہا منواتے۔ غالب کو قبر میں بے چین کرنے سے کیا فائدہ؟ ؎

رسی آنکہ بدرد ماکہ چو ما　　٭　　خامہ گیری و حرف بنگاری

غالب کا نام بچّہ بچّہ جانتا ہے لیکن نئے نواب کو سَو میں سے پانچ شخص بھی شاید بمشکل جانتے ہوں گے۔ مگر ہاں اب ضرور جان جائیں گے اُسی طرح جیسے کہ کسی شخص نے نام آوری کے لئے سینکڑوں جتن کئے مگر نہ چلی تو اُس نے چاہِ زمزم کی جگت پر پیشاب کر دیا۔ اُس وقت سے آج تک وہ شخص ضرب المثل ہے۔ بہر حال نواب صاحب نے اپنا گراں مایہ وقت مُفت ان فضولیات میں برباد کیا اور جو نہ سننا تھا سنا۔ آسمان کا تھوکا مُنہ پر ہی آتا ہے۔ ؎

بد نہ بولے زیرِ گردوں گر کوئی میری سنے　　٭　　ہے یہ گنبد کی صدا جیسی کہے ویسی سُنے

نواب صاحب معترض کو خداوندِ تعالیٰ نے اپنے افضال و کرم سے بہت کچھ عروج مرتبت دیا ہے اب اور کیا چاہئے۔ غالب میں قابلیت نہ تھی۔ خلافِ استحقاق شہرت حاصل کی خلاصہ یہ کہ نالایق محض تھا کوچۂ شاعری سے نابلد یا شاید اس سے بھی زیادہ مذمت کے قابل ہو مگر وہ اب قبر سے پلٹ کر نہیں آسکتا کہ آپ کو جواب دے۔ حیدر آباد تو حیدر آباد اگر آپ دہلی تشریف لا کر اور اُس کی قبر پر کھڑے ہو کر بھی سب و شتم کریں تو آپ کو کچھ جواب نہ ملے گا ؎

کس سے پوچھیں خبرِ قافلۂ مُلکِ عدم　　٭　　کوئی پیدا نہ ہوا خاک میں پنہاں ہو کر (مونس)

بس اس سعیِ بے کار سے نتیجہ کیا ہے۔ ہماری صلاح تو یہ ہے۔ ؎

کبھی بُرا نہیں جانا کسی کو اپنے سوا　　٭　　ہر ایک ذرّے کو ہم آفتاب سمجھے ہیں (انیس)

حالی نے کیا خوب کہا ہے۔ ؎

رنج کچھ اس کا نہیں اس کو کہ وہ ایسا ہے کیوں　　٭　　بلکہ ساری کوفت ہے اس کی کہ میں ویسا نہیں

کوئی کیا خوب کہہ گیا ہے ؎ حسدوا الفتیٰ اذ لم ینالوا سعیہٗ[۱]　٭　فالقوم اعداء لہٗ وخصومٗ　٭　کضرائر الحسناء قلن لوجہہا

[۱] جب کسی کو وہ بات نصیب نہیں ہوتی (جو ایک شخص کو ہو گئی) تو لوگ حسد کرنے لگتے ہیں۔ اور قوم اُس کی دشمن اور برسرِ پرخاش ہو جاتی ہے۔ جیسے حسین سوکنیں کہ ایک دوسرے کی صورت کو کہہ بیٹھتی ہیں۔ حسد اور عداوت سے کہ وہ تو بُری ہے۔

اب جناب ہاشمی صاحب جزاہم اللہ تعالیٰ امن الجزا کیا فرماتے ہیں۔ بگوش دل سنئے :۔

" نواب حیدر یار جنگ کے طعن و اعتراضات کی تعداد جو مرزا غالب مرحوم کے اشعار پر انہوں نے اپنی شرح میں کئے ہیں سَو سے زیادہ ہے۔ لیکن غور کرنے سے معلوم ہوا کہ معدودے چند کے سوا ان میں سے تقریباً (۸۹) فی صدی اعتراضات بے جا اور نادرست ہیں۔ دوسرے افسوس ہے کہ جا بجا فاضل شارح نے شعر کے صحیح مطلب کے سمجھنے یا بیان کرنے میں غلطی کی ہے اور اس عیب نے اُن کی شرح کی ادبی وقعت کو گھٹا دیا ہے۔"

ہاشمی صاحب تین اعتراضوں کو تسلیم کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ :۔

" ان چند نشانوں کو چھوڑ کر نواب حیدر یار جنگ صاحب کے دوسرے اعتراضات پر نظر ڈالئے تو معلوم ہوتا ہے کہ خود فاضل شارح کو اپنے اجتہاد و ہمہ دانی کا بڑا دعویٰ ہے۔

غلط اعتراض کی مثال ۔ نقش فریادی ہے کس کی شوخیِ تحریر کا ؛ کاغذی ہے پیرہن ہر پیکر تصویر کا ۔ مرزا صاحب کے دیوانِ اُردو کا مشہور مطلع ہے اور خود مرحوم نے ایک خط میں اس کی شرح لکھی تھی۔ اسے نقل کر کے نواب حیدر یار جنگ فرماتے ہیں :۔ "مگر مصنف کا یہ لکھنا کہ ایران میں رسم ہے کہ داد خواہ کاغذ کے کپڑے پہن کر حاکم کے سامنے جاتا ہے۔ میں نے کہیں یہ دیکھا نہ سنا۔"

جواب کاغذی پیراہن کے متعلق تعجب ہے۔ جناب نواب صاحب نے کسی مبسوط فارسی لغت کے دیکھنے کی بھی زحمت نہ فرمائی۔ بہار عجم میں اس کے معنی یہ لکھے ہیں "کاغذی جامہ و پیراہن" جامۂ کاغذکہ فریاداں پوشند (مطبوعہ ۱۳۳۴ھ نول کشور جلد دوم صفحہ ۲۸۷) پھر کئی نظیریں لکھ کر کمال اسمٰعیل کا یہ مشہور شعر بھی نقل کیا ہے۔ ؎

کاغذی جامہ بپوشید و بدرگاہ آمد ؛ زادۂ خاطر من تا بدہ داد مرا

زبردستی کا اعتراض ؎ دُکھ جی کو پسند ہو گیا ہے غالب ؛ دِل رُک رُک کر بند ہو گیا ہے غالب

" اس رباعی کے دوسرے مصرعے کا ایک رکن وزنِ رباعی سے زاید ہو گیا ہے اور چوں کہ نواب صاحب کا بیان ہے کہ اُنہوں نے دیوانِ غالب کے اُس نسخے میں بھی جسے خود مرزا صاحب مرحوم

نے اپنی تصحیح سے چھپوایا تھا یہہ مصرعہ اسی طرح چھپا دیکھا ہے۔ اس لئے اسے کتابت
کی غلطی سمجھنا حُسنِ ظن پر محمول کیا جائیگا اور ماننا پڑے گا مرزا صاحب سے چوک ہوئی"

میں کہتا ہوں کہ حُسنِ ظن ہر حال میں بدظنی سے مرجح ہے۔ اگر کوئی نسخہ دیوان
کا زیرِ نگرانی مرزا صاحب چھپا ہو تو اُس سے یہہ لازم نہیں آتا کہ اُس میں کوئی غلطی نہ رہی
ہو۔ مجھے خود تجربہ ہے۔ کتابیں چھپواتا ہوں خود کاپی کی تصحیح کرتا ہوں پروف پڑھتا ہوں
مگر پھر بھی غلطیاں رہ جاتی ہیں۔ انسان کی نظر چوک جاتی ہے خصوصاً مصنف کی اپنی تصنیف
پر نظر نہیں جمتی نگاہ پھسلتی چلی جاتی ہے۔ قرآن شریف سے بڑھکر صحت کا اہتمام نہیں ہوتا
کئی کئی مصحح دیکھتے بھالتے ہیں اور اِس شرط سے شایع ہوتا ہے کہ فی غلطی ایک اشرفی
دی جائے گی مگر پھر بھی غلطی رہ جاتی ہے چنانچہ مطبع مجتبائی دہلی کی مطبوعہ ایک حمایل شریف
بڑے اہتمام سے چھاپی گئی تھی اور مولوی عبدالاحد صاحب مرحوم نے فی غلطی ایک اشرفی
دینے کا وعدہ کیا تھا چنانچہ اُن کو کئی اشرفیاں دینی پڑیں۔ مانا کہ دیوان کا نسخہ غالب کی نظر
سے گزرا اور انہوں نے تصحیح بھی کی ہو تب بھی اُس میں غلطیوں کا رہ جانا بہت ممکن ہے۔
غالب نے کوئی نوٹ اُس دیوان پر نہیں دیا کہ اِس میں کوئی غلطی نہیں رہی اور نہ انہوں
نے اِتنے غور سے دیکھا ہوگا کہ غلطی کے باقی رہنے کا احتمال نہ ہو وہ دیوان تھا قرآن نہ تھا۔

مجھے یہ ڈر ہے کہ ایمان لے نہ آئیں لوگ ؛ خدا کرے غلطی کچھ مرے سخن میں رہے

ابھی ہمارے سامنے مراثی انیس کی جلد اول ہے جو انہیں نواب صاحب کی مرتبہ
ہے اور بڑے اہتمام سے نہایت خوشخط نظامی پریس بدایوں میں سنہ ۱۹۲۱ء میں چھپی ہے
اور حضور اُسکی کاپیاں نواب صاحب معز کی نظرِ انور سے گزری ہوں گی۔ کتابت کی غلطیاں
اُس میں جا بجا موجود ہیں پھر اِس سے کیا جناب میر انیس مرحوم و مغفور پر کوئی الزام دھرا
جا سکتا ہے یا نواب صاحب نے ترتیب دیکر اپنی گردن پر اُس کی صحت کا ذمہ لیا ہے۔
ہرگز نہیں۔ کبھی نہیں۔ ایسا خیال بھی کوئی سمجھ دار نہیں کرسکتا۔ جناب چودھری سید نظیر الحسن

صاحب

صاحب فوق اپنی کتاب المیزان میں جو مولنا شبلی کی کتاب موازنہ انیس و دبیر پر ایک محققانہ اور منصفانہ رویو ہے کتابت کی غلطیوں کی نسبت بالکل مطابق واقعہ تحریر فرماتے ہیں کہ انہوں نے کتاب کی صحت کا حد درجہ اہتمام کیا چار چار مرتبہ کاپیاں ملاحظہ کیں غلطیوں کو پتھر پر اپنے سامنے بنوایا پھر بھی غلطیاں رہیں پر رہیں۔ وہ لکھتے ہیں" اتنی کوششوں اور محنتوں کے بعد انشاء اللہ کتاب میں غلطیاں بہت کم رہی ہوں گی۔ لیکن از بس کہ سہو لبشریت لازمی ہے بعض مقامات پر دو چار غلطیاں نظر آتی ہیں .... اصل یہ ہے کہ کتاب کا صحیح چھپوانا اور صحت میں کوشش کرنا بھی مصنف کے واسطے ایک جانکاہ مصیبت ہے اور میرے خیال میں کوئی شخص پورے طور پر اس کام سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتا۔ مولوی شبلی صاحب نے شعر العجم میں بہت صحیح لکھا ہے کہ" دنیا میں ناممکنات کی اب تک جو فہرست تیار ہو چکی ہے اس میں ایک نمبر کتاب کا صحیح چھپنا بھی اضافہ کرنا چاہئے۔ یہ مصیبت مدت سے مجھ کو پیش آتی ہے لیکن علاج کی کوئی صورت نہیں نکلتی۔ کاپیوں اور پروف کی تصحیح چنداں کام نہیں دیتی۔ چھپنے میں حرف کچھ کے کچھ ہو جاتے ہیں"۔ ؎

مشہور ہیں عالم میں مگر ہوں بھی کہیں ہم
القصہ نہ در پے ہو ہمارے کہ نہیں ہم

شکوہ اچھا ہے کسی کا نہ شکایت اچھی
صبر کی خو ہے بھلی شکر کی عادت اچھی

حررہٗ۔ خاکسار بشیر الدین احمد اول تعلقدار (پنشنر)
سرکار عالی نظام
از دہلی

صلائے عام۔ یہ مضمون اہل علم کے لئے معرکہ کا ہے کہ علمی مباحثہ و گفتگو میں اہل علم و فن کو رائے زنی کا اختیار ہے یا نہیں؟ گو اس میں شک نہیں کہ محض عیب بینی و نکتہ چینی از روئے

اخلاق بہت معیوب ہے۔ خاصکر اہل علم و اہل فن کی سہ

آپ سب عیب پر نظر نہ کریں ✤ نقص کو حسن کی نظر دیکھیں ✤ نکتہ چینی ہے فعل پوچ و لچر ✤
بہت دھرم ہیں مزخرفات مگر ✤ حسب قول خدائے پاک و نبیؐ ✤ دیکھنا گر صریحاً بھی بدی ✤
دیدہ دانستہ ٹال ہی دینا ✤ ہو سکے تو نکال ہی دینا ✤ ورنہ ہو جائیگا وہ بغض و حسد ✤
ہے یہ اہلِ ہنر میں شیوۂ بد

لیکن وہ بحث رہ گئی کہ جو چیز پبلک میں پیش ہو وہ صاحب مضمون و تصنیف کے اختیار سے باہر ہو جاتی ہے۔ جو چیز آپ اپنے اظہار ہنر و کمال کی غرض سے پیش کریں اُسکی نسبت آپ کے ہم پیشہ اور ہم مرتبہ اصحاب کو اپنی اپنی رائے کے اظہار کا اختیار ہے۔ اہلِ یورپ میں اہل علم کی تصانیف کی تنقید کا فن بہت زوروں پر ہے۔ یہاں تک کہ توریت و انجیل کے متعلق۔ ہائی کریٹی سزم جائز سمجھی جاتی ہے ✤ مولانا شبلی نے جو کچھ لکھا اگر صحیح ہے تو داد کے قابل ہے۔ اگر صحیح نہیں ہے تو اُسکی صحت میں شبہہ کرنا گناہ نہیں ✤

رہا جناب غالب کی اُردو شاعری کا مسئلہ اسکا فیصلہ اُن کی اشعار اُردو کی طرح مشکل ہے انکی دقت طلبی انکی عادت میں داخل تھی:

جناب نواب ناظم کے کلام میں بھی غالب کی شاگردی سے اسکا اثر پایا جاتا ہے: اسکے ثبوت میں جناب ناظم کے دو ایک شعر عرض ہیں جو غالب کی طرز پر ہیں سہ

صرف اِک مناسبت ہے اگر یہ نہ ہو تو پھر ✤ موتی بنے صدف میں نہ قطرہ سحاب کا
کر نہ خواہش خاتونِ ارمن ورنہ دیکھ ✤ گنج بادآورد صرف رنگ و بو ہو جائیگا۔

"خاتونِ ارمن" کسی نے اُردو شعر میں نہیں باندھا اور اسکے ساتھ گنج بادآورد کا ذکر ✤

نوائے خونچکاں کو اور دکھلادیں ہم آنکھوں سے ✤ بنا کر اک نیا باجہ گلوئے مُرغ بسمل کا۔

[illegible]

غزل نواب صاحب بہادر فرماں روائے ریاستِ لوہارو

تیرے رخ کی سی ضیا مانگنے کہاں سے لائے شمع ٭ گر یہہ دعویٰ وہ کرے محفل میں منہہ کی کھائے شمع

ہے بجا تیر اُنکا جلتا بھی تو روئے ہے کم ٭ عمر صرف اک رات کی تجھکو ملی ہے ہائے شمع

سوزِ پروانہ اگر نزدیک تیرے کچھہ نہ تھا ٭ اشک کیوں آنکھوں میں تیرے اسقدر بھر آئے شمع

تو نے اے پروانے جاں دیتے ہوئے اُف تک نکی ٭ تیرے ایسے ضبط پر صد مرحبا شیدائے شمع

خاکِ پروانہ میں تازہ روح پڑ جائے وہیں ٭ اسکی تربت پر جلانے گر کوئی لے جائے شمع

سینہ اپنا کھولکر گر سامنے اسکے رکھوں ٭ تابشِ داغِ جگر کو دیکھ کر شرمائے شمع

عشق کی اُس بُت کے اعظم جب سے ہمکو لو لگی
ہوگئی اُس وقت سے دل میں ہمارے جائے شمع

صلائے عام - اس غزل کے ساتھ جناب نواب صاحب بہادر نے ارقام فرمایا ہے کہ ۔۔۔۔ "آپ نے میری غزل اپنے رسالے میں طبع کرائی تھی اُسکا شکریہ۔ ایک غزل دوسرے صفحے پر اپنی لکھتا ہوں اگر آپ کے خیال میں یہہ بھی اس قابل ہے کہ طبع کرائی جائے تو اسے بھی براہِ مہربانی رسالے میں چھپوا دیں" ۔۔۔۔۔۔۔۔

ہماری زبان کی خوش نصیبی ہے کہ فرماں روایانِ ریاست اپنی زبان کی طرف متوجہ ہوں۔ ہز اکزالٹڈ ہائی نس فرمانفرمائے ریاست حیدر آباد (دکن) کا کلام بھی کبھی کبھی دیکھنے میں آتا ہے۔ اور سنا ہے کہ فرماں فرمائے ریاست رام پور کو بھی اسطرف توجہ ہے ٭ لیکن خود شعر کہنے سے اس فن کی بہت ترقی نہیں ہو سکتی ٭ جناب نواب ناظم اور اُنکے بعد نواب کلب علیخاں بہادر نے دہلی اور لکھنؤ کے نامی شعراء اپنی ریاست میں جمع کئے اور اُنکی قدر کی ٭ میں اگر خود خوشنویسی پر محنت کروں تو شاید اچھا خوشنویس ہو جاؤں۔ لیکن فنِ خوشنویسی کی ترقی اُسوقت ممکن ہے جب کہ خوشنویسوں کی قدر کی جائے۔ اس میں شک نہیں کہ خود فن کے جاننے سے اُس فن کی ترقی پر کچھ ممکن ہے مگر زیادہ تر اہلِ فن کی قدردانی سے فن کی ترقی ممکن ہے ٭ اسکے ساتھ مجھے یہہ بھی عرض کرنا ضرور ہے کہ شعر میں

مسلمانوں کے علم و فضل کی تحقیق

اُوپر کے عنوان کے ساتھ دو مضمون پچھلے اکتوبر ۱۹۲۲ء کے رسالہ صلائے عام میں ہماری نظر سے گذرے ہیں اس وقت اس سے بحث نہیں کرتے کہ اصل مضمون کو عنوان مضمون سے کہاں تک علاقہ اور تعلق ہے نہ یہہ سمجھ میں آیا ہے کہ مضمون نگار کا مطلب کیا ہے۔ تاہم اس ذیل کے صاف جملوں سے یہہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے علم و فضل کی جو عام شہرت ہے یہہ درست نہیں ہے مسلمانوں نے اپنے عروج کے زمانہ میں سوائے اسکے کہ یونانیوں رومیوں کے علوم حکمیہ کے ترجمے کئے اور کچھہ نہیں کیا اس لئے مسلمانوں کے علم و فضل کی شہرت بلادلیل ہے۔ چنانچہ مضمون مذکور کا ذیل کا فقرہ ملاحظہ ہو جو بجنسہ درج کرتے ہیں "(مسلمانوں سے جب علم و فضل کا ذکر کیا جائے تو یہہ بات فخریہ کہتے ہیں کہ یورپ کو اس زمانہ میں جن علوم و فنون پر ناز ہے یہہ مسلمانوں کی تہذیب اور تعلیم کا نتیجہ ہے۔ جب مسلمان اسپین میں پہونچے تو یورپ والوں کو مسلمانوں کے طفیل علوم و فنون حاصل ہوئے ہے۔ اس دعوی کی دلیل عام تو کیا خاص لوگ بھی ایسی پیش نہیں کرتے جسے مخالفین بلا تکلف قبول کریں۔ الخ۔ آگے چلکر زمانہ بنی اُمیہ کے عہد حکومت کو مثال کے طور سے پیش کیا ہے۔ جس میں کسی علمی ترقی کا مسلمانوں میں پتہ نہیں چلتا۔ حقیقت میں یہہ مضمون جسقدر دلچسپ ہے اُسی قدر اس میں قلم اٹھانا مشکل ہے۔ مگر ہر شخص اپنی سمجھ اور معلومات کے موافق کچھ کہہ سکتا ہے اس لئے ہم بھی خون لگا شہیدوں میں شریک ہونا چاہتے ہیں۔ باقی ان مضامین کے لکھنے کے ہم اہل نہیں ہیں ہاں ہمارے لئے یہہ آسان بات ہے کہ جو لوگ اسکے اہل ہیں وہ بہت کچھ لکھ چکے ہیں اُنکے کلام سے ہم بھی استفادہ کریں۔ اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ جس قوم نے دُنیا میں کسی قسم کی ترقی کی ہے

خواہ وہ باعتبار علوم وفنون کے ہو یا دنیا کی دولتمندی یا حکومت اور فتوحات کے وہ ترقی بتدریج کی ہے کسی نے نہ ایک ہفتہ میں علم وفضل حاصل کر لیا نہ کسی نے ایک ہفتہ میں دُنیا کے مختلف حصّوں کو اپنے زیرنگین کیا۔ کوئی شخص واحد ہو یا کوئی قوم ہو پہلے ضرور مبتدی ہوتی ہے پھر عرصہ کے بعد منتہی ہوتی ہے۔ ہر شخص جانتا ہے کہ کمال کا زمانہ بعد کا ہوتا ہے اور ابتدا انتہا میں بُعد لازمی ہے۔ پس اسی قواعدِ نیچر کی پابندی کے ساتھ مسلمانوں میں بھی دولت اور حکومت اور علوم وفنون آئے تھے۔ یہہ بالکل سچ ہے کہ ابتدا میں مسلمانوں میں دنیاوی علوم وفنون کا اس قدر قحط تہا کہ بدر کی لڑائی تک صد ہا مسلمانوں میں ۱۷ مسلمان پڑھے لکھے تھے۔ جب دوسری قوم کے لوگ لڑائیوں میں پکڑے آتے تھے اور اونکو رہائی کے لئے کچھ تاوان دینا ہوتا تھا تو مسلمان اُن سے یہہ شرط کر کے اُن کو رہا کر دیتے تھے کہ ہمارے دس بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھا دو۔ یہاں چونکہ اسوقت علم دین سے بحث نہیں ہے اس لئے اسکا تذکرہ نہیں کرتے۔ خلاصہ یہہ کہ پہلی دوسری صدی میں مسلمانوں نے اپنے دینی سرمایہ کو سب سے مقدم بڑے اہتمام اور بڑی احتیاط سے جمع کیا۔ کیونکہ مذہب کو مرکز سے جسقدر دوری ہوتی ہے اور جس قدر زمانہ گذرتا ہے اُسی قدر اختلافات اُس میں رُونما ہوتے ہیں۔ اس لئے ضرور تھا کہ سب سے اوّل اپنے مذہبی سرمایہ سے بے نیاز ہو لیں تب دوسری طرف توجہ ہو۔ پھر اُس سے فرصت ملے بعد جو جو فتوحات بڑھیں اُسی قدر مسلمانوں کی دُنیوی معلومات کا دائرہ وسیع ہوا۔ یہاں تک کہ اول یونانیوں رومیوں۔ مصریوں۔ ہندیوں کی کتابوں کے ترجمے کئے۔ اور اُن سے علوم وفنون سیکھے۔ پھر تھوڑے عرصہ بعد اُنکے سکھانے کے قابل ہو گئے۔ یہاں تک کہ اُنکی کتابوں کے دوسروں نے ترجمے کئے اور آجتک اُنکی کتابوں کے ترجمے کئے جا رہے ہیں۔ یہہ کہنا درست نہیں ہے کہ مسلمانوں نے صرف ترجمے کئے اور کچھ نہ کیا۔ بلکہ یہہ کہنا چاہئے کہ مسلمان علوم وفنون دنیوی میں ایک اہل یورپ کے کیا بلکہ سارے عالم کے استاد مانے گئے۔ مسلمانوں نے تمام علوم وفنون کے صرف ترجمے نہیں کئے بلکہ اگلوں سے بہت زیادہ کامل ہوئے۔ یونانیوں کی غلطیاں ثابت کیں پہلے حکماء کے نامکمل فنون کو درجۂ کمال پر پہونچایا۔ اور خود بہت سی باتوں میں اضافہ کیا۔

کندی اسلام کا پہلا فیلسوف ہوا۔ فارابی فن موسیقی کا مدون ہوا اور ارسطو اور افلاطون کے اختلافات کا مٹانے والا یہہ ہی ہے۔ ابن ہیثم علم مناظر اور نور کا محقق ہوا۔ ابن جابر کیمسٹری کا موجد ابن شاکر میکانک کا مدون اور زمین کی پیمایش کرنے والا ہے۔ زہراوی سرجری کا مدون۔ ابن سینا سبع سیارہ کی ترتیب وضعی ثابت کرنے والا۔ ابن بیطار علم نباتات کا ماہر فرغانی ماہر علم ہیئت ہوا۔ خوارزمی علم جبر و مقابلہ کا موجد ہوا۔ انکے سوا۔ ابن طفیل خیام ابن زہر۔ ابن ماجہ۔ ابن بطلان۔ ابن جزلہ۔ زرقانی وغیرہ صدہا حکماء اسلام ہیں جنکی تصنیفات اور انکشافات پر یورپ کے موجودہ علوم فنون کی بنیاد ہے۔ بشپ بطرس سے دریافت کرو جو ۱۰۹۲ء میں پیدا ہوا کہ تو مسلمانوں سے کیا لیگیا تھا۔ البرٹ اعظم سے معلوم کرو جو ۱۱۹۳ء میں تھا کہ تو پیرس کے کالج میں جب ارسطو کی تصنیفات کا درس دیتا تھا تو کس کی کتابوں سے استناد کیا کرتا تھا۔ اسی طرح اسپین کا عالم بریمنڈ لول۔ اسکاٹ۔ راجرس۔ ہنری چہارم وغیرہ جو علوم اسلام اور زبان عربی سے اور زباتوں میں ترجمہ کرنے والے اور یورپ کو نفع پہونچانے والے ہیں اُن کی قبروں سے پوچھو کہ مسلمانوں نے یورپ پر کسقدر احسان کیا ہے ہم خود کیوں اس بیان کو طول دیں۔ لاؤ خود یورپین علماء حکماء کی زبانی شہادت سے اپنے دعوی کو کیوں نہ ثابت کریں مگر مختصر طور سے مسٹر سڈلیو مدرس علم تاریخ ملک فرانس کا قول ہے کہ اسلام یورپ کا اُستاد ہے۔ اسلام نے وہ سامان مہیا کئے جس سے ہماری تاریخیں درست ہوئیں مسلمان ہی صناعی و دستکاری میں مرتبہ کمال کو پہونچے اسلام والوں نے جو نئی باتیں ایجاد کی ہیں اُن سے اُنکی اسقدر فضیلت ظاہر ہوتی ہے کہ ہم نے اُسکے موافق اُنکی قدر نہ کی۔ علم فزک۔ طب۔ تاریخ۔ کیمسٹری۔ فلاحت۔ جب اُن میں آیا تو اُنہوں نے اُن مین اور خوبیاں اور کمالات زیادہ کر دئے۔ عرب کے لوگ اب تک جملہ فضل و کمالات کے چشمہ ہیں۔

اسکندر ہملیطہ۔ جرمن کے عالم کا قول ہے کہ اسلام کو خدا نے دنیا میں اسواسطے پیدا کیا تھا کہ علوم و فنون اور اسباب تمدن کو کل قوموں تک پہونچا دے۔ تاریخ وردی کا مصنف اعظم

فرانس لکھتا ہے کہ ایک زمانہ میں یورپ کے لوگ جہالت کی تاریکی میں سر ٹکرا رہے تھے
کہ دفعتاً اُنپر اسلام کی جانب سے علوم ادبیہ اور فلسفہ اور صناعی کا نور پرتو فگن ہوا۔ سیل صاحب
اپنی کتاب کی دفعہ ۱۵ا میں لکھتے ہیں کہ محمد صاحب جب مبعوث ہوئے تو عرب کے لوگوں نے دو صدیوں
میں ہی بہادری۔ سخاوت۔ عدالت۔ خدا پرستی اور اخلاق حسنہ کا دنیا کے پردہ پر نشان قایم
کردیا۔ مسٹر طامسن کارلائل صاحب اپنی کتاب لکچران ہیروز میں لکھتے ہیں کہ اسلام گویا
تاریکی میں روشنی کے ساتھ آیا تھا۔ ڈاکٹر اسپنسر صاحب نے اس شہادت کا بھی خاتمہ
کردیا وہ لکھتے ہیں کہ مسلمان اپنے علم ادب پر جسقدر فخر کریں وہ بجا ہے۔ اس لئے کہ نہ کوئی قوم
ایسی ہوئی نہ اب ہے۔ کہ جس نے علماء کی حالت زندگی کو اس طرح لکھا ہو کہ کوئی قرن دہ سالہ
مسلمانوں کی تاریخ کا ایسا نہیں کہ اُس میں اُنکی نام آوروں کا تذکرہ نہ ملے۔ اور حقیقت میں
مسلمانوں نے تاریخ کی ایسی بنیاد ڈالی کہ اُنکی تاریخ کے مقابلہ میں دنیا کی کوئی تاریخ کچھ حقیقت نہیں رکھتی
یونانی اور رومی کسی واقعہ کو تاریخی حیثیت سے دکھلا سکتے ہیں مگر سلسلۂ روایت کو اصل وقوعہ
تک نہیں پہونچا سکتے۔ یہہ اسلام کی خصوصیت ہے کہ ہر واقعہ کو بہ سند متصل روز وقوعہ
تک پہونچا دیا۔ اور پھر سلسلہ روایت میں یہہ کمال دکھلایا کہ ہر ایک راوی کے حالات سے
علیحدہ بحث کی۔ دُنیا میں صرف مذہب اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے کہ جس نے مذہب
کا علوم حکمیہ عقلیہ سے تعارف کرایا۔ دوسرے مذہب والوں کی طرح یہہ نہیں کیا کہ محققین کو
جلایا ہو قتل کیا ہو جلاوطن کیا ہو جیسے کہ یورپ میں ہوا۔ جب سنہ ۱۵۴۳ء میں کوپرنکس نے نظام بطلیموس
کا انکار کیا اور اُسکی کتاب اجرام فلکی شائع ہوئی تو اُسکا کیا حشر ہوا۔ معلوم کرو گلیلیو نے دوربین
ایجاد کی اور آفتاب کے گرد زمین کی گردش ثابت کی تو محکمہ تفتیش عقاید نے اُسکی وہ بُری گت
کی کہ توبہ ہے۔ کولمبس نے جب جدید برّاعظم کی تلاش میں سفر اختیار کیا تو اُسکے خلاف فتویٰ
دیا گیا۔ برونو تعدد عالم کا اعتقاد رکھتا تھا۔ اس لئے زندہ جلایا گیا۔ اور یہہ غریب کیا جلایا گیا محکمۂ
تفتیش عقاید نے سنہ ۱۴۸۱ء سے سنہ ۱۴۹۹ء تک دس ہزار دو سو بائیس حکماء کو جلایا تھا۔ اُنکا جرم یہہ ہی

تھا

تھا کہ کسی عقلی مسئلہ کو مذہب کے مقابلہ میں شایع کرتے تھے۔ مگر اسلام نے ایسا نہیں کیا۔ بانئے اسلام نے یہہ کہکر علوم فنون پر رغبت دلائی کہ علم کو گم شدہ مال سمجھو جہاں پاؤ اُس پر قبضہ کرو مسلمانوں کے خدا نے یہہ کہکر حوصلہ افزائی فرمائی ومن یوت الحکمۃ فقد اوتی خیرا کثیرا اور یہہ تاکید فرمائی کہ یوں دعا کرو قل رب زدنی علماً۔ مسلمان ہی دنیا بھر میں ایسی قوم ہے کہ جس نے مذہب بھی نہ چھوڑا اور علم حکمت کو بھی ہاتھ سے نہ جانے دیا۔ وجہہ اُسکی یہہ ہے کہ مذہب اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جسکی علوم حکمیہ کے ساتھ موافقت ہو سکتی ہے یہہ مسلمانوں کو ہی فخر حاصل رہا کہ جو ذات مذہبی عقائد اور علوم دینی کا سرچشمہ بنی وہ ہی ذات علوم عقلیہ اور حکمیہ اشراقیہ کا مصدر بنے۔

ابن رشد جسکا پیرو ہونا مذہب عیسوی میں جرم ناقابل معافی تھا۔ آؤ اُسی کو دیکھ لو کہ قرطبہ کی مسجد جامع میں درس دے رہا ہے اور محکمہ قضا میں مذہبی مقدمات کا فیصلہ لکھ رہا ہے۔ اگر ایک طرف وہ قاضی ہے تو دوسری طرف ارسطو کا شارح ہے۔

امام رازی۔ ایک طرف فلسفہ میں مشرقیہ مباحث اور شرح اشارات لکھ رہے ہیں تو دوسری طرف قرآن کی تفسیر آٹھ ضخیم جلدوں میں ختم کر چکے ہیں۔ یہہ مذہب اسلام ہی نے دُنیا کو سبق دیا کہ مذہب اور فلسفہ کے حدود عمل علیحدہ ہیں۔ مذہب کے اوج کمال تک عنقا، علوم نظری نہیں پہونچ سکتا۔ اسے درتگ دیوے تو ز آغاز؛ عنقائے نظر بلند پرواز۔ تاہم علم نظریات ظنیات کو اپنی جگہہ رہنے دو اور مذہبی اعتقادات کو یقینیات میں داخل کرو۔ فلسفہ دن میں چار بار گرگٹ کی طرح رنگ بدلتا ہے۔ اس پر مذہب اسلام کو نہ خیال کرو یہہ قایم بالذات ہے۔ یہہ مخدوم ہے۔ اور علم ظنیات خادم۔ خادم سے خدمت لو مگر بہت سر نہ چڑھاؤ۔

ایک حکیم کہتا ہے کہ آسمان نو ۹ ہیں۔ دوسرا کہتا ہے یہہ غلط ہے ایک کہتا ہے کہ عناصر اربع مانو دوسرا کہتا ہے کہ ۶۰ بلکہ ۷۰ مانو۔ ایک کہتا ہے کہ آفتاب مرکز کائنات ہے دوسرا کہتا ہے

کہ نہیں زمین مرکز کائنات ہے۔ اور آفتاب اُسکے گرد گھومتا ہے۔ مسلمانوں نے جسطرح اپنے مذہب میں کامل ہو کر دکھلا دیا اُسی طرح علم حکمت میں شہرۂ آفاق ہوئے۔ آج بھی یورپ مسلمانوں کی کتابوں کے ترجمے کرنے اور اُن سے فائدہ حاصل کرنے سے بے نیاز نہیں ہوا۔ ہم کسی دوسری اشاعت میں یہہ بھی دکھلائینگے کہ مسلمانوں کی کسقدر کتابوں کے اہل یورپ نے ترجمے کئے اور اس روشن زمانہ میں کسقدر ترجمے ہو رہے ہیں۔ ؎

غرض فن میں جو یا مہ دین و دولت ٭ طبیعی الٰہی ریاضی و حکمت
طب اور کیمیا ہندسہ اور ہیئت ٭ سیاحت تجارت عمارت فلاحت

لگاؤ گے کھوج اُنکا جا کر جہاں تم
نشاں اُنکے قدموں کے پاؤ گے واں تم

ہوا گو کہ پامال بستان عرب کا ٭ مگر اک جہاں ہے غزل خوان عرب کا
سفید و سیہ پر ہے احساں عرب کا ٭ ہرا کر گیا سب کو باراں عرب کا

یہہ قومیں جو ہیں آج سرتاج سبکی
کنوئڈی رہیں گی ہمیشہ عرب کی

مضمون نگار صاحب ہمارے آئندہ کسی مضمون کو دیکھکر معلوم کریں گے کہ مسلمانوں کو اس امر کی دلیل پیش کرنے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ مسلمانوں نے علوم و فنون کی اُس وقت سرپرستی کی تھی کہ جب دنیا سے رخصت ہو چکے تھے۔ اگر مسلمان ایسا نہ کرتے تو پچھلے علوم و فنون غارت ہو چکے ہوتے۔ بقول حالی ؎

وہ لقمان و سقراط کے دُرِّ مکنوں ٭ وہ اسرار بقراط و درس فلاطوں
ارسطو کے تعلیم سولن کے قانوں ٭ پڑے تھے کسی قبر کہنہ میں مدفوں

یہیں آکے مُہر سکوت اُنکی ٹوٹی
اسی باغ رعنا سے بو اُنکی پھوٹی۔ والسلام باقی آئندہ۔

مرزا محمد علیخاں الملقب بہ خانصاحب۔ رئیس دہلی۔

جنگل

جنگل کی اصلیت پرانی قصہ وکہانی سے عقل انسانی نے جو قیاس دوڑائے ہیں وہ یہہ ہیں کہ جب قدرت کاملہ خالق اکبر سے کرۂ زمین عالم ظہور میں آیا تھا تو سرتاپا سبز پوشاک پہنے ہوئے تھا اور سناہے نظر نے جدہر آنکھ اٹھا کر دیکھا جنگل ہی جنگل سراسر نظر آیا۔ یہہ جنگل اطراف عالم میں عجائب غرائب درختوں سے بھرا ہوا تھا اور ہر خطۂ زمین اپنے جنگل کی پیداوار میں تخصیص رکھتا تھا۔ اور جیسے جیسے نشیب و فراز کرۂ ارض میں واقع تھے جنگل بھی اس میں صفات سے مناسبت رکھتا تھا۔ پہاڑ و نہر جو جنگل تھا وہ اپنے درخت اور میدان کا جو جنگل تھا وہ اپنے درخت۔ مختلف انواع واقسام کے رکھتا تھا۔ خشکی اور تری کو بھی جنگل کے نباتات سے جداگانہ ہی واسطہ تھا۔ کسی جنگل کے درخت آسمان سے باتیں کرتے نظر آتے تھے۔ اور کسی جنگل کے درخت زمین پر لوٹتے دکھائی دیتے تھے۔ کسی جنگل کے درخت ازبس تناور تھے اور کسی کے ہلکے اور لاغر تھے۔ کہیں پورے پورے سیدھے درخت تھے۔ کہیں شاخ درشاخ آڑے ترچھے اور لپٹ تھے۔ کہیں کے درخت درخت ہی تھے اور کہیں کے درخت جھاڑ کی تھے پر بخت تھے۔ کوئی جنگل بلندی سے اُترتا ہوا پستی تک آپہنچا تھا اور کوئی پستی سے چڑھتا ہوا بلندی پر جاپہنچا تھا۔ کسی جنگل میں جھیلیں پانی سے بھری ہوئی درختوں سے گھری تھیں۔ کسی جنگل میں لہراتی ہوئی بڑی اور چھوٹی ندّیاں بہ رہی تھیں۔ کوئی جنگل بالکل گھنا اور تاریک تھا۔ کوئی کشادہ اور روشنی آفتاب سے نزدیک تھا۔ کسی جنگل میں گھاس ہی گھاس نظر آتی تھی اور کہیں کہیں صاف زمین دکھلائی دیتی تھی جنگلوں کے کنارے خوشنما جھاڑیوں سے بھرے دکھلائی دیتے تھے۔ اُنکے حاشئے بیل بوٹوں سے اچھے سجے نظر آتے تھے۔ قدرت نے اُنکے قطعے بڑی خوبی سے جابجا چھانٹے تھے کہیں بے خار نباتات اور کہیں جھار کے کانٹے تھے۔

بستیاں حضرت انسان جب پیدا ہوئے تو اُنہوں نے پہلے ہی جڑ کاٹنا شروع کردی۔ اپنے رہنے سہنے کے لئے کھود کھاد کر جگہہ نکالی۔ جنگل پر ہاتھ صاف کیا اور اپنا مقام کیا درختوں کو کاٹا کوٹا اور آرام کیا۔ گھر بنائے۔ کھیت کھودے اور بوئے۔ کھایا پیا اور مزے سے پڑ کر لوٹے۔ روئے زمین پر جابجا بستیاں بسائیں۔ جنگل کاٹ چھانٹ کر آبادیاں بنائیں۔ جب تک تہذیب نہیں آئی انسان بھی جنگلی ہی بنے رہے۔ اور درختوں کے پتے۔ پھل اور جڑیں نکال نکال کھاتے رہے۔ ندی نالوں اور جھیلوں کا پانی پیتے اور درختوں کے پتوں میں چھپ رہتے۔ جسقدر عقل وتمیز آتی گئی جھونپڑے بناتے رہے آفات آفات ارضی وسماوی سے درختوں کے سایہ اور نیچے اونچے کگاروں کے چھپروں میں بچتے رہے لیکن جسقدر عقل کو کام میں لاتے گئے اُسیقدر اپنی آسایش بڑھاتے گئے حتّےٰ کہ مٹی کے مکانوں سے لیکر عمدہ اور بیش بہا سنگین عمارتیں بناتے گئے اور مزرعے۔ موضعے۔ قصبے اور شہر آباد کرلئے اور اب جہاں تہاں روئے زمین انسان کی بستیوں سے بھر گیا اور اتنا ہی جنگل اب باقی ہے جو اُنکی زندگی بسر کرنے کے واسطے اشد ضروری ہے اور کافی ہے۔

جنگل سے فائدہ جنگل سے بیحد فائدے انسان کو پہونچتے ہیں جنگل ہونے کے سبب سے بارش باران کمی نہیں کرتی اور جو پانی برستا ہے وہ جنگل کے گنجان ہونے کے سبب سے اور اسکی جڑوں کی وجہ سے سیلابی سے رُک رہتا ہے اور زمین کو سیراب رکھتا ہے۔ اور جسقدر زمین سیراب رہتی ہے اُسی قدر ہر قسم کی روئیدگی میں ترقّی ہوتی ہے۔ ندّی نالے تازمان بعید خشک نہیں ہونے پاتے اور اُنکے کنارے جو جنگل سے ڈھکے رہتے ہیں وہ ڈھا جانے سے محفوظ رہتے ہیں۔ کیونکہ درختوں کی جڑیں اُنہیں تھامے رہتی ہیں۔ ہوا جسقدر جنگل پر سے گذرتی ہے وہ ٹھنڈی ہوتی ہے۔ جنگل کے خاص قسم کے درخت عمارتوں کے کام آتے ہیں اُن کی لکڑی سے ہزارہا قسم کی چیزیں تیار ہوتی ہیں۔ اُن کے چرنے سے بُرادہ جو نکلتا ہے وہ بھی صنعت گری میں کام آتا ہے۔ جو درخت کہ ناقابلِ عمارت یا ناقابلِ ساخت دیگر اشیا رہیں اُنکی لکڑی جلائی جاتی ہے۔ الغرض ہر قسم کا درخت خواہ وہ بڑا ہو یا چھوٹا پتلا ہو یا موٹا۔ کسی نہ کسی کام ضرور ہی آجاتا ہے۔ جنگل ہر قسم کے موسمی شدّت کو دفع کرتا

رہتا ہے۔ خواہ گرم ہو خواہ سرد۔

پیداوار جنگل کے اکثر درخت ایسے پھل دیتے ہیں جنکو انسان کھاتے ہیں بعضوں کی جڑیں میٹھی اور خوش گوار ہوتی ہیں جو انسان کا پیٹ بھرتی ہیں۔ بعضوں میں گوند نکلتا ہے۔ بعضوں میں لاکھ پیدا ہوتی ہے۔ بعضوں سے دودھ نکلتا ہے۔ بعضوں سے آب شیریں ٹپکتا ہے شہد اور موم جنگل کی مکھیاں بکثرت دیتی ہیں اور جنگل میں اپنے چھتے لگاتی ہیں۔ بعض جنگلوں میں عمدہ قسم کی گھاس پیدا ہوتی ہے جسکو مویشی چر کر خوب پیٹ بھرتے ہیں۔ جنگل کے درخت مختلف اقسام کی ادویات میں کام آتے ہیں۔ اسکے درختوں کی چھال بھی بہت سے کام دیتی ہے۔ اور بہت مختلف اقسام کی جنگل کی پیداوار سے بنائی جاتی ہے۔

جنگل کا علم جنگل کا علم بے انتہا ہے اور جب سے انسان نے دنیا میں آکر ہوش سنبھالا ہو جنگل کی معلومات کو بڑھاتا رہا ہے۔ مگر ہنوز ناواقفیت کا پردہ پڑا ہے اور کیا عجب ہے کہ دنیا کے خاتمہ تک اسی لاعلمی میں پھنسا رہے۔ ہزاروں قسم کی جڑی بوٹی دوا کے کام آچکی ہے اور ہنوز پتہ نہیں چلا کہ کیا کیا اور باقی ہے۔ بالآخر انسان کو یہہ کہنا پڑا ہے اور ہمیشہ کہنا پڑیگا کہ اسکا علم خدا کو ہے۔

جنگل کی داشت و پرداخت جن ممالک کے لوگوں نے جنگل کے فوائد پر تھوڑا بھی وقوف پیدا کر لیا ہے وہ جنگل کی قدر کرتے ہیں اُسکی داشت و پرداخت کرتے رہتے ہیں۔ سرکار ہند نے تو خاص محکمہ جنگلات کے رکھ رکھاؤ کا قایم فرمایا ہے۔ اُن کے واسطے قواعد و قوانین مرتب کئے ہیں جنگلوں کو مختلف طبقوں میں تقسیم فرمایا ہے اُنکی بالیدگی کی فکریں ہر ملک کے لحاظ سے کی جاتی ہیں صرف کثیر سے انکے ملازموں کو تعلیم دیجاتی ہے تاکہ وہ جنگلات کے کارآمد بنانے میں ہمہ تن مصروف رہیں۔ جنگلات میں جہاں جہاں مناسب جانا قطع و برید کی کارروائیاں جاری ہوتی رہتی ہیں کوئی جنگل محفوظ رکھا جاتا ہے۔ کوئی لکڑی کی چیر پھاڑ کے واسطے کھولا جاتا ہے۔ کسی میں چراگاہ مویشی کے واسطے محفوظ کی جاتی ہے اور ان سب باتوں سے ایک معقول آمدنی گورنمنٹ کو اور ہوشیار

فائدے رعایا کو پہونچتے رہتے ہیں۔

جنگل سے نقصان جنگل سے جسقدر فائدے ہیں انکا عشر عشیر بھی نقصان اُس سے نہیں ہوتا بلکہ جن لوگوں نے جنگل کو کاٹ بتایا ہے انہوں نے اپنی سرزمین کو فوائد سے محروم کردیا ہے اور نقصان اُٹھایا ہے۔ انکو لا محالہ عمارتی لکڑی۔ سوختنی لکڑی اور مویشی چرانے کے واسطے دوسرے جنگلوں میں جانا پڑتا ہے اور علاوہ وقت کے جو آمد و رفت میں اُٹھانا پڑتی ہے روپیہ بھی ضرورت سے زائد صرف کرنا پڑتا ہے۔ اور ایک خوشنما منظر بھی ہاتھ سے جاتا رہتا ہے۔ اور شکاریوں کو تو جنگلی جانور کا ہیکو نصیب ہوتے ہونگے۔

اظہار قدرتِ خالق جہاں سب باتیں کم و بیش بیان کردیگئیں وہاں قدرت کاملہ کے ظہور کا بھی ذکر ہونا پر ضرور ہے۔ کیا خدا کے بندے اسکو نہ سمجھتے ہونگے کہ اُس خالق مطلق نے بلا تخم کے بے شمار اقسام کے درخت اپنے ید قدرت سے پیدا کئے ہیں اور وہ کیسا قادر مطلق ہے کہ وہ شے پیدا فرما دیتا ہے جو کسی کے وہم و گمان میں نہیں ہو سکتی۔

نظم۔ نے مکان رہ یافت سوئیش نے زماں ؛ نے بیاں دارد خبر زو نے عیان

ایں ہمہ مخلوق علم داور است ؛ خالق عالم ز عالم برتر است

لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا وَمَا تَحْتَ الثَّرٰى

راقم۔ **مرزا عرفان علی بیگ۔**

ای۔ ایس۔ او۔ از آگرہ

نیچر کیا چیز ہے

لفظ نیچر کی ابتدا اُردو میں سر سید احمد خاں بہادر کی یادگار ہے۔ مسلمانوں میں یہہ لفظ پہلے رائج نہ تھا۔ سر سیّد کے عقائد کے پیرو "نیچری" کے نام سے عرصے تک مشہور رہے ؛ عقائد نیچریہ کے خلاف اور تائید میں مدت تک بحث رہی۔ اس میں یورپ کی وضع اور خیال کو زیادہ زور دیا گیا؛ جہاں کسی نے انگریزی طرز معاشرت یا آزادانہ خیال کا برتاؤ برتا نیچری سمجھا گیا۔ مجھے اس وقت اس روش کے خلاف یا تائید میں لکھنا منظور نہیں ہے۔ اسکی نسبت تیس[۳۰] پینتیس[۳۵] برس پہلے بہت کتابیں اور رسالے لکھے گئے ؛ لیکن جس خیال سے از روئے عقائد اس میں بحث چھڑی اب بیکار ہوگئی : یعنی جس خیال سے سر سیّد نے اسے چھیڑا تھا اُس سے زیادہ زمانے نے کر دکھایا ؛ یہاں عقائد کی رُو سے اسکا ذکر منظور نہیں ہے۔ مجھے اس وقت یہہ دیکھنا ہے کہ ہماری زبان یعنی روزمرّہ میں اس کا مفہوم کیا قرار دیا جائے اس فقرہ سے میں اپنا مطلب صاف نہیں کہہ سکا۔ اسکو ذرا تفصیل سے بیان کرنا ضرور ہے ؛

انگریزی میں نیچر کے معنی زیادہ وسیع ہیں اور نہایت مطلب خیز و برجستہ

اگلے زمانہ کے مصوّر رنگین تصویروں کے لئے مچھلی کے پوٹہ سے رنگ بناتے تھے جو مدا یوں اگر نہیں تو قرنوں اور پشتہا پشت اصلی حالت پر رہتا تھا۔ سُرخ روشنائی شنجرف سے عرصہ تک کھرل میں گھس کر تیار ہوتی تھی۔ اچھی سیاہی کاجل پار کر بنتی تھی۔ یہہ مسالے از روے نیچرا ہوئے: اب مجنٹن سے سُرخی۔ بلیو بلیک سیاہی معمولی پڑیا کے رنگ سے بنا لیتے ہیں۔ یہہ رنگ نیچرا کا نہیں سمجھا جاتا۔ مصوری میں ہری پتّی بنانے کے لئے ہرے پتّے پیس کر ہرا رنگ بنایا جائے۔ گلابی رنگ سُرخ گلاب کے پھولوں سے اور زرد رنگ گیندے کے پھولوں سے لیا جائے۔ سنہرا رنگ سونے سے اور روپہلا چاندی سے تو نیچرال رنگ سمجھنا چاہئے۔ اس مضمون کو پائنیر کے نامہ نگار نے اپنی چٹھی مورخہ ۲۰ دسمبر سنہ ۱۹۲۲ء میں نہایت معقول طرز پر لکھا ہے (مطبوعہ پائنیر ۱۲ جنوری سنہ ۱۹۲۳ء)

اب گفتگو یہہ ہے کہ نیچرا اور غیر نیچرا میں کیا امتیاز ہے؟ انگریزی میں نیچرا کے مقابلہ میں لفظ آرٹ ہے جسکے لفظی معنی فن و صنعت کے ہیں۔ اس حساب سے نیچرا عالم اسباب میں قدرتی اشیا اور قدرتی اسباب و سامان کا نام ہوا یعنی صنع الہی۔ اور انسانی صنایع کا نام آرٹ سمجھئے۔ یہہ تعریف نیچرا اور آرٹ کی بہت صاف نہیں۔ ہماری زبان میں یہہ دو لفظ نئے ہیں: انکی تعریف اساتذہ کی تصانیف میں مفصّل دیکھنے میں نہیں آئی۔ سر دست کام نکالنے کے لئے اس طرح سمجھ لینا چاہئے کہ قدرتِ ایزدی نے جو سامان مہیا کر دیا وہ نیچرا میں سمجھئے اسکے ساتھ یا بعد جو بات صنعت انسانی نے اپنے ذہن سے ایجاد کی وہ آرٹ ہے۔

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ از روئے خوبصورتی نیچرا کی چیزیں انسان کی نگاہ میں زیادہ حسین ہیں یا صنعت انسانی کی۔ شام کو غروب آفتاب کا نظارہ زیادہ دلکش ہے یا بزم عیش میں کافوری شمعوں کی روشنی اور عطر و پھولوں کی مہک

انسان کی شکل جو مفلوج یا جذامی پیدا ہوا دل کش ہے۔ یا مانی و بہزاد کی کھینچی ہوئی تصویر کسی حسین کم سن ماہوش کی؟ انسان ہر چیز کو اپنی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ نیچر کو ہماری نگاہ سے غرض نہیں۔ وہ اپنی مصلحت کے موافق کام کر رہی ہے اور اس مصلحت سے انسان لا علم ہے۔ برخلاف اسکے انسان اپنی صنعت یعنی آرٹ میں اپنے ذہن کے موافق جو خوبی جہاں نظر آتی ہے ایک جگہ جمع کر لیتا ہے۔ کمر نہایت پتلی۔ بال بہت لمبے۔ دہن نقطہ سے زیادہ تنگ۔ غرض جو جو باتیں اسکے ذہن میں خوبصورتی میں داخل ہیں تصویر میں جمع کر دیتا ہے؛ انسان کو اپنے ذہن کے موافق کام کرنا ہے۔ اور نیچر کو اپنی مصلحت سے؛ اب رائے لگائی تو انسان اپنے ذہن کے سوا اور کس چیز سے رائے لگا سکتا ہے؛ انسان جس طرح پیدا ہوا اگر اُسی طرح چھوڑ دیا جائے تو بہت خوبصورت نہیں سمجھا جا سکتا۔ اسکی خوبصورتی میں آرٹ کو زیادہ دخل ہے؛ اس کا فیصلہ کہ خوبصورتی میں نیچر کا مرتبہ زیادہ ہے یا آرٹ کا مشکل ہے؛

میرے عقیدہ میں نیچر کے ساتھ آرٹ کی ضرورت ہے۔ نیچر کے ساتھ آرٹ گویا ع عروس جمیل و لباس حریر۔ کی مثال سمجھئے۔

محض نیچر کا مزاج بتان سنگ دل سے زیادہ سخت ہے۔ نیچر کے مزاج میں نہ رحم ہے نہ ترس۔ کوئی مرے یا جئے اس کی بلا سے؛ یہہ بہری گونگی اور اندھی ہے؛ بہرے کو خبر نہیں کہ گانے میں ساز ملا ہوا ہے یا اپنی اپنی ڈفلی اپنا اپنا راگ ہے۔ آرٹ سے گانے کے سُر و لے معلوم ہو جاتے ہیں۔ نیچر کو رنج و افسوس۔ شرم و حیا سے غرض نہیں۔ یہہ باتیں آرٹ سے علاقہ رکھتی ہیں؛ نیچر نہیں جانتی کہ گناہ کیا چیز ہے؟ بدصورتی کسے کہتے ہیں۔ نیکی و بدی میں کیا امتیاز ہے؟ اِنکا تعلق تعلیم و تہذیب سے ہے جسے ایک خاص آرٹ

کہنا چاہیئے: اس آرٹ کا واسطہ دل و دماغ سے ہے۔ جسکو مذہب کہتے ہیں؛

نیچر کی مثال ایک کف دست میدان کی سی ہے جسکا وجود انسان سے پہلے تھا۔ انسان نے اسے آکر آباد کیا۔ نیچر کو ایک صحراے لق ودق سمجھے جس میں درخت وپہار و دریا ہیں۔ انسان نے اسے باغ کی شکل بنایا۔ موقع سے درخت لگائے۔ روشیں بنائیں۔ دریا سے نہریں نکالیں؛ میدان میں پتھر لکڑی کنکر مٹی کے جابجا ڈھیر پڑے ہوئے تھے۔ انسان نے حسب ضرورت جہاں مناسب ہوا اس مسالہ سے شہر آباد کئے؛

نیچر کو محض پیدایش سے غرض ہے۔ اسے یہہ فکر نہیں کہ یون ہی خلقت پیدا ہوتی جائے تو انکی زندگی میں معاش کیا صورت ہو سکتی ہے: اس میں کچہ تو نیچر کو سوجھی کچھ انسان کو۔ نیچر نے دیکھا کہ محض پیدایش ہی پیدایش کی چلی تو زندگی مشکل ہے۔ پیدایش کی تعداد میں کمی کرنے کے لئے قحط۔ وبا۔ ناگہانی اموات اور ایسی مہلک بلاؤں سے کام لیا۔ بعض عورتیں بانجھ کردیں اور بعض مرد اولاد کے کام کے نہ رکھے؛ انسان نے اولاد کے قبول کرنے میں نکاح اور حلال کی شرط لگادی۔ لڑائی میں جانیں تلف کرنے کے لئے غضب غضب کے سامان ایجاد کئے۔ ان تدبیروں سے پیدایش کی کثرت کا کچہ علاج ہوگیا؛ نیچر تو پیدا کرکے الگ ہوگئی انسان نے اس میں انتخاب شروع کیا کہ فلاں اولاد حلال کی فلاں حرام کی۔ فلاں قوم بدعقیدہ ہے فلاں کو ہمارے عقیدہ سے اختلاف ہے انکا زندہ رہنا مناسب نہیں؛ دختر کشی کی رسم اسی غرض سے تھی کہ پیدایش کم ہو۔ انسان کی قربانیاں تک جائز سمجھی گئیں۔ خاصکر پہلوٹھی کا بچہ تو خدا کے نام کا سمجھا جاتا تھا؛ غرض ان باتوں سے یہ ہے کہ نیچر اور انسان نے ملکر دنیا کی یہ صورت پیدا کردی جو نظر آرہی ہے۔ اس میں انسان کے دل و دماغ کے کارناموں نے یہہ دنیا اس لایق کردی کہ خدا کے بندے چندروز آرام سے بسر کرکے چلے جاتے ہیں؛

پیری میں جوانی کی تلاش

پیری و صد عیب چنیں گفتہ اند لیکن بڑا عیب پیری میں یہہ ہے کہ بڑھاپے میں جوانی کی ہوس ہوتی ہے۔ انسان بڑھاپے میں اپنے تئیں بوڑھا سمجھ کر جوانی کا خیال اگر چھوڑ دے تو بڑھاپا مصیبت میں داخل نہیں ۔ مصیبت تب ہوتی ہے جب کہ چالیس پچاس برس کی عمر میں انسان کو پچیس برس پہلے کے ولولے یاد آئیں۔ بڑھاپے میں جوانی کی باتوں کا خیال سوہانِ روح ہوجاتا ہے۔ بڑھاپے میں انسان سارے زمانہ کی شکایت کرتا ہے اور دراصل اُسے اپنی عمر سے شاکی ہونا چاہئے۔ جو صحبتیں گذر گئیں اور جو ولولے مٹ گئے اُنکو یاد کرکے رونا غلطی ہے۔ بڑھاپے میں بچپن کی دلّی اور واجد علی شاہ کے وقت کا لکھنؤ ڈھونڈھنا حماقت ہے۔ نہ وہ دلّی ملتی ہے نہ وہ لکھنؤ۔ انسان خواہ مخواہ ابنائے زماں کا گلہ کرتا ہے کہ وہ لوگ اب نہیں ۔ گھر میں جو بال بچے چھٹ پن میں ہاتھ پھیلا کر دوڑتے تھے وہ خود بال بچے والے ہوکر اپنے اپنے جھگڑوں میں لگ گئے تو اس میں اُنکا کیا قصور ؟ لڑکیاں جو گڑیوں سے کھیلتی تھیں اب شادی بیاہ کے بعد اپنے بچوں کو گودیں لئے پھرتی ہیں ۔ آپ کے رات دن کے ملنے والے جو نوعمری میں ادھر اُدھر کی گپیں اڑایا کرتے تھے روٹی دال کے جھگڑے میں مبتلا ہوگئے تو آپ خفا کیوں ہوتے ہیں ؟ بڑھاپے میں جوانی کی باتیں یاد کرکے اپنے تئیں جوان سمجھنا یا جوانی کی اُمنگیں کرنی بڑھاپے کی خرابی ہے۔ بڑھاپے میں بازگشت جوانی کا خیال مصیبت کا گھر ہے

سہ

دامن پہ اب شباب کے وہ داغ مے کہاں ۔ جب بال تک سفید مرے سر کے ہوگئے

آغازِ شباب میں جب آپ کھانے کمانے کے لئے گھر سے نکل گئے اور کما کما کر وطن کی

یاد آئی تو پندرہ بیس برس جو آپ کو باہر گذرے تو ساون کے اندھے کی طرح آپ کو اُسی صحبت و زمانہ کا خیال آیا جو آپ چھوڑ گئے تھے ۔ وہ صحبت اور وہ صحبت افسانہ ہوگئی ۔ وہ افسانہ یاد نہیں رہا اور وہ خواب خیال سے اُتر گیا ۔ جو خط و خال جس چہرے پر آپ دیکھ گئے تھے مزاج یار کی طرح بدل گئے ۔ سیاہ بال سپید ہوگئے اور سپید بہت کم رہ گئے ۔

جناب رشید لکھنوی نے پیری کی نسبت بہت پاکیزہ رباعیاں لکھی ہیں

ہیں یاد وہ دن نظر میں وہ راتیں ہیں ۔ سمجھوں گا مرے پاس بھی سوغاتیں ہیں
تربت میں گنہ سارے بیاں کرکے رشید ۔ کہدونگا جوانی کی یہہ سب باتیں ہیں ۔

حسب حال کیا خوب فرمایا ہے

سن لیجئے شباب کی کہانی مجھ سے ۔ کچھ اسکی ہوئی نہ قدر دانی مجھ سے
میں پیر ہوا سخن ہوا مرا جوان ۔ لی مرے کمال نے جوانی مجھ سے

قسم کھانے میں دستور ہے کہ عزیز سے عزیز چیز کی قسم کھاتے ہیں ۔ جوانی کو بھی عزیز سمجھکر جوانوں کو جوانی کی قسم زیب دیتی ہے مگر

پیری کی طرف دیکھ کے آتی ہے شرم ۔ جب اپنی جوانی کی قسم کھاتا ہوں ۔

اس مضمون سے میری غرض یہہ ہے کہ انسان بڑھاپے میں جوانی کا خیال چھوڑ دے ۔ بوڑھے جو اپنے تئیں جوان سمجھتے ہیں اور جوانی کی نقل کرتے ہیں مفت میں اپنی جان کو تکلیف دیتے ہیں : بڑھاپے میں جوانی کی حرکتیں حماقت ہے ۔ یہہ غلط ہے کہ ع پیری کہ دم زعشق زندلیں غنیمت است

اپنے اعمال سے پیری میں خبردار ہوئے
سوئے تھے سر پہ جو دھوپ آئی تو بیدار ہوئے

صلائے عام

سید منظر علی صاحب (سید امجد علی صاحب اشہری کے صاحب زادے) نے مجھے حیدر آباد (دکن) سے لکھا ہے کہ × × × × "میرے خیال میں اد بار وقت کے گروہ میں آپ سب سے زیادہ کہن سال ہیں۔ اگر اپنے زمانہ کے اخبارات و رسائل نیز اخبار نویسوں پر کچھ ارقام فرمائیں گے تو **صلائے عام** کے لئے ایک تازہ مضمون ہوگا ؛ میری مُراد قدیم سے قدیم اخبارات و رسائل سے ہے۔ خصوصاً اُن سے جو مُردہ ہو چکے ہیں یا اب نیم جاں ہیں" ؛ × × × × × × ×

صلائے عام۔ یہہ تحریک نہایت پاکیزہ ہے۔ ائندہ کے لئے بہت کار آمد ہوگی ؛ اس کے لئے اور اصحاب مجھے مدد دیں تو ایک رسالہ علیحدہ ہی نکل سکتا ہے ؛

اس مضمون کے متعلق جو صاحب جس قدر مسالہ عنایت کر سکیں مجھ پر اور اہل علم پر احسان ہے ؛

اس وقت جناب مولوی سید احمد حسن صاحب **شوکت** کے انتقال پر مجھے بہت افسوس آیا کہ ایسا باکمال شخص پیدا ہونا مشکل ہے۔ شاید آیندہ زمانہ اس کی تلافی نہ کرسکے ؛ **صلائے عام** کے لئے نہایت پاکیزہ مضامین عنایت کیا کرتے تھے۔ ایک تحریر میں لکھا کہ × × × × × × × × × × ×

"جناب خان بہادر۔ فروری کا رسالہ (صلائے عام) اچھا نکلا۔ اس میں فارسی کلام کا قوام ہے اور شاعری فارسی ہی میں ہے جس سے اُردو شعرا بے نصیب ہیں۔ مگر گُتا کی غلطیاں۔ الہی توبہ۔ شاید کوئی شعر بچا ہو۔ مجبوری ہے ع چہ تواں کرد مرداں ایں اند ؛ میں مضمون بھیجتا مگر مشکل یہ ہے کہ شاعروں۔ انشاپردازوں خصوصاً نامہ نگاروں کی توہین ہوتی ہے۔ حالانکہ میں تعلّی سے ایک حرف بھی اپنی نسبت نہیں لکھتا۔ واقعی حالت لکھتا ہوں۔ تعلّی کس کے سامنے کروں کوئی مرتبہ شناس نہیں سب پر جہالت کا قبضہ ہے × × × شاید آپ یہہ سمجھتے ہیں کہ مجھے مضامین دینے کی ضرورت [illegible] ہے × × × ×

مکتوبات

"مکتوباتِ فرنگ"

یہہ چھوٹا سا رسالہ ہے جس میں ایک انگلش نواب زادی صاحبہ کے خطوط کا انگریزی سے اُردو میں ترجمہ ہے۔ ترجمہ جناب ڈاکٹر محمد عبد الغفور صاحب بسمل بریلوی کا کیا ہوا ہے۔ مترجم کی لیاقت انگریزی و اُردو کی لاجواب ہے۔ انگریزی کی نازکخیالیاں نہایت خوبصورتی سے اُردو میں ادا کردیں۔ کسقدر مشکل و نازک خیال غیر زبان سے اپنی زبان میں ترجمہ کرکے دکھانے ہیں ملاحظہ فرمائیے "آہ! وہ چاندنی رات جس کی بابت یہاں کے لوگوں کا خیال ہے کہ فرشتے آسمان سے اترکر سیر کیا کرتے ہیں"۔ "بلیغ الفاظ وہی ہیں جو لب تک نہ پہونچے ہوں" "چھوٹے چھوٹے تجانے جھیل کے کنارے پر کھڑے ہوئے ایسے معلوم ہوتے ہیں کہ گویا ہوا میں تیر رہے ہیں"۔ بہرکیف جب شوق کی دلفریبیاں زائل ہوجاتی ہیں تو پھر بجز اُس تاریک خیال کے جس کا نام بیغرضی ہے اور کیا باقی رہ جاتا ہے"۔
"نسیم گلاب کی پنکھڑیوں کی طرح نرم ہے"

"نگار"

ابتک جو اُردو کے رسالے میری نظر سے گذرے اُن میں رسالہ نگار کی تعریف کرنے کو بے اختیار جی چاہتا ہے۔ دسمبر ۱۹۲۲ء کے نگار میں "افسانہ ستی" کا اندازِ بیان مجھے بہت پسند آیا۔ جناب نیاز فتحپوری نامور لکھنے والوں میں ہیں اور اس طرز کے موجد ہیں جو "ستی" کا ہے: یہہ مضمون میں نے حرف بحرف پڑہا اور پڑھ کر جو خوشی ہوئی اُس کے شکریہ میں از روئے داد یہہ عرض کیا گیا۔

"عبرت"

رسالۂ عبرت کے جناب اڈیٹر سے یہہ التماس ہے کہ رئیس ہند نامی رسالہ میں جو مضمون شہاب الدین غوری کی قبر کے متعلق اگست و دسمبر ۱۹۲۲ء کے متحدہ دو پرچوں میں شایع ہوا ہے اُسکے متعلق اپنی خود معلومات سے مفصل مضمون لکھیں کہ در اصل واقعی کیا صورت ہے۔ یہہ معاملہ ذرا معرکہ کا ہے۔

ؔ۱ خاموشی از ثنائے تو حدِ ثنائے تست۔ فصاحت ختم کردی۔

التماس و اطلاع

مضمون نگاروں کی خدمت میں التماس ہے کہ معمولی و رسمی مضامین سے **صلائے عام** کو بچائے رکھیں۔ **صلائے عام** کو بھرتی کے مضامین کی ضرورت نہیں۔ مضمون میں جب تک کوئی خاص ادائے بیان از روئے کمالاتِ علمی و معلومات قدیم و جدید پائی نہ جائے بے کار ہے سہ

ہمیں ہے حضرتِ عیسےٰ کا امتحان منظور ؎ کہے نہ کوئی کہ پھرتے ہیں ہم دوا کے لئے

صلائے عام کے پچھلے پرچے کمیاب کیطرح نظر نہیں آتے۔ اور جسطرح شعراء ماضی حال اسی کی تلاش میں رہے۔ صلائے عام کے پچھلے پرچوں کے لئے اسقدر درخواستیں آرہی ہیں کہ انکا جمع کرکے پھر چھاپنا ضرور ہوا؛ مشکل سے مجھے چند پرچے جابجا سے ہاتھ آئے ہیں اور پرچوں کی تلاش ہو رہی ہے۔ جنکے پاس صلائے عام کے پرانے پرچے ہوں از راہ کرم عاریتاً یا قیمتاً عنایت فرمائیں: پچھلے پرچوں میں جو مضامین انشاء ادب کی خوبیوں کے ہیں انکا انتخاب کتاب کی صورت میں چھاپنے کا ارادہ ہے سہ

تم اپنے تیر کے کیوں توڑ کا کرو دعوے ؎ وہ دل ہی نرم تھا جو تیر کا نشانہ ہوا

صلائے عام کا خاص مطبع علیحدہ ہے جس سے پہلی شکایت غیر مطابع سے چھپوانے کی جاتی رہی۔ مطبع و دفتر کا اہتمام بھی پہلے سے زیادہ ہے اور سامان ابھی جمع ہو رہا ہے؛ اسکی اطلاع اس لئے دی گئی کہ **صلائے عام** کا مطبع ہو جانے سے غیر مطابع میں چھپوانے کا ورد سر مٹ گیا۔ آئندہ یہ رسالہ وقت پر نکلا کریگا۔ رسالہ اپنا اور مطبع اپنا۔ اب اور کیا چاہئے

منحصر آنکھ کے سُرمے پہ سمجھتے ہو بناؤ ؎ ایک ایک طرّہ پُرخم بھی سنوارا ہوتا

صلائے عام

ہے ہر ایک انجام آغاز اک نئے انجام کا ٭ رات کی آمد ہے دن کے بعد ہو نام شام کا
اس سال کے آغاز کا پہلا پرچہ آپ کی نظر سے گزر چکا۔ یہہ اگر پسند آگیا تو آپ
سرے پرچہ کا انتظار کریں۔ اسی طرح دوسرے کے بعد تیسرے کا جب تک کہ
صلائے عام نکلتا رہے: اس پرچہ کو آپ گویا سلسلۂ انتظار کا آغاز سمجھیں ٭
لے انتظار کے واسطے اس لیئے عرض کیا گیا کہ صلائے عام کے پرچے مطبع سے
تے ہی ہاتھوں ہاتھ نکل جاتے ہیں پھر ہاتھ نہیں لگتے ع
لے گئے سمجھ کے تبرک لحد کی خاک ٭ اعمال نیک نے مری مٹی خراب کی ٭
صلائے عام اہل کمال کی طرف سے ذی کمال لوگوں کے لیئے جاری کیا گیا ہے
اسکے لکھنے والے جس لیاقت کے ہیں پڑھنے والے بھی اسی مرتبہ کے ہیں: یہی وجہ
ل قدر دانی کی ہے ع
سی شوخی خدا نے دی ہے حسن و عشق کو ٭ فرق بس اتنا کہ وہ آنکھوں میں ہے یہہ دل میں ہے

صلائے عام کی قیمت پیشگی چھہ روپے سالانہ ہے۔ نامہ نگار قیمت سے بری نہیں
ت بذریعہ منی آرڈر عنایت کی جائے ٭ صلائے عام کا پتہ یہہ ہے:
دہلی۔ فراشخانہ: مکان میر ناصر علیخان بہادر

حسب الارشاد میر ناصر علیخاں بہادر مطبع ناصری واقع فراشخانہ دہلی میں باہتمام میر احمد
چھپا اور شایع ہوا۔ اڈیٹر میر ناصر علی خاں بہادر۔ منیجر میر احمد۔

Printed and Published by Mir Nāsir Ali Khan Bahadur (Edit
at the Nāsiri Press, Farrâsh-Khânah, Delhi.

...istered No. L. 1463



نمبر ۲ | جلد ۱۱

صلائے عام دہلی

SALA-I-AM, DELHI.

A high class Monthly Magazine devoted to the cause of Urdu literature, the preservation of the old Indian, especially Mohammadan culture and refinement, and the assimilation of the best features of the new civilization.

جلد ۱۱ نمبر ۲

فہرست مضامین

بابت ماہ فروری سنہ ۱۹۲۳ء مطابق ماہ رجب سنہ ۱۳۴۱ ہجری ۶۴

پیرایۂ آغاز

اس پرچہ میں پہلا مضمون صلائے عام کے نام سے زبان کے وقار پہ لکھا گیا ہے کہ زبان کا مرتبہ اساتذہ کی زبان سے معلوم ہوتا ہے۔ ہر رطب ویابس کا نام لٹریچر نہیں نہ ہر کس و ناکس کی زبان پہ فصاحت کا اطلاق ہو سکتا ہے ؛ عامیانہ و بازاری زبان کا اعتبار نہیں گو عوام کو زیادہ پسند ہو تو ہوتے دیجئے۔ جہاں تک ہوسکے آپ زبان اساتذہ کی تقلید کریں کہ از روئے علم و فضل یہی کام آ سکتی ہے ؛ لیکن آپ مجھے اساتذہ کی زبان کا مدعی نہ سمجھیں۔ یہ صرف میری آرزو ہے جس کے پورا ہونے سے میں خوش ہوں گا۔

رخنہ زاں چاہ زنخ در خانۂ تقوائے فتاد ؛ ما ہنوز از پاک بازی ہا صلائے میزنم

دوسرا مضمون مضمون پریشان ہے جسکے دیکھنے کی آپ کو عادت ہو گئی ہے۔ جس چیز کی عادت ہو جائے اُس کے نہ ہونے سے الجھن سی ہوتی ہے ؛ عرصہ سے اِس مضمون کا طرز خاص ہو گیا ہے جس سے پریشانی اور الجھن میں ل جمعی ہو جاتی ہے

سے رشتۂ جمعیتم تا بنگاہ صورت است ؛ تا بدل سودائے آں زلفِ پریشاں ریختند
زلفِ محبوب و نسیم سحر و بوے چمن
دلِ مجموع مرا بُرد پریشانے چند

خلفاء بنی فاطمہ کا حال مورخانہ ہے کہ خلفاء بنی اُمیّہ و عباسیہ اور خلافت قرطبہ کا حال تاریخوں میں بہت مفصّل دیکھنے میں آیا۔ خلفاء بنی فاطمہ کا حال بہت کم لکھا گیا ؛ اِس خلافت کے ہر خلیفہ کا حال علیحدہ علیحدہ لکھنے کا اِرادہ ہے ؛

دہلی کا ذکر بھی مورخانہ ہے جو واقعی و قوعی ہے ؛

جناب ضیاء دہلوی نے سیرِ کوہِ طور کی داد خوب دی ہے
بہ طور کے شوم از درگہش کہ شاہدِ حسن ؛ نمودہ روے درایجا و لب کشود آنجا
اسکے ساتھ وادیٔ ایمن کا مضمون بھی اچھا لکھا گیا ہے
وادیٔ ایمن دلِ داغ تمنّامی سوخت ؛ آتشِ طور گرفتیم و بداماں کردیم

قلعۂ چتور اور ماہی مراتب کا حال جناب مرزا محمّد علی خاں صاحب نے بہت اچھا لکھا۔ آپ کی معلومات کا مرتبہ بہت بڑھا ہوا ہے ؛

مشغلہ کی ضرورت۔ جناب مرزا عرفان علی بیگ صاحب کا مضمون ہے آپ کو مضمون نگاری میں ید طولے حاصل ہے ؛ جنوری کے صلاے عام کا ریویو آپ نے بہت اچھا لکھا ؛

کلامِ یاس اُردو۔ فارسی دونوں بہت پاکیزہ ہے۔
جنابِ یاس کو شعراء لکھنؤ کی شکایت ہے کہ آپ کے کلام کی قدر جتنی چاہیئے نہیں ہوتی ؛ صلائے عام کو ذاتی بحث سے غرض نہیں۔ کلام سے واسطہ ہے : کلام کسی کا ہو اگر داد کے لایق ہے تو داد سے دریغ کرنا صریح بیداد ہے ؛

آپ دیکھتے ہیں کہ صلائے عام میں آپ کی زبان کی خوبیوں کے ساتھ معلومات علمی خاصکر قدیم و جدید تحقیق و تاریخ کا مسالہ کس محنت و تلاش سے جمع ہو رہا ہے اور ہمیشہ اسی طرح بلکہ اس سے زیادہ شایع ہوتا رہیگا سہ

خاموش کے شوم کہ سخن دانیم بجاست
تا جوہرم بجاست دُر افشانیم بجاست

صلائے عام اپنی وضع کا ایک خاص رسالہ ہے جس کو آپ کی زبان کی خوبیاں دکھانے کا دعوے ہے۔ اس سے زیادہ جس کو دعوے ہو اُسکی داد سب سے پہلے ہمارے ذمہ: صلائے عام سے غرض یہی ہے کہ آپ اپنی زبان کی خوبیوں کی داد دیں اور داد لیں سہ

ما چنین بیخود اگر یار رسد بر سر ما ❊ کہ دہد مژدہ اگر دل نہ طپد در بر ما

آپ اپنی زبان کی قدر شناسی میں غفلت کریں اور صلائے عام بھی چُپ رہے تو پھر فرمائیے ہماری زبان کس کے دروازہ پر جائے؟ سہ

چو یوسف را نہ بیند غیر یوسف را چرا بیند
چہ مِنّت ہا کہ بر یعقوب دارد دیدۂ تارش

اہلِ کمال کے لئے صلائے عام گویا دنگل کا لُطف رکھتا ہے کہ

ع ہمیں میداں ہمیں چوگاں ہمیں گو

صلائے عام

یہہ رسالہ اہلِ کمال کی طرف سے اہلِ کمال کے لئے جاری کیا گیا ہے۔ اس کے پڑھنے والوں کو علم و فضیلت میں اس کے لکھنے والوں سے میں کسی طرح کم نہیں سمجھتا۔ اہلِ علم میں مقتضائے شرافت یہہ بات سمجھی جاتی ہے کہ اپنے سے دوسرے کو علم میں زیادہ سمجھنا چاہئے۔ کسی کو اپنے سے کم سمجھنا شرافت کا خون کرنا ہے۔

اس خیال کے اظہار کی ضرورت اس لئے ہوئی کہ بعض اصحاب صلائے عام کی زبان مشکل بتاتے ہیں: اسکی زبان مشکل ہرگز نہیں۔ اہلِ علم و کمال کے لئے اس سے کہیں زیادہ فضیلت درکار ہے۔ خاص کر اپنی زبان میں جسے ہم اُردو کہتے ہیں: سبب یہہ کہ ہماری زبان مجموعۂ کمالات ہے۔ "کمالات" میں نے اس دلیل سے کہا کہ ہماری زبان میں ہر زبان کی گنجایش ہے: اس سے زیادہ اور کیا کمال ہوگا کہ سوسن کی طرح ہزار زبان اور بلبل کی طرح ہزار داستان کہئے تو میری دانست میں اتنا بڑا مبالغہ نہیں کہ آپ مجھ سے اور اپنی زبان سے خفا ہو جائیں۔ لیکن اگر یہہ

مبالغہ ہے تو آپ ہی انصاف کریں کہ ہم ہندوستانی ہو کر ہندوستان ہی کی زبان بیکار جانیں۔ جس گھر اور جس صحبت میں پیدا ہوئے اُسی سے بیگانہ و نابلد رہیں۔ اپنی زبان کی خوبیاں دہن یار کی طرح چھپائیں ۔ ہمارا آسمان وہی ہے جو ہمیں دکھائی دیتا ہے اور جس کے نیچے ہم پیدا ہوئے۔ وہی زمین ہمیں پسند ہے جس پر ہم پیدا ہو کر چلے پھرے۔ ہمارا باغ وہی ہے جس میں ہم پھولے پھلے ؛ ہم باغ کے اُن درختوں میں ہیں جو دوسری زمین میں شاداب نہیں رہ سکتے ۔ کوئی درخت بے سینچے اور بغیر ابرو باراں کے کسی طرح نشو و نما نہیں کر سکتا ۔

دُنیا میں کوئی مُلک اور قوم ایسی نہیں جس کو اپنی زبان کی قدر نہ ہو۔ اور جب ہر قوم و ملک اپنی زبان کی ضرورت کا قائل ہے تو پھر اپنی زبان کے اندازِ بیان کا خیال کیوں نہ کیا جائے ؟ اپنی زبان میں حسنِ بیان کی خوبیاں کیوں نہ دکھائی جائیں؟ یوں تو کہنے کو گونگوں کے مُنھہ میں بھی زبان ہوتی ہے۔ مگر ع دہنِ زخم کو حاصل ہے کہاں لطفِ بیاں ؟

بچّہ جب امّاں ابّا کہنے لگے تو دیکھنا چاہئے کہ گھر والوں کے لب و لہجہ کا خون نہ کرے۔ اپنے خاندان کی بول چال اختیار کرے۔ اپنے بزرگوں کے طرز پر بات چیت کرے تو سعادت مندی کا نشان ہے + غیر زبانوں میں آپ ناقص رہیں تو عیب نہیں اپنی زبان میں غلطی اگر کوئی بخشدی تو گناہِ کبیرہ سے بدتر ہے ۔ جب آپکو خدا نے زبان دی ہے تو اچھے سے اچھا طریقہ ادائے بیان کا کیوں نہ اختیار کیا جائے ؟ ادائے بیان کے لئے سب سے پاکیزہ طریقہ زبان اساتذہ کا ہے جنہوں نے اپنے اظہارِ بیان میں مشق کر کے کمال پیدا کیا ہے ۔

یہہ رفعتِ کلام کسی کے لئے کہاں + ہر زادۂ خیال ہے ہمرازِ آسماں
مثلِ عروسِ حسنِ مضامیں کو ہے حجاب ۔ کیا دخل چھو سکے کسی نافہم کا گماں

ہر گلی کوچہ کے بازاری سودے سُلف کے ٹوٹے پھوٹے فقرے فصاحت میں داخل نہیں۔ ڈھول کی آواز اور صدائے ارغنوں میں فرق ہے۔ ہاتھ پاؤں مارنے کو خرام ناز نہیں کہتے۔ فقیر کو گو شاہ صاحب کہتے ہیں مگر شاہ و گدا میں جو فرق ہے وہ سب جانتے ہیں ع شیرِ قالیں اور ہے شیرِ نیستاں اور ہے ؂ عوام کی زبان گویا خالی سینہ ہے جس میں دل نہیں۔ وہ پھول ہے جس میں خوشبو نہیں ؂ عامیانہ زبان وقار و اطمینان سے خالی سمجھئے۔ وقار کے لئے زبانِ اساتذہ چاہیئے ؂

مُحبت میں مَیں دیکھتا ہوں کہ دیدار سے زیادہ گفتار کو دخل ہے۔ اس کا ثبوت حضرت جامیؒ سے پوچھئے کہ ؎

نہ تنہا عشق از دیدار خیزد ؂ بسا کیں دولت از گفتار خیزد

یوں تو ہر شخص کے ہاتھ میں اُنگلیاں ہیں لیکن شرافت کا حال ہاتھ ملاتے وقت اُنگلیوں سے معلوم ہو جاتا ہے کہ سخت ہیں یا نرم؟ حسینوں کے مُنھ موڑنے سے بھی اُنکی کمر سے نزاکت کا پتہ چل جاتا ہے ؂

صلائے عام سے یہہ غرض ہے کہ اچھا خیال اپنی زبان میں پاکیزہ طرز سے ادا کیا جائے۔ آواز ہو اور دل کش۔ بقول طوطارام شایاں ع ہے لطف وطن میں مے کشی کا ؂ اُونٹ جب بھاگتا ہے پچھاں کو اور ہاتھی کو کسی ملک میں لیجائیے یادِ ہند آتی ہے۔ گلزار نسیم میں تاج الملوک کو یادِ وطن کی تمثیل اس طرح دی ہے کہ ع اُس فیل کو یادِ ہند آئی ؂

جس طرح بُلبُل کی شہرت اُسکی آواز سے ہے۔ اور پھول کی رنگ و بُو سے۔ اسی طرح زبان کا وقار اساتذہ کی زبان سے ہے ؂ ہر خیال کے ادا کرنے کے لئے مشقِ کہن درکار ہے۔ زبانِ اساتذہ کو آپ مشقِ کہن سمجھئے ؂ جہاں پاکیزہ اندازِ بیان کے لالے ہوں وہاں عامیانہ لب و لہجہ کو ترقی ہوگی اور عامیانہ لب و لہجہ

سے زبان کا وقار ممکن نہیں ۔ قدیم زبانوں کا وقار ہماری نظر میں اُن کے اساتذہ کی تصانیف سے ہے۔ یونانی زبان کا یادگار ھومر کا کلام ہے۔ سنسکرت کا نام والمیک و تلسی داس جی سے ہے۔ اور اسلام کی برکت کلام مجید کی فصاحت سے ہے۔ خواجہ حیدر علی آتش کا شعر ہے ؎

پڑھا ہے ہم نے بھی قرآں قسم ہے قرآں کی ۔ جواب ہی نہیں رکھتی ہے گفتگو تیری ۔

کلامِ جناب یاسؔ لکھنوی

خود پرستان ازل دارند ایمانے دگر ۔ حق پرستی می کنند اما بعنوانے دگر
دستِ خود دامانِ خود بودن ندارد لذتے ۔ دستِ گستاخے دگر خواہیم دامانے دگر
جز ترنم ہائے درد افزا ندارم چارۂ ۔ بلبلِ تنہا نشین را نیست دربانے دگر
پاسبانی از نگاہِ نارسا ناید درست ۔ بوئے یوسف راہیا کن نگہبانے دگر
گوشم از ذوقِ اسیری بر نتابد مژدۂ ۔ جان اینا دوست دارد شوق زندانے دگر
غفلتِ جاوید دارد رنگ خوابِ سرمدی ۔ جلوۂ فردا بچشم ماشبستانے دگر
الوداع اے حسن و عشقِ کفر مشرب الوداع ۔ ما ز فیضِ بیدلی داریم ایمانے دگر
ہر کسے را بہرہ باشد ز فیضانِ بہار ۔ دستِ من رنگیں ز خار و گل بدامانے دگر

زندہ در گوریم و شاید زندۂ جاوید ہم
جرعۂ خوردیم یاسؔ از آبِ حیوانے دگر

مضمونِ پریشان

طعنے دیتی ہے مجھے میری پریشاں خاطری ٭ ڈھونڈھتا پھرتا ہوں اطرافِ جہاں میں قدرداں

مضمون پریشان میں نے اسقدر لکھے کہ درازی میں زلفِ یار سے بڑھ گئے۔ اور پریشانی میں سنبل سے بازی لے گئے۔ ان کو دیکھکر

برہمی ایسی زمانہ سے ہوئی ہے معدوم ٭ کہ پریشاں نہیں ہوتے کبھی گیسوئے صنم

انسان کے لئے پریشانی کی کوئی وجہہ نہیں۔ جب یہہ قرار پاگیا کہ دنیا میں کسی چیز کو قرار نہیں تو پریشانی کو قرار کہاں سے آگیا؟

نہ دانم ایں ہمہ زلفِ تو بے قرار چراست ٭ کہ نیست غیر خیالش قرار خاطر ہا

عالمِ اسباب کا انقلاب صفات ایزدی کی طرح لایزال ہے۔ جب یہی قاعدہ ٹھہر گیا تو ہماری ہستی جو فنا ہونے والی ہے۔ اِس فنا کو بقا کس طرح ممکن ہے؟

کسی صورت کو استقلال دم بھر بھی نہیں رہتا ٭ اثر باقی ہے آنکھوں میں مرے خوابِ پریشاں کا

خالقِ لایزال نے جب ہماری زندگی گزشتنی و گزاشتنی دیکھی تو انسان

کو اولاد کی ہوس دی کہ ہم نہیں تو ہمارا نام زندہ رہے۔ اولاد سے ہماری زندگی کی ہوس نکل جائے ؎ ببین محفلِ آسودگاں کہ چوں فانوس ÷ بہ سوزِ عشقِ دلِ زندہ در کفن دارند
ماں کی خوب صورتی بیٹی کی شکل وصورت سے دیکھ لیجئے اور باپ کی جوانی بیٹے کے دست و بازو سے۔ ؎

مرد آں نیست کہ ترکِ زن و فرزند کند ÷ مرد آں ست کہ از خویشتن آید بیروں

بیج سے پھول اور پھول سے پھل اور پھل سے پھر بیج۔ یہی گلشنِ ہستی کی روش ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ چلی جائے گی ÷ ؎

ہر جا حُسنے است من غلامم ÷ ہر جا نمکے است من کبابم

عالم اسباب کی ہستی اور غیر ہستی دونوں یکساں ہیں۔ شیشہ و شراب جب دونوں یک رنگ ہیں تو کسکا کیا رنگ بتائیے۔ دُنیا کی پریشانی اور غیر پریشانی۔ دولتمندی و محتاجی۔ تکلیف و آرام۔ ضُعف و توانائی۔ مصیبت و راحت جب سب کو فنا ہے تو گھڑی دو گھڑی کے لئے انکا ذکر و فکر کونسی عقلمندی ہے؟ ؎

بہ یک کرشمہ دلِ نازکم پریشاں ساخت ÷ زہے پری کہ بہ شوخی شکست مینا را۔

فروغِ حُسن کے لئے نقاب بے کار ہے کہ آفتاب کی روشنی آفتاب کے لئے نقاب کے برابر ہے۔ اور اندھیرے میں سیاہی کی تلاش فضول ہے کہ تاریکی میں نگاہ کیا کام دے سکتی ہے؟ انسان کو جب غش آئے تو اس پاس اندھیرا ہو یا روشنی دونوں یکساں ہے ؎

بود از جنبشِ یک تار گاہے زیر و گاہے بم ÷ نوائے شادی و غم پردۂ یار است میدانم

زندگی کی علّتِ غائی موت ہے۔ ورنہ دونوں کو یکجا کرنا کیا ضرور تھا ؎

بہانہ موت کا تھا جسم و روح کو ورنہ ÷ ہر اک کو اپنی طرح پر جریدہ رہنا تھا

میاں کو زندگی و موت ملا کر ہمیں جھگڑے میں ڈالنا تھا ورنہ موت کو

الگ رکھتے اور زندگی کو الگ تو یہاں فکر معیشت اور وہاں وغدغۂ حشر سے ہم بچ جاتے سه
دیکھا جو گیا روز جزا نامۂ اعمال ؛ جس لفظ کو پڑھتے تھے تمہارا ہی گلا تھا
تمام عمر اور ایک زمانہ کی تلاش کے بعد آجتک میاں نے اپنا پتہ نہ دیا۔ اسکے دو سبب ہو سکتے ہیں: ایک یہہ کہ سه
جاننا تھا پڑے رہیں گے وہیں ؛ اس لئے یار گھر بتا نہ سکا
اگر ایسا ہی ہوتا کہ ہم در یار پر پڑے رہتے تو یار کا ہرج کیا تھا؟ یہہ نامۂ پیغام قاصد و ہرکاروں کی ضرورت نہ رہتی: لیکن دوسرا سبب ذرا زیادہ ہے کہ مرتے وقت سه
کھلا قرآں تو وہ سمجھے مرے شکووں کا دفتر ہے ؛
اُٹھے شرما کے بالیں سے جب آیا وقت یٰسیں کا
اس میں شک نہیں کہ زندگی ہو یا موت پروردگار کی نعمتوں میں شک نہیں سه
بہ قدر جوہر حسن است عشق را سودا ؛ تواں شناخت زیوسف غم زلیخا را
لیکن یہہ بتائیے کہ زندگی کی تمنا کس نے کی تھی۔ نکاح کی طرح سنت پیغمبر گلے میں پڑ گئی: جو آرزوئیں کہ ہم ساتھ لائے تھے اور جن کے پورا کرنے کا کم و بیش مسالہ بھی تھا اُنکا خون کرنا پڑا ؛ جناب نسیم دہلوی فرماتے ہیں سه
بوسے میں نے نہ لئے گو کہ اجازت بھی ملی ؛ آپ کا مجھپہ کرم آپ پر احساں میرا
نیکی برباد گنہ لازم مرنے کے بعد باز پرس کی اچھی ٹھہری۔ سه
مذاق خدمت صیاد مدت میں ملا ہم کو ؛ مبارک ہو قفس اب فاتحہ پڑھیئے رہائی کا
یہہ داغ ہم قیامت تک اپنے ساتھ لے جائیں گے۔ سه
نہ چھوٹا آج تک دامن سے تیرے ؛ یہہ کیسا داغ تھا کس کا لہو تھا

* * * * *

قاتل ادبِ ذبح سکھا یا کیا ہر روز ٭ برسوں مرا سینہ تہِ زانو نظر آیا

× × × × × ×

ذبح کے وقت جو بے رحمی قاتل دیکھی ٭ اپنے مرجانے پہ احسانِ قضا یاد آیا

× × × × × × ×

کھلا اوجِ زمیں کا حال ہم کو بعد مرنے کے ٭ اُسے بالائے سر دیکھا جسے زیرِ قدم پایا

لیکن آخر کو مرگ و زندگی کا تماشا کبھی ختم بھی ہونے کو آئیگا یا نہیں ؟ سنتے ہے کہ قیامت بعد پھر موت نہیں - زندگی میں تو موت کا سہارا ہے مرنے کے بعد پھر زندہ ہونے میں موت کا بھی آسرا نہ رہا - ۵

جان و دلِ شکستہ ہزاراں نمود جمع ٭ زلفِ محبت ہنوز پریشاں چرا چرا

چشم دارم کہ نہ دستم نہ ستانی داماں

خاصہ آں روز کہ جانم ز تن آید بیروں

ہر عزیز از سرِ ہستی نتواند برخاست ٭ یوسف است آں کہ ازیں پیرہن آید بیروں

وصف رعنائی زلفِ تو بہ لبتاں کردیم ٭ خرمنِ گل چہ قدر ہا کہ پریشاں کردیم

حرفے از سوزشِ عشاق در آفاق نبود

از خطش نسخہ گرفتیم و پریشاں کردیم

خُلَفَائِ بَنی فَاطمہ

تاریخِ اسلام میں خلفائے بنی اُمیہ و عباسیہ اور خلافت قرطبہ کا حال بہت مفصّل درج ہے۔ بنی فاطمہ کی خلافت کا ذکر بہت نہیں دیکھا گیا ۔ اُس خلافت کو گو زیادہ قیام نہیں رہا مگر شمالی افریقہ (دیارِ مغرب) کیروان اور مصر میں اس خلافت کو خاصہ عروج ہوا ۔ اس سلسلہ کی بنیاد حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے ساتویں امام حضرت امام جعفر صادق ؑ تک برابر بتاتے ہیں۔ پھر امامت میں اختلاف ہو جانے سے "سبعین" یعنی سات امام ماننے والے اور اثنا عشری بارہ اماموں کے معتقد علیحدہ ہو گئے ۔ خلافت بنی فاطمہ کی اصل وہ عقیدہ ہے جو خلیفۂ چہارم کو خلیفۂ برحق مانتے ہیں اور خلافت حضرت ہی کے خاندان میں نسلاً بعد نسلاً صرف سادات کا حق سمجھتے ہیں ۔ بنی فاطمہ کی خلافت کا آغاز من ابتدائے ۲۶۰ھ لغایت ۲۵۶ھ ہجری سمجھا جاتا ہے اور عروج ۲۵۶ھ سے ۴۶۹ھ ہجری تک اس کے بعد زوال کا زمانہ یعنی ۴۶۹ھ سے ۵۶۴ھ تک ۔ بنی فاطمہ کے عروج کے زمانہ میں مسلمانوں میں علم وفضل کو بہت ترقی ہوئی فلسفہ۔ شعر و سخن۔ فنِ تعمیر اور کمالات علمی کی قدر زیادہ ہوئی۔ مُتنبّی اسی زمانے کا مشہور شاعر ہے جو خلیفہ المعز الدین اللہ کے دربار میں پہونچا ۔ کافور نامی ایک حبشی سپہ سالار و منتظم بڑا نامور ہوا ہے یہہ خلیفہ مہدی کیروان والے کا غلام تھا۔ اس کی سیاہ رنگت کی

وجہہ سے اس کو ابو المشک کہتے تھے ؛ خلافت مصر میں یہہ بڑا زبردست حکمراں سمجھا جاتا تھا ؛ اسکو موسیقی سے جیساکہ باشندگان ملک حبش کی خصلت ہے بہت شوق تھا اسکی قدردانی سے فن موسیقی میں ترقی ہوئی ؛ اس کے بنائے ہوئے باغ قاہرہ کی شہرت کا باعث ہیں ؛ شعراء کی ایسی قدر ومنزلت تھی کہ ایک شاعر کی نسبت لکھتا ہے کہ سو جوڑے خلعت ولباس فاخرہ کے اور اس کے دو چند اور بیش بہا دستار وپارچے اس شاعر کے مرنے کے بعد اس کے اسباب میں نکلے ؛ ایک دفعہ مصر میں بہت زلزلے آئے۔ اس کی وجہہ ایک شاعر نے اپنے مضمون میں اس طرح باندھی کہ اہل مصر کافور کی داد ودہش سے خوشی میں رقص کرنے لگے یہہ زلزلے نہیں مصریوں کے رقص کا نتیجہ ہے کہ زمین ہل گئی ؛

کافور نے مصر میں بائیس برس حکومت کی۔ اس کے مرنے پر انتظام میں قدرے قلیل رخنہ پڑا مگر پھر سنبھل گیا ؛

خلفاء بنی فاطمہ میں پہلا خلیفہ المہدی۔ دوسرا القایم تیسرا المنصور۔ چوتھا المعز الدین اللہ۔ اِس خلیفہ کے کارنامے بہت مشہور ہیں۔ قاہرہ اسی خلیفہ کا بنایا ہوا ہے اور مسجد الاظہر بھی ؛ پانچواں العزیز۔ چھٹا الحاکم۔ خلیفہ المعز کی طرح الحاکم بھی نامور ہوا۔ ساتواں الظاہر۔ آٹھواں المستنصر۔ نواں۔ المستعلی باللہ دسواں الامیر احکام اللہ۔ گیارھواں الحافظ۔ بارھواں الظافر باعداللہ۔ تیرھواں الفایض باللہ۔ چودھواں العدیلہ ؛ العدیلہ پر بنی فاطمہ کی خلافت کا خاتمہ ہوگیا ؛

مختلف خلافتوں کا باعث زیادہ تر قومی خصائل تھا کہ پہلے تو عرب وعجم میں نقیض رہی پھر ان میں فرقہ بندیاں ہوئیں۔ اور مذہب وعقاید کی آڑ پکڑی گئی ؛ خالص اسلام تو عرب سے نکلکر مشکل تھا کہ اپنی اصلی حالت پر رہتا۔ مگر اسلام کی یہہ بڑی خوبی سمجھئے کہ

متضاد عقاید اور اقوام کو جزئیات میں اگر نہیں تو اصول میں ملا رکھا ؛ حلول و تناسخ ارواح اہل فارس کے عقاید قدیم میں داخل تھے ۔ اس سے سلطنت و خلافت میں جھگڑے پیدا ہو گئے ۔ مگر سب دائرۂ اسلام میں رہے ؛

دُنیا میں موت کا مسئلہ سخت ہے ۔ انسان سارے کمالات روحانی اور غیر روحانی کے بعد جب اس طرح مٹ جاتا ہے کہ پس ماندگان اور معتقدین روتے رہ جاتے ہیں تو اس خیال کے مٹانے کا علاج اور کیا ہو سکتا ہے کہ کسی طرح اُن بزرگوں کا اثر دل میں بنا رہے ۔ خاص کر جب کہ عقائد مذہبی کی وہ باتیں جو معمولی سمجھ سے باہر ہوں اور اُن پر ایمان لانا نجات کا باعث سمجھا جائے تو بزرگان دین کی واقعی یا خیالی زندگی کی ضرورت ہوئی اس لئے اکثر مذاہب میں روحانی تعلیم کے خیال سے سلسلۂ تعلیم کے لئے ہادیان دین کا بعد موت بھی زندہ سمجھنا انسانی طبیعت کے خلاف نہیں ۔ تاکہ وقتاً فوقتاً ذہنی مسائل کے سمجھنے اور سمجھانے میں تسلی رہے ؛ کوئی مذہب کم و بیش اس خیال سے خالی نہیں ؛ اس خیال سے کہ حق و ناحق میں امتیاز کرنے کا اور کیا طریقہ ہو سکتا ہے رہنمایان دین کا دُنیا سے ہمیشہ کے لئے علیحدہ ہونا ناگوار سمجھا گیا ؛ اسی خیال نے سلطنتوں میں بڑے انقلاب پیدا کر دئے ؛ خلیفہ الحاکم نے اپنے تئیں خدا کا اوتار ماننے کا اعلان کر دیا ؛ عقاید ہمدان الملقب بہ قرمطیہ ۔ پیروان مقنع ۔ حشیشین اور اور ایسے ہی خیالوں کے فرقے سلطنتوں اور خلافتوں کے زوال کا باعث ہوئے ؛ یہانتک کہ ایران میں اسوقت بابی عقیدہ کی بنیاد ایسے ہی خیالوں کا نتیجہ ہے اور ان سے پہلے داعی ایسے عقاید کی ترویج میں بہت مصروف رہے ؛ ان کی ہدایت کے لئے کتاب کتاب السیاسہ نامی علیحدہ لکھی گئی تھی ؛ اس میں درج تھا کہ بنی اُمیہ کے اہل عرب کے ساتھ سادات کی تعریف بہت نہ کرنا ۔ سابعین سے سات

اماموں کی مدح کرنا۔ بنی اسرائیل سے امام آخرالزماں کا ذکر کرنا۔ کہ قیامت کو حضرت عیسٰے یعنی مسیح کا جو انتظار ہے وہ یہی ہیں۔ عیسائیوں کو سمجھانا کہ فاراقلیط کا ابھی انتظار کریں۔ خلاصہ یہہ کہ اپنا اصلی عقیدہ صاف صاف اور علانیہ ہر ایک پر ظاہر نہ کرنا جب تک اپنے ہی عقیدہ کا آدمی نہ ملے۔ سنت جماعت کے سامنے خلفاء راشدین کی تعریف مناسب ہے ؛ اسے تقیہ سمجھنا چاہئے جس سے غرض اخفاء عقاید خود ہے ؛

بنی فاطمہ کی خلافت کا زمانہ قریب تین سو برس کے رہا۔ گو یہہ زمانہ از روئے نام و نمود خاصہ گزرا مگر اسلام کے لئے راس نہ آیا ؛ اس خلافت کا پہلا خلیفہ عبیداللہ الملقب بہ مہدی تھا۔ یہہ شیعیان حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی نگاہ میں گویا مسیح کا کام کر گیا۔ اس نے دیار مغرب میں ۳۰۳ھ ہجری میں مہدیہ نامی ایک شہر بنا کر اپنا پایۂ تخت قایم کیا ؛ سلطنتِ عباسیہ کے زوال کا آغاز اسی شخص سے سمجھا جاتا ہے۔ اس نے خلیفہ ہاروں رشید کے جرنیل اغلب نامی کو جو دیارِ مغرب میں خلافتِ عباسیہ کی طرف سے حکمران تھا تباہ کر کے اپنی سلطنت قایم کی ؛ اسکے بعد القایم نے خلافت عباسیہ اور خلافت قرطبہ دونوں کو ہلا دیا۔

آخر کو خود خلافتِ بنی فاطمہ سلطان صلاح الدین کے ہاتھ سے خلیفہ العدید کے عہد میں غارت ہو گئی ؛

اس مضمون کا ماخذ زیادہ تر ڈاکٹر ڈی لیسی اولیری صاحب کی تصنیف ہے جس کا نام انگریزی میں یہہ ہے :-

A short History of the Fatimid Khalafate.
(Trubner's Oriental Series.)

دلی کس نے بچائی

چند روز سے جو بحث لاہور میں جناب سرجان لارنس صاحب بہادر کی یادگار کا سنگین بت اپنی جگہ سے ہٹانے کی نسبت ہوئی وہ اخباروں میں حیرت کی نگاہ سے دیکھی گئی۔ حیرت کی وجہ یہ ہے کہ حضور ممدوح کے احسان جو پنجاب پر ہیں ان سے ایک زمانہ واقف ہے ان احسانوں کا اعتراف ہر ایک کے دل میں اثر پذیر ہے کہ ۵۷ء کے مفسدہ کا فرو ہونا جناب کے کارہائے نمایاں کا نتیجہ تھا۔ دہلی جو غدر کے بعد پنجاب میں شامل ہوئی اس کی دوبارہ زندگی کا باعث سرجان لارنس صاحب کی نظر لطف و اکرام تھی۔ سرجان لارنس صاحب کو نہ صرف پنجاب کا بچانے والا بلکہ ہندوستان کا بچانے والا سمجھتے ہیں۔ خاصکر دلی کا۔ یہ شہر (شاہجہان آباد) جو اس وقت موجود ہے اور پرانی دلیوں کی طرح کب کا فنا ہو گیا ہوتا۔ سرجان لارنس نے اس کو فنا ہونے سے بچالیا۔ اس وقت جو شاہجہان آباد کی رونق ہے۔ شاید شاہجہاں کے وقت میں بھی یہ بات میسر نہ ہوئی یہ صرف سرجان لارنس کی حمایت و رعایت کا نتیجہ ہے۔

صاحب ممدوح نے شاہجہان آباد اور شاہجہان آباد کے رہنے والوں کی حمایت و رعایت میں اس پر آشوب زمانہ میں جو کوششیں کیں ان کے ثبوت میں چند تحریروں کا خلاصہ منشی ذکاء اللہ خاں بہادر کی تاریخ ہند سے پیش کیا جاتا ہے۔ یہ مورخ غدر میں موجود تھے اور اکثر حال اپنی آنکھ سے دیکھا

سرجان لارنس صاحب نے جو اس وقت پنجاب کے چیف کمشنر تھے ۲۶ ستمبر کو جنرل ولسن صاحب کو لکھا کہ ×

× × "میں نہیں خیال کرتا کہ اگر شہر کے باشندے اپنے گھروں میں واپس آئیں تو آپ کو اس بات کا خوف پیدا ہو

کہ دہلی پر کسی طرف سے حملہ ہوگا۔ میں اُن تمام مصائب سے قطع نظر کرکے جو ان پر گزرے ہیں یہ کہتا ہوں کہ ہماری حکومت میں پچاس برس کے عرصہ میں کبھی انہوں نے سرتابی نہیں کی۔ اگر ہماری اپنی فوج نے غدر نہ مچایا ہوتا تو وہ اور پچاس برس تک خاموش رہتے"۔

× × × × × × × × × × ×

دہلی کے فتح ہونے کے دس روز بعد ہی صاحب ممدوح نے ۳۰ ستمبر کو برن صاحب ملیٹری گورنر کو دہلی کے لکھا کہ۔

"شہر کے باشندوں کی نسبت میری یہ رائے ہے کہ جب قلعہ کی محافظت کا بندوبست خاطر خواہ ہو جائے تو وہ رفتہ رفتہ حزم و احتیاط کے ساتھ اپنے شہر میں بلائے جائیں۔ نوّے فیصدی باشندوں کو اس غدر سے کچھ علاقہ نہ تھا اگر ان سے ہو سکتا تو یہ ہمارا ساتھ دیتے۔ بہت سے دلّی کے باشندے مجبوراً بغاوت کے ہنگامے میں جبراً نہیں گئے۔ ہم خود اپنی حماقت و ضعف کے سبب سے انکی محافظت کے قابل نہ رہے تو یہ الزام ہم پر عائد ہوتا ہے"۔

× × × ×

۶ر اکتوبر کو چارلس سانڈرس صاحب کمشنر دہلی کو لکھتے ہیں کہ:۔

"میری رائے میں مناسب شرطوں کے ساتھ شہر کے تمام باشندوں کو بلا لینا چاہیئے اب سب سے زیادہ تکلیف عاجز و بے قصور باشندوں ہی پر ہے"۔

۹ر اکتوبر کو لارڈ کیننگ کو لکھا کہ:۔

"میں خیال کرتا ہوں کہ دلّی کے باشندوں کو واپس آنے کی اجازت دینا ایک عمدہ پالیسی ہے۔ دلی عرصۂ دراز سے بڑی تجارت کی منڈی ہے اور پولٹیکل اور تمدنی لحاظ سے وہ ایک بڑا ضروری مقام ہے۔ ہر طرح سے اس پر قبضہ رکھنا اس کے برباد ہونے کی نسبت زیادہ مفید ہوگا۔ گو اس کے باشندے کیسے ہی قصوروار ہوں لیکن مجھے یقین ہے کہ کوئی شخص جو متعصب نہ ہو وہ اس امر سے انکار نہیں کریگا کہ دلّی کے باشندوں میں اکثر آدمی بغاوت میں شریک نہ تھے اگر ہم صاحبِ اختیار ہوتے تو ان میں سے اکثر آدمی ہمارے ساتھ ہوتے لیکن یہ معلوم ہے کہ وہ ایک ظالم بے رحم شتر بے مہار سپاہ کے اختیار میں تھے۔ ان پر بڑی مصیبت پڑی ہے اس واسطے یہ عمدہ پالیسی ہے کہ زندہ باشندوں کو اپنے گھروں میں بسنے کی اجازت دیجائے"۔

× × × × × × × × × ×

"بہت سے انگریز کہتے تھے کہ دلّی کی اینٹ سے اینٹ بجا دو۔ جن کا غصہ کچھ اُتر گیا تھا وہ کہتے تھے کہ جامع مسجد

کو گرجا بنا دو اس کے میناروں پر صلیب لگا دو اسکی سنگِ مرمر کی سلوں پر جو بہت سی ہیں۔ اس عیسائی کا نام کندہ کرو جو غدر میں شہید ہوا ہے۔ مسلمان کو مسجد کا دل سے دینا ایک جنون سمجھا جاتا تھا۔ جب پنجاب کے ذی اقتدار افسروں اور ان کے دلی دوستوں نے اور بعض نے اصالتاً حاضر ہو کر یہ دلیل بیان کی کہ دنیا میں دلی کی جامع مسجد سب سے زیادہ رفیع الشان ہے اس کے انہدام سے ہر مقام کے مسلمانوں کے مذہب پر ایک ضرب پڑے گی۔ تو انہون نے ــــ بہت نرمی و ملائمت سے دلائل کو بیان کیا جب دیکھا کہ اس کہنے کا کچھ اثر نہیں ہوتا تو وہ کھڑے ہوئے اور کہا بابا یہ رائے نہ دونگا ؛ بہت سے امور ایسے ہیں کہ جن کے لئے تم مُصر ہو سکتے ہو کہ میں ان کو کروں لیکن کبھی اس باب میں مجھ سے اصرار نہ کرنا بس مناسب ہے کہ آپ اس معاملہ میں اپنے تئیں تکلیف نہ دیں ؛

۴ ستمبر ۱۸۵۷ء کو لارڈ کیننگ کو اپنی چٹھی میں انہوں نے لکھا کہ :۔

"مجھے معلوم نہیں کہ لارڈ شپ نے دہلی کے باب میں کیا تجویز کی ہے اگر جناب اس کو شہر کی حیثیت سے قائم رکھنا چاہتے ہیں تو میرے نزدیک پرائز ایجنسی کی کارروائیوں کو روکنا چاہئے۔ میں کوشش کرتا ہوں کہ شہر میں سے مارشل لا موقوف کیا جائے۔ دلی کے لئے صرف ایک مستعد و جری نیک چلن سپاہی کی ضرورت ہے کہ وہ سپاہ کو اپنے اختیار میں رکھے اور ایک زبردست پولیس اور عمدہ مجسٹریٹ امن و امان قایم رکھے۔ جبتک ہندوستانی باشندوں کی جان و مال کی حفاظت نہیں کیجائیگی تب تک امن و امان قایم ہونا دشوار ہے۔ میں اس امر کی اصلاح کا بڑا خواستگار ہوں کہ جن لوگوں پر جرم ثابت ہو ان کو فوراً سخت سزا دی جائے لیکن جو لوٹ مار اس وقت برابر ہو رہی ہے اس سے یہ بات ضرور واقع ہونے والی ہے کہ رفتہ رفتہ ہندوستانی آشفتہ و برہم ہو جائیں اور ہمارے اور ان کے درمیان اس وقت جو رخنہ پڑا ہوا ہے وہ اور ہمیشہ کے لئے کشادہ ہو جائے ؛

اسی زمانے میں انہوں نے لارڈ الفنسٹن کو لکھا کہ :۔

اگر دہلی میں مارشل لا اور پرائز ایجنسی موقوف کر دی جائے تو بخوبی اصلاح ہو جائے" ؛ * * * *

اسی زمانہ میں جنرل پینی کو انہوں نے بڑے زور سے چٹھی لکھی ہے کہ :۔

اگر ہم سے اعلیٰ دماغی کی کارروائیاں نہیں ہو سکتیں تو معمولی پولیسی کے اعتبار سے بھی ہم پر لازم ہے کہ اپنے ہم وطنوں کو ظلم و تعدی سے باز رکھیں مجھ سے کوئی اور شخص زیادہ باغیوں اور قاتلوں کو پھانسی دینے اور گولی مارنے پر آمادہ نہ ہوگا لیکن

کرپاشنکر

[illegible]

جس وقت تک ہم دوست و دشمن میں تمیز نہ کریں گے اس وقت تک یہی کھٹکا رہے گا کہ سب ہندوستانی ہمارے مخالف ہو جائیں اور ہر ایک مقام پر گوناگوں بوقلموں لڑائیاں ہونے لگیں اور ملک رفتہ رفتہ ویران ہو جائے اور آخر کار اتنا گرم ہو جائے کہ ہمارا رہنا دشوار ہو جائے ؛

اس چٹھی کا اثر فوراً ہوا دوسری چٹھی میں وہ ایک ہفتہ کے بعد جنرل پنی کو لکھتے ہیں کہ :-

میں آپ کا بہت ممنون ہوں کہ آپ نے لوٹ مار کے روکنے میں بہت جلد کارروائی کی مجھے اس بات کے سننے سے نہایت افسوس ہوا کہ ہمارے ملک کے لوگ بے سبب ہندوستانیوں کو مار ڈالتے ہیں بن کے مجرم و بے جرم ہونے پر لحاظ کرنے کا اختیار ان کو نہ تھا ؛ جب انہوں نے دیکھا کہ یہ دلخواہ اصلاحیں نہیں ہوتیں تو وہ ۲۴ فروری سنہ ۱۸۵۹ء کو خود دہلی میں آئے اور یہاں آکر پہلا کام انہوں نے یہ کیا کہ دہلی کے کل خاص افسروں کو بلایا جن میں چارلس سانڈرس و فلپ ایجرٹن۔ نیوجیمبرلین اور بعض اور افسر تھے یہ چیف کمشنروں کی کارروائیوں کی بابت سر جان لارنس نے ملایم تقریر فرمائی کہ میں تسلیم کرتا ہوں کہ خاص حالتوں میں شر و فساد کے انسداد کی خاص تدابیر جائز تھیں لیکن پھر فرمایا کہ اب ان تدابیر کا زمانہ گذر گیا۔ اب تو اس بات کی ضرورت ہے کہ ہندوستانیوں میں امن امان قائم کیا جائے۔ اور ان کے دلوں میں اپنا اعتماد جمایا جائے اور اس کے ساتھ ہی انہوں نے لارڈ کیننگ سے بذریعہ تاربرقی استفسار کیا کہ جن افسروں کو پھانسی دینے اور رہا کرنے کا اختیار دیا گیا تھا انہوں نے اس اپنے اختیار کو بری طرح استعمال کیا فوراً ان کے اختیار سلب کرنے کی مجھے اجازت دیجائے ان کی جگہہ سول اور ملٹری حکام کو شامل کر کے ایک کمیشن مقرر کیا جائے جو مفسدہ کے مقدمات کی تحقیق کرے اور بلا منظوری گورنمنٹ کسی کو موت کی سزا نہ دینے پائے۔ پھر انہوں نے لارڈ کیننگ کو لکھا کہ میں نے مفسدہ اور بغاوت کے مجرموں کی تحقیقات کے لئے تین افسروں کے کمیشن مقرر کرنے کا بندوبست اس لئے کیا ہے کہ ہر ایک جوڈیشل افسر کو بذات واحد موت کی سزا دینے کا جو اختیار دیا گیا اس انتظام میں کوئی بہبودی نہیں پیدا ہوئی ؛ دہلی میں ان کے بڑے عزیز سکرٹری رچرڈ ٹمپل آگئے تھے انہوں نے ان سے کہا "کہ شہر میں بالکل امن امان ہے۔ خوف کرنے کی کوئی وجہ نہ تھی لیکن لوٹ مار و خونریزی اب تک جاری ہے ہندوستانیوں کے رنگ فق تھے اب بھی وہ کثرت سے گرفتار ہوتے اور اکثر پھانسی پاتے میں یا قید کئے جاتے ہیں ؛ غرض وہ مارچ کے تیسرے ہفتے میں اس سے روانہ ہو گئے اور مسلمانوں کو شہر میں آنے کی اجازت دے گئے اور جنرل کمانیر کو ان کی محافظت کے بندوبست کی تاکید کر گئے - دہلی کی مسجد منہدم نہیں ہوئی شہر کے باشندے آوارہ وطن نہیں ہوئے ؛

یہہ انتخاب و اقتباس منشی ذکاء اللہ خان بہادر کی تاریخ ہند صفحہ ۴۲۶ سے ۴۲۸ تک کیا گیا۔ اُن سے ثابت ہے کہ سر جان لارنس صاحب کے احسان ہمارے سروں پر کس قدر ہیں - ایسے محسن کے احسانات نظرانداز کرنا احسان فراموشی ہے ؛ یہہ مضمون مؤرخانہ ہے

دادِ صلائے عام

ماہ جنوری ۱۹۲۳ء

× × × × × × × × × × × × × × × ×

صلائے عام ماہ جنوری ۱۹۲۳ء ضخیم اور دلچسپ مضامین سے بھرا صادر ہوا۔ بے حد جی خوش ہوا۔ اب میں صلائے عام کی خوش قسمتی کہوں یا اس کے پڑھنے والوں کی۔ کہ نازک خیال وعالی دماغ مضمون نگاروں کی خوش بیانی ولطافت زبانی کا مخزن ہے۔ اور امر حق یہ ہے کہ آپکی بدولت ملک کو فیض پہونچ رہا ہے گھر بیٹھے فصاحت وبلاغت کے بھرے مضامین ہاتھ آتے ہیں جن سے معلومات میں ترقی ہوتی چلی جاتی ہے ؛

خان بہادر صاحب سچ جانئے کہ بشیر الدین احمد صاحب اول تعلقدار پنشنر سرکار عالی نظام نے بہت ہی پُر زور اور مدلّل مضمون لکھا ہے۔ ہم سب کو ان کا شکریہ ادا کرنا چاہیئے کہ غالب وشبلی مرحومین کی روحوں کو صدمات اعتراضات سے کیسا بچالیا۔ ایسے قابل لوگوں کی سُبکی ہم سب کو خاک میں ملا دینے والی ہے۔ بالخصوص جبکہ وہ خود خاک میں مل چکے ہیں ؛

تعلقدار صاحب نے جو تصویر کا دوسرا رُخ دکھایا ہے اس میں ثابت کر دکھایا ہے کہ ع گر یکے نیری داری وصد گونہ عیب ؛ دوست نہ بیند بجز آن یک ہنر۔ بالکل امر حق ہے۔ "کوہ کندن" میں تو فرہاد بازی لے گیا تھا مگر "موش بر آوردن" میں معترض صاحب نے کمال دکھلا دیا۔ بالآخر سارے مضمون کو پڑھ کر یہ عرض کروں گا کہ اُن بزرگوں کی حمایت جو ہم سے پہلے گزر گئے ہیں ہمیں بالیقین لازم ہے تاہم جواب ترکی بہ ترکی سے حتی الامکان اجتناب بہتر ہے کیونکہ ان باتوں سے ثقل طبیعت تو ضرور ہی جانبین میں پیدا ہو جاتا ہے اور وہی بہترین طریقہ ہے جس کے لحاظ سے تعلقدار ممدوح خاتمہ مضمون پہ لکھتے ہیں کہ ع شکوہ اچھا ہے کسی کا نہ شکایت اچھی ؛ اپنے گھر آپ بھلے اپنی حکایت اچھی ؛

فی الحقیقت یہ معرکہ آرائی کا مضمون تھا جو لائق نامہ نگار کی قلم سے بے ساختہ پنے سے نکل گیا اور جب دل جلے تو کیا کرے۔ اور یہ بھی بالکل سچ ہے کہ ؎

مضمون اعتراضی محمود خان والا ٭ تشنیع سے بھرا ہے کہتے ہیں اسکو غیبت ٭ غیبت بہت بری ہے اس سے خدا بچائے
سنتے ہیں ہو کبیرہ یہ از رہ شریعت ٭ زیبا نہ تھا کہ ناحق شبلی پہ حملہ کرتے ٭ اور اعتراض کرنے سب پوچ ہے حقیقت
گر اعتراض کچھ تھا تو زندگی میں کرتے ٭ مرنے کے بعد ہرگز زیبا نہ تھی فضیحت

سیر کوہ طور بڑا پیارا مضمون لکھا گیا ہے۔ اب میں اسکی داد دوں تو کیا دوں۔ کچھ بن نہیں پڑتی اور یہ کہکر خاموش ہوتا ہوں ؎

اُردو کے لکھنے والے عارف تمہیں نکیں ٭ ناصر علی کی اُردو اُردو ہے فی الحقیقت

مرزا عرفان علی بیگ آئی۔ ایس۔ او
ڈپٹی کلکٹر پنشنر۔ آنریری مجسٹریٹ آگرہ

کلام جناب یاس لکھنوی

ٹھوکریں کھلوائیں کیا کیا پائے بے زنجیر نے ٭ گردش تقدیر نے جولانیِ تدبیر نے
کارواں کتنے بگولے بن کے غائب ہو گئے ٭ خاک سے یکساں کیا جولانگہ تدبیر نے
عالم اسباب سے کیا فیض ناکامی ملا ٭ راہ پر لا کر مجھے بھٹکا دیا تقدیر نے
داد خواہی کو اُٹھا ہے ذرۂ پامال تک ٭ سوتے فتنوں کو جگایا حشر عالمگیر نے
ماتم حسرت کیا پہلے گریباں پھاڑ کر ٭ پھر دُعا دی دشمنوں کو دست بے شمشیر نے
جان دے کر ایک حکم آخری مانا تو کیا
لکھ دیا جب سرکشوں میں کاتب تقدیر نے

ع - باز آمدم کہ سجدۂ آن خاکپا کنم

مکرمی خان بہادر - جنوری کا صلائے عام ناظورۂ پری جمال بنکر چشم مشتاقان کے لئے برق تجلی بن گیا - اس مرتبہ سارے مضامین اچھے رہے - آپ کے مضامین کی داد تو خاموشی ہی دے سکتی ہے - مرزا محمد علیخاں صاحب نے مسلمانوں کے علم و فضل کی تحقیق میں نہایت زبردست اور جامع مضمون لکھا - جس کے لئے وہ خاص داد کے مستحق ہیں ؛ میرے خیال میں تھا کہ اس مضمون پر قلم اٹھاؤں - مگر سہل انگاری نے ارادہ ملتوی رکھا - مرزا صاحب نے اس ضرورت کو رفع کر دیا - اور مجھسے بہتر میری منشا کے موافق اس کام کو انجام دیا - آج عرصہ کے بعد صلائے عام کے لئے کچھ خامہ فرسائی کی گئی ہے - جو چھوٹی بھولی مشق کی وجہ سے اس پایہ کی تو نہیں کہ اسکو مضمون کہا جا سکے مگر ہفوات ضرور ہے - اُمید کہ آپ صلائے عام کا دیرینہ خادم سمجھکر میری ناچیز تحریر کو شرف قبولیت عطا فرمائیں گے -

نیازمند میر ضیا دہلوی -

ہرچند پیر و خستہ دل و ناتواں شدم ؛ ہرگہ نظر بروئے تو کردم جواں شدم

مدت ہوئی کہ شعر شاعری اور نثر نگاری کا شوق نذرِ افکارِ دنیوی ہو گیا - اب چہ خورم صیف و چہ پوشم شتا ہی کی اُدھیڑبن لگی رہتی ہے - دوسرے تقاضائے عمر سے دل میں وہ ولولے اور اُمنگیں کہاں جن سے شباب کا جنوں زور پر تھا - اچھی صورتوں سے علاقہ تو درکنار خیالی واسطہ بھی باقی نہ رہا - پھر رنگینیٔ طبع کا سامان کیونکر مہیا ہو اور صفحات اخبار و رسائل پر گلکاری کس طرح کی جائے - اب تو ہم بقول سعدی شعر مندرجۂ ذیل کے مصداق ہیں - ؎

رسم است کہ مالکان تحریر ؎ آزاد کنند بندۂ پیر- علاوہ ازین ہم صفیروں کی نوا سنجی بھی یک قلم موقوف ہے۔ نہ ریاض الاخبار میں حضرت ریاض گل کھلاتے ہیں اور نہ حکیم برہم فتنہ میں بہار افزائی فرماتے ہیں- ایم۔ مہدی حسین صاحب الٰہ آبادی دائرہ ادبیہ میں ایک دو قسط بھیجکر سبکدوش ہو گئے دلگیر دل گرفتہ ہوکر اکبرآباد جا بیٹھے۔ ہماری طرح سارے ہمنوا گوشۂ عزلت میں اس طرح چھپ گئے کہ انکی صدائے بازگشت سے کان آشنا نہیں ہوتے- سچ مچ یہی صورت ہوگئی ؎

اسیر آکے ہوئے سارے ہمصفیر جلال ؎ قفس کو خوب پھلے موسم بہار میں ہم

ایسی حالت میں صلائے عام کے لئے کچھ لکھنا اور وہ بھی اس رنگ خاص میں لکھنا جس کے ہم ہمیشہ سے عادی رہے ہیں فرہاد کی تیاری جوئے شیر سے کم نہیں۔ اس پر طرہ ناقدری ابنائے زماں- بقول جناب عزیز ؎ دنیا کا خون دورِ محبت میں ہے سفید- آواز آرہی ہے لب جوئے شیر سے دن کیا مہینے گزر جاتے ہیں اور قلم کو جنبش نہیں ہوتی- صلائے عام کے چار نمبر پہونچ چکے ہیں ان کے مطالعہ سے دل میں سرور اور آنکھوں میں نور پیدا ہوا- طبیعت نے خامہ فرسائی کا عزم کیا مگر وہ عزم حسینوں کا پیمانِ وفا بنکر رہگیا- جنوری کے صلائے عام میں سیر کوہِ طور کے عنوان سے جو مضمون درج ہوا ہے اور جس میں نامہ نگار پائیر کے اقتباسی واقعات شامل ہیں وہ دلِ پُر ارمان کو برقِ تجلّی کی جھلک دکھا گیا- شوق کی دبی ہوئی چنگاری دل میں بھڑک اُٹھی- ارنی و لن ترانی کا سماں آنکھوں میں پھرنے لگا- جی میں آیا کہ وادی ایمن کو جلوہ گاہِ ناز سمجھکر داد خوش بیانی دی جائے- صاحبِ صلائے عام کا یہ اجتہاد کہ حضرت موسٰے کی آرزوئے دید کو بجائے ارمان کے ہوس کہا ہماری نظروں میں کھٹک گیا۔ ع کچھ فرق ہو رہیگا ارمان اور ہوس میں۔ کتبِ مقدسہ سے ثابت ہے کہ کلیم اللہ کی یہ آرزو ایک حد تک پوری ہوئی- طور پر برقِ تجلی نے ایک جھلک دکھائی جس سے حضرت موسیٰ بیہوش ہوکر گر پڑے اور طور جلنے لگا- پھر اسکو ہوس کہنا بالکل ناروا ہے۔ مگر صلائے عام چونکہ ادبی رسالہ ہے اسواسطے بحث مباحثہ اور مناظرہ سے قطع نظر کرکے ہم وادیٔ ایمن کے عنوان سے چند سطور حوالۂ قلم کرتے ہیں۔ ارادہ ہے کہ اس عنوان سے کچھ عرصہ تک

اظہارِ خوش کلامی کیا جائے۔ فارسی اور اُردو شاعری میں اس مضمون کی وہ کثرت ہے اور اسی میں ایسی ایسی نازکخیالیاں موجود ہیں کہ جن سے چشم نکتہ بیں بہت کچھ لطف اٹھا سکتی ہے۔ صاحب صلائے عام نے بھی مضمون کے اخیر میں واقعۂ طور و موسیٰ کے متعلق چند اشعار نقل کئے ہیں ہم اس سلسلہ کو ابھی جاری رکھنا چاہتے ہیں۔ ؎

نہ کھینچو جگر سے کٹاری ابھی ؛ مزہ دیتی ہے بیقراری ابھی

نئے ناقوس میں پھونکی ہے جس نے روح وہ مئے معنی ؛ ابھی موجود ہیں اہل کلیسا دیکھنے والے ؛

راقم میر ضیا دہلوی

از کلام برہمن

باشمع روئے دوست بافسانہ ساختیم ؛ چو شمع سوختیم چو پروانہ ساختیم

باصد زباں زبانِ خموشی نکو بود ؛ باپیچ و تابِ زلفِ تو چوں شانہ ساختیم

آباد باد ملکِ مروّت کہ ما بخویش ؛ در کنج غم چو گنج بویرانہ ساختیم

با ما نہ ساخت قاعدۂ عقل دوربیں ؛ فارغ شدیم و با دلِ دیوانہ ساختیم

ناآشنا شدیم برہمن بہ خویشتن ؛ باآشنائی دلِ دیوانہ ساختیم

صلائے عام۔ یہ کلام فارسی میں اس غرض سے سناتا ہوں کہ غیر زبان میں ہندوستان کے ایک بیگانہ از اسلام نے کسقدر پاکیزہ زبان پیدا کی۔ فارسی تو درکنار اب اچھی اُردو کے بھی لالے پڑ گئے ؛ برہمن کی دوسری غزل اور سن لیجئے۔ کتنا پاکیزہ کلام ہے :-

بہار آمد نظر از جامِ صہبا مے تواں گفتن ؛ سخن گر نشود ساقی بمینا میتواں گفتن

شکایت ہا ز عقلِ ذوفنوں پیشِ جنوں دارم ؛ ز ناداں ہرچہ پیش آید بدانا میتواں گفتن

تو بر ساحل کجا از شورشِ دریا خبر داری ؛ بہ غواصی سخن از قعرِ دریا مے تواں گفتن

بہر دل نیک نتواں گفت غمہائے محبت را ؛ اگر در دل نمی گنجد بصحرا مے تواں گفتن

کر چوں خراب شود قابلِ بنا گردد ؛ تو خود بچشم خرد بیں کہ استخواں از سگ ؛ اگر خلاص شود طعمۂ ہما گردد ؛

دل نتواں ساخت منظرِ جاناں ؛ کجا بہ آب و گِل اے غافل ایں بنا گردد ؛ درین معاملہ سرّے است ورنہ در معنی کدام خانہ کہ شایان کبریا گردد

وادی ایمن

شبانِ وادیٔ ایمن گہے رسد بہ مراد ٭ کہ چند سال بجاں خدمتِ شعیب کند

لسان الغیب خواجہ حافظ شیرازی نے شعر مندرجۂ عنوان میں اُن ابتدائی واقعات کا خاکہ کھینچا ہے جو حضرت موسیٰ کو سیرِ کوہِ طور سے پہلے رو براہ ہوئے۔ کئی برس تک آپ نے حضرت شعیب اپنے خسر کی بکریاں چرائی تھیں اور کوہ طور کی وادیوں کو چل پھر کر اچھی طرح دیکھا بھالا تھا۔ اس واقعہ کا مختصر حال قرآن مجید میں بھی مرقوم ہے۔ اور توریت میں تو اس اجمال کی تفصیل ہی ہے یہ زمانہ حضرت موسیٰ کے لئے خاص ذوق و شوق کا تھا۔ عشقِ الٰہی و محبت خداوندی کے شعلوں سے اُن کا دل خوب مشتعل ہو چکا تھا۔ ارنی و لن ترانی کے سوال و جواب نے شوق کی آگ کو اور بھی بھڑکا دیا تھا۔ جلوۂ یار کی دید کے لئے اصرار کر بیٹھے نتیجہ جو کچھ ہوا۔ آج تک زبانوں پر ہے۔ ؎

موسے پڑے ہیں غش میں تڑپتی ہے برق طور ٭ پردہ تمہارے رُخ سے کہیں اُٹھ گیا نہ ہو

جس شعر کا حوالہ جناب خاں بہادر نے اپنے مضمون میں دیا ہے اور جس میں تجلی کو سنہری لکیر سے تشبیہ دی گئی ہے۔ وہ عزیزؔ لکھنوی کا یہ مشہور شعر ہے ؎

دعوائی تو تھا بہت ارنی گوئے طور کو ٭ ہوش اُڑ گئے ہیں ایک سنہری لکیر سے[1]

یہ جدت طرازی جناب عزیزؔ کو خاص داد کا مستحق بناتی ہے۔ بجلی کو سنہری لکیر خوب کہا اس تشبیہ میں واقعیت زیادہ ہے اور مبالغہ بالکل نہیں۔ مرزا رفیع السوداؔ جو متقدمین شعرا میں ممتاز شاعر مانے گئے ہیں اور جن کی سخن گوئی ایک عالم سے خراجِ تحسین وصول کر چکی ہے یوں زمزمہ سنج حقیقت ہیں ؎ ہر سنگ میں شرارہ ہے تیرے ظہور کا ٭ موسیٰ نہیں جو سیر کروں کوہ طور کا۔

مرزا سوداؔ اگر اس زمانہ میں ہوتے تو سیر کو مذکر نہ لکھتے بلکہ اور کوئی لفظ غرم یا اسکے مثل نظم فرما دیتے

[1] سیرِ کوہ طور میں اس شعر کے مضمون کا حوالہ ہے۔ جنوری سنہ رواں کا صلائے عام ملاحظہ فرمایا جائے۔

مگر اُس زمانہ کی زبان یہی تھی۔ پتھر میں شرر اور اسکی چمک میں کسی کے جلوہ کی جھلک معرفت مبنی کا خاص رنگ پیش نظر کرتے ہیں عوام جس سے ہرگز ہرگز آشنا نہیں۔ مرزا غالب فرماتے ہیں ؎

گرنی تھی ہم پہ برقِ تجلی نہ طور پر ٭ دیتے ہیں بادہ ظرفِ قدح خوار دیکھکر

اس شعر میں شاعرانہ شوخی سے اُنہوں نے مبدء فیاض پر اعتراض کیا ہے۔ اسی مضمون کو امیر مینائی نے ادب کا جامہ پہنا کر اعتراض سے بری کر دیا ہے۔ اور اسکی خوبی دوبالا ہو گئی ہے۔ مضمون اقتباسی ہے مگر ادائے بیان میں جدت نے عجیب لطف پیدا کر دیا ہے۔ ؎

اے برقِ حسنِ یار یہ کیسا ظہور تھا ٭ دیدار کو کلیم تھے جلنے کو طور تھا

کلیم لطفِ دیدار اُٹھائیں اور غریب طور جل کر خاک ہو یہ معمّا سمجھ میں نہیں آتا۔ اس راز سے عالم اسرارِ خفی جلی ہی خوب واقف ہے۔ دوسرا شعر ملاحظہ ہو۔ ؎

اب کون اُٹھ کے جائے تری جلوہ گاہ سے ٭ اُو شوخ چشم پھونک دے برقِ نگاہ سے

اس میں بھی واقعۂ طور کی طرف کنایہ ہے۔ غلبۂ عشق و محبت اتنا تو ہو کہ عاشق پروانہ وار جلے اس سوختگی کی لذت بقول سعدی پروانہ ہی کو حاصل ہے۔ مُرغِ سحر اس سے ناآشنا ہے۔ کاں سوختہ را جاں شد و آواز نیامد۔ دیگر ؎ موسیٰ سی کہہ دو طور پہ جایا کریں نہ روز ٭ اچھی نہیں ہیں برق جمالوں کے سامنے ایک دفعہ کے سامنے نے تو یہ گل کھلایا۔ بار بار کی برق تجلّی ایک عالم کو پھونک کر رکھدیتی۔ سیر کوہِ طور کے مضمون نے (مطبوعہ صلائے عام جنوری سنہ رواں) قدیم یادگاروں کا تذکرہ کرکے یہ ثابت کر دیا ہے کہ طور و موسیٰ کا واقعہ محض افسانہ نہیں بلکہ اہل کتاب کے عقیدہ کے موافق واقعیت پر مبنی ہے۔ کوہِ طور پر اب بھی پرانے نشانات اس بات کا ثبوت دے رہے ہیں کہ حضرت موسیٰ وہاں پہنچے تھے اور انکو برق تجلی کی جھلک نے بیہوش کرکے گرا دیا تھا۔ وادیٔ ایمن میں حکم فاخلع النعلین کا اتباع آجتک اس دیر کی زیارت کے وقت کیا جاتا ہے۔ جناب عزیز لکھنوی نے اپنے ایک قصیدے کی تشبیب میں جہاں طور و موسیٰ کا واقعہ نظم کیا ہے وہاں یہ شعر بھی لکھا ہے جو وادیٔ ایمن کے واقعات کا ہو بہو نقشہ کھینچتا ہے ؎

اسی وادی میں حکم فاخلع النعلین آیا تھا ٭ کہاں تھا کچھ یہیں ہوسے سے برقِ طور نے ہنسکر۔ ایمن کے نقوش

ماہی مراتب

ماہی مراتب کا نام شاہان مغلیہ کے منصب دار سرداروں کے تذکرہ میں پڑھا ہوگا بہت لوگ نہیں جانتے ہوں گے کہ کیا شئے تھی - اصل میں ایران کے بادشاہ خسرو پرویز نے ایک بڑی مصیبت اٹھائی بعد جب اپنے آبائی ملک کا قبضہ کیا تو بہت بڑی خوشی اور جشن کامرانی کا موقع پیش آیا اُس وقت نجوم کے قاعدہ سے چاند برج ماہی میں تھا پس ایرانیوں نے اسکو نیک فال سمجھ کر یہہ کیا کہ بڑے منصب داروں کے نشانوں پر چاند اور مچھلی کی شکلیں بنوائی تھیں - شاہانِ مغلیہ سلے بھی اپنے سرداروں کے واسطے اسکو عزت کا نشان جانا اور اُنکو ماہی مراتب دیا جانے لگا مگر پانچہزار کے تنخواہ داروں سے کم مرتبہ والوں کو یہ نہیں دیا جاتا تھا آخر میں چاندی سے ایک مچھلی بنائی جاکر اُسکے مونہہ میں چاند کی شکل آویزاں کی جاتی تھی اور مچھلی ہاتھی کے ہودہ پر ایک جانب اس طور سے آویزاں کی جاتی تھی کہ جب ہاتھی آگے پاؤں رکھتا تھا تو چاند دہنِ مچھلی میں دیکھنے والوں کو نظر آتا تھا پھر ہاتھی کی حرکت سے اندر ہو جاتا تھا -

میں نے مچھلی ڈھائی گز قد کی اور چاند سرخ مخمل کا گول آٹھ اِنچ قطر کا دیکھا ہے اگر میری یاد غلطی نہیں کرتی تو میں نے بچپن میں اسی طرح ہاتھی پر دیکھا تھا (مرزا محمد علی - الملقب بہ خاں صاحب)

ماہی مراتب میں ماہی یعنی مچھلی سے مناسبت کے متعلق مجھے خیال ہوا کہ لکھنؤ کی سلطنت کے نشان میں مچھلی کی تصویر کو زیادہ دخل دیکھنے میں آیا - اسکا سبب یہ بیان کیا جاتا ہے کہ نواب سعادت علیخان نواب وزیر صوبہ اودہ - نوابی سے پہلے سپاہی کی حالت میں دریا کے کنارے پانی پینے کو جھکے اسوقت ایک مچھلی پانی سے اُچھل کر انکی گود میں آگئی یہ امر انکے اقبال کا شگون سمجھا گیا اور سلطنت اودہ کے سکوں اور عمارات پر دو مچھلیوں کی تصویر کا رواج ہوا ٭ مچھلی نیک شگون زمانۂ قدیم سے سمجھی جاتی ہے - سفر کے وقت خانگی رسم ہے کہ گھر سے

قلعۂ چتوڑ

تمام ہندوستان کے قلعوں میں چتوڑ ملک میوار کا قلعہ اپنی خوبیوں کے اعتبار سے بہت ممتاز ہے بقول ایک انگریز سیاح کے۔ اس قلعہ میں بہت سی خوبیاں ہیں۔ اول تو بہت وسیع ہے دوسرے ایسی بلند خوبصورت پہاڑ پر واقع ہے جسکے دامن کی چھوٹی بڑی چیز صاف نظر آتی ہے تیسرے کوئی مقابل پر ایسا پہاڑ نہیں ہے جس پر غنیم کو اس قلعہ سے مقابلہ کرنا آسان ہو۔ چنانچہ اکبر جلال الدین کو بھی مشکل پیش آئی تھی اُسنے بذریعہ سلامت کوچہ کے ایک بلند ٹیلہ بنایا تھا۔ چوتھے پانی کے چند تالاب ہونے سے پانی کی کمی کا اندیشہ نہیں ہے۔ زراعت بھی ہوتی ہے جو ایک حد تک ضرورت پر مدد دے سکتی ہے۔ سُنا ہے کہ شورہ کوئلہ گندک بھی اس پہاڑ سے مُیسّر آسکتا ہے جو بارود بنانے میں قلعہ والوں کے واسطے ضروری چیز ہے یہ قلعہ چھٹی صدی عیسوی کی یادگار ہے۔ اس کو راجہ چترنگ موری نے تعمیر کیا تھا۔ اودے پور سے ۶۵ میل جانب شمال و مشرق۔ اور نصیر آباد سے ستو میل جانب جنوب واقع ہے اصلی نام اس قلعہ کا چترکوٹ یعنی تمام قلعوں کا سرتاج۔ تھا کثرت استعمال سے چترکوٹ کا چتوڑ ہوگیا۔ بڑی مدت تک مہارانا صاحب اودے پور کا دار الریاست رہا ہے ۱۳۰۳ء میں اول مرتبہ علاء الدین محمد شاہ خلجی نے راول رتن سے فتح کرکے مارواڑ کے راجہ کو دیا تھا کچھ عرصہ بعد رانا صاحب نے لے لیا۔ دوبارہ ۱۵۲۶ء میں مہارانا بکرمادت سے بہادر شاہ گجراتی نے چھین لیا۔ پھر مہارانا بکرمادت نے قبضہ کرلیا ۱۵۶۸ء میں جلال الدین اکبر شاہ نے چار ماہ کے کامل محاصرہ کے بعد مہارانا اودے سنگھ کے ماتحت سرداروں سے لڑکر لے لیا جیمل سردار قلعہ دار اکبر کی بندوق سے مارا گیا اور جوہر ہوا یعنی قلعدار کے مرنے پر بہادر راجپوتوں نے اپنے زن و بچہ آگ کی نذر کئے اور خود زعفرانی لباس پہن کر اکبر کی فوج کا مقابلہ کیا۔ کہتے ہیں کہ جوہر دیکھکر لشکر شاہی میں تردد

پیش آیا کیونکہ جان بکف راجپوتوں سے مقابلہ آسان نہ تھا۔ اس واسطے اکبر کے وزیر نے یہہ صلاح دی کہ راجپوتوں کو میدان میں پھیلنے نہ دو جس قدر جلد ہو سکے دروازہ پر جا لو چنانچہ ایسا ہی ہوا تاہم ایک بڑا رن پڑا خون کے نالے بہہ گئے ایک ایک راجپوت نے اپنے دل کا حوصلہ نکالا اور مردانہ وار جان دی۔ فتح سنگہ سردار نے جسکو فتا اور مورخوں نے پتا لکھا ہے قلعہ کے راستہ میں سخت زخمی ہوئے بعد ادھر اودھر دیکھا کیونکہ پاؤں بیکار ہو گئے تھے۔ ایک رشتہ دار نے دریافت کیا کہ کیا دیکھتے ہو جواب دیا کہ ارمان رہا جاتا ہے پاؤں بیکار ہوئے مگر ہاتھ کام دے رہے ہیں اُس نے کہا کہ میرے اوپر سوار ہو لو کہا کہ اچھا پھر دونوں نے اس قدر تلواریں ماریں اور دور تک لڑتے آئے کہ سب کو حیرت ہوئی۔ آخر یہہ بہادر سردار ہاتھی کی سونڈ میں لپیٹنے سے مارا گیا۔ خلاصہ یہہ کہ ڈیڑھ سو برس تک اس فتح کے بعد قلعہ بہ حالِ خود ویران رہا۔ بعدہٗ محمد شاہ بادشاہ کے عہد میں پھر مہارانا نے قبضہ کر لیا۔ اس وقت شاید مہارانا سنگرام سنگہ کا زمانہ تھا۔ پھر اب تک بدستور اُن کی اولاد کے قبضہ میں ہے۔

اس قلعہ کا پہاڑ ۳۰۰۰ ہزار فیٹ بلند ہے طول ۳ میل اور عرض مشرق سے مغرب سوا دو میل۔ یہہ قلعہ دور سے بہت خوش نما معلوم ہوتا ہے اس قلعہ کے ایک بعد دوسرے کے ۳ دروازے ہیں مشرق میں ایک چھوٹا دروازہ اور بھی ہے۔ اس قلعہ میں دو منارے بنے ہوئے ہیں۔ ایک بہت بلند اور خوب صورت ہے۔ اسکو مہارانا کو بنہا نے فتح کی یادگار میں جو اُسے محمود خلجی پر حاصل ہوئی تھی درمیان پندرھویں صدی عیسوی کے بنایا تھا۔ ایک عمارت اس میں گیارہ سو برس کی تھی جس کا بڑا حصہ منہدم ہو چکا ہے۔ ضرورت کے لحاظ سے اس قلعہ میں اکثر مکانات بنے ہوئے ہیں۔ اور بعض پدمنی کے نام سے مشہور ہیں۔ راقم نے اس قلعہ کو اندر باہر سے اچھی طرح دیکھا ہے۔ میرے دوست ٹھاکر جگناتھ سنگہ جی ایک زمانہ میں اس قلعہ کے حاکم تھے اُنہوں نے میری دعوت اس قلعہ کے پہاڑ کے دامن پر جہاں قدرتی پانی پہاڑ سے جاری تھا دہاں کی تھی سارا دن لطف سے گذرا تھا۔ جزوی حالات

قلم انداز کر دیئے گئے کہ طول ہوتا۔ فی زمانہ مہارانا صاحب بہادر رئیس حال نے اِس قلعہ کی بہت کچھ مرمت کرائی ہے۔ کیونکہ آثار قدیمہ میں یہہ قلعہ سب سے بڑی یادگار ہے۔

مرزا محمد علی خاں۔ سابق ممبر کونسل ریاست ٹونک

صلائے عام۔ یہہ قلعہ زیادہ تر پدماوت کے معرکہ کی وجہ سے تاریخ میں بہت مشہور ہے۔ تاریخ کے سوا افسانہ کے طور پر بھی اِس سے زیادہ دلچسپ کوئی مضمون نہیں کہ ہندی اُردو۔ فارسی میں اسکے متعلق کثرت سے مثنویاں لکھی گئیں ؛ اس معرکہ کی تصویریں لاجواب دیکھنے میں آئیں۔ ایک تصویر اُس موقع کی میرے پاس ہے جس میں رانی کا آئینہ میں اپنی شکل کا عکس میں دکھانا دکھایا گیا ہے۔ یہہ موقع مؤثر خانہ سمجھا جاتا ہے

کلام جنابِ یاس لکھنوی

نیش دردو نوش درماں برنتابد ہر دلے ؛ زیست مشکل مرگ آساں برنتابد ہر دلے ؛ جلوۂ شام غریباں برنتابد ہر دلے
منزل ہر رنگ زنداں برنتابد ہر دلے ؛ خوش سر و کارے مرا با درد سر افتادہ است ؛ غمزۂ ناخواندہ مہماں برنتابد ہر دلے
از خزاں آباد عالم خویش را دزدیدہ ایم ؛ رنگ بوے ایں گلستاں برنتابد ہر دلے ؛ گریہ در بہار پر خلش آسودہ نتواں زیستن
خار در پیراہن جاں برنتابد ہر دلے ؛ دست و پا گم گشتہ از اندیشۂ تعبیر ید ؛ یاد از خواب پریشاں برنتابد ہر دلے
العطش اے ساقی خمخانۂ غم العطش ؛ نشۂ عیش پشیماں برنتابد ہر دلے ؛ تہمت راحت کشم در منزل واماندگی
پا بہ گل۔ سر در گریباں برنتابد ہر دلے ؛ منزل موہوم ما را پا بجولاں می برد ؛ خاک بر سر بے سر و ساماں برنتابد ہر دلے
بہرہ از عقل جو یا فیضے از دیوانگی ؛ پند پیر و سنگ طفلاں برنتابد ہر دلے ؛ دود نیخ خود را ہمیشے سازم از اعجاز عشق
جائے گل آتش بداماں برنتابد ہر دلے ؛ یاس آمیدے از لکھنو فکر محال ؛ در گروہ نامسلماں برنتابد ہر دلے

مشغلہ کی ضرورت

خدا کے بندے ایسے بھی جابجا ملیں گے جو اپنی زندگی محض کھانے پینے کے لئے وقف سمجھتے ہوں گے۔ اور اکثر دولتمندی کے ساتھ وہ انسان ملیں گے جنکو دولت کے بوجھ سے کسی قسم کی مصروفی ہلکا نہیں کر سکتی لیکن کیا اُنکے دلوں میں خیالات جنبش نکرتے ہونگے۔ یا بیقدر خیالات کا ہیجان ہوتا ہوگا اور وہ اس قدر پریشانی میں ڈالتا ہوگا کہ کچھ بھی کرتے دھرتے نہ بنتا ہوگا۔ جو لوگ تعلیم یافتہ ہیں اُن کے واسطے تو سخت مصیبت کا سامنا ہوتا ہوگا۔ کیونکہ جاہلِ مطلق بھی تو بغیر خیال جمائے کوئی جنبش نہیں کرتے۔ اور یہی خیال باعثِ مصروفی ہوتا ہے لیکن فرق یہہ ہے کہ اگر کسی خیال کی پابندی ہے تو اوقاتِ زندگی میں مصروفی بایقین ہے اور اگر وہ مصروفی کارآمد ہے تو زندگی بھی کارآمد ہے۔ اور عقلی دلیل یہہ کہتی ہے کہ ع درکم زخودی تکیہ کن و شادبزی لیکن اگر خیالات کا ہجوم ہے اور کسی ایک خیال پر مصروفی نہیں ہے تو پریشانی ہر وقت دامنگیر اور عمر کی کوتاہی بالائے سر موجود رہتی ہے پس اچھی مصروفی تو یہہ کہتی ہے کہ؎

گر یک نفست ز زندگانی گزرد ۞ مگذار کہ جز بہ شادمانی گزرد ۞ زنہار کہ سرمایہ ایں ملک جہاں ۞ عمرست چناں کش گزرانی گزرد ۞ (عمر خیام)

اس میں کیا شک ہے کہ جتنی عمر بدی ہوئی ہے اُتنا جینا پڑے گا خواہ وہ کسی حال میں ہو مصروفی ہو تو بھی اور پریشانی ہو تو بھی لیکن جب خدا نے سمجھ دی ہے اور ہاتھ پاؤں دئے ہیں تو مصروفی کے ساتھ عمر کا کاٹنا لطف زندگی کا اُٹھانا ہے۔ دولت مند اپنی طرز اور انبساطِ خاطر کا شغل اختیار کر سکتے ہیں اور مفلس اپنی طرز پر چل سکتے ہیں اور دونوں قسم کے انسان یعنی امیر و غریب اپنے اپنے خیال میں خوش رہ سکتے ہیں۔ انسان اگر کسی شغل میں مصروف نہیں ہے

تو وہ بیکار ہے۔ اور کسی کی نظر میں اُس کا وزن ایک پتھر کے برابر بھی تو نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ پتھر اپنی شکل میں کام دیتا ہے اور بے شغل انسان کوئی کام نہیں دیتا۔ اور اسکی زندگی بالکل عبث ہے گو ایک نہ ایک دن با کار اور بے کار سب ہی کو مرنا ہے ؎

از دفتر عمر پاک می باید شد ٭ در دست اجل ہلاک می باید شد

ایک عمدہ تمثیل با شغل اور بے شغل زندگی بسر کرنے کی قید خانہ کی زندگی ہے اُس میں دو قسم کے قیدی رکھے جاتے ہیں ایک تو وہ جن سے مشقت لی جاتی ہے اور ایک وہ جو بلا مشقت کے قیدِ محض میں رہتے ہیں۔ ان دونوں قسموں کے قیدیوں کی زندگی پر اگر غور کیا جاوے تو وہ قیدی جو با مشقت قید میں رہتے ہیں بمقابلہ قیدِ محض میں رہنے والوں کے اچھی زندگی بسر کرتے ہیں اور اُن کو وہ پریشانیاں ہرگز نہیں گھیرتیں جو قیدِ محض کے زندانیوں کو گھیرے رہتی ہیں البتہ ایک نعم البدل اُن لوگوں کو ضرور ہے جو شاعرانہ طبیعت رکھتے ہیں اور جو ہر وقت اپنی دُھن میں لگے رہتے ہیں اُن کے خیالات اُنکے واسطے بجائے پریشان کرنے کے دل بستگی پیدا کرتے رہتے ہیں۔ جو ایک دماغی مصروفی با کار ہے۔ ہاں ایسے قیدی کسی قدر اُن قیدیوں کے ہم عصر بلحاظ ایام گزاری کہے جا سکتے ہیں جو دماغ اور ہاتھ پاؤں کو برابر کام میں لگائے رکھتے ہیں یعنی جو قیدِ با مشقت بھگت رہے ہیں اگرچہ شاعر کا دماغ بھی محتاج تساہل ہے کیونکہ وہ تمام گھنٹے ان کے اور سب کے ایک ہی خیال کی پابندی سے نہیں کاٹ سکتا۔ پھر بھی اُسکو کچھ گھنٹے ضرور ایسے مل جاتے ہیں جن میں وہ پریشانی سے چھٹکارا پا جاتا ہے اور اس کو وہ مغتنم جانتا ہے۔ بادی النظر میں تو یہ ضرور سخت مصیبت پائی جاتی ہے کہ ایک شاعر قید خانہ میں مقید نظر آوے مگر فی الحقیقت شاعر کو وہ قید کسی طرح سے مصیبت نہیں ہے کیونکہ شاعر تو خود ہی اپنی قوت تخیلہ میں ایسا غرقاب ہوتا ہے کہ وہ تنہائی پسند طبیعت رکھتا ہے گویا کہ وہ اپنے خیالی شہر میں آباد ہے اور اس طرح سے ہر ایک قسم کی پریشانی و قید سے آزاد ہے۔ قید خانہ اُس کے واسطے گو دوسری قید ہے مگر وہ اس کو اپنی تنہائی پسند طبیعت سے ہر طرح اپنے موافق و حسب حال پاتا ہے

اورنو

اور نہ تو متنفر ہوتا ہے نہ قید خانہ کو باعث آزار سمجھتا ہے۔ اب ہر ہوشمند اس تمثیل سے سمجھ سکتا ہے کہ مصروفی انسان کے واسطے کیسی نعمت عظیم ہے۔ اگر انسان کسی اچھے خیال کا پابند ہوکر زندگی بسر کرے تو اس سے اچھی زندگی اور کیا ہو سکتی ہے۔ اس موقع پر خیال سے صرف قوت متخیلہ کا وہ اظہار مقصود نہیں ہے جو خالی دماغ میں گونج کر رہجاوے بلکہ اُس خیال کی پابندی کسی معقول کام میں مصروفی پیدا کرے جو خاص مقصود ہے۔ کیا جانے یہ قیاس عقلی دلائل سے کہانتک ثابت کیا جا سکتا ہے کہ مصروفی صرف خوش گزرانی ہی پیدا نہیں کرتی بلکہ عمر بھی دراز کرتی ہے۔ غالباً کچھ ایسا ہی عقیدہ ہے جس نے عام طور پر اس دعا کو پر اثر بنادیا ہے کہ "عمرت دراز باد" فقط

(مرزا عرفان علی بیگ۔ ای۔ ایس۔ او۔ از آگرہ)

کلام جناب یاسؔ لکھنوی

سنگدل بھی یاد کرتے ہیں تہِ دل سے مجھے ❊ فتح حق کی داد مل جاتی ہے باطل سے مجھے
دردِ سر کی جستجو تھی دردِ دل حاصل ہوا ❊ واہ کیا دولت ملی اس فکرِ باطل سے مجھے
مانگنے دیتا نہیں پامالیٔ دل ایذا طلب ❊ خوں بہا کیا مانگنے دیگا یہ قاتل سے مجھے
دُور سے ہنستے ہیں ظالم پا شکستہ جان کر ❊ خیر مقدم کی صدا دیتے ہیں منزل سے مجھے
خواب سے اندیشۂ فردا نے چونکایا تو کیا ❊ غفلتِ امروز فرصت دیگی مشکل سے مجھے
ناخدا اپنی سی کر گزرا مگر مجبور تھا ❊ کھینچ لایا پھر درِ مقصود ساحل سے مجھے
ہے کوئی ایسا ملادے شاہدِ مقصود سے ❊ یوسف گم گشتہ و پروانہ دل سے مجھے
جلوۂ بیرنگ تھا پردہ کے اندر کچھ نہ تھا ❊ حق بجانب تھا جو اندیشہ تھا محمل سے مجھے

شاعری و فلاسفی

مرزا سلطان احمد خان بہادر نے ایک مضمون برکلے کی فلاسفی کے متعلق بہ عنوان "برکلے شرقی لباس میں" صلائے عام کے لئے از راہ عنایت بھیجا ہے۔ مضمون ذرا بڑا ہے کیونکہ فلاسفی کی بحث ہی ایسی نہیں جو بغیر تفصیل و تطویل لکھی جا سکے۔ اس کے لئے متعدد تصانیف کی ضرورت ہے: لیکن فلاسفی کا تعلق شاعری سے جس قدر صاحب مضمون نے بیان کیا ہے اس کا انتخاب نذر ناظرین صلائے عام کیا جاتا ہے۔

روشن دلاں چو آئینہ بہر چہ رو کنند ❊ ہم در طلسم خویش تماشائے او کنند

× × × × × × × × ہر شاعر خصوصاً پیدائشی شاعر طبعاً اور فطرتاً ہی گویا فلاسفر ہوتے ہیں ایسے شاعروں کی نظر ہمیشہ قدرت کے مناظر اور مظاہر پر پڑتی ہے ایک معمولی سا منظر بھی ان کی نگاہوں میں تنقیدی اور خیالی پہلو سے ایک بسیط اور دلاویز منظر رکھتا ہے ایک چھوٹی سی کیفیت بھی ان کے ذہن میں ایک حیرت خیز حقیقت ہوتی ہے مختلف شاعروں کی شاعری میں بہت سے اس قسم کے نمونے مل سکتے ہیں کہ گویا اپنے اپنے رنگ میں فلسفہ کی کہانیاں ہیں۔

بعض شاعروں کے اشعار میں وہ مختلف تھیوریاں اور اجتہادات مل سکتے ہیں جو بڑے بڑے فلاسفروں کے ذہن کا نچوڑ ہوتے ہیں فلاسفر اپنے رنگ میں ان کو اوراق اور صفحات متعددہ میں بیان کرتا ہے اور شاعر ایک دو شعروں میں ہی بیان کر دیتا ہے۔ مشرقی شاعری۔ عربی ہندی۔ اور فارسی میں ایسا ذخیرہ کم نہیں ہے۔ اگر اس قسم کا انتخاب کیا جائے تو بہت سا مسالہ مل سکتا ہے۔ اس قسم کے فلسفیانہ۔ صوفیانہ محققانہ اور وجدانی اشعار کا دل و دماغ پر جو اثر ہوتا ہے

وہ اِن

وہ ان تحریرات فلسفیانہ سے کہیں زیادہ ہوتا ہے۔ جو کاغذ کے متعدد اوراق میں بیان ہو سکتی ہیں × × × × × × × مرزا بیدل کے مندرجہ ذیل شعروں پر غور کرو کہ کس خوبصورتی سے ان میں برکلے کی تھیوری اور اجتہادات کی داد دی گئی ہے اور کس وضاحت سے ان ہی خیالات کا اعادہ کیا گیا ہے۔ ؎

ہمہ غیب است و شہود ایں جا نیست ٭ جملہ اخفاست نمود ایں جا نیست

اعتبارات ہمہ اوہام اند ٭ تو عدم باش و وجود ایں جا نیست

ان دونوں بیتوں میں اس بات کی وضاحت کی گئی ہے کہ اس ماحول زندگی میں یا جس کائنات میں ہم رہتے ہیں۔ ایک عالم شہود ہے اور دوسرا عالم غیب عالم شہود فریب نظر اور محض اعتبارات ہیں اور اعتبارات اوہام ہیں نمود نہیں ہے۔ بلکہ اخفا ہے۔ جو کچھ حواس محسوس کرتے ہیں ان کا وجود وہمی ہے۔ حقیقت میں اجزائے محسوسہ کے اندر کچھ نہیں ہے۔ ؎

پردہ از سر حقیقت کہ تواند برداشت ٭ ایں قدر ہست کہ نقشے بہ نظر می آید ٭

اس شعر میں شاعر نے برکلے کی تھیوری اور اجتہاد پر اور بھی روشنی ڈال دی ہے برکلے نے اپنے جدید فلسفہ میں جو بات کہی ہے وہی بات شاعر نے دوسرے مصرعہ میں صفائی کے ساتھ کہہ دی ہے۔ سر حقیقت سے پردہ کون اٹھا سکتا ہے۔ بس اس قدر کہ محض ایک صورت نظر آتی ہے۔ حواس احساس کرتے ہیں اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ اس شعر میں شاعر نے فلسفہ برکلے کو اس خوب صورتی سے بیان کیا ہے کہ برکلے بھی متعدد صفحات میں بیان اور واضح نہ کر سکا کس خوب صورتی سے فلسفہ ادبیت کی تنقید کی ہے اور کس جامعیت سے ان چند الفاظ میں فلسفہ ادبیت کی حقیقت کھول دی ہے کہتا ہے۔ سر حقیقت مناظر پیش آمدہ محض ایک سحر ہیں ان کی حقیقت کا کاشف کون ہو سکتا ہے۔ جو کچھ نظر آ رہا ہے وہ سب عوارض ہیں محض ادبیت۔ نقاب انکشاف راز اور احقاق حقیقت نہیں ہو سکتا جو نظروں میں آتا ہے وہ خفا ہے حقیقت میں نہیں۔ دیکھتے بھی ہیں اور نہیں بھی دیکھتے۔ سنتے بھی ہیں اور

نہیں بھی سُنتے۔ عالم شہود میں بھی ہیں اور عالم غیب میں بھی غیبوبیت میں نمود ہے اور نمود میں غیبوبیت۔ اظہار میں اخفا اور اخفا میں رمز حقیقت۔ ؎

دست گاہِ رنگ و بوئے عالم غیب شہود ٭ نیست غیر از صورت پنہاں و پیدائے سخن

اس شعر میں بھی وہی رمز بیان کی گئی ہے جو اُوپر کے بندوں میں بیان ہوئی ہے پھر کہتا ہے ؎

سبک سازی است از آب دیدۂ ترک سرگرانی کن ٭ نگاہ را اندکے روشن سواد جلوہ فدائی کن

کائنات شہود ایک راز یا ایک پُر اسرار طلسم ہے اس راز اور اس طلسم کے اندر کچھ اور بھی ہے ظاہر کیفیت ہے اور غیب ایک حقیقت۔ رباعی ذیل کو ذرا غور سے پڑھو اور پھر کہو کہ برکلے کے مقابلہ میں کس خوبصورتی سے فلسفہ برکلے کی توضیح کی گئی ہے ؎

بیداری میان دو خواب است ہستیم ٭ گر د تخیل دو سراب است ہستیم
سرمایہ وقف غارت و امید محو یاس ٭ یارب چہ جز خانہ خراب است ہستیم

عالم شہود کی بیداری عالم غیب کا خواب ہے۔ پھر کہتا ہے ؎

این موجہا کہ گردنِ دعوے کشیدہ اند ٭ بحر حقیقت اند اگر سر فرو کنند

اس مختصر سے شعر میں شاعر نے فلسفہ برکلے کا سارا خاکہ کھینچ کر رکھ دیا ہے۔ اگر برکلے بھی سنتا تو عش عش کرکے رہ جاتا۔ قدرت کے دونوں نمونے پیش کرکے جتایا ہے کہ ان رموز اور ان اسرار پر غور تو کرو کہ حقیقت کیا ہے جو تم اپنی ظاہری آنکھوں سے دیکھتے ہو یہ ایک منظر ہے مگر اس کے ساتھ میں کچھ اور بھی ہے۔ اسکی حقیقت کچھ اور ہی ہے۔ ظاہری نظر میں جو کچھ دکھتی اور تصور میں جو کچھ آرہا ہے ان کا سلسلہ بہت لمبا ہے اور اس میں صرف روح اعظم یا پرم آتما کام کر رہی ہے آتما کے ساتھ پرم آتما بھی ہے اور یہہ سب ظہور پرم آتما ہی کا ہے ہم محض سایۂ اور ظلاً ہیں جس کا ہم سایہ اور ظل ہیں وہ کچھ اور ہی ہے

(سلطان احمد)

پاٹ شالہ کا نقشہ

مُلّا غنیمت نے مکتب کی تصویر مثنوی نیرنگِ عشق میں بلا کی کھینچی ہے۔ اسی طرح حضرت سیّد اسماعیل منیر نے اپنی مثنوی معراج المضامین میں ایک جگہہ پاٹ شالہ کا نقشہ بہت صاف کھینچا ہے ٭ صلائے عام میں چونکہ ہر طرح اور ہر وضع کی فصاحت کی ضرورت ہے پاٹ شالہ کا نقشہ اُس مثنوی سے اُتارا جاتا ہے۔ جس سے ثابت ہو کہ مسلمانوں کو بھاکا زبان میں بھی مہارت پیدا کرنے کا شوق کس قدر تھا ٭

وہ نقشہ یہہ ہے ٭

سماں جو دیوار در سے آشکار ٭ لیا ہر گائے گو بر سے سارا ٭ ہوا راہب تہیّا حیرت اندیش ٭ سر در دا زتھی تصویر گنیش بچھے تھے تختہ چوبیں سراپا ٭ ہر ایک تختہ پہ ایک کم عمر بیٹھا ٭ کہیں باہم جوان و پیر و کودک ٭ کوئی پوتھی لئے ہے کوئی پستک کوئی پڑھتا ہی پیش چشم استاد ٭ کوئی کرتا ہی کچھ بھولا سبق یاد ٭ کہیں ہی بھاگوت گیتا کا چرچا ٭ مہا بھارت ہی رامائن کسی جا کہیں ہے شاستر کا غل کہیں بید ٭ کسی کو جوتشی بننے کی امید ٭ کوئی اشلوک پڑھکر پوچھتا ہے ٭ کہیں پنگل کا ٹیکا ہو رہا ہے کبیشر ایکطرف گرم بیاں ہیں ٭ کبت و دوہرہ چھپا کنڈلیاں ہیں ٭ کہیں پنڈت ہیں گرم بید خوانی ٭ پہ پیوسن رہی ہیں دیو بانی کہیں بیدانت ہی میمانسا ہے ٭ کہیں جوگ اور بیدک بدھیا ہے ٭ پرانوں کی کہیں ہوتی ہی تجبید ٭ کہیں ہوتی ہی دیبی پاٹ کی بید سروں پر پگڑیاں ہیں سبکے خوش رنگ ٭ جبینوں پر ہی قشقوں کا نیا ڈھنگ ٭ جنیئو آڑے ترچھے ہیں طرحدار ٭ پڑے ہیں گردنوں میں پھولوں کے ہار کھڑاویں پاؤں میں پہنے ہی ہر مرد ٭ بندھی ہیں ریشمی پیامبر زرد ٭ پڑی ہیں کان میں سونے کے بالے ٭ گلوں میں خوشنما تلسی کے مالے زباں اُنکی نہ سمجھا راہب نیک ٭ نہ سمجھا پنڈتوں میں اُسکی بات ایک ٭ کئی دن میں غرض قیسِ عارف ٭ بہ مشکل کچھ ہوا بھاکا سے واقف

التماس خاص

میں نے دیکھا ہے کہ اُردو کے اکثر اخبار و رسالوں کو قیمت کا رونا رہتا ہے۔ کوئی وجہ نہیں کہ صلائے عام اس شکایت سے بچا رہے: یہ میں بہ لاچاری عرض کرتا ہوں ورنہ اخبار یا رسالہ کی قیمت کے لئے تقاضے کی نوبت آنی پاکیزہ مزاجی کے خلاف ہے ٭ صلائے عام کے خریداروں سے التماس ہے کہ مجھے تقاضے کی تکلیف سے بچالیں۔ رسالہ کی قیمت پیشگی عنایت فرمانے میں میری طرف سے تقاضے کا انتظار نہ کریں ؎

فروختیم متاعِ سخن بدیں فریاد ٭ کہ مژدہ باد شناسندگانِ کالا را

"فروختیم" کی رعایت سے یہہ چند شعر سُننے کے لایق ہیں:۔

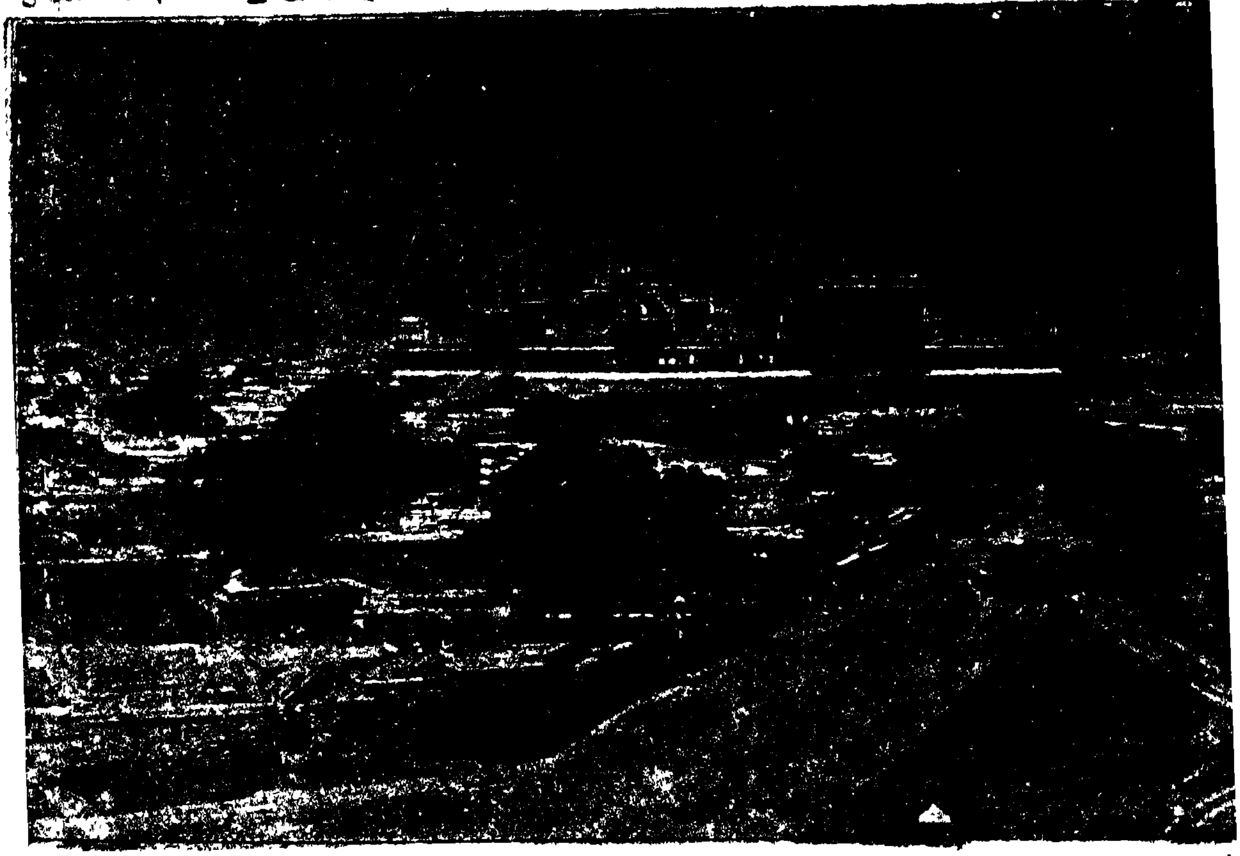
مالختِ دِل بدیدۂ گریاں فروختیم ٭ سر را بپاؤ پائے بداماں فروختیم
باشد کہ گردِ ناقۂ لیلےٰ بمار سد ٭ مجنونِ خویش را بہ بیاباں فروختیم
بختِ سیاہ درنظرش جلوہ دادہ ایم ٭ ما سرمہ را بچشمِ غزالاں فروختیم
مژگانِ کج نہاد ترا دل سپردہ ایم ٭ این شیشہ را بحلقۂ مستاں فروختیم
دستِ طلب بدامنِ مقصد نمیرسد ٭ ما پاشکستہ سر بہ گریباں فروختیم
آمد غمِ نگار دل و دین ما ربود ٭ ما خانہ با متاع بہ مہماں فروختیم

صلائے عام کی قیمت پیشگی چھہ روپیہ سالانہ ہے۔ نامہ نگار قیمت سے بَری نہیں ٭ قیمت بذریعہ منی آرڈر عنایت کیجائے۔ صلائے عام کا پتہ یہہ ہے:۔ دہلی۔ فراشخانہ: مکان میر ناصر علیخاں بہادر۔

حسب الارشاد میر ناصر علیخاں بہادر مطبع ناصری واقعہ فراشخانہ دہلی میں باہتمام میر احمد چھپا اور شایع ہوا ٭

Printed and Published by Mir Nasir Ali Khan Bahadur (Editor) the Nasiri Press, Farrash Khanah, DELHI.

Registered No. A. 1403 Sala-I-Am.



صلائے عام دہلی

جلد ۱۱ نمبر ۳

SALA-I-AM, DELHI.

A high class Monthly Magazine devoted to the cause of Urdu literature, the preservation of the old Indian, especially Mohammadan culture and refinement, and the assimilation of the best features of the new civilization.

Press, Farrash-Khana, Delhi.

جلد ۱۱ — # فہرست مضامین — نمبر ۳

بابت ماہ مارچ ۱۹۲۳ء مطابق شعبان ۱۳۴۱ ہجری

پیرایۂ آغاز

انسان کو اپنے قصور کے اقبال کرنے میں ذرا جھجھک سی ہوتی ہے۔ اس جھجھک کا علاج یہی ہے کہ پہلے اپنے قصور کا اعتراف کرلے۔ پیشتر اس سے کہ اور لوگوں کو عیب نکالنے کا موقع ملے۔ اس پرچہ میں مَیں اپنی ناسازیٔ طبیعت کی وجہ سے معمول سے کم لکھ سکا۔ مہینہ کے اخیر میں میری طبیعت درست ہوئی جب کہ رسالہ کی اشاعت کے دن بہت کم رہ گئے تھے اس حالت میں موت کے وقت کی توبہ[1] کی طرح میرا عذر نامقبول سمجھا گیا۔ اور پیرایۂ آغاز لکھنے کی تاکید ہوئی پس

بڑھتی ہے مثلِ گنج ویرانہ ❊ قدرِ مضمون زمینِ مہمل میں

اس پرچہ میں دعا کا مضمون بُرا نہیں۔ گو ایسا وسیع مسئلہ اس

---

[1] داراشکوہ نے مرنے سے پہلے اورنگ زیب کو لکھا کہ بھائی اب تم میری پچھلی تقصیروں کو معاف کردو اور میری جان لینے سے باز آؤ۔ اس پر اورنگ زیب نے لکھا کہ توبہ مرگ مقبول نیست۔

سے کہیں زیادہ طبع آزمائی کا محتاج ہے جتنی کہ مضمون سے ثابت ہونی ممکن ہے: پھر بھی اس کے خلاف یا اس کی تائید میں از روئے تحقیق جس قدر لکھا جائے دل و دماغ کے لئے اچھا مسالہ ہے؎

اے چرخ مژدہ تیر ہوا تیرے کماں شکن ؛ یعنی زبان فگار ہجوم دعا سے ہے۔

تاریخ مسئلہ خلافت محض مورخانہ مضمون ہے ؛

مضمون پریشان۔ صلائے عام کے مضامین کا جزو خاص ہو گیا ہے اسکی نسبت کچھ لکھنا یا نہ لکھنا بے کار ہے۔ میں سہل انگاری کی وجہ سے نہ لکھنے میں زیادہ آرام سمجھتا ہوں ؛

پیرایہ آغاز کوئی خاص مضمون نہیں لیکن کبھی کبھی خوبئ پیراہن سے خوبئ اعضا ظاہر ہو جاتی ہے۔ اس لئے آپ پیرایہ پر ایک نظر ڈال کر مضامین دیکھیں ؛

جناب مرزا عرفان علی بیگ صاحب کو ہر مسئلہ پر مضمون لکھنے میں کمال ہے۔ **شاعر والا** مضمون شاعرانہ نہیں مگر خان بہادر مرزا سلطان احمد صاحب کا مضمون دیکھنے کے بعد جو کچھ آپ نے لکھا بہت اچھا ہے کہ ایک دوسرے کی گویا شرح ہو گئی ؛

ابجد کے عنوان سے مرزا عرفان علی بیگ صاحب کا مضمون خاص توجہ کے لایق ہے کہ ناواقفوں کی وجہ سے ہندی و اردو دونوں زبانوں کا گلا گھٹ رہا ہے ؛

کلام ظفر کے ہوا خواہ واقعی سخن دوست ہیں لیکن اسکی ضرورت نہیں سخن دوستی سے شاعر کی روح کو اگر فائدہ پہونچے تو پہونچے۔ ہمیں سخن دوستی سے زیادہ سخن فہمی کی ضرورت ہے ؛

سے زیادہ سخن فہمی کی ضرورت ہے ٭ بہادرشاہ بادشاہ کا کلام اساتذہ میں داخل نہیں۔ اس سے بہتر تہا کہ آپ ذوق۔ مومن۔ غالب وغیرہ کے ساتھ بہی رعایت کرتے اور اُن کے کلام پر مشق کرتے ٭ بہرحال۔ یہ ہی غنیمت ہے ٭

رسالۂ ہمایوں کا ریویو میں اپنی مرضی کے موافق نہ لکھ سکا۔ سبب یہ کہ پچھلے پرچے میں نے نہیں دیکھے ہیں اور یہہ پرچہ خاص نمبر تھا جس میں زیادہ تر انعامی مضامین کے فیصلہ پر بحث تھی ٭

مسلمانوں کے علم و فضل کی تحقیق ضروری مضمون ہے لیکن جس غرض سے یہہ گفتگو چھیڑی گئی وہ مفقود ہوئی جاتی ہے۔ مضمون سے غرض تحقیق تھی نہ طرفداری ٭

ازکلام عالیجناب نواب صاحب بہادر فرمانروائے ریاست لوہارو

قطعہ

اکدن کہیں جو گورِ غریباں پہ میں گیا ٭ دیکھا کہ ایک قبر پہ کچھ سبزہ زار ہے ٭ دو چار گُل کھلے ہیں ہاں جنکے سوز سے
بلبل بھی ایک خستہ و سینہ فگار ہے ٭ حیران ہوئے دلمیں یہ کہنے لگا کہ کیوں ٭ خاص اس مزار پہ یہ نرالی بہار ہے
بولا یہ عندلیب کہ حیراں نہو عزیز ٭ تھا ایک نامراد یہ جس کا مزار ہے ٭ تربت پہ اسکی آیا تھا معشوق اس لئے
عاشق کا جوشِ دل یہ ہوا آشکار ہے ٭ میں نے کہا کہ آپ بھی کیسے ہیں خوش شنوا ٭ میت کی دل میں جوش ہو کب اعتبار ہے
اعظم ہے تمکو فیر دیا اس نے یہ جواب ٭ عاشق پہ موت کا نہ اثر ہے نہ وار ہے ٭ فرہاد و قیس گو نہیں قیدِ حیات میں
نام اُنکا عاشقی سے مگر برقرار ہے ٭ ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق ٭ حافظ کے قول پر بھی نہیں اعتبار ہے
سچ ہے کہ عشق جنکے دلوں میں ہے جاگزیں ٭ اُن پہ مدام رحمت پروردگار ہے ٭

منقول از نیرنگ اعظم۔

دُعا میں اثر ہی یا بے اثری؟

ازروئے عقاید تو یہہ امر مُسلّمہ ہے کہ دعا میں اثر ہے۔ فلسفہ اور سائنس والے اگر اِس مسئلہ کے خلاف نہیں تو دعا کے اثر کے بہت معتقد بھی نہیں ؛ سَر سیّد احمد خاں صاحب نے جن دنوں عقاید نیچریہ کا زور زیادہ دیا تھا دُعا کے اثر کو بہت کم مانا۔ اُن کا قول تھا کہ بیچارے مولوی۔ مُلّا جو بلاؤں سے بچنے کے لئے دُعا کے بعد دہنے بائیں شانوں کی طرف چھو کرتے ہیں اور آسمان کی طرف دَم کرتے ہیں اور پھر مُنہہ پر ہاتھ پھیر لیتے ہیں یہہ سیدھے سادے لوگ ہیں اِن سے کچھ نہ کہنا چاہئے

ورنہ چرخ کج رفتار کس کے دم میں آتا ہے؟ سق

اگلے وقتوں کے ہیں یہہ لوگ اِنہیں کچھ نہ کہو جو مئے و نغمہ کو اندوہ رُبا کہتے ہیں۔

اِس میں شک نہیں کہ آرزوؤں کے ساتھ دعا کی بہت ضرورت ہے۔ اور انسان گو خاک کا پُتلا کہلاتا ہے۔ مگر دراصل یہہ ارزوؤں کا پتلا ہے۔ اور

جب تک آرزوئیں ہیں دعا سے مفر ناممکن ہے ؎ دُعا کے ساتھ مجیب الدعوات
کا ماننا بھی ضرور ہوا کہ مجیب الدعوات کے بغیر دعا بیکار ہے۔ اِس حساب سے دُعا
مانگنی قادرِ مطلق کے وجود کا قائل ہونا ہے: اور یہہ ہر مذہب کا اصول ہے؎

یہہ کیا ضرور ہے ہو جائے آج وصلِ بتاں ؎ خدا کبھی تو سنے گا دعا کئے جاؤں۔

اس مضمون میں مُجھے عقائد مذہبی سے بحث نہیں نہ فلسفیانہ گفتگو منظور ہے۔ انسان پیدا پہلے ہوا پھر عقائد اور عقائد کے بعد فلسفہ و سائنس پیدا ہوئے بڑے بھائی کی طرح عقائد کے سامنے فلسفہ کی نہیں چلتی اور عقائد اور فلسفہ دونوں انسان کے بغیر بہت بکار آمد نہیں ؎ حضرت زندہ پیل احمد جام قدس سرہٗ فرماتے ہیں؎

نہ در مسجد گزارندم کہ رندی ؎ نہ در میخانہ کایں خمّار خام است ؎
میانِ مسجد و میخانہ راہے است ؎ غریبم عاشقم آں رہ کدام است ؎

رہ گزرِ عقائد اور دشتِ فلسفہ کے درمیان سے بھی راستہ نکلتا ہے یہہ راستہ انسان کا دل ہے کہ جو بات جس طرح جس کی سمجھ میں آجائے۔ کیونکہ دُعا کا تعلق محض دل سے ہے: زبان سے نہیں اور قلم سے تو واسطہ ہی نہیں؎

اے زخمِ دل نہ مانگ دعا تیرِ یار کی ؎ تیرا بھی اس زبان کے لائق دہن ہوا

نالہ۔ آہ۔ فغاں۔ فریاد۔ شیون و بُکا۔ شکوہ و گلہ۔ یارب۔ الغیاث۔ دُہائی دینا۔ خدا یاد آنا۔ کوسنا۔ ہزاروں شکلیں دعا اور بد دعا کی ہیں ؎ دعا تو دعا بددُعا بھی اثر سے خالی نہیں۔ عورتوں کی بد دعا کوسنا ہے۔ ہماری دعا سنی جائے یا نہ سُنی جائے حسینوں کا کوسنا تیرِ بہ ہدف سمجھئے ؎

ساتھ ہے سیلِ فنا جائیں جدھر دُنیا میں ؎ ڈھال کیا ہر طرف اِس گھر کی ہے انگنائی کا

دعاؤں کے نام، مقام و سامان علیحدہ علیحدہ ہیں۔ مسجد میں دُعا کیجئے تو مناجات..

کسی عزیز کی قبر پر دُعا کا نام فاتحہ ہے : رات کی دُعا زیادہ سُنی جاتی ہے - اور اضطراب میں جو دُعا کیجئے ضرور قبول ہوتی ہے ؛ دعا کے قبول ہونے کے وقتوں میں بعض دن اور بعض مہینے زیادہ برکت کے سمجھے جاتے ہیں - رمضان میں شبِ قدر اور ہر مہینہ کے آغاز کے دن خاص کر چاند دیکھ کر دعا مانگنا اچھا ہے ؛ آخر شب کی دعا سنا ہے زیادہ اثر رکھتی ہے ؎

میری فریاد کا نام آخرِ شب ؛ نالۂ مُرغِ سحر ٹھیرا ہے

درگاہوں - خانقاہوں - مسجدوں خاص کر خانہ کعبہ میں دعا زیادہ سُنی جاتی ہے ؎

یاس ہے وصلِ بتاں سے کہ چلے ہم کعبہ ؛ چارہ کچھ بن نہیں آتا تو دعا کرتے ہیں ؛

مشہور ہے کہ دعا سحری میں زیادہ اثر ہوتا ہے - لیکن شبِ فراق میں سحر کی کسے امید ہوتی ہے ؎

آجائے گی یاں موت سحر ہوتے ہی ہوتے ؛ پائیں گے شبِ غم میں نہ ہم وقت دُعا کا -

چلہ کشی - زیارت گاہیں - منتیں - وظیفہ - دریا کا کنارہ - قبرستان - تعویذ گنڈے - چھو منتر - فقیروں کا کچھ پڑھ کر پھونکنا - کسی خاص چیز کا کسی کے نام پر ترک کرنا یا اختیار کرنا - غرض بے شمار سامان دعاؤں کے پورا ہونے کے لئے ہر قوم اور ہر مذہب میں کم و بیش موجود ہیں - ان کی تعمیل فرائض دینی سے زیادہ کیجاتی ہے اور اکثر بیکار نہیں جاتی ؛ اگر بیکار جانیکا اندیشہ ہوتا تو یہ سامان کب کے مٹ چکے ہوتے ؎

بخششیں ترے عاشق جو اثر آہِ رسا کا ؛ موسے کے لئے اور سہارا ہو عصا کا -

عشق و محبت میں چاہنے والے رات دن یار سے ملنے کی دُعائیں مانگتے ہیں - انکا دعویٰ ہے کہ انکی آہ سے عرش ہل جاتا ہے ؎

کروں گا تنگ آکر اب کے وہ آہ ؛ کہیں گے لوگ یاں چرخِ کہن تھا ؛

لیکن جہاں تک مجھے خیال ہے زلیخا کے سوا کسی کی دُعا سُنی نہیں گئی ؎

فریاد سُننے کی جو دُعا مانگی یار سے نے ۞ بزمِ دعا میں ماتمِ مرگِ اثر ہوا

کہتے ہیں کہ چپ کی دُعا زیادہ سنی جاتی ہے۔ یعنی جو زبان سے نہ نکلے وہ دُعا جلد قبول ہوتی ہے ؎

بھایا ہے سوزِ عشق تو ظاہر نہ کیجیے ۞ تا دیر آگ رہتی ہے جتنی دبی رہے

دُنیا میں مُنہہ مانگی مراد ملنی نعمت ہے مگر کبھی کبھی بے مانگے مراد بر آتی ہے اور اکثر اُلٹی بھی پڑ تی ہے ؎

کام سب میرے ہوا کرتے ہیں خواہش کے خلاف ۞ مجکو دینا نہ کہیں خضر دُعا جینے کی۔

لیکن آج تک یہہ ثابت نہیں ہوا کہ دُعا سُنی جاتی ہے یا نہیں سنی جاتی؟ ایک ناخداشناس کا قول ہے کہ دُعا شائبہ جنوں ہے کہ انسان اکیلا اپنے سے باتیں کرنا پسند کرتا ہے۔ اور اکیلے باتیں کرنی جنوں میں داخل ہیں ۞ سائنس والوں کا خیال ہے کہ دُعا بیکار بات ہے ؎

بیداد کن کہ نالہ اگر نالۂ من است ۞ از صد یکے بجانبِ گردوں نمیرود

کیا میں اِظہارِ مدعا کرتا

ٹوٹتے ہاتھ اگر دعا کرتا

مگر میرا عقیدہ تو یہہ ہے (اور آپ میری عرض کیوں نہ سُنیں؟) کہ دعا زیادہ تر سُنی جاتی ہے: اِس عقیدہ سے بڑا فائدہ خداشناسی کا ہے ۞ دُعا دراصل خداشناسی کی جڑ ہے ۞ اکثر مذہبوں کے ارکانِ عبادت حقیقت میں مختلف دعائیں ہیں ۞ دُعا سے انسان کے دل میں طاقت آجاتی ہے۔ یہہ آپ علیحدہ علیحدہ ہر شخص کے دل سے تنہائی میں پوچھیے۔ ؎

حکم شراب دے تو دُعا دوں گا اے فقیہہ ۞ مستوں کے ہاتھ سے تری عزت بچی رہے

ایک بڑی خوبی دعا میں یہ ہے کہ دعا میں چھوٹے اور بڑے شاہ و گدا کا امتیاز نہیں۔ صرف حضور قلب چاہیئے۔ دعا میں ہم اپنے خدا کو پاک اور قادر سمجھکر اپنے تئیں اُسکی مرضی پر چھوڑتے ہیں کہ ہمارے پاس یہی پونجی ہے جو تیرے حوالے کرتے ہیں سے

سپردم بتو مایۂ خویش را ٭ تو دانی حساب کم و بیش را

سُنیں اچھی طرح اور پھر سُنیں وہ
فغاں ہو اور پھر میری فغاں ہو

اِس مسئلہ میں غم یار کی طرح جسکی حد نہیں ہوتی ابھی بہت لکھنے کی گنجایش ہے۔ پھر بھی قول فیصل مشکل ہے: زیادہ لکھنے کی امید میں اور اصحاب پر چھوڑتا ہوں۔ یہاں صرف اس قدر اور عرض کرنا چاہتا ہوں کہ دعا میں اثر ہو یا نہ ہو دعا قبول ہو یا نہ ہو۔ دعا تو انسان کے لئے لازمی ہے۔ دعا قبول ہوئی تو کیا نہوئی تو کیا۔ عالم اسباب (نیچر) کی نگاہ میں دونوں صورتیں برابر ہیں۔ دعا قبول ہوئی تو موت سے بچنا ناممکن ہے۔ نہ ہوئی تو موت کہیں نہیں گئی ٭ دونوں حالتوں میں نیچر کا بال بیکا نہیں ہو سکتا ٭ حضرت منصورؒ نے دعوے انا الحق کیا۔ اُن کو دار پر کھینچ دیا ٭ نہ دار کو خبر ہوئی نہ زمین کو نہ آسمان کو ٭ حضرت کو کسی نے خدا نہ مانا۔ نہ کسی نے انا الحق کی تائید میں ایک حرف زبان سے نکالا ٭ اِس میں آپ ہی فرمائیں عالم اسباب کا کیا نفع یا نقصان ہوا؟ سے

وادیٔ وحدت ندارد نقش پائے ہوشدار
از سرِ منصور می باید نشاں پرسید و رفت

تاریخ مسئلہ خلافت

یہہ مسئلہ جس قدر نازک ہے اُس سے زیادہ دقّت طلب ہے۔ خاص کر جب کہ بلا تعصب اور بغیر طرفداری بیان کیا جائے: سوار نازک اور دقّت طلب ہونے کے تیرہ سو برس کا پُرانا ہے اور اسلام میں بڑے بڑے معرکوں اور انقلابوں کا باعث ہوا ÷ عقاید اثنا عشری اور اہلِ سُنّت جماعت کے اختلاف کا یہی سبب شروع سے چلا آتا ہے۔ یہہ اختلاف ابتک طے نہیں ہوا اور ظاہرا اس کا طے ہونا مشکل ہے ÷ ایام جہالت میں ایک گروہ بلکہ ایک خاندان کو دوسرے سے محبت کا وجود نہ تھا۔ اسلام نے مخالف و موافق کا امتیاز مٹانا چاہا اور اصول دین میں یہہ کم و بیش مٹ گیا مگر رسم و رواج میں جہان اور جب موقع ہوا اختلاف رائے نے سر اُٹھایا ÷ حضرة علی کرم اللہ وجہہ کی خلافت تک خلافت راشدہ سمجھی گئی۔ سبب یہہ کہ خلافت سے خلیفہ کو دُنیوی سلطنت مقصود نہ تھی۔ بلکہ از روے خدا ترسی خلیفہ پر اسلام کا

بڑا بار تھا ۔ خلافت خدا کی ودیعت سمجھی جاتی تھی جس سے عہدہ برآ ہونا ہر انسان کا کام نہ تھا ۔ خلفاء اربعہ تک کسی خلیفہ کو چین سے زندگی بسر کرنی نصیب نہ ہوئی۔ رات دن اسلام اور اشاعتِ اسلام کی فکر رہی ۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے بعد دار الخلافۂ اسلام جو عرب میں تھا شام میں آگیا اور یہاں آکر خلافت نے زیادہ تر سلطنت کی شکل اختیار کی یعنی خلفاء بنی اُمیہ اور عباسیہ خلیفہ سے زیادہ سلطان تھے یا دونوں ساتھ ۔ اور خلافتِ قرطبہ میں تو خلیفہ برائے نام اور سلطان فی الحقیقت ۔ یہی صورت کم و بیش خلفاء بنی فاطمہ کی تھی ۔ غرض خلافت نے سلطنت کا رنگ زیادہ یا در اصل اختیار کیا ۔

یہہ ذکر میں عمداً اس لئے کرتا ہوں کہ جس بادشاہ نے اسلام میں فتوحات کثیرہ کیں وہ اکثر خلیفہ سمجھا گیا اور نسلاً بعد نسلاً جب تک کہ اختیار رہا۔ جس خاندانِ سلاطین سے سلطنت گئی اُس میں خلافت نہ رہی ۔ خلافت عباسیہ کو جب ہلاکو نے مٹا دیا تو خلافت خاندان عثمان میں جا پہونچی ۔ یہاں یہہ بات زیادہ غور کرنے کی ہے کہ ہندوستان میں گو بڑے زبردست بادشاہ ہوئے ۔ مگر کسی نے خلیفۃ اللہ کا لقب اختیار نہیں کیا ۔ عالمگیر سا بادشاہ جو اسلام میں از روئے علم و فضل اپنا جواب نہیں رکھتا تھا خلیفۃ اللہ نہیں کہلایا۔ گو سنا ہے کہ غدر میں بہادر شاہ نے اپنے تئیں خلیفۃ اللہ قرار دینا چاہا مگر اس کا کچھ اثر نہ ہوا ۔ اس کا خاص سبب یہہ معلوم ہوتا ہے کہ سلاطینِ ہند زیادہ تر شاہانِ ایران کے قدم بقدم زبان اور دربار اور انتظام میں پیرو رہے ۔ اور شاہان ایران بوجہہ عقائدِ امامیہ خلافت کے بہت قائل نہیں ۔

غرض ہندوستان میں لفظ خلافت و خلیفہ پر از روئے تاریخ بہت زور

نہیں دیا

نہیں دیا گیا۔ یہاں کے دینی مسائل یہیں کے سلاطین اپنی اور اپنے قاضی مفتیوں کی صلاح اور رائے پر طے کرتے رہے ٭

یہہ مضمون عقائدِ مذہبی سے تعلق نہیں رکھتا۔ محض مورخانہ ہے اور تاریخ کی رو سے دار الخلافت اور خلافت ایک صورت اور ایک ہی خاندان میں نہیں رہی۔ دار الخلافہ عرب سے شام اور شام میں دمشق و بغداد اور قرطبہ پھر مصر و روم پہونچا۔ خاندان کا یہہ حال ہے کہ خلفاء اربعہ کے بعد بنی اُمیہ۔ بنی عباسیہ بنی فاطمہ اور آل عثمان میں خلافت رہی ٭

ہندوستان کی تاریخ میں خلافت کے مسئلہ پر بہت زور نہیں دیا گیا۔ ہندوستان جیسے مختلف المذاہب ملک میں اس مسئلہ کی ضرورت کم نظر آئی۔ کیونکہ خلافت کا مسئلہ خالص اسلامی اور اُس میں حضرات اثنا عشری شروع سے علیحدہ جن کو حضرت امام مہدی علیہ السلام کا انتظار ہے: اقوامِ غیر کو خلافت سے تعلق نہیں۔ مرہٹے۔ سکھ۔ اور عموماً تمام اہلِ ہند سوائے اہل سنت وجماعت کے اس سے بیگانہ ہیں ٭

اکبر نے مذہب الٰہی اور خود اپنی پرستش کا خیال کیا۔ مگر خلافت کو نہیں چھیڑا۔ خاندان مغلیہ نے اپنے لئے شاہجہاں۔ جہاں گیر۔ عالمگیر۔ شاہ عالم کے لقب و نام پسند کئے۔ اور غدر میں بہادر شاہ نے بھی اپنے تئیں خلیفہ کا لقب از راہ تصوف ایجاد کیا کہ اخیر میں بہادر شاہ کو پیری مریدی کا شوق بہت ہوگیا تھا ٭ تصوف میں صوفیاء کرام کے جانشین خلیفہ کہلاتے ہیں: کہ فلاں بزرگ کے فلاں خلیفہ تھے۔ یہہ خاندان صوفیہ میں عزت و امتیاز کا لفظ ہے۔ حضراتِ تصوف کو دُنیوی بحث مباحثہ سے غرض نہیں ٭

مضمون پریشان

مضمون پریشان سے میری غرض پریشانی کا علاج ہے کہ گو علاج بالضّد زیادہ مشہور رہے لیکن کبھی زہر سے زہر کو مارتے ہیں اور ہیرے کو ہمیشہ ہیرے سے کاٹتے ہیں۔ جس طرح رات کے نشۂ خمار کا علاج صبوحی ہے اور محبت کے مارے ہوؤں کے دردِ سر کا علاج سنگِ درِ جاناں ہے کہ فرہاد کے دردِ عشق کا علاج تیشہ سے ہو گیا ع ہمیں یک تیشۂ آخر بجا زد : اور قیس کی وحشت کا مداوا ریگ بیابان کہ دماغ کی خشکی کے لئے بہت موزوں نکلی : اور طرفہ یہہ کہ دونوں کو یہہ علاج راس آئے: جس طرح تماشائے برقِ رخسارِ جاناں بیقراروں کے اضطراب کا علاج ہے اور شمیم گیسوئے مشکیں آشفتہ مزاجوں کی دوا۔ اسی طرح پریشاں حالوں کا علاج پریشانی

سمجھئے ؎

اسی سے پائی ہے شیرازۂ کونین نے بندش ÷ وہ عالم کی ہے جمعیت تری زلفِ پریشاں میں

کہتے ہیں کہ حشر کے دن بندوں کے دفترِ عصیاں جمع ہوں گے۔ کراماً کاتبین ایک ایک پرچہ ہمارے اعمال کا احتیاط سے منتقی کرکے تمام فائل مکمل مسل کا پیش کریں گے۔ لیکن ان سے پوچھئے کہ گنہگاروں کے حواس کس طرح جمع ہوں گے؟ ہم تو حواس باختہ حیران و پریشان پھر رہے ہوں گے ؎

محشر میں جمع دفترِ عصیاں ہوا مگر ÷ مجموعۂ حواس پریشان رہ گیا

سارا دفتر جمع ہوا اور ہمارے حواس پریشان رہے تو کون کس کا جواب دیگا؟ ؎

جو تم تلوار کھینچے ہو تو ہم بھی سر جھکائے ہیں ÷ تمہیں طاقت ہمیں اپنا مقدر آزمانا ہے

جناب منیر کا شعر ہے ؎

قیس کا گھر دل میں لیلےٰ کے ہوا تھا یا نہیں ÷ ساربان و ناقہ و محمل سے پوچھا چاہیئے۔

میں پوچھتا ہوں کہ تمام دنیا سے پوچھنے کے بدلے آپ لیلےٰ ہی سے کیوں نہ پوچھ لیں۔ وہ سامنے پردۂ محمل کی آڑ میں بیٹھی دیکھ رہی ہیں ÷ اسی طرح گنہگار کا حال کراماً کاتبین سے نامۂ اعمال دیکھکر۔ فرشتوں کو جمع کرکے۔ میزان کھڑی کرکے۔ حساب کتاب لگاکر ہنگامۂ محشر میں دریافت کرنے سے یہہ کتنا آسان ہے کہ میاں سے کیوں نہ پوچھ لو؟ علاوہ اس کے کہ اتنی مدت کی باتیں کیسے یاد رہتی ہیں۔ اگر فرشتوں کو یاد بھی رہیں تو از روئے سائنس ہر چیز انقلاب روزگار سے پتھر بن جاتی ہے۔ مثلاً ہڈیاں۔ نباتات۔ اور اور اجسام پتھر کی شکل میں بدل

جاتے ہیں۔ نگینوں میں کیسے کیسے خولصوت اشجار کے شکل کی پتّیاں دکھائی دیتی ہیں۔ تو اِس مدّت کے بعد ہمارے آہ و نالے مسخ ہو کر جمادات سے جانے کیا اور کیا سے کیا ہو گئے۔ آنکھیں جب پتھرا جاتی ہیں تو دیکھنے سے رہ جاتی ہیں۔ اب پتھرائی ہوئی آنکھیں کس کام کی؟ مجھے تو شبہ ہے کہ جو آہ ۱۹۲۳ء میں کھینچی جائے اِس صدی کے ختم ہونے سے پہلے جانے کہاں سے کہاں اور کیا سے کیا ہو جائیگی ؛ آہ سے ہوا ہوا سے پانی اور پانی سے پتھر جو چیز ہو جائے اُسکا پہچاننا مشکل ہے ؛ قیامت تو دور ہے لیلےٰ کو اِس وقت قیس پہچان بھی نہ سکے نہ فرہاد شیریں کو گو دونوں نے تمام عمر اسی خیال اور اسی فکر میں رائگاں کی ؛

حسین جب اپنے خط و خال آئینہ میں دیکھتے ہیں اُن کے ذہن میں اپنے خط و خال کی خوبصورتی کے برابر کوئی نعمت کوئی دولت خدا نے پیدا ہی نہیں کی۔ دانتوں کی چمک کے آگے ہیرے بیکار۔ سرخیٔ لب کو لعل بدخشاں نہیں ہو سکتا۔ نگاہ کا توڑ تیر سے زیادہ تیز۔ اور اپنی خوبصورتی کا علم کہ ہم ایسے ہیں دنیا بھر کے علم و فضل کو بیکار کر دیتا ہے ؛

لیکن یہہ خیالات حضرت عمر خیام کو زیب دیتے ہیں۔ نہ صلای عام کو : یہہ وضع بدلنی چاہئے کہ ہماری لٹریچر کی رونق اور آبرو کا باعث صرف یہی طرز بیان نہیں ہے ؎

تعریف میری آبلہ پائی کی کیوں نہ کی ؛ اتنا بھی خارزارِ جنوں بے زباں نہ تھا۔

لیکن میں دیکھتا ہوں کہ صلائے عام کے مضامین میں مضمون پریشان زیادہ دیکھا جاتا ہے۔ یہہ مضمون محض شاعرانہ ہوتا ہے اور نئے طرز کی وجہہ سے اس کی تقلید بھی ہونے لگی ہے ؛ میں خوش ہوں کہ کسیطرح آپکی زبان اور زبانوں سے بازی نہ لیجا سکے تو

صلائے عام

اس سرخی کی شانِ نزول اس طرح ہے:-

میں ابھی مضمون پریشان لکھ ہی چکا تھا کہ مہتمم صلائے عام کا تقاضہ آیا کہ اس مہینہ کے پرچہ میں دو تین صفحے کا مضمون اور درکار ہے۔ اُنہیں معلوم ہے کہ گیسوئے پریشاں کا ہنر درازی ہے ؎

دامنِ حسن ہو دراز ترا ❊ اُلجھے زلفِ طویل دامن میں ❊

مجھسے کہا کہ اسی مضمون پریشان کو ذرا اور بڑھا دیجئے کیونکہ پریشان نگاری میں بہت عیب ڈھک جاتے ہیں ؎

محوِ شوق ایسا ہوں لکھ جاتا ہوں خط میں کچھ کا کچھ ❊ نامہ میں آداب سے القاب کو نسبت نہیں:

میں نے کہا ؎

عشق گیسوئے پریشاں نہ چھٹے گا ہم سے ❊ پسند گو مغز پریشان کیا کرتے ہیں

مجھے یہہ پوچھنا ہے کہ انسان کی زندگی اگر خواب کے مشابہ ہے تو خوابِ غفلت کیا کم تھا پھر خوابِ پریشان کیوں دکھائے جاتے ہیں؟ ؎

وقتِ غفلت کچھ نہیں اقسامِ انسان میں تمیز ❊ دیکھ لو یکساں ہیں نابینا و بینا خواب میں

انسان کو اگر نام کی ہوس ہے تو نام سے پہلے نشان کیوں مٹائے جاتے ہیں؟

سکندر کا نام گو باقی ہے مگر نشان کا پتہ نہیں۔ حضرت نظامیؒ نے اتنا بڑا سکندر نامہ لکھ ڈالا مگر یہہ نہ بتایا کہ اُس کا فاتحہ پڑھنے کہاں جائیں؟ دارا کا تو صرف نام ہی نام رہ گیا نشان کا پتہ نہیں۔ نمرود و شداد و فرعون گو ہر شخص کی زبان پر ہیں مگر انکا پتہ نہیں کہ کہاں ڈھونڈنے جائے؟ لیلےٰ و مجنوں کے افسانے پڑھتے پڑھتے میں تھک گیا لیکن قبر کا نشان نہیں کہ فاتحہ کہاں پڑھیئے؟ ؎

نام جنکا رہ گیا اُن کا نشاں ملتا نہیں ٭ قصرِ فغفور و درِ نوشیروان ملتا نہیں۔

کہتے ہیں کہ پروانہ جذبِ محبت سے شمع کے گرد پھر پھر کر صدقہ ہو جاتا ہے۔ یہہ بی گیتی جنکو کرۂ ارض کہتے ہیں راتوں غلطاں پیچاں حاملہ عورت کی طرح سارا بوجھ لیئے آفتاب کے گرد کیوں گھوما کرتی ہیں؟ کیا یہہ بھی آفتاب کے پیچھے جان دیں گی؟ ساری دنیا اگر آفتاب پرست ہو جائے تو نظام شمسی کا بال بیکا نہوگا۔ ؎

ذرّوں کا اضطراب نہ کرتا کبھی پسند ٭ انصاف کچھ بھی ہوتا اگر آفتاب میں۔

زندگی نام ہے اُس رسی کے جھٹکوں کا جو ع رشتۂ در گردنم افگندہ دوست کیطرح نیچر نے ہماری گردن میں ڈال رکھی ہے۔ جس طرح مداری جو ریچھ بندر نچاتے پھرتے ہیں محض ڈوری کے جھٹکے سے جس میں جانور کی گردن بندھی ہے جانور سے کام لے لیتے ہیں۔ اس میں بیچارے جانور سے کوئی نہیں پوچھتا کہ تیرا جی کیا چاہتا ہے؟ شام کو مداری دو ٹکڑے روٹی کے ڈال دیتا ہے۔ اور صبح کو پھر وہی دھندا ٭

تقدیر و تدبیر میں مجھے تدبیر ہی پسند ہے کہ باوجود ہماری مجبوری کے تدبیر ہمارا ساتھ نہیں چھوڑتی۔ تقدیر ایسی بدمزاج عورت ہے کہ محض ضد سے ہمارے چلنے چلاتے کام میں روڑا اٹکا دیتی ہے: تدبیر تو بھلا بُرا جیسا اس سے ہو سکتا ہے ہمارا ہاتھ بٹانے کو حاضر ہے۔ برخلاف اسکے تقدیر کو بگاڑنے کے سوا کچھ نہیں آتا۔

تقدیر اُس اناڑی کاریگر کے مشابہ ہے جسے کام میں تو دخل نہیں لیکن اوزار اور مسالہ خراب کرنے کو موجود ۔ میری دانست میں دُنیا کے کام تدبیر سے زیادہ چل رہے ہیں۔ تقدیر تو اکثر بگاڑنے میں کام آتی ہے [1]

نہوں جو رحم تو اطفال ہوں کہاں پیدا ۔ ہوئے ہیں قتل مکین منزل و مکاں پیدا

تدبیر سے کام بنتے ہیں اور تقدیر سے بگڑتے ہیں۔ اس بننے اور بگڑنے کا نقشہ نواب امین الدولہ بہادر نے کتنا پاکیزہ کھینچا ہے - ملاحظہ فرمائیے :-

طورِ دلِ خراب بنا پر بگڑ گیا ۔ گو شیشۂ حباب بنا پر بگڑ گیا
ہر چند مثلِ خانۂ دُنیائے بے ثبات ۔ میں خانماں خراب بنا پر بگڑ گیا
اک دن وہ آئیگا کہ کہینگے فلک کو سب ۔ خیمہ تو بے طناب بنا پر بگڑ گیا
کام اپنا بد سلوکئ گردوں سے بارہا ۔ بے دخلِ انقلاب بنا پر بگڑ گیا
وہ بے ثبات ہوں کہ پس مرگ مقبرہ ۔ ہر چند لاجواب بنا پر بگڑ گیا
ایوانِ عیش اہلِ فنا کو نہ پوچھیے ۔ مانندِ بزم خواب بنا پر بگڑ گیا

چلتا نہیں ہے ابلقِ ایام ایک چال
کتنا یہ بد رکاب بنا پر بگڑ گیا

صلائے عام کا یہ طرزِ بیان جو مضمونِ پریشان میں اختیار کیا گیا ہے ولایت کے اچھے اچھے خوش بیانوں اور نازک خیالوں کی تقلید کا نمونہ ہے۔ مجھے سنسکرت کا علم نہیں اور علم نہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ اولاً خویش بعدہٗ درویش مجھے اپنی ہی زبان سے اتنی فرصت نہیں کہ غیر زبانوں میں کمال پیدا کرنے کی اُمید ہو: کچھ عربی زیادہ فارسی میں نے دیکھی ہے دونو زبانوں کی نثر میں زبان کی خوبیوں میں شک نہیں نثر میں خیال کی طرف توجہ بہت کم دیکھنے میں آئی ؛ زبان و خیال کی جیسی خوبیاں ہیں ہر زبان نے نظم میں ختم کر دیں ۔ اُردو کی شاعری

[1] از کلام نواب امین الدولہ سید آغا علیخاں بہادر - فیروز جنگ -

(باقی)

میں بھی نہ زبان زیادہ اور خیال کیطرف کم وبیش توجہ نظر آتی ہے مگر نثر کی طرف از روئے ناز کخیالی کوئی نظر اٹھا کر نہیں دیکھتا + صلاے عام نے بادۂ کہن کی خاصیت پیدا کی کہ مئے دو آتشہ کیطرح دل ودماغ دونوں کو قابو میں کرلیا۔ اِس کا نشہ از روئے زبان دماغ کو چڑھا اور از روئے خیال انسان جھومنے لگا کہ یہہ بات تو کبھی سُننے میں نہیں آئی تھی خواب دیکھنے میں آئی۔ اگر سُنی تھی تو یہہ اثر نہ ہوا کہ یہاں گرے وہاں گرے: یہہ لغزشیں صحبتِ حال وقال کی کیفیتیں رکھتی ہیں کہ بیہوشی میں ہوشیاریوں کا لُطف حاصل ہے:

عطرِ کلامِ ظفر

صلاےٴ عام کے مہربانوں میں سے ایک صاحب نے کلیاتِ ظفر کے چیدہ چیدہ اشعار کا ایک مجموعہ مرتب کیا ہے جس میں کئی شقیں رکھی ہیں۔ شق "گرمیٔ کلام ورنگینیٔ تخیل" کے تحت جو اشعار جمع کئے ہیں انکا کچھ حصہ ناظرینِ صلاےٴ عام کی ضیافتِ طبع کے لئے ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔ امید کہ انکا مطالعہ خالی از دلچسپی نہو گا ٥

وہ قیامت ہے مرا نالہ کہ دم میں ہمدو ٭ بند کردوں صورِ اسرافیل کی آواز کو ٭
خیمۂ آسماں کو ایک دم میں دے جلا ٭ وہ بلا آتش ہمارے نالۂ سوزاں میں ہے ٭
گر لگے میری ہوائے آہِ سرد اے سرد مہر ٭ مشعلِ خورشید بھی یکبار گردوں پر بجھے ٭
کاسۂ گردوں ابھی بہتا پھریگا چوں حباب ٭ جوشِ گریہ سے مرے اے چشم گر دریا چڑھا ٭
بارش سے مرے ابرِ مژہ کے عجب نہیں ٭ موسم رہے تمام برس برشگال کا ٭
کیا منہ ہے ابر کا جو کریگا مقابلہ ٭ دریا بھرے ہوئے وہ مری چشمِ تر میں ہیں ٭
ان کو انجم مت سمجھنا میرے تیرِ آہ سے ٭ ہوگئے ہیں روزن یکسر سینۂ افلاک میں
سُنا میرا نالہ تو خوش ہو کے بولے ٭ کہ نغمہ سرا کون یہ خوش گلو ہے ٭
میری آہِ آتشیں کا بھی تماشہ دیکھئے ٭ تُمنے ہیں چھٹتے انارِ آتشیں دیکھے بہت ٭

ہمسری اسکی کرے اب لاکھ گردوں پر ہلال ٭ پر خمِ ابرو کی تری اور ہی کچھ شان ہے
جام بر کفِ گل ہے اور غنچہ سبو بر دوش ہے ٭ کیا چمن میں آج پھر دورِ مئے گلگوں ہوا

سید وزارت علی

شاعر

شاعر کچھ محض اسوجہ سے شاعر نہیں کہا جا سکتا کہ وہ کلام کو موزوں کرتا ہے۔ بلکہ خوبی کلام سب سے پہلا جوہر ہے جو شاعری کے واسطے بطریق لازم درکار ہے۔ موزونی طبیعت کی ایک خداداد نعمت ہے جو شاعر کو شاعری کے واسطے موزوں بناتی ہے۔ اگر یہ دونوں صفتیں یعنی خوبی کلام اور موزونی طبیعت کسی شاعر میں موجود ہیں تو وہ بیشک شاعر ہے۔ موزونی طبیعت کیواسطے تو کسی اکتساب کی حاجت ہی نہیں ہے وہ تو قدرتی عطیہ ہے مگر خوبی کلام کے واسطے بہت کچھ مادہ درکار ہے جسکا تعلق دل و دماغ دونوں سے تخصیص رکھتا ہے اور جسقدر علم و فضل و صحبت و سفر زیادہ اسیقدر خوبی کلام زیادہ ہوتی ہے۔ علم تو وہ شے ہے کہ جس سے انسان کمال کو پہونچ جاتا ہے۔ چنانچہ سعدی علیہ الرحمتہ فرماتے ہیں کہ بنی آدم از علم یابد کمال ؎ نہ از حشمت و جاہ و مال و منال۔ یہ ظاہر ہے کہ انسان کو فضیلت جو اپنے ابنائے جنس پر حاصل ہوتی ہے یا ہو سکتی ہے وہ محض علم کی بدولت اور جب تک مختلف صحبتیں کوئی شاعر نہ اُٹھا لیوئے اُس وقت تک اُسکی واقفیت ناتمام ہی رہتی ہے علیٰ ہذا القیاس جب تک سفر نہ کرے اور مختلف ملکوں کو نہ دیکھے تب تک قدرت کے تماشوں سے مطلق بے بہرہ رہتا ہے۔ ع بسیار سفر باید تا پختہ شود خامے۔

اگر ایک ہوشمند شخص جو اوصاف متذکرہ صدر سے بہرہ مند ہے تو وہ شاعری بھی ایسی کر سکتا ہے کہ جس سے شاعر مشہور ہونے کی قابلیت رکھتا ہے۔ اور مستحقِ شہرت بالضرور ہے۔

کسی نثار کے واسطے ہرگز اُس قابلیت کی ضرورت نہیں ہے جو ایک شاعر کو شاعر بناتی ہے۔ ایک نثار کی قابلیت محض دماغی قوت پر منحصر ہے مگر ایک شاعر کی قابلیت دل و

و دماغ دونوں کی قوتوں کی محتاج ہے۔ دماغی قوت تو ایک نثار کو محض مضمون آفرینی میں مدد دیتی رہتی ہے۔ اور قوت متخیلہ اس کو مضمون کے لکھنے میں نازک خیالیوں میں وسعت پیدا کردیتی ہے۔ مگر ایک شاعر کے دل کی قوت تو گوناگوں رنگوں سے اس کے مضمون کو نظم کرتی رہتی ہے۔ اور موزونی طبیعت اس کی معین ہوتی چلی جاتی ہے ایک نثار اس قدر غور اپنی نثر لکھنے میں ہرگز نہیں کرتا جتنا فکر ایک شاعر کو کرنا پڑتا ہے۔ ایک شاعر کو علاوہ مضمون آفرینی کے قوافی و ردیف غضب کی الجھن میں ڈالے رکھتے ہیں اور وہ اپنے مضامین کو قدرت کے تماشوں سے رنگارنگ بناتا رہتا ہے۔ اور وہ اپنی نظم لکھنے اور ہر دل عزیز کرنے کی کوشش میں مستغرق رہا کرتا ہے۔ اور یہہ استغراق اُس کا ایک خاص دل کی کشش سے پیدا ہوتا ہے وہ اپنا رات اور دن اسی مصروفی میں خرچ کرتا ہے اور گھنٹوں اس کو اپنے خیال کی بندش کسی اور کام میں مصروف ہونے سے باز رکھتی ہے۔ ایک نثار کو یہ دقتیں کاہیکو پیش آتی ہیں۔ اور قافیہ اور ردیف اس کو کب گھیرتے ہیں۔ اس کو تو صرف اپنے مضمون کو خواہ معقولات خواہ منقولات کی بنا پر لکھ دینا ہوتا ہے نثار کی نثر شاذ و نادر ہی کسی کی زبان پر ہوتی ہے مگر ایک شاعر کا کلام ہزاروں انسانوں کی زبانزد ہوتا ہے اور اُس کے مرجانے پر بھی اس کو خوبی کے ساتھ لوگ یاد کرتے رہتے ہیں۔ اکثر نظیروں میں شاعروں ہی کے کلام پیش ہوتے رہتے ہیں اور شاعر اپنے کلام کی بدولت ہمیشہ زندہ رہتا ہے اور اس کلام تازہ نظر آتا ہے۔

شعر و شاعری کا ہر کس و ناکس گاہک ہوتا ہے۔ جو لوگ لکھنے پڑھنے کے ہنر سے محض سب بے بہرہ ہیں وہ بھی کلام شعرا کو از بس خوش الحانی سے ازبر یاد رکھا کرتے ہیں اور شعرا ہی کے کلام ایسے پُر تاثیر ہوتے ہیں جو دل تک ہلا دیتے

ہیں ان ہی کے کلاموں میں وہ تاثیریں ہیں کہ انسان کو اپنا شیدا بنا لیتی ہیں۔ ان ہی کے کلام سے جوش و خروش پیدا ہوتا ہے۔ حتیٰ کہ کمزور بھی کلام کو سُن کر طاقتور ہو جاتے ہیں۔ شعرا کے کلام میں عجیب و غریب تاثیرات ہیں اور جس طرح سے کہ رگوں میں خون دوڑتا ہے کلام شاعر کی تاثیر ہر رگ و پے میں اثر کرتی ہے۔

شاعر پر ایک بے خودی کا عالم طاری ہوتا ہے وہ اپنے خیال میں بعض اوقات تو ایسا ڈوب جاتا ہے کہ اُسے دنیا و مافیہا کی خبر نہیں رہتی شاعر تنہائی پسند ہوتا ہے اور اس کا سبب یہ ہے کہ وہ اپنے خیال میں دوسرے کی معیت پسند نہیں کرتا اور اس کے ذہن کی رسائی میں خاموشی کے عالم میں ترقی ہوتی ہے اور وہ اپنے خیال کی محویت میں بڑا لطف پاتا ہے جب اس کی طبیعت کو یکسوئی حاصل ہوتی ہے تو نازک خیالیوں سے اپنی نظم کو مُرصع کر دیتا ہے اور جب شاعر ایسا تنہائی کا مقام پا جاتا ہے جہاں صنعتِ انسانی کا گذر نہیں ہو سکتا اور قدرت کا سبزہ زار سامنے ہوتا ہے تو وہاں سے ہٹنے کو اس کا جی نہیں چاہتا۔ حافظ شیراز رح فرماتے ہیں ؎

من ایں مقام بہ دنیا و عاقبت نہ دہم ٭ اگرچہ در پیم افتند خلق انجمنے ٭

اور جو لوگ ایسے مقام کو چھوڑ بھاگتے ہیں وہ شاعری کا لطف نہیں اُٹھا سکتے ؎

ہر آنکہ کنج قناعت بہ گنج دُنیا داد ٭ فروخت یوسف مصری بکمتریں ثمنے ٭ ایسے لوگوں کو یہ نصیحت ہے ؎

ببیں در آئینہ نقشبند صورتِ غیب ٭ گرت زملکِ قناعت ہوس کند وطنے۔ شاعر ہر طرح سے آزادی پسند طبیعت رکھتا ہے اور نظارۂ قدرت سے لطف اٹھاتا ہے اور اس وقت اس کی موزونی طبیعت عجب عجب نازک خیالیوں کا انکشاف کرتی ہے۔ سچ یہ ہے کہ شاعر ہوا اور ع فراغتے و کتابے و گوشۂ چمنے فقط راقم مرزا عرفان علی بیگ (آنریری مجسٹریٹ آگرہ) ای ایس او

ابجد

موجودہ زمانہ میں عربی و فارسی کے الفاظ کی مٹی خراب ہے۔ آجکل کے ابجد خوانوں کو املے کی صحت سے کچھ واسطہ ہی نہیں ہے۔ ایک صاحب نے مجھے املا کی غلطی سے بھرا ہوا ایک خط بھیجا میں نے اُن سے ایسی بداملگی کی شکایت کی اُنہوں نے مجھے باتوں باتوں میں ایسا سمجھایا کہ جس سے اُن کی لیاقت علمی کا مجھے پورا یقین آگیا اُنہوں نے اسانی کے ساتھ اپنے املے اور اپنے قول کی تائید کرنے کے بعد فرمایا کہ آخر ش اس بد املا تحریر سے بھی آپ کو میرا منشاء تو معلوم ہو ہی گیا اور اس سے زیادہ لکھنے پڑھنے کا مقصد کیا ہو سکتا ہے۔ میں اُن کی باتیں سن سن کر حیرت میں آتا تھا اور میرے پاس ایسی بے تکی باتوں کا کوئی جواب بھی نہ تھا بجز اس کے کہ میں اُن کے جواب دینے سے اپنی خاموشی کو افضل تر سمجھا گو اس میں ایک بات تو ضرور ہے کہ املا کی صحت کا خیال تو کاتب کے دل سے ضرور محو ہو جاتا ہے اور وہ بے خوف و خطر اور بلا کسی قسم کی روک کے قلم چلانے سے باز نہیں آتا۔ ان جدید ابجد خوانوں کا دل اس پر مائل ہے کہ الف بے کے حروف میں یہانتک کمی کر دی جاوے کہ قریب المخرج حروف کے لفظ چاہے جس حرف سے لکھے جاویں اور اُن میں کوئی تمیز باقی نہ رکھی جاوے۔ مثلاً ث س ص جن الفاظ میں واقع ہوں

تو وہ منجملہ ان تیس حرفوں کے کسی ایک دو اور تین سے لکھے اور پڑھے جا سکتے ہیں بالکل گویا کہ دیوناگری کا طریقہ اختیار کر لیا جاوے۔ مثلاً افسوس کا لفظ افصوص افصوس افثوث افسوث وغیرہ ہر طرز پر لکھا جائز سمجھ لیا جاوے۔

لیکن اس سے تو بہتر یہ ہو کہ حروف قریب المخرج ہیں وہ صرف ایک ہی حرف سے لکھے جاویں۔ جیسے کہ افسوس صرف سین سے لکھا جاتا ہے تو ث و ص کے الفاظ بھی سین ہی سے لکھے جاویں۔ جیسے ثمر کو سمر۔ صف کو سف۔ خلاصہ یہ کہ حروف کا استعمال حسب ذیل کیا جاوے۔

حرف مندرجۂ ذیل استعمال کیا جاوے	بجائے حروف مندرجۂ ذیل کے
س	ث۔ ص۔ س
ہ	ح۔ ہ
ذ	ذ۔ ز۔ ض۔ ظ
ت	ط۔ ت
ا	ع۔ ا
گ	غ۔ گ
ک	ق۔ ک
۷	میزان ۱۶

دوسرے طرز پر اسکے معنی یہ ہوتے ہیں کہ بجائے سولہ حروف مذکورۂ بالا کے صرف سات حرفوں سے کام نکال لیا جاوے۔ مگر افسوس یہ ہوگا کہ جس زبان کا جو کوئی لفظ ہے وہ اُس زبان کا نہ رہے گا اور بجائے عربی و فارسی الفاظ کے جو اُردو زبان میں مستعمل ہیں جدید الفاظ ہندی کے بنا لئے جاویں گے۔ فقط

وادری کی سمجھ بوجھ۔ اچھی سوجھی جہاں سب چیزیں سُدیشی ہوں وہاں لفظیں بھی سُدیشی ہو جاویں۔ زبان غیر سے بالکل تعلق توڑ دیا جاوے۔ زمانہ کی اس لیاقت اور اس خیال کو دیکھکر بہت بڑا افسوس معلوم ہوتا ہے۔ گو ہندو اور مسلمان منہ سے کہہ لیویں اور قلم سے لکھدیویں کہ وہ ایک دل و ایک رائے اور ایک قوم بن گئے مگر کوئی صاحبِ عقل کب اس کو باور کر سکیگا۔ اسی طرح سے گو وہ لفظوں کو بگاڑا کریں مگر جو لفظ جس زبان کا ہے وہ اُسی کا ہو کر رہے گا۔ ہاں دیو ناگری میں اگر لفظیں لکھی جاویں گی تو بیشک کوئی لحاظ صحت لفظی اور املا کا ہرگز نہیں رہے گا جیسا کہ اب بھی اسی طرح سے تحریر عمل میں آتی ہے اور عبارت کبھی مہمل نہیں ہوتی پوری طور پر سمجھ میں آجاتی ہے سہ

ضاد و ذال و ظوے زے پر آ گری ؛ ہے نرالا طرز دیو ناگری
زے بھی اس میں جیم لکھی جاتی ہے ؛ کب سمجھ میں بات جےؔ کی آتی ہے[1]
تا و صاد و سین یہ سب حرف تین ؛ ناگری خط میں لکھے جاتے ہیں سین
حائے حطی ہو وہ یا ہوز کی ہے ؛ لکھتے ہیں ہر ایک ہے کو چھوٹی ہے
طا و تا کا ایک مخرج کرتے ہیں ؛ عین و ہمزہ کو الف سے لکھتے ہیں
غین کو بخشا تلفظ گاف کا ؛ قاف کو دیتے ہیں مخرج کاف کا
فا کے بدلے پھا کو لاتے ہیں کہیں ؛ کیونکہ فا تو ناگری میں ہے نہیں

دیکھو عارف تمکو آ رہچھ لکھتے ہیں
یہ جباں داں جلم بیحد کرتے ہیں[2]

[1] زے کو جے لکھتے ہیں جیسے زبان کو جبان ۱۲ [2] زباں داں ظلم بیحد ۱۲

قدرِ صلائے عام

صلائے عام کی قدر کے ثبوت میں ولایت کے ایک عالم متبحر کے خط کا اقتباس یہاں لکھا جاتا ہے - یہہ خط پچھلی ڈاک میں مجھے پہونچا ہے صاحب تحریر السنہ مشرقیہ عربی - فارسی اور ہندی میں کامل لیاقت رکھتے ہیں اور صلائے عام کی طرزِ بیاں کو پسند فرماتے ہیں ؛ اس تحریر سے نہ صرف صلائے عام کی قدر دانی ثابت ہوتی ہے بلکہ جامع اوراقِ صلائے عام کے ساتھ نظرِ الطاف بھی کہ میری زندگی کا صاحبِ ممدوح کو خیال رہا - حالانکہ حضور سے مجھے شرفِ ملازمت کبھی حاصل نہ ہوا : محض صلائے عام کی وجہہ سے یہہ مرتبہ مجھے حاصل ہوا ہے ؛

from Oxford (England)

Extract from a letter dated 11. February. 1923. from R. P. Dewhurst, Esquire

---

× × × × × × × × × × × × × × × × × ×

" A few days ago a copy of the December nmber of the Sala-i-Am reached me. I had

never had a copy of it for over three years and I had begun to fear that you were dead.

I am particularly glad to see that you are not only still living but writing with the same skill and in the familiar and admirable style.

I am very pleased indeed and hope that the Salâ-i-Am may be sent to me regularly. × × × × × × × × × × × × × ×
× × × × × × × × × × × × × × ×

with all good wishes.

I remain,

your sincere friend,

R. Paget Dewhurst.

(I.C.S. Retired)

(Late Session Judge, Oath Commission.)

× × × × × × × × × × × × × × × × ×

"اس رسالہ کا عارضی التوا اُردو زبان کی بڑی بدنصیبی تھی۔ اور اس بات کی دلیل کہ اُردو والوں میں صحیح ادبی ذوق ابھی تک مفقود ہے۔ آپکی پاکیزہ دکونثر دھلی ہوئی زبان۔ آپ کی فلسفیانہ وشاعرانہ نازک خیالیاں۔ اور آپ کا بے نظیر اسلوب بیان ان سب خوبیوں کو رسالہ کی ہردلعزیزی اور قبول عام کا ضامن ہوتا تھا۔ لیکن دنیائے اُردو کا باوا آدم ہی نرالا ہے۔ آپ کے ہم وطن غالب کو اپنے زمانے میں کس کس کے طعنے نہ سُننے پڑے۔ لیکن وہ اپنی جگہ سے نہ ہٹا۔ اور آج ساری دنیا اس کے کمالات کی معترف ہے۔ یہی حال آپکی نثر کا بھی ہونے والا ہے۔ آنے والی نسلیں ہرگز اس سے وہ بے اتفاقی نہیں کرسکتیں جو موجودہ نسل کررہی ہے۔ آپ اپنے کام میں مصروف رہیں۔ اور صلائے عام کو بالاستقلال نکالتے رہیں۔"

× × × × × × × × × × × × ×

خاکسار قاضی عبدالودود۔ از پٹنہ۔

از روئے انصاف

صلائے عام میں لارڈ لارنس صاحب کے متعلق آپ نے واقعی اچھا مضمون لکھا ہے۔ اس کی خوبی اس سے ظاہر ہے کہ جب میں نے پڑھنا شروع کیا تو طبیعت میں یہہ آیا کہ محض خوشامد سے لکھا ہوگا۔ لیکن جب اخیر تک پڑھا تو قائل ہوگیا کہ واقعی جان لارنس کے دہلی والوں پہ بڑے احسان ہیں۔ اب اگر میرے سامنے کوئی لارنس کی بُرائی کرے تو میں قطعی لڑ پڑوں۔ لوگ اصل میں کسی بات کو غور و تعمق سے تو دیکھتے نہیں۔ اوپری

باتوں کا خیال کرکے شور مچا دینا اپنی پولیٹیکل زندگی کا معیار سمجھتے ہیں × ×

× × × × × × × × × × × × × × × × × ×

صلائے عام - یہہ رائے ازروئے انصاف اُس مضمون کی نسبت ہے جو فروری کے پرچہ میں اِس سرخی کے ساتھ شایع ہوا کہ

"دلی کس نے بچائی ؟"

فروری ۱۹۲۳ء کے صلائے عام کی داد

صلائے عام ماہ فروری ٹھیک یکم مارچ کو مجھ تک رسالے نے پہونچایا۔ شکریہ ادا کرتا ہوں ٭ آپکا یہ کلام چونکہ امرِ حق ہے لہذا ازبس دلپذیر ہے کہ "غیر زبانوں میں آپ ناقص رہیں تو عیب نہیں ہے اپنی زبان میں غلطی اگر کوئی بخشدے تو گناہ کبیرہ سے بدتر ہے"۔ اور کس فصاحت کے ساتھ مضمون صلائے عام آپ کی زبان سے نکلا ہے کہ قلم بھی فصاحت کا دم بھرتا ہے اور کیا اچھی بات کہی ہے کہ "آپ ہی انصاف کریں کہ ہم ہندوستانی ہوکر ہندوستان ہی کی زبان بیکار جانیں"۔ خدا کرے اِس کا اثر ہر دل میں پیدا ہو۔ آمین - میں تو ہر فقرہ لاجواب پاتا ہوں کون سا نثار اور کون سا شاعر اِس نازک خیالی کو اِس خوبی کے ساتھ بیان کرسکیگا گویا یہ مجھ سامنے کا واقعہ ہے اور چشم دید ہے کہ "حسینوں کے منہہ موڑنے سے بھی اُنکی کمر سے نزاکت کا پتہ چل جاتا ہے"۔ ماشاءاللہ خوب سراغ لگایا ہے۔ باید وشاید مجھے حضرت یاسؔ کا یہ شعر بہت پسند آیا کہ ؎

دستِ خود دامانِ خود بودن ندارد لذتے ٭ دستِ گستاخے دگر خواہیم دامانے دگر۔

واہ رے پر ارمان ؛

یہ مضمون کہ "دلّی کس نے بچالی؟" بہت ہی قابل قدر ہے اور اُن کوتہ اندیشوں کے واسطے جو سرجان لارنس صاحب بہادر کے یادگار کو مٹانا چاہتے ہیں بہت ہی پرتاثیر نصیحت ہے۔ خدا کرے کہ وہ اب بھی سمجھیں اور محسن کُشی اور احسان فراموشی سے باز آئیں۔

جب صلائے عام کے ۵۲ صفحات پڑھ چکا تو شاعری و فلاسفی کا مضمون نظر آیا اس پر طبیعت نے بے ساختہ یہ فیصلہ کر دیا کہ میں بھی شاعر کے متعلق کچھ عرض کروں چنانچہ مضمون شاعر نذر ہے فقط

آپکا نیازمند۔ عرفان علی

(آئی۔ ایس۔ او۔ آنریری مجسٹریٹ آگرہ)

کسی طرح سے تو آئے اُنہیں خیال اپنا ؛ ضرور چاہئے اُن سے بیانِ حال اپنا
دل کو اے یار سمجھ عاشق شیدا اپنا ؛ دیکھ اس آئینہ میں بے پردہ تماشا اپنا

× × × × × × × × × × × × × × × × × × × ×

"فروری کا صلائے عام نظر سے گزرا۔ آپ کی زبان، آپ کی اسلوب بیان اور نیز آپکے پاکیزہ خیالات کے متعلق مجھ ایسے ہیچ مداں کا کچھ لکھنا اگر سوء ادب نہ ہوتا تو میں ایک ایک فقرہ کی داد دیتا۔ حقیقت یہہ ہے کہ آپ کے مضامین تعریف و توصیف سے بے نیاز ہیں۔ اور اُردو کی عزت آپ کے دم سے قائم ہے۔

برہمن کا کلام شایع فرما کے آپ نے اہل ذوق پر خاص احسان کیا ہے۔ برہمن باوجود ہندو ہونے کے عمدۂ شعرائے شاہجہانی میں ہے۔ اللہ اللہ! ایک وہ زمانہ تھا کہ ہندو فارسی میں اہل زبان کی طرح دادِ خوش کلامی دیتے تھے۔ اور آج اُردو سے وہ نفرت

ہے کہ اگر بس چلے تو ہندوستان سے اسے خارج کردیں۔ میں بھی آج ایک ہندو شاعر کا منتخب کلام فارسی ایک قدیم قلمی بیاض سے جو تقریباً ڈیڑھ سو برس قبل کی لکھی ہوئی ہے نقل کرکے ارباب خدمت کرتا ہوں۔ انکا ترجمہ میں نے تذکرۂ مصحفی میں دیکھا ہے مگر اس وقت موجود نہیں کہ ان کے کچھ حالات لکھ سکوں۔ دہلی کے ایک اور باکمال قدرت اللہ۔ قدرت مرحوم کا کلام فارسی بھی بھیجتا ہوں۔ قدرت مرزا جعفر علی حسرت اور شمس الدین فقیر کے شاگرد تھے۔ اردو کے تو مستند اساتذہ میں ہیں لیکن فارسی کلام میں بھی پختگی موجود ہے۔ مولینا روم کے ایک شعر کا جواب کیا خوب دیا ہے۔ میں دونوں نقل کرتا ہوں ؂

مولانا روم۔ "میگفت چشم مستش با کاکل سیاہش ؂ من مے دہم فلاں را تو در رہ با کلاہش"

قدرت۔ "میگفت چشم ابرو بازلف چوں کمندش ؂ من مے کشم فلاں را تو دست و پا بہ بندش"

میرا یہ مطلب نہیں کہ قدرت کا شعر مولانائے شعر کے برابر ہے۔ لیکن اس ہندی نژاد شاعر کی جرأت تو دیکھو۔

نیازمند قاضی عبدالودود (از پٹنہ)

کلام رائے صاحب سنگھ خاموش دہلوی

یارب کہ رساند خبر آں تازہ جواں را ؂ کامشب دم نزع ست زہجر تو فلاں را

پابند غم دہر دل پاک نہ گردد ؂ خاشاک نہ گیرد سر رہ آب رواں را

چشمۂ خورشید تاباں را بہ خاک اندودن ست ؂ نیست حاجت مہ جبیں صندل بہ پیشانی ترا

شادم کہ مرا ہم غم یارے شدہ پیدا ؂ باخستہ ولانت سر و کارے شدہ پیدا

پیرانہ سرم عشق تو آتش بدل افروخت ؂ فریاد دریں پنبہ شرارے شدہ پیدا

بہ پیری مکن توبہ از عشقِ خوباں ۞ کہ آتش بہار است برگِ خزاں را
بہ فکرِ تخالم نظر کن کہ خواہم ۞ کنم مہرباں چوں تو نامہرباں را
در حسرتِ گفتارِ تو اے غنچۂ خاموش ۞ خارے نتواں یافت کہ در پیرہنم نیست
در غمِ عشقِ تو برایں تب و تابے کہ مراست ۞ کہ زند آب بہ جز چشمِ پُرآبے کہ مراست
گفتہ بوالہوسم پیشِ رقیباں ظالم ۞ جز نکو گشت نتواں گفت جوابے کہ مراست
بودے وفا بہ مرگ ز آب و گلم نہ رفت ۞ جاں رفت از تنِ من و مہر از دلم نہ رفت
ممنونِ بختِ جانیِ خویشم کہ از سرم ۞ تا بود در تنم رمقے قاتلم نہ رفت
چشمِ تو ز احوالِ منِ زار چہ پرسد ۞ بیمار عیانست ز بیمار چہ پرسد
نتوانم ز غمت پیشِ کس اظہار کنم ۞ شکوہ بر لب چو رسد از تو دعا می گردد
دل دار ازیں دیدۂ گریاں گلہ دارد ۞ آں تازہ گل از ابرِ بہاراں گلہ دارد

کلام خان بہادر میر علی محمد صاحب شاد عظیم آبادی

کون سی بات نئی اے دلِ ناکام ہوئی ۞ شام سے صبح ہوئی صبح سے پھر شام ہوئی
وقتِ رخصت ہے مسافر کو جو فکرِ انجام ۞ عمر بھر کون سی تدبیر سرانجام ہوئی
لعلِ احمر سے بھی رتبہ میں سوا ہیں وہ لب ۞ داغ دیدہ ہوئے گر عادت دشنام ہوئی
باتیں واعظ کی کہاں تو نے اڑا لیں اے مست ۞ میکشی مفت تری چال سے بدنام ہوئی
سچ ہے غیروں کی کہاں موت کہاں تو مری ۞ اب پریشاں نہ تری زلفِ سیہ فام ہوئی
جھک کے صیاد نے کچھ ہنس کے جو چہرہ دیکھا ۞ نو گرفتار کو ایک عید تہِ دام ہوئی
خضر بھی راہِ رضا میں یونہی دیکھا کئے منہہ ۞ مرحلہ سخت تھا لغزش مجھے ہر گام ہوئی
شاد ایجاد کرو پھر نئی ترکیب کوئی ۞ جو روش خاص تمہاری تھی وہ اب عام ہوئی

ریویو

رسالہ ہمایوں لاہور

رسالہ ہمایوں کے دیکھنے کا مجھے کم و بیش شوق تھا - کیوں کہ میں چاہتا ہوں کہ صاحب سروشتہ زبان کی طرف زیادہ متوجہ ہوں -

اہلِ ہنود میں لالہ سری رام صاحب . ایم - اے - نے خمخانہ جاوید کا اہتمام شروع کرکے - ہماری اُردو شاعری پر احسان کیا ؛ اور مدیر رسالہ ہمایوں نے آنریبل جسٹس محمد شاہ دین صاحب مرحوم کی یادگار میں رسالہ نکالکر رسالہ والوں پر احسان کیا ؛ میری آرزو ہے کہ جس قدر اصحاب دولت و جاہ اس فن کی طرف توجہ کریں اُسی قدر لکھنے پڑھنے والوں کی عزت ہے ؛ یادگار کی یہہ نئی ترکیب ہے جو پہلے ہندوستان میں رائج نہ تھی ؛ ہمایوں کے آغاز کے پرچے میں نے نہیں دیکھے جس سے معلوم ہو کہ یادگار کی یہہ طرز کیسی ہے - اور اس کے متعلق کیا دلائل ہیں ؛ ماہ مارچ ۲۲ء کے پرچہ میں زیادہ مسالہ انعامی مضامین کے متعلق تھا - ان کے متعلق فیصلہ میری دانست میں ابھی ملتوی کیا جائے تو بہتر ہے - مولوی سید مقبول احمد صاحب . بی - اے - الہ آبادی نے اپنے مضمون کے اخیر میں جو کچھ لکھا ہے اس سے مجھے اتفاق ہے - وہ مذاق بگاڑنے والوں کی شرح اس طرح لکھتے ہیں ؛

"اصل میں وہ سب سے بڑے مجرم ہیں بدی دُنیا میں بہت جلد پھیلتی ہے نہایت لغو اور لچر مضامین پر کتابیں خوب نکل جاتی ہیں - میرے ایک دوست

صرف کشمیری لوگ شاستر بیچتے ہیں۔ اور شہرت سے زیادہ کما چکے ہیں۔
مذاق کے بگاڑنے والے دو قسم کے لوگ ہیں۔ ایک تو اخبار کے کم علم اڈیٹر۔ دوسرے خلافت کے جوشیلے ممبر۔ مولانا محمد علی کی ماں کا پیغام۔ اور وہ غزل۔ "جان بیٹا خلافت میں دیدو" ہاتھوں ہاتھ بک گئی ہے۔ مولانا آزاد کا خلافت پر ایک خطبہ کئی ایڈیشنوں میں شایع ہو چکا ہے۔ اور شایع ہوتا رہے گا۔ کچھ نہیں۔ حجاز کے چشم دید حالات لکھ مارو۔ جیسے سرنامہ ہیں۔ اور سب کچھ اَلَمْ غُلِبَتْ میں کہہ جاؤ۔ میرا ذمہ۔ اگر مہینے تک کوئی کتاب بکنے سے باقی رہ جائے۔ یا انگریزی حکومت کی لعنت۔ جب تک گورنمنٹ اس کو ضبط کرے گی۔ تمہاری کتاب بک چکے گی۔ اِس پر مجھے سرسید کی لائف کا ایک واقعہ یاد آیا۔ ایک صاحب نے آکر اُن سے شکایت کی کہ کچھ کھانے کو نہیں کہیں سفارش کرکے اُنکو نوکر رکھا دیں۔ اُنہوں نے کہا یہ تو میں نہیں کر سکتا۔ مگر تم کو ایک بڑا اچھا لٹکا بتا دیتا ہوں۔ تم جاؤ ہماری کسی کتاب کی تردید میں ایک رسالہ لکھ ڈالو۔ مگر خیال رکھنا کہ ہر صفحہ میں مجھے دس بیس مغلظات اور اسی تعداد میں بے نقط سنانا۔ تھوڑے دن میں تم کو نوکری کی حاجت نہ رہے گی۔ اُنہوں نے یہی کیا اور واقعی وہ امیر ہو گئے ؛

تو اس مذاق کا رونا سرسید کے وقت سے ہے۔ اس کی اصلاح کیونکر ہو ضرورت اس کی ہے کہ ہم ایک مجاہدہ علمی شروع کریں۔ علمی مذاق کے رسالے جیسا ہمارے سامنے "ہمایوں" ہے ہر طرف سے صف باندہ کر نکلیں اور اس قسم کی مطبوعات۔ جیسے مولانا محمد علی کی ماں کا پیغام۔ مولانا آزاد کا خطبۂ خلافت۔ شیخ سنوسی کے حالات وغیرہ وغیرہ کو شایع کرنا کم کردیں۔ یہاں پر

مُسلمانوں کے علم و فضل کی تحقیق

اکتوبر کے رسالہ صلائے عام میں اُس مضمون کو اِس کے ساتھ پڑھو جو مسلمانوں کے علم و فضل کی تحقیق کے عنوان سے چھاپا گیا ہے جس میں مسلمانوں کے علم و فضل کے معراج کو اُن کو بے بنیاد اور علمی شہرت کو محض مبالغہ بیان کیا گیا ہے اور یہہ کہکر مسلمانوں کے علم و فضل سے انکار کیا گیا ہے کہ مسلمانوں نے صرف یونانیوں کی کتابوں کے ترجمے کئے اور کچھ نہ کیا اور مسلمانوں کے دعوائے ترقی علوم و فنون کو بلا دلیل بیان کیا ہے ہم اسکے جواب میں ایک مختصر مضمون اول لکھ چکے ہیں۔ آج یہہ دکھانا ہے کہ اہل یورپ کا سرمایۂ علم و فضل آیا کہاں سے ؟

فریڈریک ثانی پہلا شخص ہے جسنے عام طور سے یورپ میں اسلامی علوم و فنون کے مدارس قائم کئے۔ یہہ شخص ۲۶ دسمبر سنہ ۱۱۹۴ء میں پیدا ہوا تھا اور بالرم میں تعلیم و تربیت پائی بالرم اس وقت عرب کے حُکماء و علماء سے بھرا ہوا تھا۔ فریڈریک مسلمانوں کے تہذیب و تمدن کا بہت دلدادہ تھا یہاں تک کہ اس کا باڈی گارڈ بھی مسلمان تھا اس کے قلعے محلات مسلمانوں کی عمارتوں کے طرز کے تھے۔ اس سے یورپ کو بہت کچھ علمی نفع پہونچا یا۔ جب مسلمانوں نے اندلس کو فتح کیا اور فرانس میں داخل ہوئے تو مسلمانوں کے لٹریچر نے فرانس پر نمایاں اثر ڈالا خاص کر شاعری پر۔ پہلے فرانس والے جو شعر کہتے تھے اُس میں قافیہ کی پابندی نہ تھی عرب کی تقلید

اب قافیہ لازمی ہوگیا۔ جب اندلس میں مسلمانوں کی سلطنت کا خاتمہ ہوگیا اور اُس کے بڑے بڑے شہر عیسائیوں کے قبضہ میں آئے تو مسلمان اپنے مرکز سے نکلکر جنوبی فرانس میں پھیل گئے اور مسلمانوں کا مونبیلیہ کی یونیورسٹی پر خاص اثر پڑا۔ یہاں ایک طبی مدرسہ کی بنیاد پڑی۔ اور اہل عرب نے ان کو بہت کچھ نفع پہونچایا۔ یہ ہی مدرسہ یورپ کی دماغی ترقی کا مرکز تھا۔ سسلی کو جب مسلمانوں نے فتح کیا تو اس پر اُن کے تمدن کا رنگ چڑھا چونکہ سسلی وسط یورپ میں واقع تھا اس بنا پر مختلف قومیں انکے رنگ میں رنگی گئیں سسلی کے شہروں سے لیکر دیہات تک عربی تمدن کا اثر تھا۔ خصوصاً بالرم۔ سالرن تو عربی تمدن کا مرکز تھے بڑے بڑے مدارس قایم ہوئے ان میں نابولی کا مدرسہ ممتاز تھا۔ یورپ میں سب سے پہلے مسلمانوں کے علوم حکمیہ کے ترجموں کا مذاق جربرٹ کو ہوا جو ۹۹۹ء میں عیسائیوں کا سب سے بڑا پوپ تھا۔ اس کے بعد ہرمان۔ مقنع۔ قسطنطین۔ افریقی افلاطون طبیوری۔ یوحنا۔ اشبیلی۔ مرقس۔ طلیطلی۔ کریمونی۔ فیلبوث اسکاٹ۔ فراغوث وغیرہ بہت سے مترجمین پیدا ہوگئے۔ اگرچہ ان لوگوں نے عربی کتابوں کے مختلف زبانوں میں ترجمے کئے مگر لیٹن میں کثرت سے ترجمے ہوئے وجہ اس کی یہ تھی کہ عربی زبان ایک مکمل زبان کا دوسری زبانیں لیٹن کے سوا وزن نہ اُٹھا سکیں۔ جن کتابوں کے ترجمے ہوئے ان میں ایک تو وہ کتابیں ہیں جن کو خود اہل عرب نے ترجمہ کیا۔ گو یہ ترجمے عربی میں تھے مگر ان کتابوں کو اصلی مصنفین کی طرف منسوب کر دیا گیا۔ دوسرے وہ کتابیں ہیں جن کو اہل عرب نے معراجِ کمال پر پہونچکر ہر فن میں خود تصنیف کیا تھا۔ مثلاً ابوالحسن فلکی۔ اسکی کتاب کا ۱۸۴۲ء میں ترجمہ ہوا۔ ابوالوفا بوزجانی بتانی۔ جو بہت بڑا ماہر علم ہیئت تھا۔ اسکی کتاب کا ترجمہ ۱۸۴۰ء میں پیرس سے شایع ہوا۔ یعقوب کندی اس کی طبی تصانیف کا ترجمہ لیٹن میں ۱۵۳۱ء ۱۶۳۰ء میں کئی بار شایع ہوا۔ موسیٰ خوارزمی جبر مقابلہ میں اس کی کتاب تھی جس کا ترجمہ علامہ اوزن نے ۱۸۳۱ء میں انگریزی زبان میں کیا ہے۔ ابونصر فارابی

ان لنز

ابن رشد ان کی کتابوں کے طب ہیئت فلسفہ میں مختلف عنوان سے لٹن میں ترجمے ہوئی ہیں۔
ابن سینا قانون اسکی مشہور کتاب سے لاطینی میں ترجمہ ہوئے اور اٹھارھویں صدی کے آخیر تک
اسکی شرحیں شایع ہوتی رہیں۔ قسطنطین افریقی۔ اس کی تصانیف کا ترجمہ ۱۵۳۶ء میں مقام بال
سے شایع ہوا۔ جابر بن حیان کیمسٹری کا بہت بڑا عالم تھا اس کی کتابوں کا ترجمہ فرنچ میں اور
لٹن میں ہوا اور ۱۸۷۸ء میں انگریزی میں اشاعت ہوئی۔ جابر فالکی۔ اس کی کتاب علم ہیئت
میں ہے۔ عباس اس کی کتاب فن طب میں ہے۔ حسن بن الہیثم ریاضی کا عالم تھا اس کی
کتب کا ترجمہ ۱۷۵۲ء میں شایع ہوا ابن العوام اندلسی۔ علم النباتات کا ماہر تھا اسکی کتاب کا
۱۶۳۷ء میں فرنچ میں ترجمہ ہوا۔ قزوینی فن ہیئت۔ جغرافیہ۔ تاریخ طب۔ عجائب المخلوقات کا
ہے فرنچ میں اور جرمن میں اس کی کتب کے ترجمے ہوئے۔ ضیاء ابن بیطار نباتات کا ماہر ہے ۱۸۴۷ء میں
پیرس سے اس کی کتاب مفردات کا ترجمہ ہوا۔ ابن یولس وہ شخص ہے جو علم ہیئت میں استاد
مانا گیا۔ زیچ حاکمی جو بے مثل تصنیف ہے اس کی تالیف ہے۔ اس کا ترجمہ ۱۸۱۳ء میں پیرس سے
شایع ہوا تھا۔ یحییٰ ابن ماسویہ طب کا عالم تھا۔ محقق طوسی علم ریاضی وغیرہ میں بے نظیر محقق ہوا
ہے اس کی زیچ کے ترجمے لٹن میں ۱۶۴۸ء اور ۱۶۵۲ء میں شایع ہوئے۔ الغ بیگ تیمور لنگ
کا پوتہ ہے۔ ریاضی کا عالم تھا اس کی تالیف کے تراجم ۱۶۶۵ء و ۱۸۴۸ء میں پیرس سے شالع
ذکریا رازی بہت بڑا طبیب ہوا اس کی تصانیف کی تعداد ۲۲۶ تک پہونچی علم کیمیا میں آجتک
اس کی تین کتابوں کے ترجمے متداول ہیں۔ ثابت بن قرہ یہہ پہلا شخص ہے جس نے جبر مقا
اور ہندسہ میں تطبیق دی۔ سیدیو نے اس کی تصنیفات کا خلاصہ شایع کیا ہے۔ قصہ مختصر
اگر تمام علماء عرب فارس کی کتابوں کے جن کے ترجمے ہو چکے ہیں نام لکھے جاویں تو ایک کتا
تیار ہو یہ وہ مصنفین ہیں جنہوں نے خود علم حکمت میں کمال حاصل کیا تھا اور انکو استاد سمجھکر ا
کتابوں کے ترجمے اہل یورپ نے مختلف زبانوں میں کئے۔ اور ان سے علوم وفنون حاصل
کیا اس پر بھی مسلمانوں کے علم وفضل کا دعویٰ بے دلیل ہے۔ مرزا محمد علیخاں۔ المخاطب خانصاحب۔

صلائے عام

مجھ سے بڑا تقاضہ احباب کا ہو رہا ہے کہ صلائے عام روزانہ نہیں تو ہفتہ وار کر دیا جائے لیکن میں دیکھتا ہوں کہ اُردو لٹریچر کی ترقی کے لیئے روزانہ اخبار کی اسقدر ضرورت نہیں۔ اول تو روزانہ خبریں انگریزی اخباروں سے زیادہ نقل کیجاتی ہیں۔ انگریزی خواں یہ خبریں انگریزی اخباروں میں پہلے ہی پڑھ لیتے ہیں۔ باسی خبریں دیکھکر کیا کریں؟ اور اب ہندوستان میں بہت کم ایسے لوگ ہیں جو اتنی انگریزی بھی نہ جانتے ہوں کہ معمولی خبریں انگریزی میں نہ پڑھ سکیں۔

خبروں کے لحاظ سے ہفتہ وار اخبار کا زمانہ نہیں کہ جہاں رات دن تار و ٹکا تانتا بندھا ہو تار کی خبر ایک ہفتہ ترجمہ ہو کر دوسرے ہفتہ میں پڑھنا کون پسند کریگا؟

علاوہ اسکے خبروں اور مضامین کا جوڑ نہیں ملتا۔ خبر تو جہاں ایک دفعہ دیکھ لی پھر دیکھنے کو جی نہیں چاہتا روزانہ اور ہفتہ وار اخبار کے پرچے احتیاط سے رکھنا بیکار ہے۔

لٹریچر کے لحاظ سے ماہواری رسالوں کی زیادہ ضرورت ہے ان کی ضرورت اُردو کی اور تصانیف سے بھی زیادہ ہے جو کتابوں کی شکل میں شایع ہوتی ہیں کہ کتاب تو جہاں ایکدفعہ پڑھ لی پھر تازہ نہیں رہتی اور ماہواری رسالہ میں ہر مہینہ میں تازہ مضامین دیکھ لیجیے خاصکر صلائے عام جیسا رسالہ کہ جب دیکھیئے اسمیں لٹریچر کی وہ خوبیاں نظر آئینگی جو ہر وقت تازہ ہیں اور انسے بہتر کہیں نظر نہیں آ سکتیں۔

لیکن اس بحث کو طول دینے کی ضرورت نہیں۔ خود صلائے عام آپکے سامنے ہے۔ الف لیلہ میں کسی طلسمی محل کا ذکر ہے جہاں عجیب عجیب سامان عیش مہیا تھا کہ مہمان نے ایک ماہوش سے وہاں کے طلسمی اسرار دریافت کرنے میں زیادہ کد کی تو اُس لعبتِ ناز نے سمجھایا کہ زیادہ قیل و قال کرنے سے شب ماہ کا لطف اُٹھانا کہیں اچھا ہے ؎

زیادہ اس میں کد کرنے سے حاصل ٭ وہ دیکھو چاند آ پہونچا مقابل

آپ بھی صلائے عام ملاحظہ فرمائیں۔ سامنے موجود ہے: روزانہ و ہفتہ وار کا قصہ چھوڑیں ؎

دیکھنا یہ ہے کہ ہم نے نہیں کیسا چاہا ٭ پوچھنا یہ ہے کہ تم نے ہمیں کیسا دیکھا

قواعد صلائے عام

صلائے عام کی قیمت پیشگی ۵ روپے سالانہ ہے۔ چھ مہینے سے کم کی خریداری منظور نہیں ہو سکتی: قیمت بذریعہ منی آرڈر عنایت کی جائے ؛

مضمون نگار قیمت سے بری نہیں نہ یہہ ضرور ہے کہ مضمون خواہ مخواہ شایع کیا جائے: جو مضمون شایع نہ ہو سکیں، اُن کے واپس کرنے کا ذمہ نہیں ؛ صاحب مضمون اپنا نام اور پتہ ضرور لکھیں۔ گمنام تحریریں شایع نہیں ہو سکتیں ؛ جامع اوراق کو مضمون میں کمی بیشی کا اختیار ہے ؛

یہہ رسالہ اعلٰے حکام سول و ملیٹری افسروں کے امتحان میں گورنمنٹ آف انڈیا سے منظور ہو چکا ہے۔ ہندوستان کے سوا یورپ کے عالم و فاضل صلائے عام کی قدر کرتے ہیں: اُردو میں صلائے عام کے مضامین کو خاص مرتبہ حاصل ہے ؛

صلائے عام کے پچھلے پرچوں کے مضامین کا انتخاب علیحدہ کتاب کی صورت میں شایع کرنے کی تجویز ہے۔ اس تجویز سے اردو لٹریچر کے لئے اچھا رسالہ جمع ہو جائیگا:

صلائے عام کے پچھلے پرچے اب تلاش سے بھی نہیں ملتے ؎

چھو کے لے گئے تاؤں میں سب ترے وحشی
جنوں کے دشت میں اب کوئی خار تک نہ رہا

صلائے عام کا پتہ یہہ ہے :۔

دہلی۔ فراشخانہ: مکان میر ناصر علیخاں بہادر

حسب الارشاد میر ناصر علیخاں بہادر مطبع ناصری واقعہ فراشخانہ دہلی میں
باہتمام میر احمد چھپا اور شایع ہوا

Printed and Published by Mir Nasir Ali Khan Bahadur (Editor) at the nasri Press Farra[illegible]



جلد　　صلائے عام دہلی　　نمبر

SALA-I-AM. DELHI.

A high class Monthly Magazine devoted to the cause of Urdu literature, the preservation of the old Indian, especially Mohammadan culture and refinement, and the assimilation of the best features of the new civilization.

فہرستِ مضامین

بابت ماہ اپریل سنہ ۱۹۲۳ء مطابق رمضان سنہ ۱۳۴۱ ہجری

پیرایۂ آغاز

خط تجھے بھیجکے وہ شک نے بیتاب کیا ٭ کہ ترے کوچہ میں قاصد سے ہم اوّل آئے

پیرایۂ آغاز ایک اچھا خاصہ مضمون ہر پرچہ کا ہو رہا ہے۔ حالاں کہ اس سے غرض صرف مضامین کی تمہید ہے: لیکن طرز کلام میں ہر طرح کے پیرایہ میں اپنا مطلب ادا کرنا فصاحت میں داخل ہے ٭ جناب نواب **ناظم** کا شعر ہے ؎

میں نے جو کی حسد کی مذمت تو آپ نے ٭ پیرایہ میں ہنسی کے کہا مرحبا مجھے ٭

"پیرایہ" بمعنے آرایش و لباس۔ یعنی بطرز آرایش جو لباس کسی چیز کو پہنایا جائے ٭ میں نے **صلائے عام** کے لئے **پیرایۂ آغاز** کا عنوان اس وجہ سے پسند کیا کہ یہہ طرز گو نیا ہے مگر "گندہ بروزہ باخشکہ اگرچہ گندہ لیکن ایجاد بندہ"۔ آپ یہہ طرز اگر پسند نہ کریں تو بھی نہ ہونے سے بہتر جانیں۔ سمجھ لیں کہ دیباچہ کیطرح "پیرایہ" کے لئے ہمیشہ نیا مضمون پیدا کرنا مشکل ہے ؎

پس مُردن مجھے راحت کا مژدہ پھر سُنا دینا ٭ مرے دم توڑنے کی پہلے شکل دیکھتے جاؤ ٭

لیکن نہیں ؎

سامنے یار کے خود رفتہ نہ ہو جائے کہیں ؛ دلِ بیتاب کو پہلے سے سکھا رکھا ہے ؛

اس پرچہ میں **مضمون پریشان** اپنے نام کی وجہ سے اُلجھی ہوئی باتوں کی گُلجھٹی ہوگیا ہے۔ یہہ طرزِ بیان صلائے عام کا حصہ سمجھیئے ؎

عشقِ گیسو میں مجھے ایسی پریشانی ہوئی ؛ بات بھی مُنہ سے نکلتی ہے یہاں اُلجھی ہوئی

اردو رسالوں کا حشر۔ گو واقعی مضمون ہے مگر مرے کو ماریں شاہ مدار" ایک آقا کے نوکروں یعنی اپنی زبان کے خواجہ تاشوں کو ایک دوسرے کا بھانڈا پھوڑنا زیب نہیں دیتا۔ مگر پھر بھی آپ مجھے اس بات کے کہنے سے نہ روکئے کہ اپنی زبان کی ترقی کے بغیر قومی و ملکی بہبودی کا دعوائے خیالی پلاؤ ہے

مشاعرے والا مضمون میں نے شعرا کی خاطر سے لکھا ہے کہ واقعی یہہ مشغلہ ہماری زبان کی ترقی کے لئے بہت بکار آمد ہے۔ ہماری زبان کی شاعری جس مرتبہ کو پہونچ گئی ہے اسکو اس سے گرنے نہ دیجیئے

خوبی مضمون کا تعلق بھی شعر و سخن سے ہے۔ یہہ مضمون مجھسے اچھی طرح بن نہ پڑا سبب یہہ ہے مجھے شعر میں دخل نہیں ؛ اُمید ہے کہ شعرائے اُردو اس مضمون کے نقص نکال دیں گے ؛ اسی کے ساتھ آپ **ادائے بیان** کا مضمون دیکھیں کہ دونوں مضمون سے شعر و سخن کی فضیلت مقصود ہے ؛

اجتماعِ ضدّین کو آپ **مضمون پریشان** کے بعد پڑہیں کہ اُردو میں دونوں نئی وضع کی انشاپردازی کے نمونے ہیں ؛

ابنِ مقنع تاریخی مضمون ہے۔ اس کا تذکرہ مورخانہ نظر سے بہت دلچسپ ہے ؛

خیالاتِ خاص و عام پر نظر۔ یہہ مدنی ہے: اس میں روزمرّہ کے معاملات و واقعات کا ذکر کیا جاتا ہے جو اہل الرائے کے پیشِ نظر ہیں ؛

صلائے عام کی ڈاک۔ پُرانی مدّ ہے جس میں بدستور سابق خط و کتابت کی ایسی تحریریں شایع ہوا کریں گی جن کا تعلق لٹریچر سے ہوگا ؛

میں خوش ہوں کہ **صلائے عام** کے لئے بہت پاکیزہ مسالہ اپنی زبان کی انشاء

وادب۔ معلومات و تحقیق کا جمع ہو رہا ہے ؛ اس پرچہ میں مضمون نگاروں کے مضامین شایع ہونے سے رہ گئے۔ سبب یہ کہ رسالہ کے لئے وقت کی پابندی کی وجہہ سے جو مضمون دیر میں پہونچتے ہیں وہ رہ جاتے ہیں : جو مضمون دیر میں انشاء اللہ اگلے پرچہ میں نکل جائیں گے ؛

ریویو کے لئے اکثر رسالے ، تصانیف آئے ہوئے ہیں ان کو دیکھ رہا ہوں کہ ریویو میں جلدی مناسب نہیں : : دیکھنے کے بعد جو خوبیاں نظر آئینگی وہ عرض کی جائیں گی ؛

کلام یاس متعلق بہ وجاہت اچھا ہے۔

حضرت دردمند کا ساقی نامہ تذکرۂ گلشن ہند سے اس خیال سے نقل کیا گیا کہ اس کی زبان گو پرانی ہے مگر پاکیزہ خیالی اور مضمون آفرینی سے خالی نہیں ؛

اس پرچہ کے اخیر میں صلائے عام کی سرخی کے نیچے رسالہ کے چند قواعد لکھدئے ہیں تاکہ خریداران صلائے عام کو دریافت کرنے کی نوبت نہ آئے ؛

خدا کا شکر ہے کہ صلائے عام کے دوبارہ نکلنے سے پہلے سے زیادہ صلائے عام کی قدر ہو رہی ہے۔ صلائے عام مثل صبح خندان تیار ہو کر نکل رہا ہے اور ناظرین صلائے عام کا نور نظر سمجھا جاتا ہے ؎

نقشہ نیا کھچا کرے ہر روز اے خیال ؛ جب تک بقا رہے ہنر آذری رہے

ایک صاحب لکھتے ہیں کہ صلائے عام کے مضمون اکثر تصویر کی شکل ہیں کہ جی چاہتا ہے کہ انہیں دیکھا کیجیے ؎

آئینہ بن گیا ہوں تحریر کی مشق سے ؛ دیکھا تو کیجیے مجھے بٹھلا کے سامنے

مضمون پریشان

غیروں میں دوستوں میں حسینوں میں آجکل ٭ کھلتے ہیں اپنے شوق کے دفتر کہاں کہاں

صلائے عام کے مضامین میں مضمون پریشان کی دھاک زیادہ ہو رہی ہے۔ حالانکہ ایک ہی وضع کے مضمون سے پڑھنے والوں کے دل اُکتا جانا چاہئے: لیکن نہیں۔ آپ نے خیال نہیں کیا کہ قافلہ کی پریشانی پر جرس کا نالاں ہونا بے کار نہیں جاتا ؎

ہے جرس نالاں ہمیشہ کس لئے ٭ قافلہ کس کا پریشاں ہو گیا

کہ آوازِ درا پر قافلہ سے آوارہ کو دلجمعی کے آثار دکھائی دیتے ہیں ؎

کون آوارہ وطن نجد میں خواہاں ہے مرا ٭ کس پریشاں کو ہوئی مجھ سے پریشاں کی تلاش

دوسری تمثیل پریشانیٔ اوراقِ چمن کی بہت اچھی ہے کہ ؎

ہزاروں گلوں کے ورق اُڑ گئے ٭ چمن کا پریشاں جو دفتر ہوا

اوراقِ چمن کی پریشانی کے متعلق جناب رعنا کا یہہ شعر بہت برجستہ ہے سه

ادھر اے باغباں لانا ورق بکھرے ہوئے گل کے ٭ ہمارا دل بھی ہو شاید ان اوراقِ پریشاں میں

اسے بھی جانے دیجئے۔ حسینوں کا کسی کی یاد میں آنسو بہانا جس سے آنکھ کا

کاجل بھی پھیل جائے۔ پریشانی کی تشبیہہ بُری نہیں سه

کیا بہے تجھے کسی کی یاد میں اشک ٭ پھیلا کا ہے کو آنکھ کا جل ہے ٭

پھر خزاں جاتی ہے پیدا ہوئی ہے بلبل کو ٭ وہ جو ناخواندہ تھا مہماں سی مہماں کی تلاش

دنیا میں ہم ناخواندہ مہمان بن کر آئے۔ کس نے ہمیں بُلایا نہ تھا: اب یہاں سے پھر

بُلائے کیوں جاتے ہیں؟ ہم جانتے ہیں کہ ناخواندہ مہمان ہو کر تو ہم کچھ دنوں جی گئے

بلائے ہوئے مہمان کا خدا جانے کیا حشر ہوگا؟ خواندہ سے ناخواندہ مہمان اچھے رہے

دیکھئے کون سے بلبل کا قفس بستا ہے ٭ بوئے گل باغ سے نکلی ہے پریشان ہو کر

خالقِ زمین و آسمان کا قبضہ گو سات آسمانوں عرش و کرسی و ملایک پر ہے

مگر زمین کی طرف زیادہ نگاہ لگی رہتی ہے کہ یہیں پیغمبر و نبی وحی و الہام بھیجے گئے اور

یہیں کی نقل آسمان پر ہُو بہُو ہو رہی ہے۔ حُور و غلمان شراب و باغ و نہریں ایسی یہاں

تو ان سے ملتی جلتی مُہیا کی گئیں۔ یہاں کا سا سب سامان تو کہاں ممکن تھا؟ مگر جہاں

تک ہو سکا زمین کی نقل آسمان پر اُتاری گئی۔ لیکن یہاں کی نقل پوری نہ اُتر سکی سه

دیکھا تو خُلد میں غمِ عشقِ بتاں نہ تھا ٭ جو کھا کے ہم پلے تھے وہ کہاں وہاں نہ تھا

ہم نے اس دارِ فانی کی خوبیوں کے زور پر واعظ و زاہد سے برسوں کشتوں پر کشتیں کی

کہ دارِ بقا کے چلنے کی تیاری کیوں نہیں کرتے؟ یہاں کا ایڑیاں رگڑنا خدائے لایزال کے پاس جانے سے کیوں زیادہ پسند ہے؟ یہہ وارثین خوشی سے کسی نے نہ چھوڑا کوئے جاناں میں چلو کہتی ہے میت میری ۞ لوگ رک جاتے ہیں کندھا جو بدلنے کیلئے

انسان جو رات دن خدائی ہستی کے ثبوت میں غلطاں پیچاں رہتا ہے کہ ہے یا نہیں ہے؟ تکلیف و مصیبت میں جب اس کی زبان سے خود بخود "یا اللہ"! نکل جاتا ہے تو مجھے اس بے وقوف کی سمجھ پر ہنسی آتی ہے کہ پہلی حالت پر جو مصنوعی تھی دوسری حالت سے جو فی الحقیقت ہے زیادہ زور دینے کی کیا وجہہ ہے؟ خود بخود جو بات پیدا ہو وہ مصنوعی صورت سے زیادہ قابلِ اعتبار ہے۔ جو دل پہ گذرے سنی سنائی بات سے بہتر ہے ؎
بولے یوں سن کے وہ یوسف کو حسیں ۞ کیا خبر ہوں گے۔ سنا کرتے ہیں

یہہ دنیا یوں ہی چلی جائے گی۔ کبھی اس پر اعتبار ہوگا کبھی نہیں: خوشحالی میں اور صورت اور مصیبت میں اور ۞ بہار میں گل و بلبل کا قصہ۔ اور خزاں میں پت جھڑ کے سوا کچھ نہیں۔ بہار میں ہر نخل بلباسِ حسیناں سبزہ رنگ۔ یا بعض خاندانِ تصوف کے مشائخ کیطرح سبز پوش اور خزاں میں دیوانوں کی طرح برہنہ و عریاں ۞ ؎
اک دن یقین ہے کہ مجھے چھوڑ جائیگا ۞ ہر چند یہہ حدوث رفیقِ قدیم ہے ۞
زمین نے ہزار خاک اڑائی کہ آسمان تک پہونچ جائے مگر آسمان تک نہ پہونچ سکی۔ بلندی میں آسمان آسمان ہی رہا اور زمین زیر پا رہی۔ ہم نے اسرار

ازل کے سمجھنے میں کتنی ہی تگ و دو کی لیکن ملا کی دوڑ مسجد تک ۔" ڈھاک کے تین ہی پات" رہے ؎

زندہ جو کسی کا دلِ مُردہ ہو تو جانیں ؛ باتوں سے فقط کوئی مسیحا نہیں ہوتا ؛

اسرارِ ازل کے اور مشکل مسئلوں کو آپ جانے دیں۔ صرف دو لفظ ازل و ابد کو آپ لے لیں ان ہی کی تہہ ۔ انسان تو کیا چیز ہے؟ نہ زمین نے جانی نہ آسمان نے سورج چاند ستارے کواکب و سیارے رات دن اسی چکر میں خدا جانے کب سے سرگرداں پھر رہے ہیں۔ پہاڑ گردن اُٹھائے دیکھ رہے ہیں کہ کہیں ازل و ابد کا اور چھور نظر آئے۔ اور چھور تو درکنار اُفقِ آسماں کی طرح جس قدر کنارے کے پاس گئے اسرارِ ازل کا کنارہ اسی قدر کمر یار کی طرح غائب ہوتا گیا ؎

آبادیاں ہیں صنع سے خالی نہ کوہ و دشت ؛ انسان بھر دئے کہیں حیوان بھر دئے ؛

آئے عدم سے جائیں گے اک دن سوئے عدم ؛ یہ ابتدا غلط ہے نہ یہ انتہا غلط ؛

جسے آپ ترقی کہتے ہیں عالمِ اسباب میں اس لفظ کا پتہ نہیں۔ کمی تو ممکن ہے ترقی ناممکن ہے ؛ نیچر نے آجتک کوئی انسان تین آنکھ کا پیدا نہ کیا۔ ایک یا دونوں آنکھیں بے قصور اور بلاوجہ ندارد تو دیکھنے میں آئیں ؛ معمولی چڑیا کو انسان سے زیادہ آزاد پیدا کیا کہ اس درخت سے اُس درخت پر بلا تکان جا بیٹھی۔ یہاں دو پاؤں دئے وہ بھی کسقدر محدود جو گز دو گز سے زیادہ پھیل نہیں سکتے۔ اور اس پر قُل سیروا فی الارض کا حکم ؛ مشکل سے دو ہاتھ دئے۔ ان میں بھی دہنا بایاں کہ طاقت میں دونوں برابر نہیں ؛ بیٹھے پیچھے کی چیز

نظر نہیں آتی اور آسمان کے پیچھے کا حال بتانے کا دعوے - جو شخص کرے راندۂ درگاہ ہے پیدا ہونے سے پہلے کی ایک لمحہ کی خبر نہیں اور مرنے کے بعد قیامت تک کا حال کروڑوں صدیوں کا از بر سن لیجئے ع

تیرے دیوانے کہاں شورش مچائیں ؛ عرصۂ ملک بقا بھی تنگ ہے۔

عالم بقا کا حال تو درکنار یہاں ان عالم فانی کے سمجھنے کے بھی لالے ہو رہے ہیں ع

کسے خبر تھی کہ لیلےٰ کے ساتھ مکتب میں
پڑھا لکھا ہے جو مجنوں نے سب بھلا دیگا

شعراء جو چاہنے والوں کے پیغام یار کے نام باد صبا کے حوالے کرتے ہیں غلطی نہیں کرتے کیونکہ انسان کے مقابلہ میں بادِ صبا سے خیانت اور خباثت کا اندیشہ بہت کم ہے

انسان کا اصلی و واقعی حال اُسکی زندگی میں بہت کم معلوم ہوتا ہے۔ وجہ یہہ کہ ابنائے زماں جو ہم عصر ہیں طرفداری یا حسد میں حقیقت حال گھٹا بڑھا دیتے ہیں۔ مرنے کے بعد جب حسد کی ضرورت باقی نہ رہی تب وہ ہیں قدر ہوتی ہے۔ حضرت شیخ سعدی رح کی رائے ہیں انسان کے علم و فضل کا حال تو ایکدن میں معلوم ہو جاتا ہے مگر خبث نفس کے معلوم کرنے کے لئے ایک عمر چاہئے ع کہ خبثِ نفس نہ گردد بسالہا معلوم ؛

آپ نے دیکھا ہو گا کہ تازہ چوٹ میں پہلے کم درد معلوم ہوتا ہے پھر جیوں جیوں ہوا لگتی ہے ٹیس زیادہ ہو جاتی ہے۔ یہہ تمثیل انسان کے آغاز پیدایش

میں دُنیا کے رنج و آلام سے بے خبری کی اچھی دلیل ہے: لیکن اس سے اچھی تمثیل دُنیا گوشہ ورع سے دارِ محن سمجھنے کی یہ ہے کہ زخم جو آلا ہو اُس سے ہڑمیں میں جان پہ بن جاتی ہے ؎ زرد تھا غم سے نہایا اب لہو میں ہو کے قتل ٭ تھا وہ جوڑا مائیوں کا ہے یہ جوڑا بیاہ کا ٭

دُنیا کی مصیبتوں سے آنکھیں بند کرلینی مصیبتوں سے بچنے کی ذلیل تدبیر ہے جس طرح افیون کے نشہ میں درد کم معلوم ہوتا ہے: مگر اطبا کے نزدیک یہ علاج ہی نہیں ؎ کسی نے مرنا مرا نہ دیکھا کہیں جنازہ مرا نہ دیکھا

لحد نے لاشہ مرا نہ دیکھا کفن نے میرا بدن نہ دیکھا

حضرت شیخ شبلی رحمۃ اللہ فرماتے ہیں کہ میں بغداد کے بازار میں جا رہا تھا ایک حسین لڑکی کوٹھے پر سر کھولے نظر پڑی۔ شیخ نے لڑکی سے پوچھا کہ تو سر کیوں نہیں ڈھانکتی؟ لڑکی نے جواب دیا کہ شیخ جی تم آنکھیں کیوں نہیں ڈھانکتے (آنکھیں بند کیوں نہیں کرتے؟) حضرت نے جواب دیا کہ ہم عاشق لوگ ہیں ہم آنکھ نہیں بند کرتے۔ لڑکی نے کہا ہم مست لوگ ہیں ہم سر نہیں ڈھانکتے۔ یہہ کہہ کے غائب ہو گئی ؎

آئے دُنیا میں تو سب کچھ دیکھ لو

دیکھو کیا ہوتا ہے کیا ہوتا نہیں

اُردُو رسالوں کا حشر!

صلائے عام نکال کر اور اس سے پہلے مضمون نگاری کی وجہ سے میں اُردو کے معمولی انشا پردازوں میں شامل ہوگیا۔ بقول جناب **ذوق** ؎

گل اُس نگہ کے زخم رسیدوں میں مل گیا ؛ یہہ بھی لگا کے خون شہیدوں میں ملگیا

اب چونکہ اس برادری میں آگیا ہوں۔ مجھے زیب نہیں دیتا کہ برادری کو عزت کی نگاہ سے نہ دیکھوں + لیکن چونکہ ہر مشغلے اور پیشے کی قدر و بیقدری کا مدار زمانہ کی حالت پر ہے کہ اگر زمانہ کے موافق مشغلہ ہے تو قدر کی اُمید ہو سکتی ہے۔ زمانہ کے موافق نہیں تو ع "گر زمیں را بہ آسماں دوزی"۔ کامیابی کی اُمید بیکار ہے ؛ زمانہ کی طاقت کو دُنیا کی طاقت نہیں پہونچتی۔ آپکی آواز مرغانِ خوش الحان سے زیادہ نفیس سہی لیکن اگر سُننے والے بہرے ہیں یا سُنتے ہوئے بہرے بن گئے ہیں تو آپ اپنا گلا نہ پھاڑیں: جس نے قاعدہ بغدادی بھی نہیں دیکھا اُس کے آگے مقامات حریری کی فصاحت کا ذکر تضیع اوقات ہے ؛ آپ نے عُرفی کے قصیدوں کا جواب لکھا مگر سنایا اُن لوگوں کو جو نظم و نثر میں امتیاز نہیں کر سکتے۔ خط و خال کی تعریف اندھوں کے سامنے خوبصورتی کی جان پر ظلم ہے ؛

سب سے پاکیزہ رسالہ سر سید احمد خاں بہادر نے **تہذیب الاخلاق** نامی نکالا تھا جو ازروے آمدنی نہ چلا: میں نے اپنے جی بہلانے کے لئے دو ایک رسالے

نکالے - ایک کی نسبت سر سید احمد خاں بہادر سے مشورہ کیا: جواب ملا "کسی سے کہنے کی بات نہیں ہے مگر رسالہ کتنا ہی عمدہ کیوں نہ ہو چلنا مشکل ہے" ؛ جناب امیر مینائی کا شعر ہے ؎

مرنے کو منع ہم نہیں کرتے مگر امیر ؛ تم مر گئے تو اُن کو ہوا اعتبار کب ؛

اخبار تو کچھ چلے بھی لیکن رسالوں کو کسی فقیر کی ایسی بد دعا لگی ہے کہ آجتک کوئی مجھے چلتا نظر نہیں آیا ؛ یہاں تک کہ منشی نول کشور جیسے حوصلہ کے صاحبِ مطابع نے اس طرف توجہ کی تو اودھ اخبار تو چل گیا مگر دو ایک رسالے جو منشی صاحب مرحوم نے نکالے ان میں کوئی بھی چل نہ سکا ؛

اُردو رسالوں کو ہندوستان کی آب و ہوا راس نہیں - اخبار تو لشتم پشتم "خلافت" یا "کانگریس" کے نام سے چل جاتے ہیں رسالوں کا چلنا مشکل ہو رہا ہے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ہندوستان کا دماغ شور و شغب سے مناسبت رکھتا ہو تو ہو مگر جی لگا کر شوق سے فرصت میں بیٹھکر علمی مسائل پر غور کرنے میں عاری ہے ؛ یہہ شامت اُردو زبان کے لئے مخصوص ہے - ورنہ انگریزی و بنگالی و مرہٹی زبانوں میں یہہ نحوست نہیں ؛ مجھے تعجب ہے کہ جو بات ہندوستانیوں سے کہنے کی ہو وہ بھی انگریزی میں بیان کی جاتی ہے - مجھے اب تک شبہ ہے کہ دل کا حال تو اپنا اور زبان سات سمندر پار کی سو بھی مُنہہ پھیر کر کسی کے دل پر کیا اثر کر سکتی ہے ؟

تمام دُنیا کے قوموں کی یادگار اُن کی زبان ہوتی ہے - جب ہم نہیں رہیں گے تو ہماری زبان سے ہمارا حال معلوم ہو جائیگا : غیر زبان میں ہم کتنا ہی کمال پیدا کریں ہمارا حال بعد میں معلوم ہونے کے لئے بکار آمد نہیں ؛ ایران کے باشندے اگر

سنسکرت میں کمال پیدا کریں تو ایرانی تہذیب و صحبت کا نمونہ نہیں ہو سکتے۔ چین کے لوگ عربی پر محنت کریں تو چینی تعلیم و تہذیب کی تحقیق کے لئے بیکار رہے؛ ہر قوم اور ملک اپنی ہی زبان میں کمال پیدا کرے تو اپنی شائستگی و وضعداری کا ثبوت دے سکتا ہے ورنہ غیر صحبت اور بیگانہ زبان میں اظہار کمال رائگاں سمجھنا چاہئے؛

یہی میں اس لئے کہتا ہوں کہ اگر آپ اپنی زبان کے لٹریری رسالوں کی قدر نہیں کرتے تو آپ کے قومی اور ملکی ترقی کے دعوے نہ صرف بیکار بلکہ غلط ہیں؛

"**صلائے عام**" ۔ دارالسلطنت دہلی کا وہ مشہور و مقتدر ماہوار ادبی رسالہ جو کبھی زیر ادارت میر ناصر علی خان بہادر شایع ہوا کرتا تھا۔ ادبی سرد بازاری کے ہاتھوں کچھ دن "وقفۂ زندگی" میں بسر کر کے پھر اسی طمطراق سے رونق بخش نظارہ ہوا ہے۔

پہلے نمبر کے تمام مضامین (سوائے "کوہ کندن و موش برآوردن" کے) رسالہ کی شان کے مطابق ہیں۔ قابل اڈیٹر کی کوثر سے دُھلی ہوئی زبان میں دل کش نوٹ مضامین کو چار چاند لگا رہے ہیں معنوی دلربائیوں کے ساتھ اسکی باصرہ نوازی نے اسے مجموعۂ خوبی بنا دیا ہے۔ "کوہ کندن و موش برآوردن" کے عنوان سے جو مضمون شایع ہوا ہے ہمیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اڈیٹر صاحب بھی اسے پسند نہیں فرماتے۔ چنانچہ انہوں نے اپنے نوٹ میں دبی زبان سے غیر محسوس طور پر اسکا اعتراف بھی کیا ہے۔ سالانہ قیمت چھ روپے ہے۔ رسالہ کے مضمون لگا بھی قیمت کچھ بری نہیں ہیں

از رسالۂ ہمایوں لاہور

مشاعرے

قدیم مشاعروں کے ذکر میں مولوی عبدالحق صاحب بی۔ اے۔ پرنسپل مدرسہ آصفیہ حیدرآباد (دکن) تذکرہ گلشن ہند کے مقدمہ میں لکھتے ہیں کہ:-

"اس زمانے کی سب سے بڑی علمی اور مہذب مجلسیں مشاعرے تھے۔ جن کے لئے بڑے بڑے اہتمام کئے جاتے تھے۔ اس کے خاص خاص آداب تھے۔ بڑے بوڑھے نوجوان بچے سب ہی شریک ہوتے تھے۔ باکمال سخن وروں کو دل کھول کے داد دی جاتی تھی۔ کبھی کبھی بحث مباحثے ہوتے ہوتے لڑائی جھگڑے ہو جاتے۔ اور تھکا فضیحتی تک نوبت پہنچ جاتی تھی نوجوان ان مشاعروں میں... شریک ہوتے۔ اور اپنے کانوں سے تحسین آفریں کے نعرے سنتے تھے۔ جو شعراء کے لئے سب سے بڑی داد اور سب سے بڑا انعام تھا۔ تو ان کے دل میں بھی اُمنگ پیدا ہوتی تھی۔ کسی اُستاد کے پاس حاضر ہوئے شاگرد ہو گئے۔ اور شعر کہنا شروع کر دیا۔ گو شعر کہنے کے لئے صرف کسی اُستاد کا شاگرد ہو جانا کافی ہے۔ یہہ مشاعرے درحقیقت "شاعر گر" تھے۔ میں ان مشاعروں کو بُرا نہیں سمجھتا مگر جہاں یہی سب سے بڑی علمی اور ادبی مجالس ہوں تو ایسی سوسائٹی کی حالت کیا ہوگی؟"

اس میں شک نہیں کہ غدر سے پہلے مشاعروں کا بہت زور تھا اور مشاعرے معرکہ کی تقریبوں میں داخل تھے۔ اس میں اُمرا اور والیانِ مُلک بھی شریک ہوتے تھے اور صف بندیوں اور خانہ جنگیوں تک نوبت آجاتی تھی۔ لکھنؤ میں ناسخ و آتش کے زمانے میں مشاعرہ اچھا خاصہ معرکہ ہو جاتا تھا۔ انکا ذکر تو اب قریب

قریب تواریخ میں داخل سمجھئے ؛ یہاں مجھے یہ عرض کرنا ہے کہ اب بھی یہہ مشغلہ پاکیزہ مشغلوں میں سمجھنا چاہئے ؛ آج کل کے مشاعرے بھی تعریف کے قابل ہیں۔ ان میں کوئی مرتبہ شاعر کم شریک ہوتے ہیں لیکن کم وبیش ہر طرح کی صحبت شعروشاعری کی جمع ہو جاتی ہے ؛ بڑے مرتبے کے شعراء تو آپس کی نوک جھوک کی وجہہ سے اکثر گریز کرجاتے ہیں پھر بھی اُن کے شاگردوں کے شریک ہونے سے اکثر اچھا کلام سننے میں آجاتا ہے ؛

لیکن مشاعرہ میں سخن فہمی کی پوری اُمید ذرا مشکل ہے کہ انسان ازروے اخلاق کسی کے کلام کی نسبت صاحب کلام کے منہہ پر اچھا کہنے کے سوا اور کیا کہہ سکتا ہے شعر تو موسیقی کی طرح کانوں سے زیادہ تعلق ہے اور کانوں کا اثر بہت دیر پا نہیں کلام جب لکھا جائے تو انسان اچھی طرح سمجھکر جو رائے قائم کرے وہ اعتبار کے لایق سمجھنی چاہئے ؛۔

دلی کے مشاعروں میں یوں تو اکثر جگہہ مجھے شریک ہونیکا موقع ملا۔ مگر سب سے زیادہ اہتمام مشاعرہ کا لالہ سری رام صاحب ایم۔ اے مُصنّف خمخانۂ جاوید کے ہاں دیکھنے میں آیا ؛ مشاعرہ کے بعد میں چاہتا ہوں کہ مشاعرہ کی غزلیں رسالہ کے طور پر چھپ کر شایع ہوا کریں تاکہ سخن فہم غور کرکے اُن کی نسبت رائے قائم کرسکیں ؛

چند روز ہوئے کہ پنڈت امرناتھ صاحب ساحر دہلوی کے ہاں مشاعرہ بہت دھوم کا ہوا۔ اس مشاعرہ کی غزلوں کا مجھے انتظار ہے کہ اگر چھپ کر شایع ہوں تو اہلِ سخن دیکھکر خوش ہوں ؛ یہہ تمنّا مجھے اس وجہہ سے اور بھی زیادہ ہے کہ اتفاق سے میں اس مشاعرے میں باوجود شوقِ شراکت حاضر نہ ہوسکا تھا ؛

یہیں مجھے ایک بات اور عرض کرنی ہے کہ مشاعروں کی محض کثرت سے شعرو سخن کو بہت فائدہ نہیں ہوسکتا۔ مشاعرہ سے کوئی خاص غرض سخن گسترانہ بھی چاہئے

یعنی اساتذہ کی تقلید یا نیچرل شاعری۔ یا کوئی خاص خوبی کسی کے کلام کی۔ اور پولٹیکل بحث مباحثہ سے بالکل احتراز چاہیے کہ پولٹیکل بحث شعر و سخن کے لیئے مضر ہے ؛

شعر میں مجھے یہہ دیکھنا منظور ہوتا ہے کہ ردیف قافیہ کے سوا اور کیا خوبی شعر میں پائی جاتی ہے۔ جو بات کہ اگلے کہہ گئے ہیں ہم نے کون سی نئی بات پیدا کی ہے۔ یا اُن کے مضمون کو ہم نے کس نئی طرز پہ ادا کیا ہے۔ محض ردیف و قافیہ سے ایک دو کیا سیکڑوں دیوان بھرے پڑے ہیں ؛

شعر سے اگر آپ کو اپنی موزونیت طبع کا اظہار منظور ہے تو تحصیل حاصل ہے اپنے کلام کی کوئی خاص خوبی بھی دکھانی ضرور ہے ؛ شعر میں اگر کوئی نئی بات نہیں ہے جبتی تو شعر لطف سے خالی سمجھیے ؛

لیکن کچھ کیوں نہ ہو۔ مشاعرہ کا مشغلہ قومی و ملکی لٹریچر کے لیئے بکار آمد ضرور ہے اساتذہ کے ساتھ زمانہ حال کے کلام کا مقابلہ کرنے کی یہی صورت ممکن ہے ؛ اگلے وقتوں کے شعراء سے زمانہ حال کے شعراء کی تعداد میں نہیں کہہ سکتا زیادہ ہے یا کم ہے۔ ایک بات کی کمی البتہ ہے کہ اُسوقت کی سی قدر نہیں۔ مگر نیچر کا طریقہ ہے کہ کبھی کبھی جبکہ انچہ نقامت کہتر بہ قیمت بہتر پر عمل کرتی ہے تو قیمت سے زیادہ قامت کی طرف متوجہہ ہو جاتی ہے۔ اس حساب سے قدر ہو یا نہ ہو شعراء کی تعداد میری دانست میں اس وقت زیادہ ہے۔ یہہ بات دوسری ہے کہ اس زمانہ کا کلام دیر پا نکلے یا نہ نکلے ؛ اساتذہ کے کلام میں یہہ سحر ہے کہ جو بات جس طرح انہوں نے ادا کی پھر کسی کو میسر نہ ہوئی۔ جو لفظ جہاں ہے اُسکی جگہہ دوسرا نا ممکن ہے + جب تک آپ آج کل کے کلام میں یہہ بات نہ دکھائیں میں اساتذہ کے کلام کا معتقد ہوں اور رہوں گا ؛

خوبیٔ مضمون

شعر کو دو رُخ سے دیکھا جاتا ہے۔ ایک زبان کے خیال سے دوسرے مضمون کے خیال سے ؛ عوام میں زیادہ تر زبان کی تعریف ہوتی ہے کہ زبان جلد سمجھ میں آجاتی ہے برخلاف اس کے مضمون کے سمجھنے میں دقت ہوتی ہے : مگر اہل علم اور ذی کمال مضمون کی باریکیوں کا زیادہ خیال رکھتے ہیں ؛ دونوں میں اساتذہ بڑے بڑے مرتبہ کے گذرے ہیں ۔ اور اکثر ایک دوسرے کے ہمعصر تھے ۔ میر و مرزا ۔ ناسخ و آتش ۔ دبیر و انیس ۔ امیر و داغ : یہ لوگ اپنی اپنی وضع میں لاجواب ہوئے ؛ زبان کی تعریف کرنیوالے بمقابلہ مضمون ہمیشہ زیادہ ہوتے ہیں ۔ اس لئے جو شعرا زبان کے اُستاد ہیں اُن کی شہرت زیادہ اور جلد ہو جاتی ہے ۔ مضمون میں نازکخیالیاں پیدا کرنے والوں کی قدر دیر میں ہوتی اور کم ہوتی ہے ؛ یہ ضرور نہیں کہ جو لوگ زبان میں کمال رکھتے ہیں وہ مضمون سے بالکل عاری ہوں ۔ اور جو مضمون میں کمال رکھتے ہیں وہ زبان کی خوبیوں سے بیگانہ نکلیں : گفتگو اس میں ہے کہ دونو باتوں میں برابر کمال کا ہونا مشکل ہے ۔ شعرا ایک نہ ایک بات میں دوسروں سے سبقت رکھتے ہیں ؛

دور کے شعرا جانے دیجئے ۔ متاخرین میں جناب امیر مینائی اور جناب داغ دہلوی کو دیکھئے کہ مضمون میں حضرت امیر اور زبان میں جناب داغ کو کمال تھا ۔ یہ نہیں کہ جناب امیر زبان میں عاری تھے لیکن مضمون کی خوبی میں ید طولے حاصل تھا ؛ آج میں متقدمین کے کلام سے چند شعرا کے اشعار خوبیٔ مضمون کے ثبوت میں عرض کرتا ہوں ؛

جناب **یقین** دہلوی۔

یقین اقبال ہاتھ آیا نہیں کچھ جی کے جانے سے ÷ نہیں ہو دیں گے ہم فرہاد گو سو بار سر چیریں ÷

ولہ۔ آہ و نالہ پر نہیں موقوف شہرت عشق کی ÷ کس قدر ہے اس خموشی ساتھ پروانے کا شور ÷

ولہ۔ تجھ آنکھوں سے اُتر کر دل نہ کرتا شور کیا کرتا ÷ یہہ شیشہ طاق سے گرتا نہ ہوتا چور کیا کرتا ÷

جناب **لطف** صاحب تذکرہ گلشن ہند :

رہا جو زندہ شبِ تیرۂ فراق میں قیس ÷ سیاہ خیمۂ لیلےٰ کا اُس کو دھیان رہا ÷

ولہ۔ نہیں شیریں پہ کچھ موقوف یہ قسمت کی خوبی ہے ÷ زبانِ تیشہ سے کوئی سُنے فرہاد کا شکوہ ÷

ان کی ایک مشہور غزل کے شعر ہیں ؎

نیک بد دونوں سے یہاں ہم نے تو آنکھیں موندلیں ÷ تم دہاں چتون کی دکھلاتے ہو جادو کاریاں ÷

یاں نگ پیکرِ تصویر ہم خاموش ہیں ÷ گفتگو کی تم دکھاتے ہو وہاں طراریاں ÷

قہقہے تم مارتے ہو وہاں بآوازِ بلند ÷ دشمنوں سے یہاں چھپا کر ہم ہیں کرتے زاریاں

اضطرابِ دل سے بے پردہ ہوا یہاں رازِ عشق ÷ سوجھتی ہیں واں تمہیں ہر بات میں تہ داریاں[1] ÷

ولہ۔ نہ میں فرہاد ہوں اے عشق نہ مجنونِ دل خستہ ÷ مرا پھر منتظر بتلا تو کیوں کوہ و بیاباں ہے ÷

ولہ۔ ہو وے فضائے ہستیٔ موہوم کا بُرا ÷ کُنجِ عدم میں کاٹتے تھے کس فراغ سے ÷

ولہ۔ او میاں تیغ والے اور اک زخم ÷ کب سے ہم ایڑیاں رگڑتے ہیں ÷

کلیم۔ لگتی ہے اب تو قلقلِ مینا سے دل کو ٹھیس ÷ وہ دن گئے **کلیم** کہ یہہ شیشہ سنگ تھا ÷

ولہ۔ قبر میں بھی لئے ہمراہ گیا اپنے **کلیم** ÷ آہ کیوں دردِ دل اپنا نہ کسی کو سونپا ÷

ولہ۔ تجھے میں آنکھوں میں کیونکر رکھوں کہ ہے برسات ÷ پھر ایسا گھر کہ یہہ خانہ خراب ٹپکے ہے ÷

ولہ۔ پیری کی بھی سیر کر گئے ہم ÷ اس پل سے بھی بس گذر گئے ہم ÷

قدرت۔ زخم سے دل کے بھی اے چارہ گر بہتا ہے خوں ÷ مت ڈبو بے فائدہ پھائے نہ کر مرہم خراب ÷

---

[1] تہ داریاں خوب کہا۔ بات میں تہ ۱۲

ولہ۔ ذرا قفس سے قفس تو ملاکے رکھ صیاد ؛ کہ تا اسیر کریں مل کے ایک جا فریاد ؛

ولہ۔ دل سے کہا سناں نے کہ سینہ میں یاں رہوں ؛ ناوک یہہ پوچھتی ہے بھلا میں کہاں رہوں ؛

ولہ۔ نسبت ہے ہماری تری چوں سایہ و خورشید ؛ جس جا نہیں تو ہم ہیں جہاں تو ہے نہیں ہم ؛

ولہ۔ اوپر[1] سے زخم گرچہ ہرے ہو چلے ولے ؛ ناسور تھا جگر میں سو ناسور رہ گیا ؛ ؛

ولہ۔ کرے تو ذبح جتنک اور تو یہہ منت مرتا ہے ؛ نہ ہو غافل ارے صیاد صید نیم بسمل ہے ؛

ولہ۔ حال **قدرت** پوچھتا ہے کچھ تو ظالم مجھ سے سن ؛ اُس کے بالیں پر دُعا کو آج ہی موجود تھا ؛

آہ جو اٹھتی تھی درد دل سے تھی لپٹی ہوئی ؛ اشک جو گرتا تھا سو لخت جگر آلود تھا ؛ ؛

قائم۔ زاہد و مسجد پہ خرابات کی تونے ؛ جی بھی یہی چاہے تھا کرامات کی تونے ؛

ولہ۔ شیریں تو ساتھ خسرو کے کر ذوق سے معاش ؛ پتھر تھا تیری چھاتی پہ سو کوہ کن گیا ؛

ولہ۔ تھی شرط مجھے اُس سے تو اک رات ہے کی ؛ کیا ہے کہ دل اُس زلف سے ہرگز نہ بھر آیا ؛

فغاں۔ عبث تو تڑپے ہے کنج قفس میں مرغ چمن ؛ اسی تڑپ میں تو بہہ بال و پر گئے اپنے ؛

ولہ۔ کسے تو ڈھونڈھتا پھرتا ہے اے **فغاں** تنہا ؛ کہ اس سرا کے مسافر تو گھر گئے اپنے ؛

حسرت۔ اُڑا دے اے دِوانے شورش سودا سے سب ڈر کو ؛ بہار آئی۔ تو کدھر دیکھتا ہے۔ پھونک دے گھر کو ؛

ولہ۔ ان پتنگوں کی میں جرأت پہ موا جاتا ہوں ؛ بے کلیجے ہیں یہہ کمبخت غضب جلتے ہیں ؛

جوشش۔ جز چشم بتاں میکدہ دہر میں جوشش ؛ ہم نے تو کسی مست کو ہشیار نہ دیکھا ؛

ولہ۔ نہ کوئی دوست ہے میرا نہ کوئی دشمن ہے ؛ ایک یہہ دل ہے غرض دوست ہے یا دشمن ہے ؛

ولہ۔ لاکھوں ہی کئے قتل گنہگار مجھی سے ؛ رہتی ہے مری اک تری تلوار مجھی سے ؛

بسمل۔ در آج قفس کا ہے کھلا کیجئے پرواز ؛ اے ہم قفساں خاطر صیاد کہاں تک ؛

جرأت۔ تیرے بیمار سا بیمار نہ ہوگا کوئی ؛ جس کو ظاہر میں جو دیکھو تو کچھ آزار نہیں ؛

ولہ۔ نالہ و آہ و فغاں بھی مرا دم بھرتے ہیں ؛ آپکا جان کے سب مجھ پہ کرم کرتے ہیں ؛

---

[1] اوپر سے "بہت اچھا کہا۔"

ولہ۔ گھر سے وہ جاوے جہاں میں بھی وہیں ہوں موجود ؛ نہیں معلوم مجھے کون بتا دیتا ہے ؛ ؛

ولہ۔ تھا وہ جرأت ہی اُسکے کوچہ میں ؛ وہ جو اک خاک کا سا ڈھیر ہے کچھ ؛ ؛

ان شاعروں کا ذکر جن کے شعر یہاں میں نے لکھے مرزا علی تخلص بہ **لطف** نے اپنے تذکرہ **گلشن ہند** میں بہت خوب لکھا ہے اور اشعار ان ہی کے منتخب لئے ہوئے ہیں[۱] ؛ میری غرض اس مضمون سے یہہ ہے کہ متقدمین کو خوبی مضمون کا زیادہ خیال رہتا تھا۔ اور متاخرین کو زبان کا زیادہ خیال رہتا ہے ؛ مضمون کی طرف توجہ کم ہے ؛ اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ شعر میں تازہ مضمون کی اب گنجایش نہیں۔ وہی مضمون جو اساتذہ باندہ گئے اُنہیں کو اُلٹ پھیر کرادا کیا جاتا ہے جس میں زبان کی خوبی میں کلام نہیں۔ مگر مضمون بہت کم ؛

آج کل شاعری سے غرض زبان کی خوبی زیادہ ہے۔ مگر دراصل شاعری مضمون آفرینی کا نام ہے ؛ اگر آپ کو اور زبانوں سے بازی لینی ہے تو زبان کے ساتھ خوبیٔ مضمون کا خیال چاہئے ؛ اساتذہ کی زبان کی آپ تعریف کریں یا نہ کریں مضمون دیکھئے کیسے پاکیزہ پاکیزہ پیدا کرتے ہیں۔ مضمون کی خوبی پر زبان کو قربان کردینا ایسا بڑا نقصان نہیں ؛ زبان تو ہر سو برس پیچھے کم و بیش بدلتی رہتی ہے۔ مضمون کی پاکیزگی میں خدائے لایزال کی طرح فرق نہیں آتا ؎

بڑہتی ہے مثلِ گنج ویرانہ ؛ قدر مضموں زمینِ نہل میں

شعر کی نسبت میں اپنا عقیدہ عرض کروں کہ زبان کی خوبی کا کیا کہنا لیکن اگر کوئی نیا مضمون آپ نکال نہ سکے تو شعر کہنے سے کیا فائدہ ؟ ؎

خیالِ چشمِ جانِ جاں نکالوں کس طرح دل سے ؛ محبت ہوتی ہے اکثر سخن گو سے سخنداں کو

صحبتِ پیر و جوان کا ناموزوں ہونا کس خوبصورتی سے بیان کیا ہے ؎

جب تیر کو کماں میں جوڑا جدا ہو ؛ کیوں بے ثبات صحبت پیر و جوان ہو

خوبی مضمون کا ذکر ایسا نہیں جو مجھسے لکھنے ایک دو پرچوں میں ختم ہو سکے اور اس طرح

[۱] یہہ تذکرہ سنہ ۱۸۰۱ء میں لکھا گیا اور سنہ ۱۹۰۶ء میں حیدرآباد دکن سے عبداللہ خاں صاحب نے شایع کیا ؛

کہ سب کو پسند آئے۔ لیکن جسقدر کہ اس وقت میرے ذہن میں آیا عرض کردیا۔ اسکے ثبوت میں دو چار شعر اور سن لیجیے

حسن وہ شے ہے کہ بیجا توں میں بھی تاثیر ہے ؛ دیکھتا رہتا ہے تجکو انجمن میں آئینہ

آئینہ کا مضمون ذرا مشکل ہے کہ ہزار طرح سے باندھا گیا اور پھر بھی اس میں ایک نئی بات نکل آئی بہت غنیمت ہے ؛

کچھ روز ول کرایہ کو ہمیں چاہئے اے قیس ؛ صحرا ہو اگر عالم امکاں سے زیادہ ؛

شکوہ کا مضمون کتنا اچھا ہے

کریں خاک آدمی اس گردشِ افلاک کا شکوہ ؛ کسی نے کب سنا ظرفِ گلی سے چاک کا شکوہ

جو عالی ہیں ضرر پاتے نہیں اسفل سے وہ ہرگز ؛ فرشتوں کو نہیں ہے گردشِ افلاک کا شکوہ

ضرر کیا بحرِ رحمت کو مرے خطِ جرائم سے ؛ نہیں دریا کے لب پر جامۂ ناپاک کا شکوہ

دخترِ رز کے مضمون جہاں آپ نے اور سنے ہیں یہہ بھی سن لیجیے

مستانہ نکل آنے لگی پردۂ خم سے ؛ یہہ دخترِ انگور ہوی ہے نڈر ایسی ؛

یہہ مضمون کتنا پاکیزہ ہے

ہم نے کٹوا کے گلا تازہ کیا ہے احساں ؛ اگلے دھبے تری تلوار کے دھو ڈلے ہیں

اس شعر کی خوبیٔ مضمون کی جسقدر تعریف کیجیے تھوڑی۔ یہہ حسبِ حال صلائے عام ہے کہ آپکی زبان کی خوبیاں جو آپ بھولے بیٹھے ہیں تازہ کر رہا ہے ؛

مارچ کا صلائے عام آج مجھے ملگیا۔ کس زبان سے شکریہ ادا کروں ؛ "دعائیں اثر ہے یا بے اثر ہے" کیا بے مثل مضمون ہے کہ جسکے ایک ایک فقرے پر دل لوٹ پوٹ ہوگیا"۔ مضمون پریشان" کا سلسلہ تو ایک عرصے سے چل رہا ہے۔ ایک دریا ہے کہ زور و شور سے بہہ رہا ہے۔ جس سے کروروں تشنگان سیراب ہوئے اور ہو رہے ہیں ؛ زلف سی طبعِ ناصر جو الجھ جاتی ہے ؛ چھوٹتا ہی نہیں سلسلۂ حسنِ مقال

اخگر۔ از ریاست اسے گڈھ۔

اِجتماعِ ضدّین

دنیا کا کارخانہ اجتماعِ ضدّین کا نمونہ ہے۔ اس کے اسباب سُننے: خدا کو ہم ہر جگہ بتاتے ہیں اور پھر کہیں پتہ نہیں۔ بہارِ باغ سے جسقدر رونقِ گل و گلزار ہے اُس سے زیادہ خزاں سے پت جھڑ میں ویرانی نظر آتی ہے۔ رنگِ گل دیکھکر جس قدر نگاہ خوش ہوتی ہے اُس سے زیادہ کانٹے آنکھوں میں کھٹکتے ہیں۔ نسیمِ سحر سے کلیاں کھلتی ہیں تو بادِ سموم سے خون خشک ہوجاتا ہے ؛ دمِ سرد کے ساتھ آہ سوزاں اور شبِ وصل کے ساتھ صبحِ فراق۔ دن کے ساتھ رات اور اندھیرے کے ساتھ اُجالا۔ تدبیر کے ساتھ تقدیر کا مقابلہ۔ خوف کے ساتھ رجا۔ ایک جگہ ماتم دوسری جگہ باجا۔ یہہ اجتماعِ ضدین نہیں تو کیا ہے؟ سہ

یہاں جب تک رہا ماتم ہمارا ؛ وہاں شادی رچی نوبت بجا کی

انسان جب دُنیا سے تنگ آتا ہے تو دُنیا سے نفرت کرنے لگتا ہے۔ ہم جتنا یار کو چاہتے ہیں اُتنی ہی بے وفائی دیکھی جاتی ہے۔ چاہنے والے جفائے یار کو یار کے تغافل سے اچھا سمجھتے ہیں۔ مصیبت میں تو آنسوؤں کا نکلنا تعجب نہیں مگر افراطِ ہنسی میں بھی ہم نے

آنسو نکلتے دیکھے ہیں: جب ہم کسی کی نظر میں سبک ہوتے ہیں تو دل پر بار ہو جاتے ہیں ؎
یہہ سُبکی اور بوجھ اجتماعِ ضدین نہیں تو اور کیا ہے؟ ؎

اے ستمگر جمع ضدین ایک جا ممکن نہیں ؎ تیری نظروں میں سُبک ہوں تیرے دل پر بار ہوں

محمود و ایاز کا قصہ مشہور رہے ہے کہ سلطان محمود غزنوی نے ہزاروں غلام بناکر چھوڑ دئے اور خود ایاز سے غلام کا غلام رہا۔ جو لڑائی میں رستم و اسفندیار سے میدان میں بازی لے گئے۔ تیرِ مژگانِ یار سے تڑپتے دیکھے ؎

حضرت علیٰ علیہ السلام کا ارشاد مشہور رہے ہے کہ **عرفی** کی طرح دُنیا میں صلح کرانے آیا ہوں۔ یعنی ؎

وقتے کہ دریں دیر نہادیم قدم را ؎ گفتیم صلاح است عرب را و عجم را۔

لیکن چند ہی روز کے بعد فرمایا کہ میرے باعث باپ بیٹے سے اور مرد کی عورت سے جدائی ہو جائیگی ؎ زبان انسان کے لئے بہترین نعماء الٰہی میں ہے لیکن خموشی کی اُس سے زیادہ تاکید ہے کہ انگریزی میں زبان کو نقرئی کہتے ہیں اور خموشی کو طلائی ؎ گلستاں کا چوتھا باب سارے کا سارا فوائدِ خاموشی میں ہے ؎

لیکن سب سے پاکیزہ تمثیل اجتماعِ ضدین کی حضرت شیخ سعدیؒ نے بیان کی ہے۔ یہ حکایت گو مشہور ہے مگر جس طرز سے شیخ نے اسے ادا کیا اُنہیں پر ختم ہے کہ اس سے زیادہ پاکیزہ خیالی ممکن نہیں۔ میں نے سو دفعہ اسے پڑھا اور ہر دفعہ تازہ لطف آیا۔ آپ سُن چکے ہیں اور پھر سُنئے کہ قندِ مکرر کا مزہ آئیگا:۔

یکے پرسید زاں گم کردہ فرزند ؎ کہ اے روشن گہر پیرِ خردمند
ز مصرش بوئے پیراہن شنیدی ؎ چرا در چاہِ کنعانش نہ دیدی
بگفت احوالِ من برقِ جہاں است ؎ دمے پیدا و دیگر دم نہان است
گہے بر طارمِ اعلےٰ نشینم ؎ گہے بر پشت پائے خود نہ بینم

حضرت یعقوبؑ کو "گم کردہ فرزند" کتاب بے مثل طرز بیان ہے۔ اور کسی کا سوال کہ ؎

زمصرش بوئے پیراہن شنیدی ؛ چرا در چاہ کنعانش نہ دیدی۔

لاجواب سوال ہے: لیکن حضرت یعقوبؑ کا جواب غلط ہو یا صحیح میرے مضمون کی جان ہے کہ اجتماع ضدین کی تمثیل اس سے بہتر ممکن نہیں کہ ؎

گہے بر طارم اعلیٰ نشینم ؛ گہے بر پشت پائے خود نہ بینم

بہتر تو یہہ تھا کہ اس تمثیل کے بعد میں **اجتماع ضدین** کا مضمون زیادہ نہ بڑھاتا۔ مگر بقول نواب مصطفیٰ خاں **شیفتہ** ؎

فسانے اپنی محبت کے سچ ہیں پر کچھ کچھ ؛ بڑھا بھی دیتے ہیں ہم زیب داستاں کیلئے

مضمون کی آبرو کے لئے جی چاہتا ہے کہ ابھی اور لکھے جائے ؛

مذاہب میں کفر و دین کی تکرار سخت اور پرانی ہے کہ دونوں کو ایک دوسرے سے ضد ہے۔ مگر نہ کفر مٹ سکا نہ دین گھٹ سکا ؎

متاع کفر و دیں بے مشتری نیست ؛ گروہے ایں گروہے آں پسندند ؛

اسی طرح نیکی و بدی کا جھگڑا جو ازل سے چلا آتا ہے اور ابد تک بلکہ ابد کے بعد بھی شاید چلا جائے گا۔ ابد کے بعد میں نے اس لئے کہا کہ عاقبت میں انصاف سے اتنا کام نہ نکلیگا جتنا کہ ہمارا عقیدہ ہے کہ رحمت الٰہی جوش میں آئے گی۔ اور رحمت سے گنہگاروں کی بن پڑے گی: برخلاف اس کے نیک بندے جو عالم اسباب کی وضع سے یہاں مبتلائے آلام رہے تو خوف کے مارے ان کا حال جیسا ہوگا یہہ جانیں اور ان کا خدا۔ رہے گنہگار ان کا سہارا جوش رحمت کا کہیں نہیں گیا۔ بقول **ناسخ** ؎

کونین کے مزے ہیں مری سرنوشت میں ؛ پریاں اگر یہاں ہیں تو حوریں بہشت میں ؛

اس حال میں آپ مجھسے دریافت کریں کہ انسان کو کیا کرنا چاہیئے؟ اس کا جواب بہت معقول ہے جس سے مجھے تسلی ہو رہی ہے اور خدا کرے آپکو بھی ہو۔ وہ یہہ ہے:۔

اپ سے جن کو محبت ہے آپ ان سے محبت زیادہ کریں۔ خدا نے آپ کو جو کچھ دیا ہے آپ اُس کے بندوں کو دیں ؛ بندگانِ خدا کی خدمت میں کسر نہ کریں اور جب موت آئے بے شور و غل یہاں سے رخصت ہو جائیں ؛ مُصیبت آپ کیلیے برداشت کریں اور خوشی میں اوروں کو شریک کریں ؛

زندگی میں انسان اتنا شور کیوں مچاتا ہے جب کہ جانتا ہے کہ مرنے کے بعد سوائے چُپ کے اور کچھ ممکن نہیں شاید خدا چپ کی آواز سُن لے ؎

غضب تو دیکھو وہ کہتے ہیں سُن کے غیر کا ذکر
یہہ چُپ کی داد ہماری ہمیں خدا دے گا

اطلاع۔ باوجود اسکے کہ میں نے وی پی کی نسبت پہلے سے طے کر دیا ہے کہ صلائے عام کی قیمت بذریعہ منی آرڈر آنی چاہئے زیادہ تر درخواستیں صلائے عام کی خریداری کی جو آتی ہیں اُن میں درخواست کے ساتھ یہہ لکھا ہوتا ہے کہ صلائے عام وی پی بھیجدیا جائے ؛ افسوس ہے کہ مجھے پھر اطلاع دینے کی ضرورت ہوئی کہ صلائے عام کی قیمت پیشگی بذریعہ منی آرڈر بھیجئے اگر منظور نہیں ہے تو صلائے عام کا انتظار نہ کیجئے ؛

نمونہ کا پرچہ منگانا بے کار ہے کہ صلائے عام کو جاری ہوئے دس گیارہ سال ہو گئے۔ آپ کو نمونہ دیکھنے اور مجھے نمونہ بھیجنے کی ضرورت نہیں ؛

ابنِ مقنع

اسلام کے اسبابِ انقلابات میں ابنِ مقنع کا نام زیادہ مشہور رہے۔ یہ شخص خراسان میں خلیفہ مہدی کے عہد میں بڑے معرکوں کا باعث ہوا ؛ خراسان ہمیشہ اسلامی انقلابوں کا مرکز رہا ہے ؛ مقنع منہہ پر نقاب ڈالے رہتا تھا۔ بعض کی رائے میں یہہ شخص نہایت کریہ منظر تھا جس کو دیکھکر نفرت ہو اس لئے چہرہ چھپائے رکھتا تھا۔ لیکن دراصل اس کے عقیدہ میں تھا کہ نورِ الٰہی حسبِ ضرورت انسان میں حلول کرتا ہے جسے اوتار کہنا چاہئے۔ یہہ نور انبیا علیہم السّلام سے گزرتا ہوا (مقنع کا دعوے تھا کہ) آخر میں مجھے پہونچا۔ اس نور کے دیکھنے کی تاب انسان کو نہیں ہو سکتی اس لئے نقاب کی ضرورت ہوئی ؛ ایران کے بہت لوگ اس کے معتقد ہو گئے اور ایک جمع غفیر اس کے عقائد کے پیرو ہو گئے ؛ حاکمِ خراسان اور افواجِ شاہی کو عرصہ تک مقنع نے شکست پر شکست دی۔ آخر کو خلیفہ مہدی نے ایک نامور سپہ سالارِ فوج سعید الحرشی نامی کو مقنع کے مقابلہ میں بھیجا ؛ سعید نے مقنع کو شہر کش میں محاصرہ کر کے زیر کیا۔ مقنع نے لاچار ہو کر زہر کھالیا ؛

اس شخص کے عجیب عجیب قصے ہیں کہ اس نے مقام نخشب کے ایک کنویں سے دو ہفتہ تک چاند نکالا۔ اس چاند کی روشنی چار فرسنگ تک جاتی تھی ؛ ممکن ہے کہ آج کل کی بجلی کی طرح مقنع کو جو حکمت و فلسفہ میں دخل رکھتا تھا قوتِ برقی کا علم ہو اور کسی غار میں بجلی کا مسالہ جمع کر کے آجکل کے روشنی کے ہنڈوں کی طرح ایک ہنڈا اونچا کر کے دکھایا تو ضرور چاند سا معلوم ہوا ہوگا ؛ اگلے وقت کے لوگ کوئی بات جواب سائنس سے دریافت ہو رہی ہے

کرامت و معجزہ سمجھتے تھے ؛

اس نے ایک فرقہ حشیشین نامی پیدا کیا ۔ حشیش یعنی بھنگ ؛ انکو بھنگ کے نشہ سے اپنے قابو میں رکھتا تھا ؛ قابو میں رکھنے کی یہہ ترکیب نکالی کہ ان لوگوں کے لئے بہشت کے نمونہ پہ ایک ایسا مقام بنایا جہاں رات دن عیش میں گزرے ۔ خوبصورت عورتیں اچھے کھانے شراب و کباب ہر طرح کے لذات نفسانی کا سامان مقنع کے مریدوں کے لئے مہیا رہتا تھا ؛ مرید اکثر نوجوان عیش پرست ہوتے جو عورتوں کے ساتھ عیش میں مبتلا ہوکر مقنع کے احکام کی تعمیل میں جان دینے سے دریغ نہیں کرتے تھے ؛

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ خلیفہ نے مقنع سے صلح کی اُمید میں ایلچی بھیجے ۔ مقنع ان ایلچیوں سے پہاڑ پر ملا ۔ جہاں یہہ اکثر رہا کرتا تھا ؛ اس وقت مقنع کے پاس کہتے ہیں اُنئی نوجوان سبزہ آغاز مرید جمع تھے ۔ مریدوں میں مختلف درجے تھے ۔ خاص درجہ کے مرید فدائی کہلاتے تھے ؛ یہہ نوجوان فدائیوں میں تھے ۔ مقنع نے ان سے کہا کہ تم اپنے تئیں پہاڑ سے گرا دو ۔ سب نے پہاڑ سے گر کر جان دے دی ؛ مقنع نے خلیفہ کے ایلچیوں سے مخاطب ہوکر کہا کہ تم اپنے خلیفہ سے جاکر کہہ دینا کہ ایسے جاں باز جاں نثار میرے پاس اسی ہزار آدمی ہیں ؛

اِن فدائیوں کا یہہ حال تھا کہ خلیفہ کے ہر حال اور ہر موقع پر خُفیہ ایک نہ ایک ہر وقت موجود رہتا تھا ۔ کھانے کے وقت دسترخوان پر ۔ سوتے وقت پلنگ کے پاس ۔ یہاں تک کہ ایکدفعہ خلیفہ نے تکیہ کے نیچے ایک پرچہ دیکھا جہاں خلیفہ کا خنجر رکھا رہتا تھا کہ خنجر تو ندارد اور پرچہ میں یہہ لکھا ہوا کہ خلیفہ تو کہاں تک ہم سے بچیگا ۔ ہم نے اسوقت تجھ عمداً چھوڑ دیا کہ وہی خنجر جو سرہانے رکھا تھا تیری جان لینے کے لئے بس تھا ۔ وہ خنجر ہم لے آئے ؛

یورپ کے انارکسٹ اِس سے زیادہ کیا کرسکتے ہیں ؟

یہہ مضمون جابجا مختلف تصانیف سے ماخوذ کیا گیا ہے ۔ خاصکر انگریزی انسائی کلوپیڈیا اور جو سے کچھ مجھے زبانی یاد تھا ؛ میں چاہتا ہوں کہ کوئی صاحب اپنی معلومات سے اس شخص کا حال زیادہ لکھدیں ؛

خیالاتِ خاص و عام پر نظر

اِس مد میں میرا ارادہ ہے کہ صلائے عام کی رائے حالات روزمرہ پر لکھی جایا کرے۔ آج کل کے پیشِ نظر معاملوں میں وہ کوشش ہے جو بعض بزرگان اہلِ ہنود کی طرف ملکانہ راجپوت مسلمانوں کو مذہبِ ہنود میں شامل کرنے کی ہو رہی ہے ؛

بنی اسرائیل کی طرح ہندو مذہب کی یہہ خاص بات تمام دنیا میں مشہور ہے کہ یہی مذہب ہے جو ہر ایک کو نصیب نہیں ہو سکتا۔ یعنی از روے حسب و نسب جو ہندو نہیں وہ ہندو کیا کسی جزو اہلِ ہنود میں کھرا نہیں سمجھا جا سکتا۔ جس طرح اگلے لوگ شادی بیاہ میں نجیب الطرفین کی شرط لگاتے تھے ہندو مذہب میں نجیب الطرفین ہونے کی پابندی لازمی سمجھی گئی ؛ اگر باپ برہمن نہیں تو بیٹا برہمن نہیں ہو سکتا۔ نہ صرف باپ بلکہ ماں بھی اور ماں باپ بھی تمام عمر پابند رسوم و رواج مذہب ہنود رہیں۔ کسی غیر کے ساتھ پانی بھی اگر پی لیا تو ذات باہر ؎

نازم بہ رسم دیر کہ در بتِ غیر را ؛ صد خرقہ گر دریدہ مریدش نمی کنند

مجھے اندیشہ ہے کہ اب یہہ خوبی مٹتی نظر آتی ہے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ اس کا اثر ملک و قوم پر کیا ہو گا؟ مگر جو صاحب اس تحریک کے محرک ہوئے ہیں اس وقت ہندو مسلمان دونوں کو برابر سمجھیں تو مقتضائے اخلاق ہے ؎

پوچھکر احوالِ دل رکھنا کلیجہ پر نظر ؛ اے مری جاں پاس دونوں کا برابر چاہئے

صرف تعداد بڑھانے کے خیال سے اگر یہہ تحریک سوجھی ہے تو اوّل تو ہندوستان میں اہلِ ہنود کی تعداد ہمیشہ یونہیں بڑھی ہی ہے۔ دوسرے کم تعداد والوں کی دستگیری زیادہ تعداد والوں کو مناسب ہے ؎

عارض میں جو دو شال رخ پر رہیں وسہ ہیں ؛ ہندو ہیں یہاں قوم مسلمان سے زیادہ مذہب اچھی چیز ہے۔ ایسا ہو یا پیرایا ؛ مگر ایک کو دوسرے پر ترجیح دینی از روئے معاشرت مناسب نہیں۔ خاصکر جب کہ سیکڑوں برس سے دونوں مذہب کی قومیں ایک جگہ زندگی بسر کر رہی ہوں ؛

یہ عرض از روئے عقاید مذہبی نہیں۔ بلکہ مقتضائے تمدن و معاشرت ہے کہ موجودہ حالات میں کسی طرح کا رخنہ آرام کے منافی ہے ؛

نمک پر محصول

تمام محصولوں میں جن کا عمل در آمد ہندوستان میں ہے نمک کا محصول سب سے زیادہ ہلکا ہے۔ مجھے یاد ہے کہ پہلے تین روپے من تھا اور ساتھ ہی گوڑ شکر پر محصول تھا : گوڑ شکر کا اثر راجپوتانہ کی ریاستوں میں نہ تھا ؛ پرمٹ کی لین جو قریب قریب تمام ریاستوں کی سرحد پر حادی تھی ریاستوں سے سرکاری عملداری سے گوڑ شکر بلا محصول نہیں جانے دیتی تھی ؛ مسٹر ایلن ہوم صاحب بہادر نے جو بعد میں کانگریس کے موجد ہوئے پرمٹ کی لین توڑ کر نمک سازوں کا بندوبست کیا۔ اس بندوبست سے یہہ فائدہ ہوا کہ نمک اچھا پیدا ہونے لگا اور ریل کے پہونچ جانے سے بار برداری کے خرچ میں کفایت ہو گئی ؛ اگلے زمانہ میں نمک اسقدر گراں تھا کہ نمک جہاں زمین پر گر جائے گھروں میں بڑی بوڑھی عورتوں کی تاکید تھی کہ آنکھوں سے اٹھانا چاہیئے ؛

نمک کا محصول زیادہ ہونے سے سوائے چند اشخاص کے جو شور پسند کرتے ہیں کسی کو خبر نہیں ہوتی۔ اس سے زیادہ آرام کا محصول کسی چیز پر ممکن نہیں کہ اور محصولوں میں تو محصول وصول کرنے کے لئے علیحدہ محکمہ کی یا محکمہ کے ملازم زیادہ کرنے کی ضرورت ہوتی ہے

نمک کا محکمہ موجود ہے۔ دوسرے محکمہ کی ضرورت نہیں۔ دوسرے کسی کے دروازہ پر محصول مانگنے کے لئے جانا نہیں پڑتا نہ کسی سے تقاضہ کہنا پڑتا ہے۔ مشین کی طرح بے تکلیف و تکلف محصول جمع ہو جاتا ہے ؛

فوج میں تخفیف

اصول سلطنت میں سب سے زیادہ ضرورت فوج کی ہے۔ اگلی سلطنتیں تو سب سے مقدم سپاہی کو جانتی تھیں: تمام پیشوں سے ملازمت کے سپاہی کا مرتبہ سب سے بڑا سمجھا جاتا تھا۔ اس میں ترقی انتظام مملکت کی جڑ سمجھتے تھے بادشاہ کے لئے دولتمندی کی ضرورت نہیں۔ ضرورت ہے تو فوج کی: خاص کر ایسے وقت میں جب کہ جا بجا سے فساد کی خبریں زیادہ آنے لگی ہیں ؛ سلاطین مغلیہ کے زمانہ میں جتنے اعلےٰ عہدے ملک کے تھے اُن پر فوجی افسر مقرر ہوتے تھے کہ فلاں پنجہزاری ہفت ہزاری ہیں ؛ فوج ایسی چیز ہے کہ ہر وقت نیا نہیں مل سکتی۔ اس کے لئے پہلے سے مشق و تعلیم کی محتاجی ہے: اور ہندوستان جیسے ملک میں یہہ بہت کم کہا جا سکتا ہے کہ کس وقت رفع فساد کے لئے سپاہی کی ضرورت ہو ؛

× × × × × × × × × × × × × ×

اگر آج نوازشنامہ صادر نہوتا تو میں بدستور شدت انتظار میں مبتلا رہتا۔ میں نے تو مالک آگرہ اخبار سے بھی دریافت کیا تھا کہ صلائے عام کو کیا پچھم کی ہوا کے جھونکے اُڑا لیگئے یا مطبع کا مطلع گرد آلودہ ہوگیا لیکن آج پتہ ملگیا کہ مارچ کا پرچہ مدت کا چھپ گیا مگر آپ کے اس نیازمند کا پرچہ گم ہوگیا۔ اب ڈاک میں کیا فتور اور چٹھی رساں کا کیا قصور۔ × × × × × × × × × × ×

وہ کون ہوگا جو صلائے عام کا دل دادہ نہوگا ~ ساقی چمن گل رانے روئے تو رنگی نیست ؛ شمشاد خراماں کن تا باغ بیارای ؛ فقط۔ آپکا نیازمند۔ عرفان علی (ای ایس او۔ آنریری مجسٹریٹ آگرہ)۔

ادائے بیان

ادائے حسیناں کی طرح زبان کے لیئے ادائے بیان عجیب دلفریب چیز ہے اس کی خوبی ہمارے ہاں کی مثنویوں پر ختم ہے ؛ ایک پُرانی مثنوی میں سے میں وہ مقام نقل کرتا ہوں جہاں کسی دھوم کی بزمِ شادی میں ارباب نشاط بلائی گئیں۔ یہہ جس طرح آئیں اُن کے آنے کے حال میں لکھا ہے کہ :۔

کوی رتھ پہ بیٹھ اپنے آئی وہاں ؛ کوئی کہہ اُٹھی ہے وہ گاڑی کہاں ؛ کسی نے کہا نوکروں کو بُلا ؛
میاں سے سیانہ کوئی مانگ لا ؛ کوئی اپنے ہاتھی پہ کسوا کے جھول ؛ عماری میں بیٹھی ہے عشرت سی پھول
کہیں تھا خیال اپنے انداز کا ؛ کہیں دھیان کُرتی و پشواز کا ؛ کسو نے کہا پیٹ سر اے بُوا
وہ گہنا یہاں سے مرا کیا ہوا ؛ کہیں کسکی زلفوں میں اٹکی ہے جان ؛ لبوں پہ کہیں آگیا رنگِ پان
کسو نے وہ آئینہ سے مُسکرا ؛ پھرایا ہے زلفوں پہ شانہ ذرا ؛ مقابہ کوئی کھول کر اُس گھڑی

چڑھاتی تھی مستی کی لب پر دھڑی ٭ ہر اک کی یہی دل میں تھی آرزو ٭ نہ مجھسی بنے کوئی بن ٹھن کبھو

بزمی سنے **رتن پدم** یعنی رتن اور پدمنی کا افسانہ فارسی میں نظم کیا ہے۔ یہہ ہندی۔ فارسی۔ اُردو اکثر زبانوں میں لکھا گیا ہے اور خوبی یہہ کہ ہر زبان میں اپنی اپنی وضع پر سب نے دادِ فصاحت دی ہے ٭ یہہ موقعہ جہاں کا میں ذکر کرنا چاہتا ہوں یہہ ہے کہ سورج گرہن میں پدم تالاب میں اشنان کرنے چلی ہے اس کو **بزمی** نے اس طرح آغاز کیا:۔

ناقوسِ برہمنِ فسوں سازنہ ٭ زاں گونہ بدیر داد آواز ٭ کامروز کسوفِ آفتاب است
در غسلِ بتاں بسے صواب است ٭ ہر جا کہ بتے و پیکرے بود ٭ ناقوس زناں روانہ شد زود

پدم بھی نہانیکو اُس متبرک تالاب میں اُتری۔ نہاتے وقت سے

طاؤس کہ مویش از ہوا دید ٭ پرواز کناں سرش بہ بوسید ٭ برگفت پدم بہ او بنا کام
کاے مرغ چرا نہ ترسی ازدام ٭ طاؤس کہ یافت بوئے مویش ٭ بربست زبان گفت و گویش
در پیش چناں فتاد بے ہوش ٭ کز دل لشد آشیاں فراموش ٭ پرسید پدم کنیزکاں را ٭
کایں مرغ چرا بداد جاں را ٭ گفتند کنیزکانِ دانا ٭ ٭ کایں مرغ نداشت دل توانا

زلفِ تو بدید مار پنداشت ٭ در قابوئے خود شکار پنداشت
مرغے کہ بود چنیں غلط بیں
ایں است جزاش عاقبت ایں

اس میں یہہ تمثیل نہایت پاکیزہ ہے کہ مور نے پدم کے نہاتے وقت پدم کے سر کے بال دیکھکر خیال کیا کہ کالے سانپ ہیں۔ بے ہوش ہوکر گر پڑا اور جان دے دی۔ پدم نے اپنی لونڈیوں سے پوچھا کہ مور نے جان کیوں دی؟ جواب ملا کہ مور نے غلطی کی کہ تمہارے بال سانپ سمجھکر دوڑا اور جب غلطی کا علم ہوا تو اپنی غلطی کے افسوس میں جان دے دی ٭

پدماوت ہندوستان میں ایسا افسانہ ہے جس میں تاریخ و حسن و عشق۔ مردانگی و نفس کشی۔ ریاضت و محبت اکثر خوبیوں کی بے مثل نظیریں موجود ہیں: میں اسے لیلے مجنوں

بقیہ

شیریں فرہاد - نل دمن - وہ جن و پری کے قصوں سے اچھا جانتا ہوں ؛ یہہ میں پہلے عرض کرچکا کہ پدماوت ہندی - فارسی - اردو - اکثر زبانوں میں لکھی گئی - مسلمانوں نے ہندوستان میں آکر اس افسانہ کو زیادہ پسند کیا - یہاں تک کہ حضرت **ملک محمد جایسی** نے زبان ہندی میں کمال پیدا کرکے[٥] ہندی میں اس قصہ کو اس فصاحت سے لکھا کہ اساتذۂ ذی کمال نے اس کی داد دی ؛ اردو میں وہ خوبیاں دکھانی مشکل ہیں جو حضرت مصنف نے ہندی میں دکھائیں ہیں - میری بدنصیبی کہ ہندی میں مجھے دخل نہیں لیکن جسقدر کہ ترجمہ سے میں سمجھ سکا اصل کی خوبیوں کی داد نہ دے سکنے کی عدم لیاقت کا افسوس ہوا ؛ **پدماوت** میں کئی ہزار شعر ہیں - اور کوئی شعر غایت فصاحت سے خالی نہیں - ہر شعر میں وہ ادائے بیان ہے کہ حسینانِ شوخ طبیعت اگر تمام عمر مشق کریں تو یہہ ادائیں پیدا کرنی مشکل ہیں ؛ مجھے ہندی اشعار سمجھنے کی قابلیت نہیں اگر ترجمہ سے مطلب سمجھ میں آجاتا ہے تو ادائے بیان سے جی خوش ہو جاتا ہے ؛ میرا دل گوارا نہیں کرتا کہ جس چیز سے میں خوش ہوں اُس سے آپ کو خوش کرنے میں تامل کروں ؛

قصہ اس طرح ہے کہ پدمنی کو طوطے سے بہت محبت تھی - راجہ نے چاہا کہ طوطا مارا جائے طوطا پدمنی سے کہتا ہے **ـہ** ٹھاکر انت جیہے جو مارا ؛ تیہہ سیوک کہہ کہاں اُبارا

آقا کی نیت جب مارنے کی ہو تو پھر خادم کہاں بچ سکتا ہے ؟

جنہہ گھر کال منجاری ناچا ؛ پنکھی ناتوں جیو نہ باچا

جس گھر میں بلی مزے اڑائے پرند کی جان کسی طرح بچ نہیں سکتی ؛

میں تمہ راج بہت سکھ دیکھا ؛ جو پوچھ دئے جائے نہ لیکھا

میں نے تمہارے راج میں بہت آرام پایا اگر انصاف سے پوچھو تو اس کا حساب نہیں ہو سکتا ؛

جو اچھیا من کیں سو جیواں ؛ یہہ پچتاؤ چلیوں بن سیواں

جو خواہش دل نے کی وہی کھایا مگر افسوس ہے تو یہہ ہے کہ بغیر خدمت کے چلا - یہہ غایت

---

[٥] "کمال پیدا کرکے" اس لئے کہا کہ حضرت ملک محمد نے بھاشا پر غایت درجہ کی محنت کی ہوگی تب کہیں یہ طرز بیان ہندی میں حاصل کیا جو اُن پر ختم ہو گیا ؛

شرافت ہے کہ طوطے کو افسوس اس بات کا ہے کہ جو آرام مجھے ملا اُسکے عوض میں کوئی خدمت مجھسے بن نہ پڑی ؛ جہاں دشمن کا اندیشہ ہو وہاں آرام کیسا ؟ ع کیلا کیل کرے کا - جو بھیئے بیر پہ کیلا کیا خوشی کرے جو بیر کے درخت کا ہمسایہ ہو ؛ آگے چل کے کیا اچھی بات کہی ع

ستر آہ جہاں کریا کوہ سہو بوڑے ناؤ ؛ جہاں ملاح دشمن ہے ایک دن ناؤ ڈبو دے گا ؛

یہی موقع **پدمنی** کا تالاب میں نہانے کا جو **نرمی** نے فارسی میں باندھا - حضرت ملک محمد نے ہندی میں اس طرح ادا کیا کہ جب **پدمنی** چاند سا چہرہ لیکر تالاب میں اُتری سے

چکوی بچھڑ پکاری - کہاں ملوں ہوں ناہ ؛ اک چاند نس سرگ پر دن دوسر جل ماہ

چکوی (مادین) فراق زدہ پکاری کہ اب تم (چکوہ) سے ملنا کہاں ہو سکتا ہے ؟ ایک چاند جو آسمان پر ہے اُس کے سبب سے تو رات کو جدائی ہوئی یہہ دوسرا چاند دن کو نکلا اب ملنا دن کو بھی ناممکن ہو گیا : ہماری قسمت کہ آج سے رات دن کی جُدائی کا سامان ہو گیا ؛ مشہور ہے کہ چکوہ چکوی (نر و مادہ) رات کو جُدا رہتے ہیں - دن کو ملتے ہیں : **پدمنی** کے چاند سے چہرہ کو دیکھ کر دن کو بھی ملنا مشکل ہو گیا ؛

پدمنی کا موتیوں کا ہار ٹوٹ کر تالاب میں گر گیا اس پر **پدمنی** کے آنسو جو گرے تو گویا ستارے آسمان کو چھوڑ کر تالاب میں جھڑ گئے ؛

طوطا صیاد کے جال میں گرفتار ہوا - جال نہ دیکھا جال میں جو دانہ تھا اس پر نظر گئی سے

یہہ من کٹھن مرے نہ مارا ؛ جار نہ دیکھ دیکھ لے چارا

سوزِ فراق کی پائیداری میں خوب کہا کہ سے

لنکا بجھی آگ جو لاگے ؛ یہہ نہ بجھے اینچ بجا گے

لنکا میں جو آگ لگی تھی بجھ بھی گئی پر یہہ آتشِ فراق نہ بجھی ایسے غضب کی تھی ؛

پدمنی گونہ میں شوہر کے پاس جانے سے ڈری اور سہیلیوں سے ذکر کیا - سہیلیوں نے سمجھایا کہ سے **کون کری جو بھنور نہ رائی ؛ ڈار نہ لوٹ پھپ کروائی**

کون ایسی کلی ہے جسکا رس بھنورے نے نہ لیا - اور شاخ گرانی رنگ سے نہ ٹوٹی ۔

راجہ رتن سین کے چھڑانے کے لئے اس کا بھتیجہ بادل تیار ہو کر چلا اور قسمت سے اُسی دن اس کا گونہ تھا کہ اس کی بی بی گھر میں آئی - بی بی نے منت کی کہ مجھے چھوڑ کر لڑائی پر مت جاؤ ۔ زوجۂ بادل نے بادل کے پاؤں پر گر کر اپنے سر کے بال بادل کے پاؤں میں باندھ دئے کہ یہ گیسوئے پریشان زنجیر ہو کر تیرے پاؤں میں پڑے ہیں جن سے چھوٹنا مشکل ہے ۔ بادل نے کہا مجھے اس وقت نازو انداز سے اُلجھن ہوتی ہے میں لڑنے کو جاتا ہوں اس وقت لڑائی کا ذکر مجھے پسند آتا ہے کہ عورت وزمین تلوار کی لونڈی ہیں جو تلوار کے زور سے جیتے اُس کے بس کی ہیں ؎

عروس فتح کسے در کنار گیرد تنگ ۔ کہ بوسہ بر لب شمشیر آبدار زند ۔

مرد کا قول پیچھے کو نہیں ہٹتا جس طرح ہاتھی کے دانت جب باہر نکلے تو اندر نہیں جاتے تو عورت سے لڑائی کا حال تو کیا جانے ؟ لڑنے والا سنگار سے خوش نہیں ہوتا ۔ عورت نے جواب دیا کہ اگر تمہارا ارادہ قطعی لڑائی پر جانے کا ہے تو پہلے مجھ سے لڑ لو کہ میں نے لڑنے کے لئے سنگار کیا ہے ؎

جو تم جھو جھ پے باجا ۔ کینہ سنگار جو جھ میں ساجا

اب لڑائی کا سامان دیکھئے :-

جوبن نے اُبھر کر منہہ سامنے کیا ہے - فرط شوق سے فراق بھاگ نکلے گا : مانگ کا سیندور تلوار خون آلودہ کی طرح گویا شمشیر برہنہ ہے - ناوک مژگان اور خدنگ نظر کا مقابلہ کھیل نہیں - زلف دراز کی پھانسی گلے میں اور لب کی لب سے لڑائی - سینہ کا زور فیل مست کیطرح - لشکر غمزہ و ناز کا دھاوا - یہ وار خالی نہیں جا سکتے ۔

حضرت **ملک محمد** نے ساری **پدماوت** جو چھ سات سو صفحوں کی ہے نہایت پاکیزہ ادائے بیان سے بھر دی - انکی تفصیل کیلئے **پدماوت** سے دُگنی جلد کی کتاب بھی کافی

صلائے عام کی ڈاک

× × × × × × × × × × × × ×

کلکِ تو خوش نویسد درشان یار و اغیار ؛ تعویذ جاں فزائے افسون عمر کاہی ؛ حافظ

× × × × × آج صبح جناب کا پوسٹ کارڈ تنہا نہیں آیا مارچ کے صلائے عام کو ساتھ ساتھ لیتا آیا۔ اس ادنٰے سے پوسٹ کارڈ نے وہ کام کیا جو سرکاری ملازموں سے بھی رہ جاتا ہے۔ اکثر آپنے دیکھا ہوگا کہ دیوانی کے امین صاحب تعمیل پہ جاتے ہیں مگر لاکھوں روپیہ کی ڈگریاں بلا تعمیل کے واپس لئے چلے جاتے ہیں۔ یاد فرمائی کا شکریہ کہانتک اور کس زبان سے ادا کروں۔ یہ آپکی انتہا کی قدر افزائی ہے جو مجھ ایسے ناچیز کا خیال دل سے نہیں بھولتا۔ مجھے زیادہ لطف اس میں آیا کہ جناب صلائے عام کے پہونچنے کی رسید بھی مجھسے طلب فرماتے ہیں۔ اسکے معنی یہ ہیں کہ بمزید لطف و عنایات مرا نوشتہ مجھسے لیتے ہیں کیا اچھی حسن طلب ہے۔ آپکے ارشاد کی تعمیل کرنے میں مجھے ازبس مسرّت ہوتی ہے ورنہ مجھ میں یہ لیاقت کہاں کہ صلائے عام کے شایاں ایک فقرہ بھی لکھ سکوں ؎

مجھکو لکھنے کی مضامیں کے لیاقت گو نہیں ؛ حشو کی بھرتی بھی آجاتی ہے لیکن کام میں
میرا مضمون ہیچ اور میری زباں ناکارہ ہے ؛ اپ سے ملتی ہے لیکن آفریں انعام میں
جب ہی تو پھولا نہیں سماتا ہوں ورنہ ؎

سچ تو یہ ہے خاں بہادر حکم کی تعمیل ہے ؛ ورنہ کیا رکھا ہے مجھ میں اور میرے نام میں
کج زباں میری ہے ہے رطب اللساں ناصر علی ؛ اُن میں طرزِ پختہ کاری میں ہوں طرحِ خام میں

اس وقت کچہری جانیکا خیال بندھا ہے غلطی درست فرما دیجیئے گا۔

حق امر یہ ہے کہ ؎

نام میرا مجھسے بہتر ہے صلائے عام میں ؛ کیونکہ شہرہ خاص کھتا ہے وہ عارف عام میں

× × × × × × × آج کے صلائے عام نے تو مجھے اتنا انتظار دکھایا کہ گھڑیاں گنتے گنتے صبح سے شام کی اور آج کے ریویو کی یہ جلدی کہ فوراً لکھدوں - مجھے تملق کی باتیں تو آتی نہیں میں جو بات ہے وہ خدا لگتی سیدھی سدھی کہہ دیتا ہوں - میں حیران ہوں کہ اس مسئلہ کا جواب کیا ہو سکتا ہے کہ "دعا میں اثر ہے یا بے اثر" اگر دعا میں اثر نہوتا تو کاہیکو کوئی دعا مانگتا اور آسمان کی طرف ہاتھ کیوں اٹھاتا

حافظ شیراز رحمتہ اللہ علیہ نے دعا کے ایجاب و قبول کے مسئلہ کو یوں حل فرمایا ہے ؎

حافظ وظیفۂ تو دعا گفتن است و بس ؛ در بند آن مباش کہ نشنید یا شنید

ناآپ نے کیا خوب کہا ہے اور حق کہا ہے کہ "اس مسئلہ میں بہت لکھنے کی گنجایش ہے پھر بھی قول فیصل مشکل ہے" لیکن جب آپنے یہہ نتیجہ نکال دیا کہ "دعا میں اثر ہو یا نہ ہو دعا قبول ہو یا نہ ہو دعا تو انسان کے لئے لازمی ہے" تو پھر کونسی گنجایش آگے کسیکو لکھنے کی چھوڑ دی -

مسئلہ خلافت عجب الجھن میں پڑا ہوا ہے لیکن آپنے مورخانہ یہ فیصلہ لاثانی کر دکھایا ہے کہ سلاطین ہند زیادہ تر شاہان ایران کے قدم لقدم پیرو رہے اور شاہان ایران بوجہہ عقاید امامیہ خلافت کے بہت قائل نہیں" اس آپ کے فیصلہ سے تخالف ناممکن ہے -

مضمون پریشان میں گنہگاروں کی پرسش کا مضمون بہت پراثر اور پرمذاق لکھا ہے اور بالکل سچ ہے کہ مدتوں کے بعد تو قیامت ہوگی پھر ہم کو کیا یاد رہیگا کہ دنیا میں ہمنے کیا کیا تھا اور جو بات کہ خود ہمکو یاد نہ رہیگی وہ ہمارے فرشتوں کو بھی نہ سوجھے گی -

اب تو مجھے مطلق فرصت نہیں لیکن چلتے چلتے اتنا اور بھی لکھدوں کہ جو مضامین "از روئے انصاف" کے ذیل میں متعلق لارڈ لارنس صاحب کے لکھے ہیں وہ ایسے بے کم و کاست ہیں کہ بالکل راست ہیں اور میں یہہ بھی عرض کرونگا کہ چند احباب سے نے اس مضمون پر آپکو وہ داد دی کہ جو شایاں ہے اور خوبی یہہ ہے کہ سب متفق الرائے ہیں -

ہندی مثل ہے کہ سو سیانے ایک مت ؛ نیازمند - عرفان علی (آئی ایس او - انریری مجسٹریٹ آگرہ) ۸ر اپریل ۲۳ء

...وب سے تعلق رکھتے ہوں شایع ہوا کریں گے ؛

ساقی نامہ

ہماری زبان کی لٹریچر میں ساقی نامے ایک بڑا جزو کمال سمجھنا چاہیے مسلمانوں میں گو شراب حرام ہے مگر سب سے زیادہ شراب کے مضمون فارسی اردو میں نظر آتے ہیں۔ مضمون بہت روندہ ہوا ہے مگر جس نے اسے چھیڑا نیا کر دکھایا: فقیر صاحب نام دردمند تخلص کا ساقی نامہ ڈیڑھ سو برس کا تذکرۂ گلشنِ ہند سے یہاں نقل کیا جاتا ہے کہ زبان گو پرانی ہے مگر مضمون اب بھی تازہ معلوم ہوتی ہیں:

ساقی نامہ حضرت دردمند

پڑی اسکی خوبی کی ازبسکہ دھوم :: لیا ہاتھ قدرت کا صانع نے چوم :: ارے ساقی اے جان فصلِ بہار :: یہی تھا ہمارا و تیرا قرار\
ہماری بسر ہوگی یہ فصل تھی؟ :: فراموش کر دیگی یہ فصل تھی؟ :: تری جان کی سوں غنیمت ہوئیں :: سلیقوں میں ظالم قیامت ہوئیں\
مری عقل میں کون انباز ہے :: ارسطو مرا اک دوا ساز ہے :: فلک چرخ ماریگا گر صد ہزار :: نہ لا دیگا مجھسا کوئی رو بکار\
نظر تو کر ٹک چمن کی طرف :: شگوفہ کو آیا ہے مستی سے کف :: چمن میں بھرا ہے نشہ یاں تلک :: کہ جاتی ہے نرگس کی گردن ڈھلک\
تجھے جانِ گل کے لہو کی قسم :: تجھے باغ کے رنگ و بو کی قسم :: تجھے جام کے چشمِ تر کی قسم :: تجھے اپنی پنہاں نظر کی قسم :\
ادا سے لہکنے کی تجھکو قسم :: نشہ سے دہکنے کی تجھ کو قسم :: تجھے جامِ صہبا کے سر کی قسم :: تجھے اپنے مینا کے سر کی قسم :\
تجھے نازِ مستی کی اپنے قسم :: تجھے خود پرستی کی اپنے قسم :: قسم ہے تجھے بے سبب جنگ کی :: قسم ہے مری نام کے ننگ کی\
اری بیوفا بے مروت صنم :: میں دیتا ہوں تجھکو قسم پر قسم :: تجھے دخترِ رز کی حرمت کی سوں :: تجھے مغبچوں کی شرافت کی سوں\
تجھے وعدہ کر بھول جانے کی سوں :: تجھے اپنی سوگند کھانے کی سوں :: تجھے ناتوانوں کی طاقت کی سوں :: تجھے بیقراروں کی فرصت کی سوں

شب عید کے تجھکو چاؤں کی سوجھی مجھے اپنو مہندی کے پاؤں کی سوجھی ٭ جو تونے کیا ہے کو مجھپر حرام ٭ تو اتنا کرائے ظالمونکے امام
کہ تو سرکشی سے نکر یہ کمال ٭ مرے خون کو اپنے اوپر حلال ٭ تجھے رحم مجھ پر کچھ آتا نہیں ٭ مگر جینا میرا بھاتا نہیں
نہ توڑ آئینہ اپنے غمخوار کا ٭ زیاں خوب نہیں اپنی سرکار کا ٭ یقین جانیو گر نہ ہو ایک آن ٭ تری مہربانی کا مجھکو گمان
تو صورت نہ پکڑے ہماری حیات ٭ نکل جائے جی ناامیدی کے ساتھ

از تذکرۂ **گلشن ہند**۔ مصنفہ مرزا علی لطف

کلام یاس (متعلق بہ دعا)

× × × × × × × × × × × × × × × ×

"صلائے عام کا تازہ پرچہ موصول ہوا۔ دعا کے اثر اور بے اثری پر آپکا مضمون بہت پسند آیا۔ اس میں شک نہیں کہ یہ مضمون بہت وسعت رکھتا ہے۔ دعا کی یہ فلاسفی کتنی سچی ہے کہ یہ خداشناسی کی جڑ ہے۔ اور یہ بات کیا کم ہے کہ شوق دعا سے امید ایسی جاں نواز نعمت کا ثبوت ملتا ہے اگر امید نہ ہو تو زندگی نہ ہو"

× × × × × × × × × × × × × ×

رسم دنیا نہ سہی فرض ادا کرتے ہیں ٭ ہاتھ اٹھے یا نہ اٹھے دل سے دعا کرتے ہیں ٭ موسم گل میں جو خاموش رہا کرتے ہیں
وہ بھی ایک معنی بے لفظ ادا کرتے ہیں ٭ حضرت دل ہیں عجب ظالم مظلوم نما ٭ گھر جلا کر کف افسوس ملا کرتے ہیں
دیکھنا یہ ہے کہ سرگشتۂ سعی باطل ٭ کیا علاج دل دیوانہ نما کرتے ہیں ٭ دامن مطلب نایاب کی اللہ رے ہوس
دست شل حوصلۂ بے سروپا کرتے ہیں ٭ عمر بیداری موہوم کے دھوکے میں کٹی ٭ اب جو چونکے ہیں تو خود اپنا گلا کرتے ہیں
پاؤں ٹوٹے ہیں مگر آنکھ ہے منزل کی طرف ٭ کان اب تک ہوس بانگ درا کرتے ہیں ٭ لذت مژدۂ فردا میں جو ہیں ڈوبے ہوئے
طعنۂ غفلت امروز سنا کرتے ہیں ٭ دیکھکر دور سے مستقبل روشن کی جھلک ٭ جان نظارۂ اول میں فدا کرتے ہیں
بے اجل منزل فانوس پہ مرنے والے ٭ جان کیا دیتے ہیں اک رسم ادا کرتے ہیں ٭ موت مانگی تھی خدائی تو نہیں مانگی تھی
لے دعا کر چکے اب ترک دعا کرتے ہیں ٭ ناخدا تیرے ارادوں میں خدا برکت دے ٭ یاس اک مرتبہ پھر قصد دعا کرتے ہیں

ابوالمعانی مرزا **یاس** لکھنوی

Presentation of Mir Nasir Ali Khan Bahadur of Delhi to his Most Gracious Imperial Majesty King Emperor

—:o:—

Extract from a letter from J. P. Thompson, Esquire I. C. S. Dated 13th December, 1911.

—:-o-:—

"Dear Mir Sahib.

I enclose your invitation card for the Garden Party this afternoon, which has just reached me from the Private Secretary to His Honour."

o o o "Sir Louis Dane hopes to have an opportunity of presenting you to his Imperial Majesty" o o o o

—:o:—

Extract from a letter from Sir Richard Dane. K. C. I. E. (Brother of His Honour the Lieutenant Governor of Punjab) Dated Lieut. Governor's Camp, 25th February 1912.

"Dear Mir Nasir Ali."

o o o o o o o

My Brother has told me that you had the great honour of being introduced to his Imperial Majesty the King Emperor."

I am. Yours Sincerely,

—:o:—

Extract from a letter from Major J. C. C. Angelo, Dy. Commissioner, Dated, 18th December 1911.

"My Dear Mir. Sahib.

"I Am very glad you were presented to His Imperial Majesty—it was a fitting ending to the Durbar." o o o o

Your Sincerely.

Babu Rebindra Nath Tagore of GITANJALI, writes:—

o o o o

"I have no doubt that it (Sala-i-Am) is doing a good service in promoting the cultivation of Urdu literature."

o o o o o o

Extract from a Gentleman,s letter Dated April 4, 1914.

o o o o o o

"I conclude from the last issue of the Sala-I-Am that you have been invested with a *Khilat* as Diwan of the Pataudi State, will you permit me as an old friend of yours and an admirer of your genius to offer you my sincere congratulation,

o o o o o o o

" It like Addison you have acquired celebrity as an Essayist and a brilliant writer of Urdu prose, o o

o o o o o o

you, like him, deserve to be raised to the highest advancement in the state!" Now, that is no flattery I speak as I think" o o o

"In conversation this morning with o o I brought to his notice the SALA-I-AM, and have at his request sent him your December Number, drawing his particular attention to your "Stray thoughts" مضمون پریشان and especially to your simile of [illegible]

o o o o o o o

Farrash-khana Delhi. He has recently started an Urdu Magazine Sala-i-Am, in his own city. He is a writer of some forty years standing. His writings are appreciated in Lucknow as well as in Delhi He has been congratulated for his work by the Lieutenant Governor of Punjab. He has received congratulations from all parts of India compliments from many literary men and favourable reviews from the Press, and now, that great boon the appreciation of Lord Minto. His style is very simple but emphatic. He wtries philosophical essays in Urdu and is thus doing much to bring to a high level Urdu literature. It is hoped that the paper he has started will do much for the good of our languages. The paper itself is nicely got up, the annual subscriptions only Rs. 3. Those who are desirous of reading good Urdu should at once communicate with the editor, the point also I should add that the paper is much liked and purchased by Europeans both in India and Europe."

———:o:o:o———

Copy of a letter from the Private Secretary to His Honour the Lieutenant Governor of the United Provinces, dated 11th April 1913.

GOVERNMENT HOUSE.

LUCKNOW.

Sir

I am desired to acknowledge ... letter of the 19th forwarding ... of your paper "Sala-i-Am." ... Honour the Lieutenant ... perusal; and to say that His Honour has put it a side to study an enjoy at leisure.

————

The annexed Review of the SALA-I-AM Delhi, is re published from the Journal of the Moslem institute, Calcutta, No. 2 Vol V Page, 104.

———:o:o:o———

"The Sala-i-Am, published at Delhi is a high class Urdu periodical and in get up printing and style it is without a parallel. it has been truly remarked by the *Pioneer* that it, "seeks to promote the cultivation of Urdu literature." It is edited by Khan Bahadur Mir Nasir Ali who is a writer of 40 years standing"

Extract from the GAZETTE OF INDIA JUNE 6, 1914. EXAMINATIONS.

XVI:— The following are the Text books prescribed for the PROFICIENCY EXAMINATION:—

o o o o o o

URDU:—

o o o o o o

In addition to the Grammer and Magazine recommended for the proficiency examination, the following are recommended :— —

o o o o o o

Magazine

SALA-I-AM

o o o o o

Appendix B. List of authorised Text books. The following is a list of Text books prescribed for the various examination together with the places where they may be obtained.

o o o o o

URDU.

SALA-I-AM ______________ DELHI

o o o

school :—

"Sala-i-Am" edited by Mir Nasir Ali Khan and published at the Mustansir Press Delhi, annual subscription Rs. 5.

I have &c.

J. C. GODLEY

Director of Public Instruction, Punjab

Extract from a letter from R. P. DEWHURST *Esquire I. C. S Session Judge, dated 11th January 1911.*

"I take this opportunity of saying that I entertain a very high opinion of your Magazine I will not say that I read every word of every number, but I can say with truth that I read eagerly all the articles proceeding from your own pen begining to end."

"I have always been an enthusiast with regard to Urdu literature since I came to India eighteen years ago and have read much classical verse and prose besides the more ephemeral publications but I have never yet encountered such a model of a clear and attractive prose such as I find in your articles.

Extract from a letter from the Hon'ble W. Merk Esq., L. L. D. C. S. I. I. C. S. Late Chief Commissioner, N. W. Frontier province Written from England dated 16th August 1911

I thougt it (Sala-i-Am) a periodical that might be encouraged with for advantage. for instance to be placed in the waiting rooms for native gentleman calling on Deputy Commissionere.

Extract from a letter from A. L. GORDON WALKER Esqr. I. C. S. Punjab Commission dated 7th October 1911

"I quite agree with Mr Merk that the (Sala-i-Am) ought to be in the waiting room of all Deputy Commissioners. Curiously enough I have used it for the purpose myself and always find that the Indian gentlemen who read it are delighted with it."

Extract from a D. O. letter from the Deputy Commissioner of Gurgaon to the vice chancellor of the Punjab University dated 14th December 1910

"I wonder if you have any collection of receiving a letter from me last July when I sent you a copy of the Sala-i-Am, edited by Khan Bahadur Mir Nasir Ali, a most estimable old Government servant who spends his leisure hours, when not occupied in his Magisterial duties [he is an Honorary Magistrate in Delhi] in editing and publishing quite one of the best Magazines in Urdu.

"I am sending you another copy of the Magazine with a request that you will as Vice Chancellor of the University give it all your assistance and if possible, its Editor the Mir Sahib, who is a most loyal old man and a man of letters."

———o———

EXTRACT FROM THE INDIAN DAILY TELEGRAPH LUCKNOW DAILY 14th DECEMBER, 1901.

"But the chief point about which I have taken up my pen to write is the literature of Khan Bahadur S. Nasir Ali Sahib of

OPINIONS

Regarding "SALA-I-AM" Delhi.

The following Critique on the "SALA-I-AM," Delhi was Published by the Pioneer, in its issue of the 3rd November 1909

"The Sala-i-Am published at Delhi keeps up high character as a periodical which seeks to promote the cultivation of Urdu literature. Khan Bahadur Mir Nasir Ali, with whom loyalty and learning go hand in hand is filling the leisure hours of his retirement by devoting himself to the editing and publishing of this Magazine. His style is marked by refinement and culture, and his readers should increase in number as the merits of his work become disclosed. The Sala-i-Am is particularly well printed and European students of Urdu should find it quite worth reading."

Extract from a letter from Colonel D. C. PHILLOT Secretary Board of Examiners, Calcutta, dated 20th January 1910

"I have obtained the opinions of some of the board on the "Sala-i-Am." We think it is the best Urdu Magazine we have yet seen both in appearance and contents I shall have great pleasure in recommending it to candidates for the high Proficiency and Degree of Honour In fact, I have been doing so."

Extract from a letter from Sir Thomas GORDON WALKER L. L. K C I E. late Lieutenant Governor of Punjab Dated 15th March 1909

"The Magazine (Sala-i-Am) appears to be a very superior work one that ought to be appreciated."

SIR LUCAS WHITE KING
Kt. L. L. D., C. S. I. F. R. S.
Indian Civil Service retired
writes as follows:-

"I am delighted with the style of your Magazine and am looking forward to the next number.

Dated 15th October 1908

Extract from CIRCULAR No 26 SERIAL No 5059

From the Hon'ble Mr J C GODLEY M. A. Director of Public Instruction Punjab

TO ALL DEPUTY COMMISSIONERS INSPECTORS OF SCHOOLS, HEADS OF TRAINING INSTITUTION & MANAGERS OF AIDED and RECOGNIZED UNAIDED SCHOOLS IN THE PUNJAB.

Dated Lahore The 31st August 1910

Sir,

I have the honour to recommend the Journals noted below for the reading room of Secondary

صلائے عام

خواجہ قمرالدین راقم کا شعر ہے ؎

مقصد تمہارے ہاتھ ہے قسمت خدا کے ہاتھ ÷ جو کچھ خدا سے ہو وہ تمہاری زباں سے ہو

صلائے عام کا بھی یہی عقیدہ ہے کہ کسی ملک قوم کی ترقی تو پروردگار کے اختیار میں ہے لیکن ترقی کے لئے پہلی شرط اپنی زبان میں کمال پیدا کرنے کی ہے ÷ ضد کی اور بات ہے مگر اس وقت ہندوستان کی زبانوں میں اردو سے بہتر کوئی زبان میری سمجھ میں نہیں آتی جس پر جمہور اہل ہند ہندو ہوں یا مسلمان دونوں کی زبان کا اطلاق ہو سکے ؎

نعرۂ عشق سے ہیں سبحہ و زنار ملے ÷ ایک آواز پہ دو ساز کے ہیں تار ملے

تجھسے کوئی آشنا نہ ہو یا ہو ÷ پر تجھے سب سے آشنا دیکھا

یہہ رسالہ اپنی زبان میں اظہار کمال کی غرض سے جاری ہے کہ اردو لٹریچر کیلیئے ہر طرز پر لکھنے کا مسالہ جمع ہو اور ادائے بیان میں ہماری زبان اور زبانوں سے اگر بازی نہ لیجا سکے، تو کسی زباں سے مرتبہ میں کم نہ رہے ؎

دیکھکر تجکو مٹے جاتے ہیں دنیا کے حسیں ÷ جمع ہوتا ہے مسالہ تری یکتائی کا

صلائے عام میں ہر طرح کے مضمون نظم و نثر شایع ہوتے ہیں۔ زیادہ تر نثر کی اسوقت نثر کی ضرورت ہے : اور نثر بھی ایسی جسمیں زبان کی خوبی و فصاحت کے ساتھ خیال کی پاکیزگی اور نزاکت ضرور ہو ؎

دل باندھئے تو یار کے کاکل سے باندھئے ٭ بلبل کو باندھئے تو رگِ گل سے باندھئے

رسالہ کی قیمت پیشگی چھ روپیہ سالانہ ہے۔ چھ مہینے سے کم کی خریداری منظور نہیں ہو سکتی: قیمت بذریعہ منی آرڈر عنایت فرمائی جائے: مضمون نگار صلائے عام کی قیمت سے بری نہیں۔ نہ یہ ضرور ہے کہ مضمون خواہ مخواہ شایع کیا جائے: جو مضمون شایع نہ ہو سکیں اُنکے واپس کرنے کا ذمہ نہیں ٭ صاحب مضمون اپنا نام اور پتہ ضرور لکھیں۔ گمنام تحریریں شایع نہیں ہو سکتیں: جامعِ اوراق کو مضمون میں کمی بیشی کا اختیار ہے۔

صلائے عام اعلیٰ احکام سول و ملیٹری افسروں کے امتحان میں گورنمنٹ آف انڈیا سے منظور ہو چکا ہے۔ ہندوستان کے سوا یورپ کے عالم و فاضل صلائے عام کی قدر کرتے ہیں: اُردو میں صلائے عام کے مضامین کو خاص مرتبہ حاصل ہے سہ

پیری میں بھی ہے ولولۂ شوق نہیں ہم ٭ رکھتے ہیں ابھی اک دلِ ہنگامہ گزیں ہم ٭

شہرت نہیں مجنوں کے برابر یہ مسلّم
پر کوئی نہ جانے ہمیں ایسے بھی نہیں ہم

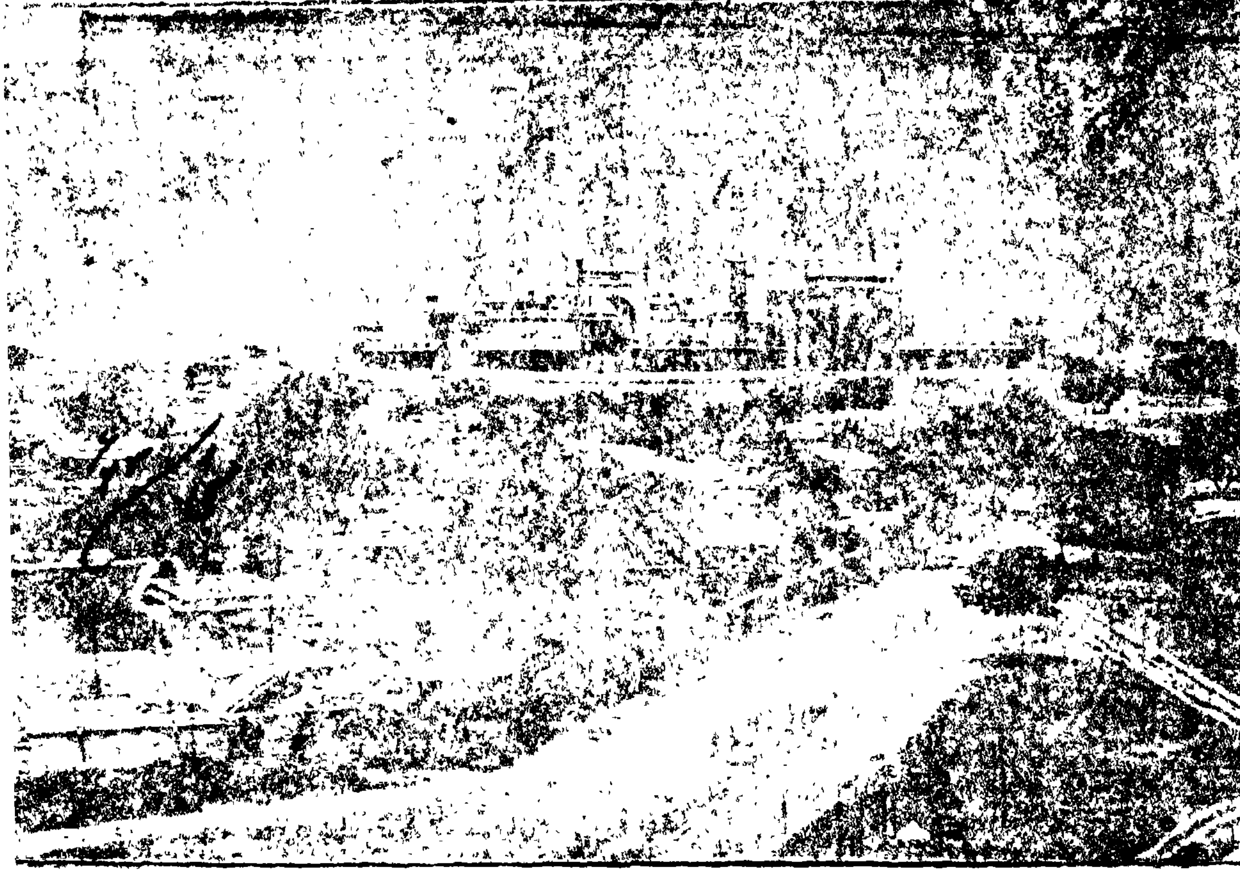
صلائے عام کا پتہ اسقدر کافی ہے کہ :-

دہلی۔ فرّاشخانہ : مکان میر ناصر علیخاں بہادر

حسب الارشاد میر ناصر علیخاں بہادر مطبع ناصری واقع فراشخانہ دہلی میں باہتمام میر احمد عصیاؔ اور شایع ہوا

PRINTED AND PUBLISHED BY MIR NASIR ALI KHAN BAHADUR (EDITOR) AT THE NASIRI PRESS, FARRASH KHANAH, DELHI.

red No. L. 1462 Sala-i-Am, Del



نمبر ۵ صلائے عام جلد ۱۱

SALA-I-AM, DELHI.

A high class Monthly Magazine devoted to the cause of Urdu literature, the preservation of the old Indian, especially Mohammadan culture and refinement, and the assimilation of the best features of the new civilization.

جلد ۱۱ — نمبر ۵

فہرست مضامین

بابت ماہ مئی سنہ ۱۹۲۳ء مطابق شوال سنہ ۱۳۴۰ ہجری

پیرایۂ آغاز

تیرِ مایوس کی تشویش مٹانے کے لئے ؛ فتنۂ حشر اُٹھا دستِ دُعا سے پہلے

ہر پرچہ میں پہلا مضمون مجھے ستاتا ہے اور پہلا مضمون ہمیشہ کے لئے **پیرایۂ آغاز** ٹھہرا۔

پرسشِ حشر ہے بیدردیٔ داور کی دلیل ؛ ہوں وہ فریاد جو اُٹھی ہے صدا سے پہلے

لیکن جب پیرایۂ آغاز ہی ہر پرچہ کا پہلا مضمون ٹھہرا تو بقول جناب نواب **ناظم**۔

کرتے ہیں ایک عذرِ نیا ہر ستم کے بعد ؛ گر یوں ہی ہے تو قاعدہ اچھا ٹھہر گیا

صلائے عام کے پڑھنے والے سب سے پہلے **پیرایۂ آغاز** دیکھتے ہیں گو مجھے سارے مضمونوں کے بعد اس کا لکھنا نصیب ہوتا ہے۔

لطفِ انجام کا آغاز میں دکھلاتے ہیں ؛ بھیروی شام سے وہ وصل کی شب گاتے ہیں

اس پرچہ میں مضمون نگاروں کے مضامین زیادہ ہیں۔ اور سب اچھے: مضمون نگاروں کے زور پر میں اس پرچہ میں زیادہ لکھنے سے مستغنی ہوگیا۔

ہمراہیوں سے چھٹ کے پس کارواں رہا ٭ رو رو دیا ہوں آج نقاہت کے زور پہ

شروع کے تین مضمون **صلائے عام** کے ہیں۔ باقی سب مضمون نگاروں کے بھیجے ہوئے ہیں ٭

صلائے عام کی ڈاک اب کی دفعہ زیادہ ہے۔ حالاں کہ اکثر خطوط روک لئے گئے ٭

عاقبت کا مضمون مرزا عرفان علی بیگ صاحب آئی ایس او آنریری مجسٹریٹ نے بھیجا ہے۔ مگر مختصر بہت ہے ٭ تقدیر بھی آپ ہی کا مضمون ہے۔ مگر یہہ بھی مختصر رہ گیا ٭ اتفاق سے جناب **یاس** کے کلام میں "تقدیر" کے شعر اچھے نکل آئے ٭

جناب **ادیب** کا کلام واقعی شاعرانہ ہے۔ آپ پہلے ایک رسالہ شعر و سخن کے متعلق نکالتے تھے جسکی شہرت بہت ہوئی ٭

مضمون نگار۔ خان بہادر جناب مرزا سلطان احمد صاحب کے مضمون کا ایک جزو ہے میں اُسکا بن گیا۔ رسالہ **ہمایوں** سے نقل کیا گیا ہے۔ یہہ طرز بیان بہت قابل تعریف ہے

ریاستوں میں سب سے قدیم حکومت۔ میواڑ اودیپور کی سمجھی جاتی ہے یہہ مضمون مرزا محمد علیخاں المخاطب بہ خاں صاحب کا لکھا ہوا ہے جو ریاست میواڑ سے خوب واقف ہیں ٭

رسالہ **ہمایوں** لاہور میں آپ نے دیکھا ہوگا کہ **صلائے عام** کے مضمون نگار بھی **صلائے عام** کی قیمت سے بری نہیں۔ یہہ بات گو صلائے عام کے لئے مخصوص ہے مگر میں مضمون نگاروں کا قطعی ممنون ہوں کہ **صلائے عام** کے ساتھ ایسا برتاؤ شرافت و عالی حوصلگی کا رکھتے ہیں۔ اسکے ثبوت میں آپ "قیمت **صلائے عام**" والا مضمون ملاحظہ فرمائیں (صفحہ ۴۰) ٥....

مضمون پریشان

از پریشانیٔ دل سوختم و بہر علاج
ہم بہ دریوزۂ دلہائے پریشاں رفتم

انسان کی پریشانی کا علاج پریشان دلوں کی تلاش ہے - یہہ قول عُرفی شیرازی کا ہے جو تمام عُمر پریشان رہا: معلوم نہیں کہ اس کو پریشان خاطر ملے یا نہ ملے ⁂ لیکن دنیا میں آئے ہیں تو اس کو دیکھ لینا چاہیے ؎

آئے۔ دنیا میں تو سب کچھ دیکھ لو ⁂ دیکھو کیا ہوتا ہے کیا ہوتا نہیں

اوّل تو ہم خود یہاں نہیں آئے۔ دوسرے کی مرضی پر جس میں اُسے بھی آنریری (بے تنخواہ کی) مجسٹریٹی کے اختیار نہ تھے آنا پڑا: اب آنے کی شرم کا تقاضہ ہے کہ جہاں آئے ہو اسے بھی دیکھے چلو ⁂ بقول اُستاد **ذوق** کہ حیات لائی اور قضا لے چلی[۱]۔ سیر مفت میں ہو گئی ⁂ اس سیر میں یہہ دیکھنا ہے کہ "کیا ہوتا ہے کیا ہوتا نہیں"؟ جو

[۱] لائی حیات آئے قضا لے چلی چلے ⁂ اپنی خوشی نہ آئے نہ اپنی خوشی چلے۔

ہوتا ہے اُسکا ذکر تحصیل حاصل ہے کہ دیکھنے والوں کے دل جانتے ہیں۔ جو نہیں ہوتا اُس کی آرزو سے تمنا حد نہیں ہو سکتی۔ **پانی پت** کے میدانِ جنگ کی طرح جہاں من ابتدائے اپریل ۱۵۲۶ء تا نہایت ۷ جنوری سنہ ۱۷۶۱ء اور **بابر** سے **احمد شاہ** درانی تک لاکھوں جانوں کا خون ہوا ہر روز انسان کی آرزوؤں کا خون ہوتا ہے۔ کسی کی تمنا بر نہیں آتی نہ کوئی حسرت نکلتی ہے جو ہوتا ہے وہ یہہ ہے کہ اکثر بے گناہ پکڑے جاتے ہیں اور گناہگار چھوٹ جاتے ہیں۔ نیک بندے پریشان رہتے ہیں اور بُرے چین کرتے نظر آتے ہیں محنتی و جفاکش روٹیوں کو محتاج دیکھے اور سست و کاہل وجود آرام میں زندگی بسر کر رہے ہیں ؛ شہدائے کربلا تو ایک بوند پانی کو ترسیں اور یزید کی زبان پر ہو کہ ع الا یا ایہا الساقی ادر کاساً و ناولہا۔ اسے حضرت حافظ اپنے دیوان کے سر مطلع کا پہلا مصرع قرار دیں ؛

آفاتِ آسمانی ... جس طرح انسان پر آتی ہیں اسی طرح جانوروں پر نازل ہوتی ہیں بجلی۔ اولے۔ آندھی۔ طوفان۔ ابر و باراں جانوروں کے لئے بلائے جان سمجھیے ہے

وہ صیاد آیا۔ ابر آیا۔ وہ کوندی برقِ ناشدنی ؛ بنایا آشیاں اور آفتیں ٹوٹیں گلستاں میں

بڑا جانور چھوٹے کا دشمن۔ ایک جانور دوسرے جانور کے انڈے بچے کھا جاتا ہے۔ چڑیمار جال سے لاسہ سے کمپے سے پرندوں کو پکڑتے پھرتے ہیں۔ طوطے۔ مینا۔ بلبل جنکو پالا کہتے ہیں پنجرے میں قید کئے جاتے ہیں۔ یہہ مصیبتیں جانوروں پر کیوں ڈالی جاتی ہیں حالانکہ جانوروں کو عذاب و ثواب سے بری سمجھا جاتا ہے ؛ ہے

ہم سب سے پوچھتے ہیں نشانِ دہانِ یار ؛ ہرگز نہیں جواب ہمارے سوال کا ؛

انسان سے زیادہ اور انسان سے پہلے **پلیگ** (طاعون) میں چوہے مرتے ہیں چوپایوں میں منہہ اور کھر کی بیماری سے بھیڑ بکری گائے بیل سیکڑوں تلف ہو جاتے ہیں۔ بہت سے

انسان کی غذا سمجھے جاتے ہیں۔ اور خدائے رحیم کے نام پہ قربانیاں ہوتی ہیں۔ ان بیچارے بے زبانوں نے کیا گناہ کیا ہے جو مصیبتوں میں گرفتار رہتے ہیں؟ ہمیں تو ہماری نیکیوں کے بدلے بہشت ملیگی جانوروں کو ان مصیبتوں کے عوض میں کیا ملے گا۔ نواب مہدی علی خاں بہادر فرماتے ہیں ؎

زندگی میں تو بہت وصفِ جناں سنتے تھے ؛ خوبیاں باغ کی تزئینِ مکاں سنتے تھے
بعد مرنے کے جو دیکھا تو اُدھر کچھ بھی نہیں

بات یہ ہے کہ عالم اسباب کو کسی کے رنج و راحت سے غرض نہیں۔ ایک ڈھچر کسی کے مشورے اور صلاح بغیر چلایا جا رہا ہے جس کی مصلحت اور غیر مصلحت میں انسان کو دخل نہیں ؎

جس کو منظور ہو عالم کا پریشاں کرنا ؛ اس کو کیا کام پڑا ہے کہ سنوارے گیسو

ان مصیبتوں پر بھی انسان کو زندگی کتنی عزیز ہے۔ ماں کے پیٹ میں پہلو تھی کے بچے کا حرکت کرنا حاملہ کے دل سے پوچھئے۔ چھوٹی عمر کی لڑکیاں گڑیوں میں اس قدر خود دیکھیں کہ **نپولین** کو لشکر آرائی کا اسقدر شوق نہ ہوگا۔ قیس کو دشت اسقدر راس آیا کہ شداد کو باغ راس نہیں آیا؛ لیلےٰ سی سیاہ عورت جسقدر مشہور ہوئی حورانِ بہشتی میں سے کسی کا نام آجتک نہ سُنا؛ زلیخا کو ایک لڑکے (حضرت یوسفؑ) کی محبت (جائز یا ناجائز) میں وہ بات نصیب ہوئی جو حضرت رابعہ بصریؒ کو مشکل سے ملی ؎

موضوع ہے ہر ایک ہر اک کام کیلئے ؛ دل میکدہ میں خاک ہوا جام کے لئے
جا کر کہیں نگین بنا نام کے لئے

جوانی کی مصیبت میں انسان تڑپتا ہے۔ تڑپنے کے لئے طاقت چاہئے

اس لیئے جوان ئے لئے مصیبت میں تڑپنا موزون ہے۔ مجھ جیسے ضعیف بڑھاپے میں سسکتے ہیں کہ سسکنے کے لئے طاقت کی ضرورت نہیں ؛ تڑپنے کے لئے موت لازمی نہیں۔ سسکنے کے بعد قطعی موت سمجھیئے: لیکن پھر بھی جو ہم جیتے ہیں یہہ تعمیل حکم الٰہی سے ؛ جناب ضیغم فرماتے ہیں ؎

تھا میں غمِ فراق میں بیہوش و بیخبر ؛ دہشت تھی نے ضرر کی نہ تھی نفع پر نظر
لیکن ہوا ثبوت کہ اس کا ہے یہہ اثر ؛ ناصح نے قسمیں دی تھیں مجھے ہاتھ جوڑ کر
اک تار ثابت اس لئے پیرے کفن میں ہے ؛

ہم نے مالک کو خوش رکھنے کے لئے بقول جناب ظہیر اس بلا کا ادب کیا کہ فرشتوں سے بن نہ پڑا ؎

اس انتہائے پاس ادب کو تو دیکھنا ؛ ہمکو ظہیر دھیان تھا قاتل کی شرم کا
گردن نہ پھر اُٹھائی جو نیچی لگا ہ کی

انسان کی زندگی کو سفر سے تشبیہہ دیتے ہیں اور موت کو منزل پر پہونچنا کہتے ہیں۔ مگر یہہ منزل پر پہونچنا قافلہ کے لٹ جانے کے بعد سمجھیئے: سارا اسباب لٹ جانے کے بعد منزل پر پہونچنے کا لطف خاک نہیں رہتا۔ بے سرو سامانی میں منزل پر پہونچنا بے لطفی میں داخل ہے ؎

گور اندھیری ہے نہ تکیہ نہ بچھونا نہ چراغ
پہونچے منزل پہ مگر بے سرو ساماں پہونچے

صلائے عام

مانا ہے مجکو قیسِ بیاباں نورد نے ؛ گر مانتی ہے لیلیٰ محمل نشین تجھے

صلائے عام کو اپنی خوش نصیبی سے ایک عجیب مرتبہ حاصل ہے کہ اس کے خریداروں میں مدرسہ کے طلبا سے لیکر علماء ذی کمال تک شامل ہیں - انگریزی خواں اس کی اُسی طرح قدر کرتے ہیں جس طرح انگریزی نہ جاننے والے : ہندو و مسلمان دونوں اس کو پسند کرتے ہیں - جوانوں کو اس کا شوق ہے تو بوڑھوں کو جوانوں سے زیادہ : سبب یہہ کہ افکار میں اس سے تسلّی ہوتی ہے اور خوشی میں خوشی کو ترقی ہوتی ہے ؛ اپنی زبان سے خوش ہونے والے **صلائے عام** پر ناز کرتے ہیں تو اہلِ یورپ اس کی داد دیتے ہیں - جو ایک دفعہ دیکھ لیتا ہے پھر نہ ملے تو تقاضہ پر تقاضے ہوتے ہیں سہ

عاشقِ چشمِ بتاں دشت میں مشہور ہیں ہم ؛ پوچھ لے قیس تو اک ایک ہرن سے ہم کو

بات یہہ ہے کہ اوّل تو اپنی چیز کی قدر یوں بھی سب کو ہوتی ہے - دوسرے ہم اپنی

زبان سے کتنی ہی غفلت کریں جسوقت اسکی آواز کان میں آئی جسطرح بچہ کی آواز ماں کے
کان میں آنے ماں کی مامتا ہوش میں آجاتی ہے ؂ علاوہ اسکے ع ہے مثل سچ کبھی کام
آتا ہے کھوٹا پیسہ۔ اور زبانوں کو دیکھکر ہمیں اپنی زبان کا خیال آہی جاتا ہے کہ جب اس
میں ہرطرح کے مضامین عالی کی گنجایش ہے تو یہہ کسی سے کم کیوں سمجھی جائے ہاں سہ
کو دکن کیا ہے کہ شیریں نے سر اپنا پھوڑا ؂ قیس کیا چیز ہے لیلے تری دیوالی ہے
صلائے عام میں ہر مشکل مضمون اس طرح ادا کیا جاتا ہے کہ اور کسی زبان میں
اس سے زیادہ دل کش طرز شاید ہی ملے۔ جناب **قلق** فرماتے ہیں سہ

ہمارا رنگ پریدہ ہے اسماں کیسا ؂ وفا کا سایۂ رفتار ہے جہاں کیسا
ستم ستم نہیں بازیچہ محبت ہے ؂ وہ دیکھتے ہیں کہ ہوتا ہے نیمجاں کیسا
وہ دیکھتے ہیں کہ اہل نظارہ کتنے ہیں
کسے ہے پاس حیا اور نگاہباں کیسا

آپ کو اپنی زبان کی قدر اگر ابتک نہ ہوئی تو اس میں آپ کی زبان کا کیا قصور ہے ؟
جب آپ بیگانہ زبان میں کمال پیدا کرنے میں ساری عمر صرف کردیں اور اپنی زبان
میں بات کرنی عار سمجھیں تو آپکے قومی و ملکی دعوؤں میں ہمیں شبہہ کسطرح نہ ہو ؟

جب تو ہی نہ اپنی شکل دیکھے ؂ کیا اس میں قصور آرسی کا

آپ جس سے چاہیں پوچھ لیں کہ انسان کے ذہن میں پہلے اپنی زبان آتی ہے یا
سات سمندر پار کی ؟

سر قیس برہنہ پا کی قسم ؂ تجکو لیلے سے ہم سوا سمجھے

صلائے عام میں اپنی زبان کی خوبیوں سے میری غرض یہہ نہیں کہ انگریزی

زبان کے ترجمے کئے جائیں یا کریما و مامقیماں کے پند و نصایح لکھے جائیں۔ یہہ آپ اصلی زبان میں دیکھ سکتے ہیں: اپنی زبان کی خوبی یہہ ہے کہ لب و لہجہ میں بیگانگی پاس نہ پھٹکنے پائے اور جس طرح جو مطلب ادا کیا جائے اُس سے بہتر کہیں نظر نہ آئے۔ صلائے عام کے زور پر آپ غیر زبانوں سے جی کھول کے مقابلہ کریں ؎

ایسی تو ہم نے حسن پرستی کی دھوم کی　٭　یوسف سے بحث کی تری صورت کے زور پر

آپ اپنی زبان میں وہ زور پیدا کریں کہ آپ کے بعد جو لوگ دیکھیں فخریہ کہیں کہ زبان یہہ ہے اور زبانوں سے مقابلہ کریں تو جھیپیں نہیں۔ یہہ نہیں کہ آج پڑھا اور کل بھول گئے:

جب زبان کی خوبیوں میں گفتگو ہو تو آپ اپنی زبان کے مضامین ثبوت میں پیش کریں٭ مضمون تازہ اور زبان ٹکسالی ہو۔ ٹکسالی سے میری مُراد اساتذہ کی زبان جنہوں نے اِک عُمر زبان کی تکمیل میں بسر کر دی۔ کیونکہ زبان میں کمال پیدا کرنا دو چار دن کا کام نہیں۔ جسقدر جس چیز پر محنت و وقت صرف ہوتا ہے اُسیقدر اس کی پائیداری سمجھئے ؎

چار دن میں عشق کامل ہو محالِ عقل ہے　٭　اسکو فرصت چاہئے اسکو زمانہ چاہئے

اسی مضمون کا ایک شعر اور سن لیجئے ؎

سیکھا تھا عشق مکتبِ لیلےٰ میں قیس نے　٭　تعلیم ناگزیر ہے ہر فن کے واسطے٭

آجکل جو عموماً تعلیم یافتہ کہلاتے ہیں بمشکل سے گھڑی دو گھڑی بھی اپنی زبان کی خوبیاں سمجھنے میں صرف نہیں کرتے: بہت کم اپنی زبان کے رسالوں کو شوق سے دیکھتے ہیں۔ یا اپنی زبان کی تصانیف نظم و نثر پڑھتے ہیں ؎

واعظ نے میکدہ کو جو دیکھا تو جل گیا　٭　پھیلا گیا چراند شراب طہور کی

لفظ "چراند" پر مجھے خیال ہوا کہ لوگ اصل اُردو کے الفاظ اکثر بھولتے جاتے

اگلے شعر میں "لپ گیا" کس خوبصورتی سے باندھا ہے ؎

نامۂ اعمالِ اعمالِ زاہدوں سے لپ گیا ٭ اے کراماً کاتبیں اک اور دفتر چاہیئے

"لپ گیا" خاص اُردو ہے جس میں بیگانگی کی بُو نہیں ٭

وہی سمجھے مرا رونا سمندر جس نے دیکھا ہو ٭ وہی سمجھے مرا جلنا جو تابے پر کباب اُس لئے

"تابہ" معمولی اُردو کی فرہنگوں میں مجھے نہ ملا ٭

چھوڑ کر پردہ وہ بیٹھے تو نگاہ شوق نے ٭ کیں وڑاڑیں اسقدر اس میں کہ چلمن ہو گیا

"وڑاڑ" ٹھیٹھ اُردو ہے ٭

دیکھو گے جو کبھی تم او جگر کا میرے ٭ خود کہو گے کہ بھرو توم کے دامن میرا

"توم" ۔ کتنا اچھا کہا!

آرزو ہے کہ رہوں تیرے در دولت پر ٭ زندگی بھر میں کروں چوکسی درباں ہو کر

"چوکسی" ۔ نگہبانی اور حفاظت سے بہتر ہے ٭

یہہ چند شعر میں نے یہاں اس غرض سے لکھے کہ زبان کو بیگانگی سے بچانے کیلئے جہانتک ہوسکے آپ اپنی زبان کے قدیم محاورے اور الفاظ کام میں لائیں جو اگلے اُستاد لکھ گئے ٭

اب میں اپنی زبان کی بیقدری کا ذکر کرتا ہوں کہ اُردو کے یہہ رسالے جو دو چار نکل رہے ہیں انکے دل سے پوچھیئے کہ کسقدر زیر باری اور درد سر اُٹھا رہے ہیں ؎

خزاں میں بھی قفس سے چھوٹنے کی تجکو حسرت ہے ٭ تری تقدیر ہی میں خاک ری بلبل اُڑانی ہے

اگر آپ اپنی زبان کی طرف متوجہ ہوں تو اس کے دن پھریں ؎

غضب ہے فصل گلشن میں دیکھنا تجکو شکستہ پر ٭ خدا پھر لائق پرواز بلبل تیرے پر کردے

فغاں مجنوں کی سن سن کر دعا کرتی تھی یہہ لیلے

بس اب کم یا الٰہی قیس کا دردِ جگر کر دے

آغاز و انجام دہر

دہر فارسی میں بمعنی زمانہ۔ اس کے آغاز و انجام کی نسبت بے شمار عقاید ہیں۔ سب سے بڑا اختلاف اسکے قدیم و حادث ہونے میں ہے کہ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ تک رہیگا یا جس طرح اسکی ابتدا ہے اسی طرح اسکی انتہا بھی ضرور ہے ٭ یہ اختلاف دُنیا میں بڑی بڑی غلطیوں کا باعث سمجھا جاتا ہے۔ اور آجتک طے نہ ہوا کہ کونسی بات صحیح ہے کون سی غلط ہے ؎

قاصد اسی بہانے سے پڑھوائیو یہ خط ٭ ہے کونسا صحیح سخن کون سا غلط ٭

جو اسکو قدیم سمجھتے ہیں "دہریہ" کہلاتے ہیں اور "دہریہ" کا لقب عوام میں اہانت کا لفظ ہے: اسکے خلاف زمانہ کو حادث سمجھنے والے از روئے عقائد مذہبی اچھے سمجھے جاتے ہیں ٭ لیکن جسطرح علم ہیئت میں زمین کی گردش مانئے یا آفتاب کی۔ رات دن۔ گرمی جاڑے برسات میں ظاہرا کوئی فرق نظر نہیں آتا: دونوں غلطی پر ہوں یا ایک غلطی پر ہو اندھیرے میں آپ کو رات کو چراغ جلانا پڑیگا۔ اور دن کو روزمرہ کے کاموں میں مصروف رہنا ہوگا۔ جاڑوں میں لحاف رضائی کی ضرورت ہوگی۔ برسات میں اگر چھتیں ٹپکتی ہیں تو تکلیف ہوگی۔ اور گرمی میں لُو سے بچنے کیلئے

نس کی شنیاں درکار ہوں گی۔ اسی طرح زمانہ (دہر) کے قدیم یا حادث کی بحث کے طے نہ ہونے سے عالم اسباب کے کاروبار میں بہت فرق نہیں آئے گا ٭ یہہ اختلاف انسان کو عمل نیک سے باز نہیں رکھ سکتا۔ گو بہ قول جناب مہر ؎

دہر سے ابتدائے دہر سے تا انتہا غلط ٭ دنیا کے ہیں یہ سات ورق جا بجا غلط

میرے عقیدہ میں صفحۂ دہر سارے کا سارا غلط نہیں ہوسکتا۔ جابجا جلدی میں یا پڑھنے والوں کی سمجھ سے باہر ہونیکی وجہ سے یا بے مشقی کے باعث دو چار غلطیاں سی دکھائی دیتی ہیں مگر حسب ضبط تقدیر کے پڑھنے میں مہارت ہو جائے تو کوئی بات مشکل نہیں معلوم ہوتی۔ اور یہ مہارت حادثات زمانہ کے انسان کے سر پہ گذر جانے سے حاصل ہو جاتی ہے ؎

آنکھیں ہوئیں جو بند یہہ مضمون کھل گیا ٭ تھا اعتماد ہستیٔ موہوم کا غلط ٭ ٭

لیکن دہر یعنی زمانہ کے قدیم و حادث ہونیکی بحث کو چھوڑ کر آپ دیکھیں تو اسکے (جبو قت آپ تشریف رکھتے ہیں) موجود ہونے میں شک نہیں۔ آپ سے پہلے یا آپ کے بعد اسکے ہونے یا نہ ہونے سے آپ کو نیکی سے باز رہنے کی کوئی وجہہ نہیں: آپ نیکی کئے جائیں اور اس کے حادث یا قدیم ہونے سے بہت غرض نہ رکھیں ؎

ہمارا رنگ پریدہ ہے آسماں کیسا ٭ وفا کا سایہ رفتار ہے جہاں کیسا

اس میں شک نہیں کہ جب دنیا میں کسی چیز کو ثبات نہیں۔ ممکن ہے کہ اسکو یعنی زمانہ کو بھی ثبات نہ ہو: لیکن آپ کی عمر محدود ہے اس جھگڑے میں یہہ چند روزہ زندگی کیوں رائیگاں جانے پائے ٭ ضرورت کے لایق بلکہ ضرورت سے زیادہ کئی ہزار ارب کھرب سے پہلے زمانہ کا اثر معلوم ہوتا ہے اور آئندہ کتنی مدت چلے گا۔ اسکا علم مجھے یا آپ کو کیا خدا کے سوا میرے یا آپ کے فرشتوں کو بھی خبر نہیں ٭ جو بات ہمکو معلوم ہے یہہ ہے

کہ زمانہ رہے یا نہ رہے ہم نہیں رہنے کے۔ نہ ہمارے متعلق کوئی چیز باقی رہتی نظر آتی ہے

افلاس کو ثبات نہ دولت کا اعتبار ؛ ہے مقتضائے خاطرِ شاہ و گدا غلط

افلاس کو کم و بیش ثبات ہو یا نہو مگر دولت کو قطعی ثبات نہیں کیونکہ میں دیکھتا ہوں کہ رنج کو تو کچھ نہ کچھ ثبات ہے مگر راحت کو بالکل نہیں ہے

ہم غم اُسے سمجھتے ہیں بے انتہا جو ہو ؛ ہے ابتدائے رنج سبھی انتہا غلط

لیکن جب یہ مسئلہ ابھی طے نہیں ہوا کہ زمانہ کب سے ہے کب تک رہیگا یا ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ تک رہیگا تو اس کی نسبت گفتگو کی کیا ضرورت ہے؟ میں یہ گفتگو از روئے بحث و تحقیق نہیں کر رہا ہوں۔ سخن گسترانہ دو ایک باتیں جو ذہن میں آئیں عرض کر رہا ہوں

تم بے دہن ہو اور مجھے شوقِ گفتگو ؛ عذر آپ کا غلط ہے نہ شکوہ مرا غلط

اگر زمانہ کی انتہا نہیں تو اک زمانہ کے اُمیدوار جو قیامت کے آسرے سے جی رہے ہیں انکا حشر کیا ہوگا؟ ع کہ مر رہے ہیں قیامت کے آسرے والے

اگرچہ آئے قیامت مگر سحر تو ہو ؛ بہت مصیبت شب ہائے تار دیکھ چکے

لیکن قیامت کے ساتھ زمانہ کا اختتام ضرور نہیں۔ وہ بھی ایک وضع کا زمانہ ہوگا اور ہم سے پہلے جو صورت تھی یعنی عدم وہ بھی زمانہ میں داخل ہے: از روئے حالت کوئی صورت زمانہ سے خالی نہیں ؛ زمانہ کا ہر وقت ہونا بعید از قیاس نہیں۔ بلکہ روزمرہ میں آرام کا باعث ہے کہ آسمان کی طرح زمانہ کا ہر وقت اور ہر حالت میں موجود ہونا قرینِ قیاس ہے

اب لکھیں گے شکوۂ بیدادِ ہم دل کھول کر ؛ نام اُن کا آسماں ٹھہرا لیا تحریر میں ؛

فارسی والوں نے بڑی عقلمندی کی کہ تمام خوبیوں کا مدار تو خالقِ کائنات کی ذات پر رکھا اور آفات کا ذمہ دار دہر (زمانہ) کو قرار دیا: چرخِ کجرفتار کی طرح زمانہ ہر جگہہ اور

اوقات

ہر وقت موجود ہے۔ زمانہ کا مدار گردش روزگار پر ہے اور گردش ایام ساری بلاؤں کی جڑ ہے ؛ یہ گردش کب سے ہے اور کب تک رہے گی اس کی تحقیق اعمال نیک کے لئے ضروری نہیں ؎

تیری رفتار کو ہم دیکھ کے لائے ایماں ؛ ورنہ کیا جانیں کہ ہوتی ہے قیامت کیسی ؟

زمانہ کا رنگ ہر شخص کے خیال کے موافق بدلتا رہتا ہے۔ چاہنے والوں کے لئے عشق و محبت کا رنگ۔ خدا رسیدوں کے لئے زہد و تقوے کا رنگ۔ عشرت پسندوں کے لئے مے و معشوق۔ اہل علم کے لئے تصانیف و تالیف بچوں کے لئے کھیل کود۔ جوانوں کے لئے شوق کے ولولے۔ بوڑھوں کے لئے حسرت و افسوس۔ غرض ہر شخص کے لئے ہر رنگ جدا ہے اور سب کے سب دوسرے کو غلط سمجھتے ہیں ؛ ؎

نیرنگیٔ زمانہ کا کرنے لگے بیاں ؛ کیا خوب طرز ہے گلۂ خوئے یار کی

یہہ زمانہ کی خوبیوں میں ہے کہ ہزار غلطیوں میں بھی ہمیں کم و بیش سنبھالے رہتا ہے جب تک زندگی ہے غایتِ ضعف میں بھی ہماری کمر پکڑے رہتا ہے۔ گریں تو ہاتھ کا سہارا دیتا ہے : آپ اس کے آغاز و انجام کی فکر بہت نہ کریں۔ اسکی خوبیاں آپ کے کام کی ہیں اور غلطیوں سے جہاں تک کہ نیک اعمالی کا تعلق ہے آپکا کچھ نقصان نہیں آپ اپنے کام سے کام رکھیں۔ انقلاب دہر سے غرض نہ رکھیں کہ کب سے اور کب تک رہے گا ؎

اشکِ خوں پونچھنے دو گوشۂ داماں سے مجھے
یا بتادو کہ کھلے سُرخ کنارا کس پر ؟

صلائے عام کی ڈاک

× × × × × × × × × × × ×

صلائے عام سال مالیہ کے اول مہینہ کا آج پہلی ماہ مئی کو اپنے وقت پر صادر ہوا مضمون فرمایا۔ میں نے جب تک پڑھکر ختم نہیں کر لیا نہ چھوڑا یا نہ ہاتھ سے دھرا مضمون پریشان میں قل سیر فی الارض پر غضب کا پیارا مضمون لکھا ہے اور اللہ میاں سے چھیڑ چھاڑ کرنا کرنا یہ بھی آپ ہی کا کام ہے کسکو یہ نازک خیالی سوجھتی ہے اور اچھا عالم اسباب کو آڑے ہاتھوں لیا ہے مگر امر حق یہی ہے کہ

آئے عدم سے جائینگے پھر کر سوئے عدم ٭ یہ ابتدا غلط ہو نہ یہ انتہا غلط۔

اُردو رسالوں کا جو شذر لکھا ہے وہ بالکل سچ ہے اور اس میں شک نہیں کہ بہت سے نکل نکل کر بند ہو گئے اور اس فقرہ کی داد کہاں تک دوں کہ "ہندوستان کی آب و ہوا اُردو رسالوں کو راس نہیں" جو سب سے نرالا مضمون اس پرچہ میں نکلا ہے وہ خاص آپ کی طبیعت کی رسائی ہے اور سچ یہ ہے کہ بالکل نئی سوجھی جو **اجتماع ضدین** پر مضمون لکھا جس سے اجتماع ضدین ثابت ہو کر رہا اور اگر نہیں ہوتا تو تمثیلیں وہ دیں۔ مجھے تو آپکی یہ دلیل بہت ہی معقول معلوم ہوئی کہ "حضرت یعقوب کا خواب غلط ہو یا صحیح میرے مضمون کی جان ہے کہ اجتماع ضدین کی تمثیل اس سے بہتر ممکن نہیں کہ

گہے بر طارم اعلیٰ نشینم ٭ گہے بر پشت پائے خود نہ بینم

اس پرچہ میں جو مضمون زیر سرخی **خیالات خاص و عام پر نظر** درج ہے وہ موجودہ ہندو اور مسلمان دونوں کے واسطے تمدن اور معاشرت کے لحاظ سے بڑی نصیحت ہے اور اسی نظر سے آپ کا فرمانا کہ "مذہب اچھی چیز ہے اپنا ہو یا پرایا" ہر طرح سے منصفانہ ہے۔ مجھے اُمید ہے کہ اگر مضمون کو آگرہ اخبار نقل کر دے تو آپ خوشی سے اجازت بخشیں گے۔ اس قسم

سے صلح کن اور صلح جو مضامین اس پر آشوب زمانہ میں جبکہ مذہبی اندازپرو و مذاہب کے درمیان کشاکش ہورہی ہے بے انتہا نفع رساں ہیں۔

ادائے بیان کی سرخی میں پدماوت کا ذکر اور اس میں **نرمی** اور **ملک محمد جایسی** کے طرز بیان کا اظہار کرنا بہت بڑی خوبی پیدا کرتا ہے۔ ان مصنفوں نے واقعی اپنی اپنی زبان اور اپنے اپنے طرز بیان میں کمال نازکخیالیاں کی ہیں ؂

آپ اس کا اقبال فرماتے ہیں کہ ہندی میں آپکو دخل نہیں لیکن ملک محمد جایسی کے کلام سے جو اقتباس کیا ہے اور جو ترجمہ اس کا لکھا ہے اُس سے شوخی مضمون برسی پڑتی ہے اور آپکی طبیعت کی رنگینی اُس سے کھلی جاتی ہے۔ ایک نازک خیال ہی تو نازک مضامین نکال سکتا ہے۔ ادائے بیان میں اس سے بہتر تمثیل شاید ہی ہو۔ میں نے تو اس کو دو دو تین تین بار پڑھا اور ہر بار لطف تازہ ہاتھ آیا۔ کیا نرالا مضمون ہے کہ "بادل کو اُس کی بی بی نے لڑائی پر جانے سے یوں روکا تھا کہ اپنے بالوں کا جال اُسکے پاؤں میں ڈالدیا تھا تاکہ پھنس کر رہجاوے اور آگے پاؤں نہ بڑھا سکے۔

حضرت یاسؔ نے دعا کے مضمون پر عجیب کمال دکھایا ہے اور کیا لب لباب ان دو شعروں میں کیا ہے کہ خدا ہی کے سننے قابل ہے۔ فرماتے ہیں ؎

موت مانگی تھی خدائی تو نہیں مانگی تھی ؂ لے دُعا کر چکے اب ترک دُعا کرتے ہیں

نا خدا تیرے اِرادوں میں خدا برکت دے ؂ یاسؔ اک مرتبہ پھر قصد دعا کرتے ہیں

پہلے شعر میں غضب کا لاڈلا پن برستا ہے جس سے اللہ میاں کے سامنے مچل جانے کا لطف آتا ہے اور دوسرے شعر سے ثابت ہوتا ہے کہ ناامیدی کفر است۔ مانگو اور پھر مانگو مچل کر مانگو رو کر مانگو گڑگڑا کر مانگو دعا مانگو کبھی تو اللہ میاں سنیں گے مایوس کیوں ہوتے ہو۔ سبحان اللہ۔

میں حسب معمول ایک چھوٹا سا مضمون "تقدیر" نذر کرتا ہوں۔ صلائے عام میں احباب کو مضامین بھیجکر آپ کا ہاتھ ضرور بٹانا چاہیئے۔ میں دیکھتا ہوں کہ سارا صلائے عام آپ ہی کی دماغی قوت سے تکمیل پا رہا ہے۔ یہہ تابہ کے۔ میرا یہہ خیال غلط نہیں ہو سکتا کہ جسقدر رنگیلے

دماغ کو فرصت ملیگی اُسیقدر عمدہ تر فصاحت کے کلام ہمارے ہاتھ آویں گے۔ پس آپ ساری قوت دماغی کو صرف نکریں اور احباب سے مضامین لکھنے میں مدد لیں جس سے فصاحتِ زبان کو آپ کے طرز و اندازِ بیان پر تمام ملک میں پھیلنے کا موقع ملے۔ جب تک اور احباب بھی اس خوبیٔ بیان کا سبق نہ لیں گے اردو زبان کی خوبی کا اظہار نہ ہوگا۔ گستاخی معاف کیجئے گا فقط

آپ کا نیازمند۔ عرفان علی (آئی ایس او۔ آنریری مجسٹریٹ آگرہ)

× × × × یوں تو میں ہمیشہ سے صلائے عام کا ایک ایک لفظ اور ہر ایک فقرہ جی لگاکر پڑھتا ہوں اور صلائے عام کو ہاتھ میں لینے کے بعد میں اتنا بے خبر ہوجاتا ہوں کہ مجھے دنیا و مافیہا کی خبر نہیں رہتی۔ لیکن صلائے عام بابت ماہ اپریل سنہ ۲۲ء میں تو جناب نے قلم ہی توڑ دی ہے۔ جو مضمون ہے معرکہ کا ہے۔ اور کس طرح پر اور کہانتک اس کی خوبیاں ادا کی جائیں تاہم چند فقرے لکھے بغیر دل نہیں مانتا۔ **مضمون پریشان** کی جو نازکخیالیاں مجھے پسند آئیں عرض کیجاتی ہیں پریشانی کو جناب نے اس طرح پر ادا کیا ہے۔ "آپ نے خیال نہیں کیا کہ قافلہ کی پریشانی پر جرس کا نالاں ہونا بیکار نہیں جاتا۔" اور پھر یہہ کہ "حسینوں کا کسی کی یاد میں آنسو بہانا جس سے آنکھ کا کاجل پھیل جائے۔ پریشانی کی تشبیہہ بُری نہیں۔" یہہ بات آجتک کسی کو نہ تو سوجھی ہے اور نہ سوجھے گی۔ یہہ صرف جناب ہی کے دماغ تک محدود ہے۔ اسی مضمون کی سُرخی میں آگے چلکر جناب نے خواندہ اور ناخواندہ مہمان کی تشریح اس طرح پر کی ہے کہ "دنیا میں ہم ناخواندہ مہمان بنکر آئے کسی نے ہمیں بلایا نہ تھا۔ اب یہاں سے پھر بلائے کیوں جاتے ہیں؟ ہم جانتے ہیں کہ ناخواندہ مہمان ہوکر تو ہم کچھ دنوں جی گئے۔ بلائے ہوئے مہمان کا خدا جانے کیا حشر ہوگا؟ خواندہ سے ناخواندہ مہمان اچھے رہے۔" دار فانی کے متعلق یہہ کہ "یہاں کی ایڑیاں رگڑنا خدائے لایزال کے پاس جانے سے کیوں زیادہ پسند ہے۔ یہہ دار محن خوشی سے کسی سے نہ چھوٹا" یہہ آپ ہی کا دماغ ہے۔ ورنہ کسکو یہہ نازکخیالی سوجھتی ہے۔ یہہ صرف آپ ہی کی ذات تک محدود ہے

"قُل سیروا فی الارض" کا حکم جناب نے کس خوبی سے ادا کیا ہے۔ آجتک کسی کو یہہ نہ سوجھی اور نہ سوجھیگی کہ "بیٹھے بیٹھے کی چیز تو نظر نہیں آتی اور آسمان کے چپے چپے کا حال بتانے کا دعوےٰ اور جو شبہ کرے رانده درگاہ - پیدا ہونے سے پہلے کی ایک لمحہ کی خبر نہیں اور مرنے کے بعد قیامت کا حال کروڑوں صدیوں کا ازبر سن لیجیے - عالم بقا کا حال تو درکنار ہیں اس عالم فانی کے سمجھنے کے بھی لالے ہو رہے ہیں" - **اُردو رسالوں کا حشر** کی سرخی میں آپ کا یہہ فرمانا کہ "اردو رسالوں کو ہندوستان کی آب و ہوا راس نہیں" غضب کا فقرہ ہے - درحقیقت اردو رسالے ہندوستان میں بالکل بے وقعتی کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں - اور برسات کے کیڑوں کی طرح سے چند روز میں غائب ہو جاتے ہیں اس لئے کہ انکی کوئی قدر نہیں کرتا - آپ کا یہہ فرمانا کہ "اپنی آواز مرغان خوش الحان سے زیادہ نفیس سہی لیکن اگر سننے والے بہرے ہیں یا سنتے ہوئے بہرے بن گئے ہیں تو آپ اپنا گانا نہ پھاڑیں" بالکل بجا اور درست ہے - **اجتماع ضدین** کی سرخی میں جناب نے کیا ہی اچھا ثبوت دیا ہے کہ "مصیبت میں تو آنسوؤں کا نکلنا تعجب نہیں مگر افراط ہنسی میں بھی ہم نے آنسو نکلتے دیکھے ہیں - جب ہم کسی کی نظروں میں سبک ہوتے ہیں تو دل پر بار ہو جاتے ہیں" - **خیالاتِ خاص و عام پر نظر** کی سرخی میں جو پاکیزہ مضمون آپ نے لکھا ہے اس کی جس قدر وقعت کی جائے کم ہے کیونکہ موجودہ زمانہ کی حالت کو دیکھتے ہوئے یہہ مضمون اس لایق ہے کہ ہر ہندو اور مسلمان کی نظر سے گذر جائے - بلکہ اردو کے اخبار اگر اس کی نقل کریں تو قوم کی بہبودی کا باعث ہے - اور آپ بھی ایسا کرنے کی اجازت خوشی سے دیدیں تاکہ لوگ بیکار جھگڑوں میں اپنی زندگی خراب نہ کریں -

راقم یکے از ناظرین صلائے عام

× × × × × × × × براہ کرم **صلائے عام** کا ایک نمبر بطور نمونہ بذریعہ وی پی پارسل ارسال کرکے مشکور فرماویں - قیمت وی پی ادا کرونگا - اگر میں اس کو ویسا ہی پاؤں گا

جیسا کہ میں نے اسکی بابت سُنا ہے تو آپ کے رسالے کا دوامی خریدار ہونے کے علاوہ دوسرے خریدار بھی پیدا کرونگا:

آپکا وفادار - پرتاپ سنگہ بی - اے از ہریانہ)

صلائے عام - صلای عام کی ڈاک سے مجھے یہہ فائدہ ہے کہ علیحدہ علیحدہ جواب دینے میں زیادہ وقت صرف ہوتا ہے - اور فرداً فرداً جواب صرف مکتوب الیہ ہی کے کام کا ہوتا ہے: صلائے عام میں جواب لکھنے سے اس قسم کے جملہ خطوط کا جواب ہو جاتا ہے - پھر کسی کو دوبارہ دریافت کرنے اور مجھے جواب دینے کی ضرورت نہیں رہتی: اس خط کے جواب میں مجھے یہہ لکھنا ہے کہ نمونہ کا پرچہ منگانا بیکار ہے - صلائے عام کوئی نیا رسالہ نہیں - اور ایک پرچہ سے سارا حال معلوم نہیں ہو سکتا جسطرح ایک اینٹ سے سارے مکان کا سودا کرنا دانائی میں داخل نہیں - دوسرے وی پی اور ایک پرچہ کا وی پی - یہہ دردِ سر نہ مجھے زیب دیتا ہے نہ آپ یہہ تکلیف گوارا فرمائیں: ایک پرچہ اس غرض سے ارسال خدمت ہے کہ آپ بی - اے - ہیں اور برادراں وطن سے میں چاہتا ہوں کہ آپ لوگوں میں اپنی زبان کا شوق پیدا ہو

جناب یاس نے لکھنؤ سے مشاعروں کے متعلق بہت پاکیزہ تحریر بھیجی ہے - اس میں سے اس وقت اس قدر اقتباس یہاں درج کیا جاتا ہے: × × × × × × ×

خلاصہ یہ ہے کہ محض مشاعرہ کی واہ واہ شاعر کے معیار کمال کی دلیل نہیں ہے - جو لوگ محض مشاعرہ کی واہ واہ کو دلیل کمال سمجھتے ہیں وہ یقیناً حقیقت امر سے منزلوں دور ہیں جو وقتی تحسین و آفریں کو حقیقی معیار کمال سمجھکر دھوکے میں پڑ جاتے ہیں انہیں آپ کا یہ قول کان کھولکر سُن لینا چاہیے کہ - "شعر کو موسیقی کیطرح کانوں سے بڑا تعلق ہے اور کانوں کا اثر دیرپا نہیں ہوتا" آپنے یہہ بات سچے کی کہی - مشاعروں کے محض معمولی سیدھے سادے اشعار پر جو اکثر پھبتیں اُڑجاتی ہیں

یہ درحقیقت اُس موسیقیت کا اثر ہوتا ہے جو شعر میں داخل ہوتی ہے۔ مشاعرہ کے بعد انہیں اشعار پر غور کیا جائے تو بچوں کا کھیل معلوم ہوتے ہیں۔ اِس تقریر سے میرا یہ مطلب نہیں کہ محاسنِ شعریہ کو کانوں سے کوئی تعلق ہی نہیں۔ ہرگز نہیں۔ کان بھی اشعار کے بلکہ یوں کہئے کہ ترنم کلام کے پرکھنے کا اِک آلہ ہے اور اس کا محاکمہ محض ترنم کلام کے متعلق مُستند مانا جاتا ہے گا۔ مگر معنوی خوبیوں کا فیصلہ نگاہ پر ہے لہذا مقتضائے انصاف یہ ہے کہ کسی کے کلام پر اگر صحیح محاکمہ کرنا منظور ہو تو پہلے کلام کو خود مُصنف کی زبان سے سنو اور یہ دیکھو کہ اُس کے کلام نے تم پر اور دیگر سامعین پر کیا اثر ڈالا۔ اس اثر سماعت اور اُسکے مختلف اسباب کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے کلام کا مطالعہ کرو اسکے بعد محاکمہ کا اختیار ہے۔

(ابوالمعانی مرزا یاسؔ)

× × × × × × × دو مہینے کے انتظار کے بعد صلائے عام ملا یعنی مارچ کا پرچہ غائب!۔ دل نے شوق کی آنکھیں بچھائیں۔ معلوم ہوا کہ میری طرح کے آپ کے پسند اور شیدائیوں کو بھی یہ پرچہ نہیں ملا۔ اور غضب تو یہہ ہے کہ آپ کے صفِ اول کے شیدائی جناب مرزا عرفاں علی بیگ صاحب کی ڈاک پر بھی کسی نے ڈاکہ مارا۔ خدا کرے اُن کو اُس پرچہ کا بدل ہاتھ آجائے اور میری میز بھی اِس پرچہ سے خالی نہ رہے۔

مضمون پریشان کو خدا زلف یار سے زیادہ درازی دے۔ آپ اپنے ناظرین کا امتحان کیوں لیا کرتے ہیں۔ کہ وہ تھکنے والے آسامی نہیں۔ مضمون پریشان کے بعد **اجتماع ضدین** کی کڑی آپ نے خوب لگائی۔ شعر اور شعراء پر آپ کے کئی مضامین ہیں اور سب اچھے ہیں۔ **ابن مقنع** کا تاریخی مضمون کوئی پورا کردے تو اچھا ہو۔ **رسالوں** پر مضمون لکھ کر آپ نے مجھے ڈرا دیا۔ مگر میں نے تو قصد کرلیا ہے کہ لسان الملک نکالوں۔ خدا ہماری ہمت میں برکت عطا فرمائے۔ × × × × × ×

خادم سید منظر علی۔

عاقبت

افلاک کہ جز غم نہ فزایند دگر ۔ نہ نہند بجا تا نہ ربایند دگر (عمر خیام)
نا آمدہا اگر بدانند کہ ما ۔ از دہر چہ میکشیم نہ آیند دگر

دنیا میں عاقبت اندیش بھی ہیں اور نا عاقبت اندیش بھی ہیں۔ لیکن غور سے دیکھا جاوے تو یہہ دونوں ایک ہی مآل کار رکھتے ہیں نہ تو وہ اپنی عافیت اندیشی سے کچھ کما کرلے جاتے ہیں اور نہ یہ اپنی ناعاقبت اندیشی سے کچھ کھو کر رہتے ہیں۔ نتیجہ دونوں کا ایک ہی نکلتا ہے۔ گردش افلاک کے مبتلا جیسے یہہ رہتے ہیں ویسے ہی وہ رہتے ہیں۔ اور فلکی گردش اپنی چال میں بجا یہ بجنسہ ہے وہ جب ایک کو چھپاتی ہے تو ایک کو نکالتی ہے۔ عجب چکر ہے۔ یہہ کسی کو کیا معلوم ہو سکتا ہے کہ کس کی جگہہ کون آتا ہے مگر یہ امر یقینی ہے کہ آنا تو ضرور ہے اور جانا بھی ضرور ہے۔ اپنے جانے کی بھی خبر کسیکو نہیں ہوتی یہ سب کہنے کی باتیں ہیں کہ فلاں شخص نے پہلے سے اپنا وقت و مقام رحلت بتا دیا تھا اور اگر بفرض محال کوئی مجذوب کی بڑ ٹھکانے پہ صحیح بھی اُتر گئی تو گو وہ فہو المراد کی مصداق ہو سکتی ہے مگر استدلال کے قابل اس کو کون کہہ سکتا ہے۔ ایسی بہت سی باتیں ہیں جو ناشدنی شدنی اور شدنی ناشدنی ہو کر رہجاتی ہیں اور ان کی وقعت اس سے زیادہ کیا ہو سکتی ہے کہ محض اتفاقیہ صورت کے نمونے ہیں چنانچہ شیخ سعدی علیہ الرحمتہ نے ایسے ہی موقع پر فرمایا ہے کہ ؎ گاہ باشد کہ کودکے ناداں ۔ بغلط بر ہدف زند تیرے۔

ہاں یہ امر یقینی ہے کہ ہر زندہ کو جان دینا ہے اور حضرت عمر خیام نے اپنے خاص پیشہ کی مناسبت کے ساتھ اپنی رحلت کے متعلق بہت خوب فرمایا ہے وہ فرماتے ہیں ؎

خیام تنت بہ خیمہ مے ماند راست ۔ جان سلطان است و منزلش دار بقاست

فراشِ اجل نزیر ویگر منزل ؛ از پا فگن خیمہ کہ سلطاں برخاست

ہم باور کرتے ہیں کہ مخلوق مخلوق ہوتی ہے اور فانی ہوتی ہے اور یہہ بھی معلوم ہے کہ ہم اس جہان میں موجود ہیں مگر یہ کیا معلوم کہ بعد فنا ہونے کے کیا صورت پیش آئے گی عاقبت کی خبر خدا جانے ۔ اور یہ بھی تو نہیں معلوم کہ وہاں ہوتا کیا ہے مگر عقلی مباحثہ کو بڑی گنجایش ہے یہ کہہ لیں کہ اگر یہاں کے آنے والوں کو یہ معلوم ہو جائے کہ یہاں مصیبت کا مبتلا ہونا ہے تو کوی بھی آنے کا رُخ نہ کرے ۔ اسی خیال کو جمائے حضرت عمر خیام فرماتے ہیں کہ ؎

افلاک کہ جز غم نہ فزایند دگر ؛ نہ نہند بجا تا نہ ربایند دگر
نا آمدہ ہا اگر بدانند کہ ما ؛ از دہر چہ میکشیم نہ آیند دگر ۔ فقط

راقم عرفان علی ۔ آئی ایس او ۔ انریری مجسٹریٹ آگرہ

صلائے عام ۔ یہہ مضمون بڑے کام کا ہے لیکن اختصار کی وجہہ سے عاقبت کے عقیدہ سے اقرار یا انکار ثابت نہیں ہوتا ؛ صلائے عام گو دینی یا مذہبی رسالہ نہیں لیکن تحقیق و معلومات کا دِل دادہ ہے جس سے دل و دماغ کو فائدہ ہو ؛

حضرت عُمر خیام کی شُہرت زیادہ تر اس بات میں ہے کہ شراب کے مضمون خوب باندھے ۔ یہہ خوبی شعر و شاعری کی ہے کہ جس طرح حسن و عشق کے مضامین شاعری کا حصہ ہیں اسی طرح شراب کا مضمون شاعری کا جزو ہے ؛ عمر خیام سے زیادہ حافظ رح نے شراب کے مضمون میں شہرت حاصل کی ۔ دونوں کو تحقیق و فلسفہ سے بہت واسطہ نہیں ؛

دیکھنا یہہ ہے کہ عاقبت کا عقیدہ واقعی ہے یا قیاسی ۔ اس میں آپ کسی فلاسفہ

مذہب کی تقلید یا تردید سے غرض نہ رکھیں ۔ جب خالقِ کائنات نے بے شمار خلقت پیدا کردی تو صرف انسان کے ساتھ عاقبت کی شرط لگانے کی کیا ضرورت تھی؟ انسان سے کہیں زیادہ اور مخلوق ہے محض انسانکو یہ حق کہاں سے حاصل ہوا کہ مرنے کے بعد عاقبت کا فکر کرے ۔ حالانکہ انسان کے سوا اور مخلوق میں کسی کے ساتھ یہہ لم نہیں لگی : خالق کے نزدیک ساری مخلوق یکساں ہونی چاہیئے ۔ مُرغ جو انسان ہضم کر گیا ۔ اس کو تو عاقبت سے کچھ واسطہ نہیں اور حضرتِ انسان عاقبت میں بھی مزے اڑائیں کہ یہاں تو مُرغ چکھا اور عاقبت میں بہشت کا مزہ ۔

یہہ مسئلہ تو مشکل ہے مگر دلچسپ ہے ۔ صاحبِ مضمون جنہوں نے اسے چھیڑا ہے اسکو ذرا بڑھا کر لکھیں : صرف اتنا خیال رہے کہ کسی خاص عقیدہ یا مذہبی پہلو سے بچائے رہیں ۔ مذہبی پہلو سے تو جسنے جو سمجھ رکھا ہے وہ قطعی درست ہے ۔ مگر از روئے تحقیق دیکھنا ہے کہ اس کے اقرار یا انکار کی دلیلیں کیا کہتی ہیں؟

تحقیق ہو تو جانتا میں کیا ہوں قیس کیا ۔ لکھا ہوا ہے یوں تو سب ہی کچھ کتاب میں

تازہ کلام جناب ادیب دہلوی

گل ٹہلنے کے لئے نکلا جو میں وقتِ سحر ۔ زیورِ گل سے لدی ہر شاخِ گل آئی نظر ۔ گل کھلاتی تھی ہزاروں چل کے گلزار نسیم فیضِ شبنم سے سرِ سبزہ پہ تھا تاجِ گہر ۔ طائرِ خوش رنگ اُڑ اُڑ کر ہوائے شوق میں ۔ مُرغزاروں پر جھکے جاتے تھے بازو تولکر نغمہ زن تھے لہجۂ قدرت میں ایسے طرز سے ۔ ہر صدا کانوں سے ہو کر دل میں کر جاتی تھی گھر ۔ اس جوارِ شہر کے رشکِ ارم گلزار میں ایک ایوانِ کشادہ شاندار آیا نظر ۔ تھی اُسی ایوان میں اک خوب صورت شہ نشیں ۔ چاندنی جسمیں بچھی تھی صاف ستھری مختصر اک سنہری پر نیفش کی چادر پر شکن ۔ جسپہ تکئے بکھرے کچھ اِدھر تھے کچھ اُدھر ۔ پھول مُرجھائے سرِ بستر تھے کچھ بکھرے ہوئے جیسے بزمِ گلشنِ رنگیں ہو کوئی منتشر ۔ جلوہ فرما اسپہ ایک نازک بدن یوسف جمال ۔ نرگسی آنکھوں میں جسکی شب خماری کا اثر مدہ بھری آنکھیں تھیں یا بدست یادو نیمچے ۔ یا شرابِ ارغوانی ساغروں میں سربسر ۔ ہر گلِ رخسار پر افسردگی چھائی ہوئی ۔

زلف و کاکل تھے پریشانی ہیں تا سوئے کمر ؞ دونوں شانوں سے دوپٹہ سینہ تک ڈھلکا ہوا ؞ کچھ نہ آرائش نہ پردے اور نہ جوبن کی خبر
گورے سینے پہ غضب وہ سارے جوبن کا نچوڑ ؞ دو برج دلبری تھے آسمانِ حسن پر ؞ حسن آیا تھا سمٹ سمٹا کے شانوں کے قریب
شوق اٹھو ہو گیا قدرت کے سانچے دیکھکر ؞ چشمۂ آبِ حیات و مسکنِ شوخی و شرم ؞ مقتلِ عشاق کہئے یا انہیں دامِ نظر
کھائی بیٹھی تھی جوانی اُٹھتے جوبن کی قسم ؞ ہاں رہوں گی جان و دل صبر و تحمل چھینکر ؞ دستِ نازک میں لیے بیٹھا تھا وہ ذوقِ نظر
جھکائے تھیں نادم خود بخود کچھ سوچکر ؞ اسپہ بھی اس نازنیں کا حسن تھا دلفریب ؞ دیکھتے ہی رہ گیا میں تو کلیجہ تھام کر
پتلیاں کہتی تھیں دیکھے جائیے جب تک ہے نور ؞ خواہشِ دل تھی رہے آغوش میں یہ عمر بھر ؞ لذت [illegible] ہم پہلے تو بے خود ہو گیا
کچھ ہوش سنبھلا تو پوچھا اس سے ہو کیخیر ؞ رہزنِ صبر و سکوں غارتگرِ ہوش و خرد ؞ دزدِ دل عیارِ شاطر حیلہ ساز فتنہ گر
کل ہی تو دیکھا تھا ظالم تیرا عالم اور حسن ؞ اُٹھتے جوبن پر قیامت کی جوانی الحذر ؞ ایک ہی شب میں یہ عالم ہائے کیسا ہو گیا
اب نہ وہ تیغ ادا ہے اور نہ وہ تیرِ نظر ؞ پیارا پیارا چہرہ مثلِ زعفراں کیوں زرد ہے ؞ برگِ گل لب پہ نہیں وہ سرخی پاں کا اثر
وہ رخِ زیبا کی نوارنی جھلک اب کیا ہوئی ؞ زاہدوں کے دل تڑپ جاتے تھے جسکو دیکھکر ؞ سُن کے اس نازآفریں نے یہ کلام جاں گداز
سر نگوں ہو کر کہا با سوزِ قلب و چشمِ تر ؞ عقل کے دشمن جوانی اک جنوں کی شاخ ہے ؞ اس زمانہ میں گذر جاتے ہیں آپے سے بشر
ہاتھ سے دل سر سے گم ہو جاتے ہیں ہوش و حواس ؞ سوچ ماضی اپنا مستقبل ہو کرتے ہے بے خبر ؞ عشق و حسن و عاشق و معشوق و ارمانِ شباب
جوش ہستی حملہ آور ہوں تو ہو کیسے حذر ؞ کیا یہ ممکن ہے کہ گذرو آگ میں آئے نہ آنچ ؞ قعرِ دریا میں گرو دامن نہ ہونے پائے تر
شبِ گذشتہ انقلابِ طبع کی تصویر تھی ؞ جس میں حسن و عشق تھے گمراہ ان یا راہ پر ؞ کچھ نہ سوجھا اضطرابِ شوق و ذوقِ دید میں
ہو گئے انجام سے دونوں جہاں کے بے خبر ؞ اسپہ بھی عصمت رہی اللہ شاہد ہے ادب ؞ جاگنے کی ہیں علامت تو گمان بد نہ کر
سن کے یہ عذر گنہ میں نے کہا اے رشکِ حور ؞ کیا نہیں رہتی جوانی میں تمیزِ خیر و شر ؞ پھول کے پہلو میں ہر اک شاخ گل پر خار ہیں
پھول کو دامن سمیٹے خار سے دیکھا مگر ؞ کوہ سے ٹکراتی رہتی ہے ہوائے تند و تیز ؞ سنگریزہ اسکا اک ہوتا نہیں زیر و زبر
شیشۂ ساعت میں ریت آٹھوں پہر ہو موجزن ؞ پھر بھی اُسکا صاف رہتا ہی کدورت سے جگر ؞ جوششِ عشقِ زلیخا نے بنایا کام کیا
پھٹ گیا دامن نہ دامن تر ہوا یوسف مگر ؞ کش مکش میں تھی بہم مستی شباب و حسن و عشق ؞ پھر بھی یوسف نے نظر اپنی رکھی انجام پر
کم سے کم پہونچا ہی سینہ پر کوئی گستاخ ہاتھ ؞ بجلیاں شب بھر گریں نازک لب و رخسار پر ؞ لب بھر بوسوں کے دیتے ہیں [illegible] چھوٹے [illegible]
جو بہت سچ بولتے تھے اب وہی جھوٹے ہوئے ؞

صلائے عام کی ڈاک (۲)

جناب نواب حیدر یار جنگ بہادر سید علی حیدر صاحب طباطبائی حیدرآباد سے اپنے نوازشنامہ میں صلائے عام کی نسبت تحریر فرماتے ہیں کہ: × × × × × × × × × × × ×

صلائے عام کا پھر جاری ہونا ایک مژدۂ جاں فزا تھا جس نے روح کو تازہ کر دیا۔ آپ سلامت رہیں۔ بہت سے ادبی رسالے ملک ہند میں جاری ہیں مگر وہ نہیں جانتے کہ ادب اور حسن بیان کیا چیز ہیں؟ بخدا ان کو اس گفتگوئے پریشان (مضمون پریشان) کے آگے زانوئے ادب تہ کرنا چاہیے × × × × × × × × × × × ×

صلائے عام اس تحریر کے ساتھ نواب صاحب کی تصانیف سے چند کتابیں بھی میرے پاس آئی ہیں۔ تحریر میں اس مضمون کا ذکر ہے جو صلائے عام میں غالب کے دیوان اردو کی شرح کی نسبت چھپا تھا۔ یہہ مضمون معرکہ کا ہے: اس میں مجھسے زیادہ اہل علم و کمال کی ضرورت ہے۔

نظم طباطبائی کے متعلق نواب صاحب نے لکھا ہے اسکو اس لئے بھیجتا ہوں کہ ع حیف بر جان سخن گر بہ سخنداں نہ رسد۔

تلخیص عروض و قافیہ۔ بقول جناب مصنف "ایک اعجوبۂ زمانہ اس فن کی کتابوں میں ہے"

تشریح الافلاک کی شرح کی نسبت خوب فرمایا کہ: × × × "میرے یہہ حواشی اوس زمانہ کے لکھے ہوئے ہیں جب اردو میں تصنیف کرنا اہل علم کے شایاں نہ تھا[۱]۔ اسی سبب سے عربی عبارت میں ہیں: اسے دیکھکر بہت سے قدیم زمانہ کے علما کی آنکھیں کھل گئیں" × × × × × × × × آپکا نیازمند دیرینہ۔

حیدر یار جنگ سید علی حیدر طباطبائی۔

---

[۱] یہی وجہ ہماری زبان و ملک و قوم کی بیقدری کی ہوئی کہ اپنی زبان کا مرتبہ نہ سمجھے۔ مجھے یاد ہے کہ میرے والد قبلہ اردو میں معمولی خط روزمرہ کی خیریت و دریافت حالات کا فارسی میں لکھتے تھے اور اردو بیکار سمجھ کر کسی علمی تحریر میں جائز نہ تھی۔

مضمون نگار

پچھلے زمانوں میں بھی جب عہدِ حاضرہ کی طرح ملک میں رسالے اور اخبارات شایع نہیں ہوتے تھے اپنے اپنے مذاق کے مطابق لوگ کچھ نہ کچھ لکھتے ہی تھے کوئی کتابی صورت میں اور کوئی بالاختصار رسالوں کی صورت میں بعض رسائل اور بعض تحریرات اس قسم کی بھی پائی جاتی ہیں کہ وہ گویا مختصراً مضامین ہی کا رنگ رکھتی ہیں عہدِ گزشتہ کے لکھنے والے میری رائے میں عہدِ حاضرہ سے کم نہیں تھے اُن کی تصنیفات اور تالیفات شاہد ہیں کہ انہوں نے ہر رنگ میں کمی نہیں کی اس عہد میں زمانہ کی ترقیات میں سے رسائل اور اخبارات بھی ہیں ان رسالوں اور اخبارات میں جو لوگ لکھتے ہیں انہیں نامہ نگار یا مضمون نگار کہتے ہیں۔

دونوں میں فرق

بعض کے خیال میں نامہ نگار اور مضمون نویس یا مضمون نگار میں فرق ہے۔ نامہ نگار تو صرف وہ لوگ ہو سکتے ہیں کہ جو صرف خبریں ہی اخبارات میں دیتے ہیں اور مضمون نگار وہ ہیں جو کسی مقصد ادبی۔ علمی۔ اخلاقی اقتصادی۔ مذہبی اور سیاسی پر طبع آزمائی کریں اور جم کر کسی مضمون پر لکھیں۔ جیسے نامہ نگاروں میں سب قسم کی خبریں دینے والے شامل ہیں ایسے ہی مضمون نگاروں میں بھی وہ سب لوگ شامل ہیں جو ہر ایک قسم کا مضمون لکھ سکیں یا لکھتے ہیں اور اگر نامہ نگاروں کو بھی مضامین نگاروں میں ہی شامل رکھا جائے تو مبالغہ نہ ہوگا پچھلے زمانوں میں نامہ نگاروں کو پرچہ نویس بھی کہتے تھے جو عموماً حکومتوں اور امیروں کے تحت ہوتے تھے

طرزِ عہدِ سابقہ

عہدِ سابقہ کے مصنف اور مؤلف بھی مختلف پیرایہ میں لکھتے رہے ہیں اور ہر ایک لکھنے والے نے بہ حیثیت مذاق خود مختلف مضامین

علمی پہ خامہ فرسائی کی ہے۔ جس طرح زمانہ حاضرہ میں لکھنے والوں کا مذاق اور طرز تحریر جداگانہ ہے۔ اسی طرح عہود گزشتہ میں بھی مختلف رنگ میں لکھنے والے لوگ تھے۔ صدہا نہیں ہزاروں کتابیں شاہد ہیں کہ لکھنے والے کیا کچھ بوقلموں پیرایہ میں لکھتے تھے فرق تھا تو یہ تھا کہ اُن عہود میں عہد حاضرہ کی طرح نشر تصنیفات اور اشاعت مضامین رفتہ رفتہ ہوتی تھی کیونکہ سامان اشاعت محدود تھا یا بالکل ہی نہیں تھا۔ پھر بھی ہزاروں تصنیفات رفتہ رفتہ دنیا کے ہر ایک حصہ میں شہرت پذیر ہو گئیں۔

تنقید باوجود اس کے کہ عہود گزشتہ میں سامان اشاعت بھی محدود تھا پھر بھی رفتہ رفتہ ان کی اشاعت اور تنقید عالمانہ رنگ میں ہمیشہ ہوتی رہتی تھی صرف متن پر ہی اکتفا نہ نظر نہیں پڑتی تھی حواشی پر بھی متنی اور زائد حواشی زیب رقم پاتے تھے حواشی بھی وہ کہ جو نصاب تعلیم میں داخل تھے اور یہ حواشی ہر ایک علمی پر دیے گئے تھے اور بعض حواشی تو اس خوبی اور اس محنت سے لکھے گئے ہیں کہ جن کی قیمت متن سے بھی بڑھ چڑھ کر ہے معمولاً ایسے حواشی ایک تو جداگانہ ترتیب دیے گئے ہیں اور دوسرے ہر ادق کتاب کے حواشی پہ بھی لکھنے کا دستور تھا۔

تحریک پچھلے زمانہ میں بھی اور اس عہد میں بھی بہت سے لوگ کسی خاص مقصد کو مقدم رکھ کر تصنیف اور تالیف کرتے ہیں اور بعض لوگ محض ایک علمی مشغلہ کی جہت سے لکھتے رہتے ہیں ان کو چنداں وصول خراج تحسین کی تمنا نہیں ہوتی بلکہ محض ان کی محنت اور ان کا تردد اپنی ذاتی خوشی کے واسطے کفیل ہوتا ہے جیسے بعض گویّے اور موسیقی داں کبھی کبھی اپنی خوشی کے واسطے ہی تن تنہا الاپتے اور گاتے رہتے ہیں یا بعض شاعر اکیلے ہی بیٹھے بٹھائے شعر پڑھتے رہتے ہیں کسی پڑھنے والے شاعر سے کسی نے پوچھا کہ آپ اپنے کلام کی تعریف سن کر خوش تو ہوتے ہوں گے شاعر نے کہا کہ تعریف سن کر خوش کون نہیں ہوتا مگر میں تو شعر صرف اپنی ہی خوشی کے واسطے کہا

قیمتِ صلائے عام

صلائے عام کے لئے جہاں اور خصوصیتیں ہیں ایک اُن میں سے یہہ ہے کہ اسکے مضمون نگار بھی قیمت سے بری نہیں چنانچہ رسالہ ہمایوں لاہور نے اسکا ذکر خاص طور پر کیا تھا اسکے ثبوت میں جناب مرزا عرفان علی بیگ صاحب۔ آئی ایس او کی تحریر سے ذیل کی عبارت نقل کی جاتی ہے ؛ مرزا صاحب صلائے عام کے ذی مرتبہ مضمون نگاروں میں ہیں ؛

نقلِ تحریر

اعزاز منزل۔ آگرہ ۱۹ مئی سنہ ۱۹۲۳ء

مخدوم و مکرم دام مجدکم۔ تسلیم: منی آرڈر کا کوپان کوتاہ ہے ورنہ نامہ بر کو میں حسب ذیل ہدایت کرتا

× × × × × × × × × × × × ×

پیامبر ذرا ہشیار ہو کے لے جانا ؛ تم احتیاط سے اس نقد زر کو پہونچانا
صلائے عام کے چندہ کا ہے منی آڈر ؛ بدستِ خان بہادر تم اس کو دو جاکر
یہہ عرض کرنا کہ ہو تحفۂ حقیر قبول ؛ صلائے عام اگرچہ ہے ہر طرح انمول
صلائے عام پہ گو ہر نثار ہوتے ہیں ؛ گلے میں اسکے تو موتی کے ہار رہتے ہیں
مجھے تو شرم سی آتی ہے بھیجتے یہہ رقم ؛ ہر ایک طرح جو سچ پوچھئے یہ قیمت کم
رقم یہ جیبھ کی نثار اسپہ میں کروں سو بار ؛ پھر اپنے دل سے کہوں یہ نہیں کسی میں شمار
صلائے عام تو بڑھیا ہے اپنی قیمت میں ؛ رقم حقیر یہہ عارف ہے کم حقیقت میں

(آپکا نیاز مند عرفان علی)

صلائے عام۔ زبان اُردو کی بیقدری اور ابنائے زماں کی غفلت شعاری میں بھی یہ بات قابلِ ناز ہے کہ صلائے عام کے مضمون نگار بھی اسکی قیمت سے دریغ نہیں کرتے حالانکہ دستور ہے کہ رسالہ والے مضمون نگاروں

میں اس کا بن گیا

اسکی اور میری گفتگو ادھر کی اُدھر کی ہوتی رہی مگر اُس نے نہ مجھے دیکھا نہ مجھے سُنا۔ کوئی آج کی سرگذشت نہیں تین سال سے برابر یہی ہو رہا ہے :-

اس نے کبھی بھی مجھے نہ دیکھا کبھی بھی مجھے نہ سُنا۔

ممکن ہے کسی بڑی بوڑھی کو شاید میرے ہونٹوں کی غیر معمولی خشکی سے میری آواز کے غیر محسوس لرزہ سے کچھ بھانپنے کا موقع ملا ہے۔ مگر میں جب اُسکے حضور میں گیا تو اپنے آپ کو پہلے باارادہ اچھی طرح دم بخود کرکے۔ نہیں۔ نہیں۔ اچھی طرح قتل کرکے یعنی آنکھوں کو یہ کہہ کے کہ اگر شوق کی شعاع تم سے چمکی تو تمہیں پھوڑ دیا جائیگا۔ زبان کو یہ کہہ کے اگر رسمی بے تعلق کے فقرات کے علاوہ کچھ نکلا تو کاٹ دیا جائیگا۔ گویا سرکارِ حسن میں دائمی باغی بن کر پیش ہوا۔ گلاب کے پھول کے سامنے بیجان حس کی طرح۔ قدرت کی گوناگوں دلفریبیوں کے سامنے بے حس دہقان کی طرح۔ نگاہ کبھی نہ اُٹھی۔ ہاتھ کبھی نہ بڑھا۔ دل کبھی نہ دھڑکا۔ دریا سے ہمیشہ پیاسا آیا۔

غیر مرا اُس کا ہوں وہ کسی کی بھی نہیں

ابھی تک اسے آئینہ دیکھنا بھی نہیں آتا۔ میں نے اسے آنچل سر پہ اگلی جانب کو ایک کافر ہاتھ سے کھسکاتے دیکھا ہے۔ وہ کبھی ایک ثانیہ بھی بہ تبسم اس آنچل کے ستم زا خم دیکھنے کے لئے آئینہ کے سامنے نہیں ٹھیری۔ اسے اپنے بالوں کی بغاوت کی شعریت کا کچھ بھی علم نہیں۔ کسی دن یہ ڈھیٹ شوخ۔ بال اس کے کان میں کچھ کہہ گذریں گے اور کلی پھول بن جائے گی۔ مگر ابھی وہ وقت نہیں آیا۔ اس کی رعنائی کے گل ہزارہ لاکھوں روزانہ اس کے کمرے میں کھلتے ہوں گے مگر وہ دیکھتی تک نہ ہو گی۔ بے پروا سرف حسینہ گرانبہا دولت کو کس بے

خبری سے پھینک رہی ہے۔

وہ خود اپنی بھی نہیں

قدرت نے اسے قد دیا ہے۔ قد کے ساتھ چال بھی لچک بھی مگر ابھی اسے اٹھلا کے۔ اترا کے۔ ٹھکرا کے چلنا تک نہیں آتا۔ کالج کی لڑکیوں کے ساتھ فوٹو اتروانے میں ایک جانب کو الگ بیٹھ گئی۔ اسے پتہ ہی نہیں کہ وہ اگر کچھ سمٹ کر کچھ مڑ کر کھڑی ہوتی تو کیا کیا قیامت برپا ہوتی۔ اسے میں نے کالج میں مصوری سیکھنے کے لئے کہا۔ اتنا بھی نہ بولی کہ میں تو خود تصویر ہوں۔ بغیر نقاشی جاننے کے دوسروں کو تصویر بنا دیتی ہوں۔ اگر وہ یہہ کہہ دیتی تو مجھے یاد آجاتا کہ ایک دفعہ گاڑی میں سوار ہونے کے لئے جب میرے پاس سے ہو کر نکلی تو میں دیکھتا کا دیکھتا رہ گیا۔ برآمدے میں پاؤں گڑ گئے گاڑی تک نہ جا سکا۔ میں اس کا ہوں گو اس قابل نہیں اور اس لئے خدا کرے کہ وہ

کبھی مجھے نہ دیکھے۔ کبھی مجھے نہ سنے۔ کبھی مجھے نہ سمجھے۔

کیونکہ مروجہ دنیاوی پیار کی لغت میری لغت نہیں۔ میری زبان اور آنکھیں اور دل اور لوگ عین بین۔ قاف کا سہ منزلہ کاغذی محل بنا کر وصل و ہجر کی لفظی کمند بازی کرتے ہیں۔ ہوا آئی تم تو نہ وہ لب بام نہ وہ کمند۔ کہاں حسن پرستی۔ کہاں یہ بوالہوس؟ میرا چاہنا الگ۔ میرا مرنا الگ میری ساری دنیا الگ۔

چاہتا ہوں۔ مدت العمر چاہوں گا۔ مگر میرا ہاتھ لگ جانے کے لئے نہیں بلکہ محض اس لئے کہ بے لوث خدمت کا موقع ملے۔ دل۔ دل کی ہر نیک آرزو اس کی نذر رہے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے۔ میرا فرض ادا ہو چکا۔ میرا انعام مجھے مل گیا۔

میں اسکا بن گیا۔

"فلک پیما"

از رسالہ ہمایوں۔ لاہور۔

ریاستوں میں

سب سے قدیم خاندانی حکومت کس کی ہے؟

دنیائی تاریخ پر نظر ڈالنے سے پایا جاتا ہے کہ برّ اعظم ایشیا میں فی زمانہ جو خاندان برسرِ حکومت ہیں اُن میں سب سے قدیم خاندانی حکومت سسودیہ خاندان مہارانا صاحب اُودیپور ملک میوار کی ہے۔ اس امر کا افسوس ہے کہ ہندوؤں میں بقول مورخ تھبرج صاحب کے ابتدا میں تاریخ نویسی کا چرچا نہ تھا سوا سطے قدیم حالات ہندوؤں کے مسلسل بہ سند مستقل نہیں ملتے۔ تاریخ کا دار مدار زیادہ تر سنی سنائی روایات پر ہے۔ چارن بھاٹ اور بڑوی راجپوتوں کے حالات کے جاننے والے اور بیان کرنے والے ہیں مگر اُنہوں نے خوشامد سے صحیح حالات کو چھوڑ کر دور از کار باتیں روایات میں ایسی داخل کر دی ہیں کہ اُن پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا۔ تاہم اودیپور کے مہارانا صاحب کا سلسلۂ نسب باپا راول تک منتہی ہوتا ہے۔ یعنی باپا راول سے مہارانا فتح سنگھ جی رئیس حال تک ۷۹ پشت ہوتی ہیں جن میں برابر حکومت چلی آتی ہے۔ ابتدا میں باپا راول کو چتوڑ کے موری راجہ کے ہاں فوج کی سپہ سالاری حاصل ہوئی تھی پھر باپا کا خود چتوڑ گڈھ پر قبضہ ہو گیا۔ باپا راول کی پیدائش کا سنہ ۷۱۳ء مانا گیا ہے۔ ٹاڈ صاحب نے باپا راول کا خراسان جا کر بیاہ شادی کرنا اور بہت اولاد چھوڑ کر مرنا لکھا ہے لیکن یہہ صحیح نہیں ہے۔ ایک چار سو برس پہلے کی مذہبی کتاب سے یہہ پایا جاتا ہے کہ باپا راول نے دنیا کو ترک کرکے سنیاس لیا۔ باپا راول سے نویں پشت میں راول کہمان ہوا جسنے اکثر اپنے دشمنوں پر فتح پائی تھی۔ کرنیل ٹاڈ صاحب نے یہہ بھی غلط لکھا ہے کہ خلیفہ مامون رشید راول کہمان سے چتوڑ پر لڑنے آیا اور ۲۴ لڑائیاں لڑیں بعد چتوڑ سے ہٹایا گیا اور اسی غلطی کی پیروی راجہ شیو پرشاد نے کی ہے یہہ غور نہ کیا کہ خلیفہ ماموں کا عہد راول کہمان

سے سَو برس اول ہے - دوسرے ماموں رشید ۸۱۳ء سے ۸۳۳ء تک زندہ رہا بیس برس حکومت کر کے مرا ہے - ماموں رشید کا ہندوستان آنا عربی تاریخوں سے ثابت نہیں ہوتا اور عربی تاریخوں کے صحیح ہونے میں کلام نہیں ہے - خلاصہ یہہ ہے کہ ۱۲ سو برس سے مسلسل حکومت سسودیہ خاندان کی ہونے سے انکار نہیں ہوسکتا - راجہ موری کو باپا راول کا ماموں بیان کیا جاتا ہے اور موری خاندان میں حکومت پہلے سے تھی - مہارانا صاحب اُدیپور سورج بنسی سسودیہ خاندان سے ہیں ان کو ہندوستان بھر کے بڑے چھوٹے راجہ اپنا بزرگ اور اپنے سے ممتاز سمجھتے ہیں - شاہان مغلیہ کی عرصہ تک انہوں نے اطاعت قبول نہیں کی مہارانا امر سنگھ جی نے بابا خرم عرف شاہجہاں کے سخت محاصرہ سے تنگ آکر سوائے صلح اور تابعداری کے اور کچھ چارہ کار نہ دیکھا اسواسطے ان کے بعد سے لڑائی کا خاتمہ ہوگیا - جہاں گیر بادشاہ نے بابا خرم کی سفارش پر مہارانا امر سنگھ کو حضوری دربار کی تکلیف نہ دی صرف کنور کرن سنگھ جی ہمراہ بابا خرم کے اجمیر جہانگیر کی خدمت میں حاضر ہوئے اور سب راجگان سے دربار میں ان کو اول جگہ ملی - اور پرگنے جیسرن تیمچ انکی جاگیر میں دئے گئے اور جب تک کنور کرن سنگھ جی جہانگیر کے پاس رہے جہانگیر اُنکے ساتھ ہر روز ایک نئی عنایت کے ساتھ پیش آتا رہا چنانچہ خود بادشاہ تزک جہانگیری میں لکھتا ہے کہ میں نے کنور کرن سنگھ کو وہ چیزیں عنایت کیں کہ جو نہیں دیجایا کرتی ہیں - نور جہاں بیگم کے سلام کو کنور کرن سنگھ گئے تو سوا لاکھ کا خلعت انہوں نے بھی دیا - جہاں گیر سے ایک موقع پر کنور کرن سنگھ نے درخواست کی کہ حضور کے گولی لگانے کی تعریف سُنی ہے - اس کے متعلق جہانگیر تزک میں اپنے قلم سے لکھتا ہے کہ میں نے قراولوں کو حکم دیا کہ اجمیر کے پہاڑوں میں شیر تلاش کریں - معلوم ہوا کہ شیر نہیں ہے شیرنی ہے - ہرچند میں شیرنی پر گولی نہیں لگاتا مگر اس ضرورت سے کہ کنور کرن سنگھ کے اودیپور جانے کی صورت قریب کی تھی اس لئے بضرورت کنور کرن سنگھ کو ہتھنی پر اپنے ہمراہ لیکر گیا اور کنور سے دریافت کیا کہ گولی کہاں لگاؤں اُس نے کہا کہ بائیں آنکھ میں شیرنی کے

لگے ایسی حالت میں کہ ہتھنی حرکت کر رہی تھی اور سہ پایہ بھی نہ تھا کہ اُس پر ٹھہرا کر بندوق لگاتا۔ خدا سے رجوع کرکے دعا کی کہ میری شرم رکھیو اور گولی لگائی گولی بائیں آنکھ میں شیرنی کے لگی۔ کرن سنگھ نے ہاتھ چوم لئے اور بہت تعریف کی اور جو فیل مادہ سواری کی تھی اُسکی اور بندوق کی بھی تعریف کی میں نے محلوں میں آکر فیل مادہ اور بندوق بھی کنور کرن سنگھ کو عنایت کردی۔ یہ بھی ایک خصوصیت اس خاندان کی ہے کہ شاہان مغلیہ سے ان کی رشتہ داری نہیں ہوئی۔ عالمگیر اورنگ زیب نے ایک موقع پر اپنے شہزادہ کو لکھا ہے کہ اودے پوری والدہ شما عزم رفاقت بمن دارد حال بیگم واند اس سے لوگ یاگ خیال کرتے ہیں کہ اودیپور کے خاندان کی لڑکی مغلیہ بادشاہوں میں گئی تھی۔ مگر دراصل یہہ خیال درست نہیں ہے اور اورنگ زیب کا لکھنا اور معنی رکہتا ہے اسکو کبھی ہم ظاہر کریں گے۔ گورنمنٹ برطانیہ جوہر ایک ادنے اعلیٰ کے حفظ مراتب کا بہت پاس کرتی ہے اُس نے بھی بہت سی خصوصیتیں مہارانا صاحب کی قایم رکھی ہیں ان کے اعزاز خاندانی کا بہت کچھ لحاظ اور تحفظ ہے اور ہونا بھی چاہئے بقول کسے کہ۔ مرنجاں کسے را کہ دارد نژاد۔ موجودہ مہارانا فتح سنگھ جی صاحب بہادر میں بھی بہت سی خوبیاں ہیں اور اپنے آپ نظیر ہیں۔ راقم الحروف کو بھی اُنکی خدمت میں نیاز ہے۔

بابا خرم عرف شاہجہاں نے کسی طرح سخت محاصرہ میواڑ کا کیا تھا جس سے تنگ آکر مہارانا امر سنگھ نے صلح کی درخواست کی۔ شاہجہاں ایام شہزادگی میں فنِ مُلک گیری میں بے نظیر تھا اُس نے باپ کے حکم سے جب میواڑ پر چڑہائی کی تو سب سے اوّل نقشہ بنوایا اور ناکہ بندی کی جو پہاڑی ضلع میں ایک ضروری بات تھی۔ بدیع الزماں کو معہ توپخانہ کے کوہمبلمیر میں مقرر کیا۔ سید سیف خاں کو جھاڑول میں تعینات کیا۔ سگر سنگھ کو گوگندہ میں۔ دلاور خاں کو انجھنلا میں۔ فرید خاں برلاس اور بوندی کا راؤ رتن سنگھ ہاترا۔ اوگنہہ میں محمد تقی بخشی۔ ماڈل میں زاہد خاں کیوڑہ کی نال میں۔ جودہ پور کے سردار ساڈرے میں۔ غرض اس قسم سے ناکہ بندی کرکے اندر فوج داخل ہوئی۔ پہاڑوں میں کئی جگہہ سخت لڑائی ہوئی لیکن زبردست فوج کے

مقابلہ میں۔ جو نکل جانے سے نجات مل جاتی ہے وہ اس ناکہ بندی سے نہ ملی۔ آخر تنگ آکر ہتھیار رکھنے پڑے۔ یہہ کہنا درست نہیں ہے کہ مہارانا امر سنگہ نے ہمت ہار دی۔ بلکہ بڑی فوجوں کے مقابلہ میں اور محاصرہ ہو جانے پر ایسا ہی ہوا کرتا ہے ہتھیار رکھنے پڑتے ہیں ؎

نہ ہر جائے مرکب تواں تاختن ؛ کہ جاہا سپر باید انداختن

خاں صاحب مرزا محمد علیخاں۔ رئیس دہلی۔

صلائے عام۔ اِس مضمون سے اکثر تاریخی مسئلے ثابت ہوتے ہیں مگر اُس سوال کا جواب باقی ہے کہ جب راجپوتانہ کے رئیسوں سے خاندان سلاطین مُغلیہ سے شادی بیاہ کی رسم جاری تھی تو اودے پور کی ریاست اس سے کس طرح مستثنےٰ ہوئی ؟ صاحب مضمون یہہ مسئلہ از روئے تاریخ (مخالف یا موافق جو امر واقعی ہو) ذرا مفصل ارقام فرمائیں ؛ اس التجا پر زور دینے کی وجہہ یہہ ہے کہ تاریخ میں حضرت مضمون نگار کا مرتبہ بہت بڑھا ہوا ہے ؛

مجھے انتظار ہے کہ عالمگیر بادشاہ نے جو "اودے پوری رانی" کی طرف اِشارہ کیا اُس کی تاویل میں کیا مسالہ پیش ہو سکتا ہے ؟ تاریخ مُغلیہ میں اودے پور کی ریاست مطیع اسلام سمجھی جاتی تھی۔ اور سلاطین مُغلیہ کے دربار میں روسار اودے پور کی دربارداری کا بھی پتہ لگتا ہے ؛ بہرحال۔ یہہ مسئلہ قطعی تحقیق طلب ہے کہ اُودے پور کے رئیس سلاطین مُغلیہ سے شادی بیاہ کی رسم سے کس طرح علیحدہ رہے ؟

ریویو

رسالوں میں آجکل دو رسالے مجھے پسند ہیں - ایک **ہمایوں** دوسرا نگار - **ہمایوں** لاہور سے نکلتا ہے اور **نگار** کا دفتر اب بھوپال میں ہے : دونوں رسالے اس مرتبہ کے ہیں کہ اس وقت ان سے اُردو لٹریچر کی عزت ہے ؛ **نگار** کی تعریف میں پہلے کر چکا ہوں - **ہمایوں** سے ایک مضمون بجنسہٖ **صلائے عام** میں نقل کیا جاتا ہے :

اس مضمون کا طرز بیان خاص ہے ؛ دوسرے مئی سنہ رواں کے **ہمایوں** سے جناب **گرامی** کی غزل جو "جذبات عالیہ" کی سرخی سے شایع ہوی یہاں نقل کی جاتی ہے - میں سمجھے ہوئے تھا کہ فارسی کی طرف لوگ اب بہت کم متوجہ نظر آتے ہیں - جو کم توجہ ہیں وہ جانیں اور اُنکی سمجھ مگر یہہ زبان حضرت **گرامی** نے اس غزل میں دکھائی لاجواب ہے اس کی زبان اور مضمون کی تعریف میرے بس کی نہیں ؛ غزل یہہ ہے :-

چشم ست سیہ مستے دل ہست سیہ کارے ؛ دردے بجگر دارد بیمار ز بیمارے
از عشق بگو با من یا شیخ چہ مے گوئی ؛ ہر کارے و ہر مردے ہر مردے و ہر کارے
آں پردہ نشیں در سیر آمد بسر بامے ؛ دیوار بامیدے اُمید بدیوارے
از یکدگر اے اُستاد دل و زد و دل آویزست ؛ رفتار ز گفتارے گفتار ز رفتارے
گفتم کہ می آئی آرے و نعم گوید ؛ انکار در اقرارے اقرار در انکارے
اے عقل چہ تدبیرے اے ہوش چہ افسونے ؛ شد رہزن ایمانم آں سادۂ پُر کارے
در بتکدہ رفت آں شیخ بخو دست و نشناسد ؛ زنار ز تسبیحے تسبیح ز زنارے
از چشم ہمہ دردم از گوش ہمہ داغم ؛ چشمے ست سراپے گوشے ست بدیوارے

بقیہ

تمہید وفا سنجان خاریست تہ پائے ÷ اُمید ہوس کوشاں گل بر سر و ستارے
انجا کہ بود قہرش ہر شہر بیابانے ÷ آنجا کہ بود عفوش ہر ذرہ گنہگارے
بے پردہ بہم یکجاں در پردہ نفاق اندیش ÷ تسبیح زتسبیحے زنار ز زنارے
ہاں جرم گرامی نیست جز کاہلی و پیری ÷ دیرینہ غلامے رامفروش ببازارے

(از ہمایوں)

جس زبان میں یہہ قوت ہو اور جس کا یہہ کلام ہے اُسکے کمال میں کیا کلام ہے۔ کسی زبان اور کسی کے کلام میں اس سے زیادہ خوش بیانی اور پاکیزہ خیالی ممکن نہیں ÷ میں نے یہہ غزل دس بارہ دفعہ پڑھی اور جی نہیں بھرا۔ جناب گرامی سے عرض ہے کہ پیری و کاہلی کا بہانہ نہ کریں۔ ایسا کلام جسقدر ہمیں مل سکے ہم آنکھوں سے لگانے کو حاضر ہیں ÷

ہر تازہ رسالہ کی نسبت مجھے رائے قایم کرنے میں تامل ہے۔ میں دیکھتا ہوں کہ اکثر نیا رسالہ نکالنے والے رسالہ بھیجکر صلائے عام میں ریویو اور صلائے عام سے مبادلہ کے متقاضی ہوتے ہیں ÷ ریویو ایسی چیز نہیں جسپر تقاضہ کا اثر ہو

محبت اور دشمن آپ کی پہچان کے صدقے ÷ اسے تو دل میں رکھتے ہیں زباں پہ یہ نہیں ہوتی

اکثر رسالوں کے نکلکر جلد بند ہوجانیسے میں ڈر گیا ہوں کہ ایسا نہ ہو زیادہ تعریف کرنیسے کہیں میری نظر نہ لگ جائے۔ کچھ عرصہ تک رسالہ چلے اُس کے بعد کوئی رائے موافق یا غیر موافق زبان سے نکالی جائے۔ رائے کے لایق تو چیز تب ہو سکتی ہے جب کہ اُسکی پائداری کا تجربہ ہوجائے ÷

رہا ہر رسالہ کا صلائے عام سے مبادلہ۔ اسے میں ضروری نہیں سمجھتا ÷ مجھے جن اصحاب سے پہلے سے رسم و راہ ہے یا تازہ شناسائی پیدا کرنی ہے تو اسکا فیصلہ میں نے اپنے ذمہ رکھا ہے۔ خوامخواہ ہر رسالہ اور اخبار کی پابندی مجھسے مشکل ہے

آدمی کے ساتھ سو آزار ہیں یہہ کیا کہ بس ÷ آہ کی اور رازِ الفت آشکارا ہوگیا ÷

تقدیر

تا درتنِ تست استخوان ورگ و پے ÷ از خانۂ تقدیر منہ بیرون پے
گردن منہ ار خصم بود رستم زال ÷ منت مبر ار دوست بود حاتم طے (عمر خیام)

حضرت عمر خیام چاہے جو کہہ لیویں مگر ہمیں تو آجتک خانۂ تقدیر ملا نہیں اور نہ کبھی کیا موقوف ہے کسی کو بھی نہ ملا ہوگا اور نہ ملیگا۔ بہت بڑا دم بھرنے والے اور بڑے حساب کتاب کے ساتھ زائچہ کھینچنے والے جو آئے دن زمانہ استقبال کو ہاتھ میں لئے رہتے ہیں وہ بھی تقدیر کے خانہ کو نہیں بتلا سکے اور جو کچھ بتایا بھی وہ ہمیشہ عالم شک کے حوالہ رہا۔ یعنی حکم لگایا تو مگر کبھی کسی کو باور نہیں ہوا۔ ہاں یقین جب ہو جاتا ہے جب کوئی قیاس صحیح اتر جاتا ہے مگر وہ بھی کیا نجومی صاحب کے حساب کی تعریف ہو جاتی ہے مگر تقدیر کا حال تو اُسیوقت کھلتا ہے جب تقدیر والے کے آگے قدر کھل جاتی ہے۔

ان باتوں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ قبل از وقت کبھی تقدیر کا لکھا نہیں معلوم ہوتا مگر خود تقدیر کے ثابت ہونے میں کوئی کلام نہیں ہو سکتا کیونکہ قدرت تقدیر کو اپنے ہاتھ میں رکھتی ہے اور انکشاف اُسکا اُس کے ظہور پا جانے پر ہوتا ہے اور اس وقت اسکا یقین آجاتا ہے کہ تقدیر کا لکھا مٹتا نہیں ہے۔ یہ تو بالکل سچ ہے کہ ہم تقدیر کے گھر میں گھرے ہوئے ہیں مگر اس سے باہر قدم رکھنا ہمارے اختیار سے ہر طرح باہر ہے۔ اور جب کبھی کوئی واقعہ سُنا ہوگا تو کہنے والوں کو یہی کہتے سُنا ہوگا کہ دیکھو تقدیر میں بدا تھا۔ مگر اس سے قبل کا آگاہی دینے والا کون ہو سکتا ہے۔ نجومی تقدیر کا لکھا بتایا کرتے ہیں مگر ہم کب اُن کے کہے پر عمل کر سکتے ہیں یہ تو ضرور ہے کہ نجوم بڑا کارآمد علم ہے مگر اسیقدر تو کہ فلاں سمت ادھر ہے اور فلاں ملک اُدھر ہے اور سمندر پر جہاز لیکر چلو تو اس سیدہ پر جاؤ اور یہ تاریکی ہے اور یہ اُجالا ہے۔ ان باتوں کے سوا اور تو کسی کام میں نجوم آتی نہیں۔ اس سے تقدیر کا معمہ کیا حل ہو سکتا ہے۔

حضرت عمر خیام کا مفہوم بھی ہرگز اسکے خلاف نہیں ہے اور منشا ظاہر ہے کہ تقدیر کے خانہ سے باہر قدم

بتی ہا

نہیں رکھ سکتے جو نوشتہ تقدیر ہے وہ ضرور پیش آمدنی ہے پس ہم اس سے نکل جانیکی کوشش کریں تو فعل عبث ہے۔ دشمن کے آگے ہم کیوں سر جھکانے لگے اور دوست کا احسان کاہیکو اٹھانے لگے۔ یہ مضمون تقدیر کے ثبوت میں پوری دلیل ہے۔ یعنی ہمکو تقدیر کے خانہ سے باہر نکلنا ناممکن ہے چاہے دشمن سے مقابلہ کی ٹھیرے چاہے دوست سے معانقہ کی۔ قبل از وقوع واقعہ محض نجوم کے حساب پر کسی واقعہ کو مان لینا یقیناً خانہ تقدیر سے باہر قدم رکھنا ہے، ورنہ تو یہ غیب کی کنجی پا جانا ہے

راقم عرفان علی (آئی ایس او)

کلام یاس

بیٹھا ہوں پاؤں توڑ کے تدبیر دیکھنا ٭ منزل قدم سے لپٹی ہے تقدیر دیکھنا
پہنا دیا ہے طوق غلامی تو ایک دن ٭ میری طرف بھی مالک تقدیر دیکھنا
شاید خدانخواستہ آنکھیں دغا کریں ٭ اچھا نہیں نوشتۂ تقدیر دیکھنا
پروانے کر چکے تھے سرانجام خودکشی ٭ فانوس آڑے آگیا تقدیر دیکھنا
ہر خوب و زشت آپ ہی اپنی مثال ہے ٭ حدِ کمال کاتبِ تقدیر دیکھنا
اصلاح کی مجال نہیں ہے تو کیا ضرور ٭ بے ربطیِ نوشتۂ تقدیر دیکھنا
مُردوں سے شرط باندھ کے سوئی ہے اپنی موت ٭ ہاں دیکھنا ذرا فلکِ پیر دیکھنا
چونکے تو چشم شوق میں عالم سیاہ تھا ٭ خوابِ نظر فریب کی تعبیر دیکھنا
مجھ ناتواں کا صبر تو کیا آزماؤ گے ٭ راس آئے تم کو جوہر شمشیر دیکھنا
ہوش اُڑ نہ جائیں صنعتِ بہزاد دیکھکر ٭ آئینہ رکھ کے سامنے تصویر دیکھنا
آوازے مجھ پہ کستے ہیں پھر بندگان عشق ٭ پڑ جائے پھر نہ پاؤں میں زنجیر دیکھنا

بادِ مراد چل چکی لنگر اُٹھاؤ یاس
پھر آگے بڑھ کے خوبیِ تقدیر دیکھنا

Presentation of Mir Nasir Ali Khan Bahadur of Delhi to his Most Gracious Imperial Majesty King Emperor.

—:o:—

Extract from a letter from J. P. Thompson, Esquire I. C. S.
Dated 13th December, 1911.

—:-o-:—

"Dear Mir Sahib

I enclose your invitation card for the Garden Party this afternoon, which has just reached me from the Private Secretary to His Honour."

o o o "Sir Louis Dane hopes to have an opportunity of presenting you to his Imperial Majesty." o o o o

—:o:—

Extract from a letter from Sir Richard Dane. K. C. I. E. (Brother of His Honour the Lieutenant Governor of Punjab)
Dated Lieut. GOVERNOR's CAMP, 25th February 1912.

"Dear Mir Nasir Ali"

o o o o o o o

My Brother has told me that you had the great honour of being introduced to his Imperial Majesty the King Emperor."

I am, Yours Sincerely,

—:o:—

Extract from a letter from Major J. C. C. Angelo, Dy. Commissioner;
Dated, 18th December 1911.

"My Dear Mir Sahib

" I am very glad you were presented to His Imperial Majesty—it was a fitting ending to the Durbar." o o o o

Your Sincerely,

Babu Rebindra Nath Tagore of GITANJALI, writes:-

o o o o

"I have no doubt that it (Sala-i-Am) is doing a good service in promoting the cultivation of Urdu literature."

o o o o o o

Extract from a Gentleman,s letter
Dated April 4, 1914.

o o o o o o

"I conclude from the last issue of the Sala-i-Am that you have been invested with a *Khilat* as Diwan of the Pataudi State, will you permit me as an old friend of yours and an admirer of your genius to offer you my sincere congratulation,

o o o o o o

" It like Addison you have acquired celebrity as an Essayist and a brilliant writer of Urdu prose; o o.

o o o o o o

you, like him, deserve to be raised to the highest advancement in the state! Now, that is no flattery I speak as I think." o o o

"In conversation this morning with o o I brought to his notice the SALA-I-AM, and have at his request sent him your December Number, drawing his particular attention to your "Stray thoughts" مضمون پریشان o and especially to your simile of

یار کی زلف پریشان

o o o o o o

Farrash-khana Delhi. He has recently started an Urdu Magazine Sala-i-Am, in his own city. He is a writer of some forty years standing His writings are appreciated in Lucknow as well as in Delhi He has been congratulated for his work by the Lieutenant Governor of Punjab. He has received congratulations from all parts of India compliments from many literary men and favourable reviews from the Press, and now that great boon the appreciation of Lord Minto. His style is very simple but emphatic. He wtries philosophical essays in Urdu and is thus doing much to bring to a high level Urdu literatare. It is hoped that the paper he has started will do much for the good of our languages. The paper itself is nicely got up, the annual subscriptions only Rs. 3. Those who are desirous of reading good Urdu should at once communicate with the editor, the point also I should add, that the paper is much liked and purchased by Europeans both in India and Europe."

—:o:—

Copy of a letter from the Private Secretary to His Honour the Lieutenant Governor of the United Provinces, dated 11th April 1913.

GOVERNMENT HOUSE.

LUCKNOW.

Sir

I am desired to acknowledge your letter of the 19th forwarding a copy of your paper "Sala-i-Am." for His Honour the Lieutenant Governor's perusal; and to say that His Honour has put it a side to study an enjoy at leisure.

—

The annexed Review of the SALA-I-AM Delhi, is re published from the Journal of the Moslem Institute, Calcutta. No 2 Vol [illegible] Page, 104.

—o—

"The Sala-i-Am, published at Delhi is a high class Urdu periodical and in get up printing and style it is without a parallel. it has been truly remarked by the *Pioneer* that it, "seeks to promote the cultivation of Urdu literature." It is edited by Khan Bahadur Mir Nasir Ali who is a writer of 40 years standing"

Extract from the GAZETTE OF INDIA JUNE 6, 1914. EXAMINATIONS.

XVI:— The following are the Text books prescribed for the PROFICIENCY EXAMINATION:—

o o o o o o

URDU:—

o o o o o o

In addition to the Grammer and Magazine recommended for the proficiency examination, the following are recommended :——

o o o o o o

Magazine

SALA-I-AM

o o o o o

Appendix B. List of authorised Text books. The following is a list of Text books prescribed for the various examination together with the places where they may be obtained.

o o o o o

URDU.

SALA-I-AM ———————— DELHI

o o o

school :—

"Sala-i-Am" edited by Mir Nasir Ali Khan and published at the Mustansir Press Delhi, annual subscription Rs. 5.

I have &c.
J. C GODLEY
Director of Public Instruction, Punjab

Extract from a letter from R. F. DEWHURST ***Esquire I C S Session Judge, dated 11th January 1911.***

"I take this opportunity of saying that I entertain a very high opinion of your Magazine I will not say that I read every word of every number but I can say with truth that I read eagerly all the articles proceeding from your own pen beginning to end."

"I have always been an enthusiast with regard to Urdu literature since I come to India eighteen years ago and have read much classical verse and prose besides the more ephemeral publications but I have never yet encountered such a model of a clear and attractive prose style as I find in your articles.

Extract from a letter from the Hon'ble W Merk Esquire, L L D. C S I I C S, Late Chief Commissioner, N W Frontier province Written from England dated 16th August 1911

I thought it (Sala-i-Am) a periodical that might be encouraged with for advantage. for instance to be placed in the waiting rooms for native gentleman calling on Deputy Commissionere.

Extract from a letter from A L GORDON WALKER Esquire I C S Punjab Commission dated 11th October 1911

"I quite agree with Mr Merk that the (Sala-i-Am) ought to be in the waiting room of all Deputy Commissioners Curiously enough I have used it for the purpose myself and always find that the Indian gentlemen who read it are delighted with it '

Extract from a D O letter from the Deputy commissioner of Gurgaon to the vice chancellor of the Punjab University dated 24th December 1910

"I wonder if you have any collection of receiving a letter from me last July when I sent you a copy of the Sala-i-Am. edited by Khan Bahadur Mir Nasir Ali, a most estimable old Government servant who spends his leisure hours, when not occupied in his Magisterial duties [he is an Honorary Magistrate in Delhi] in editing and publishing quite one of the best Magazines in Urdu.

"I am sending you another copy of the Magazine with a request that you will as Vice Chancellor of the University give it all your assistance and if possible, its Editor the Mir Sahib who is a most loyal old man and a man of letters."

EXTRACT FROM THE INDIAN DAILY TELEGRAPH LUCKNOW DAILY 14th DECEMBER, 1901.

"But the chief point about which I have taken up my pen to write is the literature of Khan Bahadur S. Nasir Ali Sahib of

OPINIONS

Regarding "SALA-I-AM" Delhi.

The following Critique on the "SALA-I-AM," Delhi, was Published by the Pioneer, in its issue of the 3rd November 1909

"The Sala-i-Am published at Delhi keeps up high character as a periodical which seeks to promote the cultivation of Urdu literature. Khan Bahadur Mir Nasir Ali with whom loyalty and learning go hand in hand is filling the leisure hours of his retirement by devoting himself to the editing and publishing of this Magazine. His style is marked by refinement and culture, and his readers should increase in number as the merits of his work become disclosed. The Sala-i-Am is particularly well printed and European students of Urdu should find it quite worth reading."

Extract from a letter from Colonel D. C. PHILLOTT Secretary Board of Examiners, Calcutta, dated [illegible] January 1910

"I have obtained the opinions of some of the board on the 'Sala-i-Am" We think it is the best Urdu Magazine we have yet seen both in appearance and content. I shall have great pleasure in recommending it to candidates for the high Proficiency and Degree of Honour In fact, I have been doing so."

Extract from a letter from Sir Thomas GORDON WALKER L. L K. C. I. E. Late Lieutenant Governor of Punjab Dated 15th March 1909

"The Magazine (Sala-i-Am) appears to be a very superior work one that ought to be appreciated."

SIR LUCAS WHITE KING
Kt. L. L. D., C. S. I. F. R. S
Indian Civil Service retired
writes as follows.–

"I am delighted with the style of your Magazine and am looking forward to the next number.

Dated 15th October 1908

Extract from CIRCULAR No 26 SERIAL No 5059
From the Hon'ble Mr J. C. GODLEY M. A. Director of Public Instruction Punjab

TO ALL DEPUTY COMMISSIONERS INSPECTORS OF SCHOOLS, HEADS OF TRAINING INSTITUTION & MANAGERS OF AIDED and RECOGNIZED UNAIDED SCHOOLS IN THE PUNJAB.

Dated Lahore The 31st August 1910

Sir,

I have the honour to recommend the Journals noted below for the reading room of Secondary

صلائے عام

خواجہ قمر الدین راقمؔ کا شعر ہے؎

مقصد تمہارے ہاتھ ہے قسمت خدا کے ہاتھ ✧ جو کچھ خدا سے ہو وہ تمہاری زباں سے ہو ✧

صلائے عام کا بھی یہی عقیدہ ہے کہ کسی ملک و قوم کی ترقی تو پروردگار کے اختیار میں ہے لیکن ترقی کے لئے پہلی شرط اپنی زبان میں کمال پیدا کرنے کی ہے ✧ ضد کی اور بات ہے مگر اس وقت ہندوستان کی زبانوں میں اردو سے بہتر کوئی زبان میری سمجھ میں نہیں آتی جس پہ جمہور اہل ہند (ہندو ہوں یا مسلمان) دونوں کی زبان کا اطلاق ہو سکے؎

نغمۂ عشق سے ہیں سُبحہ و زنار ملے ✧ ایک آواز پہ دو ساز کے ہیں تار ملے

خلاقِ دو عالم کی طرح اردو زبان کی تعریف سب سے پاکیزہ یہ ہے کہ؎

تجھسے کوئی آشنا نہ ہوا ہو ✧ پر تجھے سب سے آشنا دیکھا

یہہ رسالہ اپنی زبان میں اظہار کمال کی غرض سے جاری ہے کہ اردو لٹریچر کے لئے ہر طرز پر لکھنے کا مسالہ جمع ہو اور ادائے بیان میں ہماری زبان اور زبانوں سے اگر بازی نہ لے جا سکے تو کسی زبان سے مرتبہ میں کم نہ رہے؎

دیکھ کر تجکو مٹے جاتے ہیں دنیا کے حسین ✧ جمع ہوتا ہے مسالہ تری یکتائی کا

صلائے عام میں ہر طرح کے مضمون نظم و نثر شائع ہوتے ہیں۔ زیادہ تر نثر اس وقت

نثر

ضرورت ہے: اور نثر بھی ایسی جس میں زبان کی خوبی و فصاحت کے ساتھ خیال کی پاکیزگی اور نزاکت
ضرور ہو ؎ دل باندھتے تھے یار کے کاکل سے باندھتے ٭ بلبل کو باندھتے تو رگِ گل سے باندھتے

صلائے عام میں حکام سول و ملیٹری افسروں کے امتحان میں گورنمنٹ
آف انڈیا سے منظور ہو چکا ہے ہندوستان کے سوا یورپ کے عالم و فاضل صلائے عام
کی قدر کرتے ہیں: اردو میں صلائے عام کے مضامین کو خاص مرتبہ حاصل ہے ؎
دل پر تمہارے نقش ہوا ہے بیانِ شوق ٭ کارِ قلم دکھاتی ہے میری زبانِ شوق

اکثر اصحاب نمونہ کا پرچہ مانگتے رہتے ہیں۔ اول تو ایک پرچہ سے صلائے عام
کا پورا حال معلوم ہونا مشکل ہے دوسرے صلائے عام کو جاری ہوئے تو مدت ہو گیا۔ نمونہ
بھیجنے کی مجھے ضرورت نظر نہیں آتی ؎

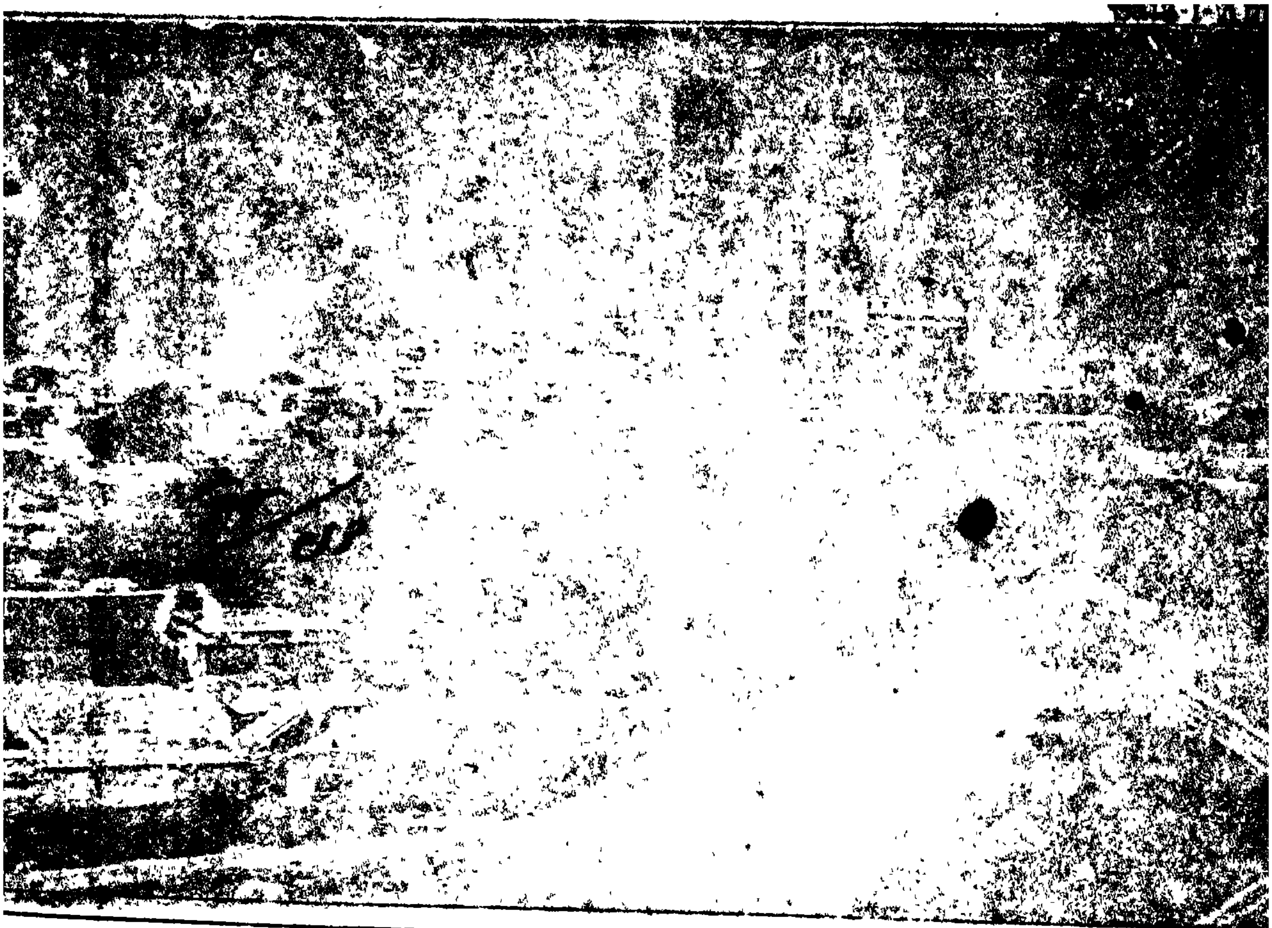
پیری میں بھی ہے ولولۂ شوق نہیں کم ٭ رکھتے ہیں ابھی اہلِ دل ہنگامہ گزیں ہم
شدت نہیں مجنوں کے برابر یہ مسلّم
پر کوئی نہ جانے ہمیں ایسے بھی نہیں ہم

صلائے عام کی قیمت پیشگی چھ روپے سالانہ ہے۔ چھ مہینہ سے کم کی
خریداری منظور نہیں ہو سکتی: قیمت بذریعہ منی آرڈر عنایت فرمائی جائے۔ مضمون نگار
صلائے عام کی قیمت سے بری نہیں: نہ یہ ضرور ہے کہ ہر مضمون خواہ مخواہ شایع کیا جائے:
جو مضمون شایع نہ ہو سکیں اُن کے واپس کرنے کا ذمہ نہیں: جامعِ اوراق کو مضمون میں
کمی بیشی کا اختیار ہے ٭

صلائے عام کا پتہ اسقدر کافی ہے کہ:
دہلی۔ فراشخانہ: مکان میر ناصر علیخاں بہادر ٭

حسب الارشاد میر ناصر علیخاں بہادر مطبع ناصری واقع فراشخانہ دہلی میں باہتمام میر احمد چھپا اور شایع ہوا ٭

PRINTED AND PUBLISHED BY MIR NASIR ALI KHAN BAHADUR (EDITOR) AT THE NASIRI PRESS
FARRASH KHANAH, DELHI.



SALA-I-AM, DELHI.

A high class Monthly Magazine devoted to the cause of Urdu literature, the preservation of the old Indian, especially Mohammadan culture and refinement, and the assimilation of the best features of the new civilization.

فہرست مضامین

جلد ۱۱ نمبر ۶

بابت ماہ جون سنہ ۱۹۲۳ء مطابق ذیقعدہ سنہ ۱۳۴۱ ہجری

پیرایۂ آغاز

قدیم دستور ہے کہ بڑی حویلیوں کے دروازہ پر اکثر قندیل لٹکائی جاتی تھی کہ آنے جانے والوں کو آرام رہے ؎

دل سوز ہیں دروازہ سے اُٹھواؤ نہ ہمکو ٭ روشن ہے چراغِ درِ کاشانہ ہمیں سے

پیرایہ آغاز کو آپ چراغِ درِ کاشانہ سمجھیں جس سے ہر پرچہ کا حال معلوم ہو جاتا ہے ٭

اس پرچہ میں **مضمون پریشان** کے طرز پر زیادہ لکھا گیا کہ یہ طرز لوگوں کو زیادہ پسند ہے۔ اس میں یہہ فائدہ ہے کہ مجھے سچ بولنے اور آپ کو سچ سننے کی عادت پڑجائے **محبت** و **لطفِ صحبت** اور **محشرِ خیال** یہہ اسی وضع کے مضامین ہیں ان کے ساتھ اخیر میں علمائے عام کی سُرخی کے نیچے (صفحہ ۲۵) کا مضمون بھی پڑھنے کے قابل ہے ؎

عروجِ فکر کو ہوتا ہے کُہنہ مشقی سے ٭ ہوا جو پیر طبیعت ہوئی جوان میری ٭

آداب الشعرا۔ جناب نواب حیدر یار جنگ بہادر کی تصنیف **نظم طباطبائی** سے نقل کیا گیا ہے ۔ کچھ عرصہ سے جناب **غالب** دہلوی کے کلام اُردو پر مختلف رائیں شائع ہوئی ہیں۔ اسکے متعلق مضمون مندرجہ صفحہ ۲۲ تا ۴۴ بھی ملاحظہ فرمایا جائے جو جناب مرزا محمد علی خاں صاحب رئیس دہلی کا لکھا ہوا ہے ۔

تقدیر یا تدبیر۔ جناب مرزا عرفان علی بیگ صاحب آئی۔ ایس۔ او۔ کا مضمون ہے۔ ایسے مسائل بہت لمبی چوڑی تحریروں کے محتاج ہیں اور پھر بھی شاید ہی طے ہوں۔ یوں دیکھنے کو تو ہر شخص کی زبان پر موجود ہیں ؎

بچپنے میں وہ طبیعت تھی سبق کا ذکر کیا ۔ صاف پڑھ لیتے تھے وہ لکھا ہے جو تقدیر میں ۔

صلائے عام کی ڈاک معمولی ہے مگر معمول سے زیادہ ہو گئی ۔ ریویو میں زیادہ لکھنے کی ضرورت تھی مگر زیادہ لکھنے کی فرصت نہ ہوئی ۔

صلائے عام کو اپنے طرزِ خاص پر مضامین کی زیادہ ضرورت ہے مضامین نظم و نثر میں مَیں یہ نہیں دیکھتا کہ زبان قدیم ہے یا جدید۔ قدیم و جدید کا جھگڑا میں نے نہیں رکھا: میری نگاہ میں لٹریچر صرف دو قسم کی ہے پاکیزہ یا معمولی: معمولی کی مد نہیں۔ پاکیزہ کم ہے۔ پاکیزہ آپکو پیدا کرنی ہے تاکہ یہ کہنے کی گنجایش ہو کہ ؎

بھری ہے کان میں ہر گل کے داستاں میری ۔ فصیح تر کہیں بلبل سے ہے زباں میری ۔

× × × × × × × × × × × × × × × ×

لکھنؤ میں کہیں "صلائے عام" کی ایک جھلک دیکھی تھی دیکھکر جان میں روح پڑ گئی۔ مدّت کے بچھڑے ہوؤں میں حسرت بھری نگاہیں قیامت ڈھاتی ہیں۔ میں نے تو دور ہی سے دیکھکر پہچان لیا۔ مگر مجھے کوئی نہ پہچان سکا۔ انقلاب سا انقلاب ہو گیا اب آئینہ میں اپنی صورت دیکھکر خود دل لرز جاتا ہے۔ × × × × خدا کرے آپ مع الخیر ہوں۔ دلِ حزیں کی فرمایش تھی "شراب" پر ایک مضمون لکھ مارو۔ چونکہ متعلا آپ ہی کا ہوں اسلئے میں باستثنا ء چند مخصوصین آپ ہی کا مرقع [illegible] جانتا ہوں آپ کو خداوند کریم دیر تک زندہ و سلامت رکھے۔ پھر کہاں ایسے لوگ۔ جی چاہا اگر ایک پرچہ بھیجدوں خدا کرے پسند آئے

مضمون پریشان

سرِ نہ شد ہیچ کس از بے سروسامانیٔ ما ؛ جمع شہ خاطرِ یاران ز پریشانیٔ ما ؛
قصہ ہائے سرِ زلفِ تو بہ شب ہا گفتم
یک سرِ موئے نہ کم گشت پریشانیٔ ما

بہت لوگ مجھسے پوچھتے ہیں کہ مضمون پریشان کبھی ختم بھی ہوگا ؟ واقعی۔ میں کہہ نہیں سکتا کہ کب ختم ہوگا یا کب تک چلا جائے گا۔ یہہ مضمون پریشانی میں اگر زلفِ جاناں سے ہمسری رکھتا ہے تو درازی میں اُس سے آگے بڑھ جانے کا دعوے ہے ۵

کیا دیکھتے ہیں آپ بہار رسوا ابھی ؛ جب ایڑیوں تک آئیں تو بالونکو دیکھنا

گرا میں پاؤں پر اُنکے گرے وہ پاؤں پر میرے
اُٹھانے کو جھکے تھے جھک گیا سر بار کاکل سے

آپ دیکھیں کہ ابتری میں دفترِ عالم گنجفہ کے پتوں سے زیادہ بکھرتا رہتا ہے کہ بازی کے

۵ یہہ نہ سمجھا تھا بناتے ہی بگڑ جائیں گے ؛ کیا پریشاں میں ہوا آپ کے چھو کر گیسو۔

بعد گو کھیلنے والے کتنی ہی ترتیب کریں مگر پتوں کے بکھرے بغیر کھیل ناممکن ہے۔ اسی طرح خزاں کے پتوں کا حال سمجھئے کہ ان کا بکھرنا لازمی ہے ؎

بادِ خزاں سے زور نہ شبنم کا جب چلے ۞ رہ جائے کیوں نہ آنکھ سے آنسو نکال کے

بادِ خزاں کے مارے ہوئے پتے نہ باغ سے شکایت کرتے ہیں نہ بہار سے۔ نہ باغباں سے غرض نہ گلچیں سے: انہیں نہیں معلوم کہ کہاں جانا ہوگا اور کیا گذریگی؟ کتنے آندھی میں بکھر جائیں گے؟ کتنے نذرِ گلخن ہوں گے؟ جب تک باغ میں رہے تو نہالانِ چمن اور جھومتی ہوئی شاخوں کا ساتھ رہا۔ مرغانِ خوش الحان کے چہچہے سنے۔ بوئے گل سے پتہ پتہ معطر رہا۔ یہہ لطف پھر کہاں نصیب؟ اور مصیبت یہہ کہ معلوم نہیں آگے کیا ہوگا؟ ؎

زبردستی نکالا باغ سے بلبل کو گلچیں نے ۞ وہاں سے پھر نہیں معلوم اڑ جانے پہ کیا گذری

میں نے یہہ تمثیل پت جھڑ کی اس لئے دی کہ درخت کے پتوں کے ساتھ نیچر کا جب یہ سلوک ہے کہ خدا جانے کیا ہوتا ہے۔ حالانکہ باغ کے پتے بے گناہ سمجھے جاتے ہیں تو ہم نے کیسے جانا کہ ہم پر کیا گزرے گی؟ ظاہرا تو بربادی کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔ مرغانِ ہوا کو قفس میں بے دانہ اور مچھلیوں کو بے پانی تڑپتے دیکھا ؎

اسپِ تازی شدہ مجروح بزیرِ پالاں ۞ طوقِ زریں ہمہ در گردنِ خرمے بینم ۞

بہ ناداں آنچناں روزی رساند ۞ کہ دانا اندراں حیراں بماند ۞ ؎

بے فائدہ ہے دل سے جو کہئے ستمِ یار ۞ مجنوں سے کبھی شکوہ لیلےٰ نہیں کرتے

لیکن عالمِ اسباب کی وضع قابلِ اعتبار نہیں۔ زمانہ کبھی بے سبب موافق دیکھا اور کبھی بلاوجہ مخالف۔ کبھی انسان سے خوش۔ کبھی حیوان سے۔ بلکہ انسان سے زیادہ غیرِ انسان موردِ الطاف ہیں ؎

دھجیاں دامنِ صحرا کی نہ اڑتے دیکھیں ۞ سختیاں کیں نہ فلک نے کبھی کہساروں پر

دنیا میں راستی بڑی نعمت سمجھی جاتی ہے کہ ع راستی موجبِ رضائے خداست
لیکن حضرت منصور حلاج رح کو محض حق پر دار نصیب ہوئی: راستی کے اچھے ہونے میں شک
نہیں لیکن سچ پوچھئے تو کبھی بھی بے کار نہیں۔ خوبصورتی میں ابروئے خمدار اور مسجد میں
خمِ محراب کی قدر ہے۔ سیدھے خط سے دائرہ کھینچنے میں زیادہ اظہارِ ہنر ہے۔ جتنے
ثوابت و سیارے۔ کواکب و ستارے۔ نجوم آسمانی و نظام شمسی گردش میں ہیں ان
کا دَور سیدھا نہیں ہے

ہمیشہ راستی کا آپ کو دعوےٰ رہا لیکن ؛ نہ نکلا کج طبیعت سے نہ نکلا پیچ کاکل سے

اُلجھتا ہے جو ہر دم یہہ خیال موئے پیچاں میں
دلِ صد چاک کیا کنگھی ہے گھونگروالے بالوں کی

دُنیا کو پیرزال۔ قحبہ۔ بیوفا۔ شوہر کُش کہتے ہیں اور خدا جانے کیا کیا عیب لگاتی
ہیں۔ لیکن غضب یہہ ہے کہ باوجود ہزار عیبوں کے اسی پر جان دینی پڑتی ہے۔
یہہ کتنا بڑا ستم ہے کہ جس سے نفرت ہو اُسی سے محبت بعیر چین نہ ملے ؛

اس کے بعد آپ محبت والا مضمون ملاحظہ فرمائیں

محبت

دُنیا میں محبت کا اثر زیادہ ہے یا دشمنی کا؟

دُنیا کے تمام اہلِ سخن دُنیا کا مدار محبت پر کہتے چلے آئے۔ انکا مُسلّمہ کم و بیش **میر تقی** کا مشہور شعر ہے کہ ؎

محبت نے ظلمت سے کاڑھا ہے نور ٭ نہوتی محبت نہ ہوتا ظہور ٭

توریت میں ہے کہ آغاز میں اندھیرا تھا۔ خدانے روشنی کو اندھیرے سے جُدا کیا: یہ کائنات کے وجود کا سبب ہوا ٭ میں نے مانا کہ محبت کام کی چیز ہے مگر عداوت سے بھی بہت کام نکل جاتے ہیں۔ جسطرح پروانہ کو شمع سے محبت ہے کہ جان دے دیتا ہے اس سے زیادہ نیولے کو سانپ سے دشمنی ہے کہ سانپ کو جیتا نہیں چھوڑتا ٭ میں دیکھتا ہوں کہ نظامِ عالم کا مدار جسقدر محبت پر ہے اُس سے زیادہ ایک دوسرے کی دشمنی پر ہے حضرت شیخ سعدی رح کا قول ہے کہ ؎

گربۂ مسکیں اگر پر داشتے ٭ تخمِ گنجشک از جہاں برداشتے۔

بلکہ سچ پوچھئے تو عالمِ اسباب کے انتظام میں ایک دوسرے کی دشمنی کو بہت دخل ہے

پیدائش سے زیادہ موت کا زور ہے۔ نرمی سے زیادہ سختی کا شور ہے ؛ مخلوق میں چھوٹا بڑے کی غذا ہے۔ ناخن و دانت والے جانور اُن جانوروں کو کھا جاتے ہیں جن کے ناخن و دانت نہیں۔ کیڑے نباتات کے دشمن ہیں اور چڑیاں کیڑوں کی ؛ بلی چوہے کا خون نہ از روئے ضرورت کرتی ہے بلکہ نہایت شوق سے مظلوم کی نعش سے جدا ہونے سے پہلے خوشی میں دیر تک چوہے کی نعش سے کھیلتی رہتی ہے۔ بھیڑیا بھیڑ کو وہیں نہیں کھا لیتا جہاں بھیڑ کو پکڑے بلکہ اُٹھا کر علیحدہ لیجاتا ہے کہ فرصت میں شکار کا مزہ اُٹھائے دیکھو میں یہ نفاست خونریزی ہے ؛

محبت کے پاکیزہ ہونے میں مجھے کلام نہیں مگر تعجب اس بات کا ہے کہ ایسی پاکیزہ چیز عام کیوں کر دی گئی رنگینوں اور آوارہ طبیعتوں کو بھی دی گئی جو نفس کی خباثت کی وجہ سے اس کی بدنامی کا باعث ہوئے۔ ہر افسانے و ناول میں دو ایک خون و آوارگی کی وارداتیں ضرور دیکھنے میں آئیں گی۔ پیشتر اس سے کہ ھیرو اور ھیروآئن (محبت زدہ مرد و عورت) ملیں پہلے خانہ خرابیوں سے سابقہ پڑتا ہے۔ اور یہی افسانوں اور ناولوں کی جان سمجھا جاتا ہے ؛ افسانوں اور ناولوں کا لطف ہی تب تک رہتا ہے جب تک کہ ان جھگڑوں کا ذکر ہے۔ جہاں دونوں محبت زدہ مل لئے پھر افسانہ کا لطف نہیں ؛ شادی کے بعد گو دونوں عمرِ نوح کو پہونچیں مگر پھر کوئی ذکر دلچسپ نہیں رہتا ؛ جس طرح نکاح کے ہوتے ہی جہاں شہدوں نے مبارکباد کا شور کیا براتی سمجھ لیتے ہیں کہ اب چلدینے کا وقت ہے ؛

محض اتنی سی بات کے لئے کہ بے گنتی مخلوق خدا میں دو محبت کے مارے ہوئے ہزار مصائب کے بعد آپس میں ملیں شاعروں اور افسانہ نویسوں نے ہزاروں جھوٹے سچے قصے لکھڈالے۔ یہی کام قاضی جی آدہ گھنٹہ میں کردیتے ؛

لطفِ صحبت

محبّت کا اثر زیادہ تر لطفِ صحبت میں ہے

لطفِ صحبت کے لئے آپ سب سے پہلے آسمان کی طرف نظر کریں کہ آغازِ عالم سے جو صحبت ستاروں کواکب وسیاروں میں پروردگار نے مقرر کر دی اُس میں آجتک فرق نہ آیا نہ قیامت تک آسکتا ہے ۔ گو اس میں بعض کو ہم نے سعد اور بعض کو نحس قرار دیا مگر صحبت وہی رہی ﷺ جو ستارہ جہاں جس بُرج میں آپ دیکھیں وہیں حضرت آدمؑ سے پہلے اور قیامت کے بعد اسی طرح نظر آیا اور نظر آئیگا - ان میں کبھی ناچاقی دیکھنے میں نہیں آئی نہ ایک کو دوسرے سے روٹھتے سُنا نہ ہر ستارہ . کوکبُ سیارہ جس جگہ ابتدا سے ہے اسی طرح چلا آتا ہے ؛ یہ صحبت کبھی برہم ہوتے دیکھی کیا سُنی بھی نہیں ؛ صحبت ہو تو ایسی ہو

پرندوں میں بھی اکثر ایک وضع کے پرند ساتھ رہتے ہیں جس پر مشہور ہے کہ ع

کند ہم جنس با ہم جنس پرواز ؛ درختوں میں بھی ایک قسم کے درخت ایک جگہہ اچھے معلوم ہوتے ہیں ؛

مسلمانوں میں گو ہر شخص پر فرداً فرداً نماز فرض ہوی مگر جماعت کی نماز کی تاکید زیادہ ہوئی۔ نماز عیدین و حج سے بڑی غرض اجماع ہے ٭ اہل ہند نے میلے واشنان وجاترے اس لئے تجویز کئے کہ لوگ ایک جگہہ جمع ہوں ٭ ان میں مذہبی رنگ اس لئے چڑہانا ضرور ہوا کہ اجتماع کی اس سے بہتر اور صورت ممکن نہیں ٭

مذہب اور معاشرت دونوں طرح سے انسان کے لئے اجتماع کی ضرورت ہے اسی ضرورت کی رو سے بادشاہوں نے دربار۔ امیروں نے محفلیں اور مجلسیں۔ صوفیاء کرام نے حال وقال۔ شاعروں نے مشاعرے اور مولویوں نے مولود شریف کی تقریبیں نکالیں ٭ میں ان تقریبوں کا ذکر خاص طور پر نہیں کیا چاہتا۔ مجھے شکایت اس بات کی ہے کہ معمولی دل ودماغ کی صحبتیں اب بہت کم رہ گئی ہیں۔ پالیٹکس (سیاسی) **کانگرس وخلافت** کے ذکر اذکار میں اگلی صحبتوں کا لطف نہیں رہا ٭ جہاں دو چار آدمی جمع ہوئے اندیشہ رہتا ہے کہ خدا جانے کس خیال کی صحبت ہے۔ زبان کھولتے ڈر لگتا ہے کہ کہیں بے موقع کچھ زبان سے نکل نہ جائے ٭ انگریزی کے اعلیٰ تعلیم یافتہ تو اپنی زبان یعنی اُردو میں بہت کم بات کرتے ہیں۔ ان کا تکیہ کلام یورپ وامریکا کی طرز زندگی۔ وہ بھی ادھوری یا مانگے تانگے کی ٭ ہندوستان کی لٹریچر اور تاریخ وعدۂ یار کی طرح ذہن میں بھی نہیں۔ ان کی طرف سے اپنی زبان کی پاکیزہ خیالیاں حسینوں کی کمر کا جواب ہیں ٭ شعروسخن کا چرچا دہنِ یار کی طرح کہیں نظر نہیں آتا۔ آپ کسی زبان میں بات کرتے ہیں اور جواب کسی زبان میں ملتا ہے ٭

ہندوستان کی مختلف قوموں میں رسم وراہ کا طریقہ یہی ایک زبانِ اُردو کا ہے۔ اس کو آپ نظر انداز کر رہے ہیں: اس صورت میں لطفِ صحبت کہاں؟ اور لطف صحبت نہیں تو ہمیشہ محبت کے لالے رہیں گے ٭

محشرِ خیال

اس مضمون کی سُرخی میں نے جناب **غالب** کے شعر سے لی ہے کہ ؎

ہم انجمن سمجھتے ہیں خلوت ہی کیوں نہ ہو ٭ ہے آدمی بجائے خود اک **محشرِ خیال**

غالب نے دو لفظوں میں اضافت کے سہارے سے وہ ہنگامہ آرا بات پیدا کر دی جو ہماری زبان کی بڑی خوبیوں میں ہے - میں بڑا تیر مارتا تو خیالی محشر کہہ ڈالتا : لیکن آپ ہی دیکھ لیں کہ فصاحت کا خون ہو جاتا ؎

نزع میں سُنکے مجھے ناز سے فرماتے ہیں ٭ یہی ہوگا وہ کسی اور پہ مر دیکھیں تو ؛

لُطفِ صُحبت والے مضمون میں میں صُحبت کی خوبیاں اور جو صورت صُحبت کی اس وقت ہے لکھ چکا ہوں مگر اس شعر میں **غالب** نے جو نازکخیالی دکھائی یہہ اُنہیں کا حصہ تھا - مجھے ہزار صفحوں میں بھی یہہ بات مُیسّر ہونی مُشکل ہے ؛ اس مُشکل کا ثبوت آپ میرے سارا مضمون پڑھنے کے بعد دیکھ لیجے گا کہ ؎

یار لوگوں نے بہت زور غزل میں مارا ٭ نہوا پر نہوا **میر** کا انداز نصیب

میں **غالب** کے اشعار کی شرح میں جو ضرورت سے زیادہ لکھی گئیں نہیں دیکھتا بلکہ شعر کے لئے شرح کی ضرورت نہیں سمجھتا - جو شعر آپ نہ سمجھ سکیں یا جسکے سمجھنے کے لئے شرح کے محتاج ہوں اسکے یہ معنی ہیں کہ یا تو شاعر اپنا مطلب بیان کرنے

میں قادر نہ تھا یا ہمارے ذہن کا قصور ہے اس صورت میں شعر کہنے اور شعر سمجھنے کا دردِ سر کیوں لیا جائے ٭ بہرحال اس شعر سے میری غرض اس وقت یہ ہے کہ انسان کو تنہائی نصیب نہیں کہ اگر اکیلا بھی ہے تو ہجوم محشر سے زیادہ اس کے دماغ میں دُنیا اور دُنیا کے بعد اور دنیا سے پہلے کے خیال گھیرے رہتے ہیں۔ اور یہ صحبت انسان کے لئے ناگزیر ہے ٭ انسان اپنی خالص صحبت سے بہت گھبراتا ہے۔ انسان کو خودغرض کہتے ہیں اور خودغرضی عیب میں داخل ہے۔ مگر آپ غور کر کے دیکھیں کہ اسے اپنے نفس سے ایسی نفرت ہے کہ دو منٹ بھی اسے بغیر کسی خیال کے بُرا یا بھلا ہو کاٹنے مشکل ہیں ٭ عبادت میں تسبیح وظیفہ وظایف کا سہارا لگا دیا گیا ہے۔ ؎

نظر آتا ہے تنہا گوشۂ تنہائی میں ٭ اپنی حالت کو ہمیں دیکھیں اگر دیکھیں تو

سوسائٹی کے سارے اصول اس بنا پر قایم ہیں کہ اس کا جینا مرنا بغیر سوسائٹی کے ناممکن ہے اور سوسائٹی سے غرض صرف صحبتِ دیگراں۔ غرض سے ہو یا بے غرض ٭ کھیل تماشے گنجفہ چوسر شطرنج صرف اپنی تنہائی کے خیال سے بچنے کے لئے ایجاد ہوئے ٭ میں نے دیکھا ہے کہ ریل کے سفر میں جہاں کہتے ہیں کہ جگہ ملنی آپ کو اگر نہیں تو مجھے مشکل ہو جاتی ہے میرے یارانِ طریقت تاش کھیلنے لگ جاتے ہیں کہ اکیلے رہنا ناگوار معلوم ہوتا ہے ٭

موت میں اور موت کے متعلق گور و لحد وغیرہ میں اگر ہمیں صحبت نصیب ہو تو ہم کو مرنا چنداں ناگوار نہ ہو۔ آپ لحد کے اوپر جلسہ کیا کریں تو ہمیں کیا ؎

ہمیں کیا کہ مرقد پہ میلے رہے ٭ کہ زیرِ زمیں ہم اکیلے رہے ٭

تمام دُنیا کے شور و غوغا میں غوغائے شہرِ خموشاں آج تک سننے میں نہ آیا ؎

اے رفتگانِ ملکِ عدم بولتے نہیں ٭ تھک تھک گئے لحد پہ تمہیں ہم پکار کے ٭

مجھ سے کیا میں تو زندگی کے التزام سے تمہاری نگاہ میں بیگانہ ہو گیا۔ جس صحبت میں تم پہونچے

ہو اُن سے تو باتیں کروں ؎

تیرے عاشق چپکے چپکے کر رہے ہیں مشورے ۔ کچھ دنوں کو شہر خاموشاں بسایا چاہئے

مرنے کے بعد قیامت تک کی تنہائی ہمیں مارے لیتی ہے ۔ قیامت پر جو ہمارا ایمان ہے اسی سہارے پر ہے کہ پھر ہم سب اکٹھا ہوں گے : ایسا مجمع نہ کسی نے دیکھا نہ سنا نہ وہ صحبت کسی کو نصیب ہوئی ؎

کر لوں پہلے صبح محشر کی طرح سے چاک جیب ۔ پھر کروں شب ہائے ہجراں کی شکایت آپ سے

زندگی میں تو ہم ہجوم خیال سے اپنے دل میں ایک قیامت نما محشر بپا کیا کرتے ہیں ۔ مرنے کے بعد جب خیال ہی عدم کو پہونچ جائے تو انسان کیا کرے ؎

حضورِ داورِ محشر ابھی نہ لے جاؤ ۔ فرشتو لینے دو دم آئے ہیں کہاں سے چلے

سنبھلنے دے مجھے اے ناتوانی کیا قیامت ہے ۔ کہ دامانِ خیالِ یار چھوٹا جائے ہے مجھ سے

دامانِ محشر ۔ دامانِ صحرا ۔ دامانِ کوہ ۔ دامنِ یار ان سب میں بڑا دامانِ خیال سمجھنا چاہئے ۔ دامنِ یار تو بڑا نہیں ہوتا کہ چاہنے والا پکڑ نہ لے ۔ دامن صحرا و دامنِ کوہ بھی محدود ہیں ۔ دامنِ محشر کسی نے نہیں دیکھا ۔ ہاں البتہ دامنِ خیال کی انتہا نہیں کہ رات دن صبح و شام سال و ماہ ۔ گرمی جاڑے ۔ ساری عمر اپنی اور پرائی اسی خیال میں گزار دو اور پھر ختم نہ ہو ۔ یہ تشبیہ محشر خیال کی خاصی ہے کہ اکیلے بیٹھے بیٹھے خیال دوڑایا کیجئے جس سے خلوت میں انجمن کا لطف آئے ۔ یا **صلائے عام کا مضمون پریشان** سمجھئے کہ فانوسِ خیال کا تماشہ دکھائے ؎

آنے لگے بیٹھے بیٹھے چکر ۔ فانوسِ خیال بن گیا گھر ۔

اسے بھی جانے دیجئے ۔ "خلوت در انجمن" صوفیائے کرام کی پسندیدہ ریاضتوں میں ہے ۔ اس کا عکس یہ ہے کہ انجمن در خلوت اور یہ صورت محشر خیال کی ہے ۔

غرض ۔ محشر خیال سے آپ کچھ ہی معنی کیوں نہ لگائیں میرا مطلب کہیں نہیں گیا کہ

سلہ داماں کہئے یا دامن

"محشر خیال" کی پھبتی مضمون پریشان پر غافی ہے ؎

اب کیوں کمی کرے تجھے کسکا لحاظ ہے ؛ رونے کا نام دیدۂ خونبار ہو چکا ؛

جب مضمون پریشان کا نام "محشر خیال" ٹھہر گیا تو صلائے عام کے سارے مضمون پریشان غالب کے "محشر خیال" سمجھئے: انہوں نے ایک "محشر خیال" باندھا یہاں صلائے عام کا ہر پرچہ محشر خیال کا جواب ہو جاتا ہے ؎

شامِ شبِ فرقت ہے پریشاں نظر آتی
گیسوئے شبِ ہجر میں کیا شانہ ہوا ہے

انگریزی میں اس مضمون کو جس خوبی سے ادا کیا ہے مجھسے ادا ہونا ذرا مشکل ہے اس لئے بجنسہٖ انگریزی میں نقل کر دینا مناسب معلوم ہوا۔

The life of the Soul is different: there is more changing, more varied, more restless...to describe the incidents of one hour would require an eternity.—

JOURNAL OF ENGINE DE GUTRIN.

انسان کے ایک گھڑی کے دل و دماغ کے محشر خیال کا قصہ ازل ابد تک شاید ہی بیان ہو سکے۔ اس میں زمانہ سے زیادہ نیرنگ. مزاج یار سے زیادہ تلوّن ہے۔ یہہ قاتل سے زیادہ سخت دل اور موم سے زیادہ نرم ہے۔ کوہ سے زیادہ گراں اور کاہ سے زیادہ سبک: ان سب صفتوں کے ساتھ ہی آخر کو کچھ نہیں ؎

احوالِ حشر دیکھہ کے پھر اسر نہ زاہدا ؛ غفلت میں اور آ گئے اس داستاں سے ہم

پھولوں کے گجرے ٹوٹے ہوئے

سیر کرنے رات کو نکلا جو یہ شوریدہ سر
بھینی بھینی بو سے تھی مہکی ہوئی راہِ گذر
اللہ اللہ کیا سہانی رات تھی کیسا سماں
شعر دیکھا کوئی صحنِ چمن میں جلوہ گر
نور کا پتلا کہوں یا حور پیکر اس کو میں
رس بھری نینوں سے پیلے رند ساغر مانگ کر
ابروئے زیبا تھیں محراب عبادت کا پتا
ناگنیں لہرا رہی تھیں مست ہو کر دوش پر
وہ صراحی دار گردن اس میں غضب گجرے پڑے
پھر ہوا بیدار تو دیکھا یکایک چونک کر
اسپہ کچھ ٹوٹے ہوئے آئے نظر پھولوں کے ہار

× × × × × × × × × ×

سیج یہ مہکا رہے تھو زیب گردن تھے یہی
سر کو قدموں پر جھکا کر ہاتھ دونو جوڑ کر
صبح اٹھکر جب تمہیں بستر پہ دیکھونگا نہ میں
آ بھی جائے گر تمہارا رنجِ فرقت بھول کر

بادِ فرحت چل رہی تھی ٹھنڈی ٹھنڈی جھوم کر
لوٹتی تھی چاندنی فرشِ زمیں پر جا بجا
وجد طاری تھا یہ قدرت کے مناظر دیکھکر
دلربائی کی ادا چھائی تھی سر سے پاؤں تک
کیا بشر ہے جان دیں پریاں بھی مکھڑا دیکھکر
گورے گورے منہ پہ سکتے ماہِ کامل لوٹ پوٹ
کیوں نہو پھر سجدہ واجب منکر اسلام پر
صاف سینہ پر قیامت شوخیوں کا کچھ ابھار
بار رہے تھے سینہ زوری سے محبت کا ثمر
اک پلنگڑی خوشنما وہ اسپہ بستر ریشمی
جو حمایل تھے گلے میں ایک گھنٹہ پیشتر
ایک ادا کے ساتھ یہ شکوہ ہے اس سے بار بار
دل ہراں سے شگفتہ تھا شام جان تر
میں سمجھتا ہوں کہ ہے پہلے مری آغوش ہے
دم بخود رہ جاؤں گا پھر تو کلیجہ تھام کر
دیکھکر بستر پہ گجرے پھولوں کے ٹوٹے ہوئے

سبزہ زاروں میں مہیا سارے سامانِ بہار
آسماں سے کر رہا تھا نور افشانی قمر
سیر کرتے کرتے جا پہنچا میں اک گلزار میں
اک قیامت نوجوانی حسن دلکش زور پر
تھا نشیلی انکھڑیوں میں سرخ ڈورا موجزن
نازکی پھولوں کی قرباں برگِ رخسار پر
رشکِ سنبل گیسوؤں میں وہ بلا کے پیچ و خم
دیکھے قدسی بھی اگر رہ جائے چھاتی تھام کر
کیا سماں تھا جسنے رکھا دیر تک غافل مجھے
پیر پھیلانے لگے خود نیند جسکو دیکھکر

× × × × × × × × × ×

ہاتھ کیا آیا تمہیں پھولوں کے گجرے توڑ کر
شکوہ سنکر یہ کہا اس بادہ نوشِ وصل نے
چھٹ پٹے تم تو دبے پاؤں چلے جاؤ گے گھر
یہ خطا دانستہ کی تسکینِ خاطر کے لئے
صبح کو یاد آئیں گے شب بھر کے ٹوٹے ہوئے

از طبیب ابن الادیب عشق آبادی

میں قادر نہ تھا یا ہمارے ذہن کا قصور ہے اس صورت میں شعر کہنے اور شعر سمجھنے کا دردِ سر کیوں لیا جائے ۔ بہرحال اس شعر سے میری غرض اس وقت یہ ہے کہ انسان کو تنہائی نصیب نہیں کہ اگر اکیلا بھی ہے تو ہجوم محشر سے زیادہ اس کے دماغ میں دُنیا اور دُنیا کے بعد اور دُنیا سے پہلے کے خیال گھیرے رہتے ہیں ۔ اور صحبت انسان کے لئے ناگزیر ہے ۔ انسان اپنی خالص صحبت سے بہت گھبراتا ہے ۔ انسان کو خودغرض کہتے ہیں اور خودغرضی عیب میں داخل ہے ۔ مگر آپ غور کرکے دیکھیں کہ اسے اپنے نفس سے ایسی نفرت ہے کہ دو منٹ بھی اسے بغیر کسی خیال کے برا یا بھلا ہو کاٹنے مشکل ہیں ۔ عبادت میں تسبیح وظیفہ وظائف کا سہارا لگا دیا گیا ہے ۔ ؎

نظر آتا ہے خدا گوشہ تنہائی میں ۔ اپنی حالت کو ہمیں دیکھیں اگر دیکھیں تو

سوسائٹی کے سارے اصول اس بنا پر قایم ہیں کہ اس کا جینا مرنا بغیر سوسائٹی کے ناممکن ہے اور سوسائٹی سے غرض صرف صحبتِ دیگراں ۔ غرض سے ہو یا بے غرض ۔ کھیل تماشے گنجفہ چوسر شطرنج صرف اپنی تنہائی کے خیال سے بچنے کے لئے ایجاد ہوئے ۔ میں نے دیکھا ہے کہ ریل کے سفر میں جہاں کہتے ہیں کہ جگہ ملنی آپ کو اگر نہیں تو مجھے مشکل ہو جاتی ہے میرے یارانِ طریقت تاش کھیلنے لگجاتے ہیں کہ اکیلے رہنا ناگوار معلوم ہوتا ہے ۔

موت میں اور موت کے متعلق گور و لحد وغیرہ میں اگر ہمیں صحبت نصیب ہو تو ہم کو مرنا چنداں ناگوار نہ ہو ۔ آپ لحد کے اوپر جلسہ کیا کریں تو ہمیں کیا ؎

ہمیں کیا کہ مرقد پہ میلے رہے ۔ کہ زیر زمیں ہم اکیلے رہے ۔

تمام دُنیا کے شور و غوغا میں غوغائے شہرِ خموشاں آج تک سننے میں نہ آیا ؎

اے رفتگانِ ملکِ عدم بولتے نہیں ۔ تھک تھک گئے لحد پہ تمہیں ہم پکار کے ۔

مجھے کیا میں تو زندگی کے الزام سے تمہاری نگاہ میں بیگانہ ہو گیا ۔ جس صحبت میں تم پہونچے

جو اُن سے تو باتیں کرو سے

تیرے عاشق چُپکے چپکے کر رہے ہیں مشورے ٭ کچھ دنوں کو شہرِ خاموشاں بسایا چاہیئے

مرنے کے بعد قیامت تک کی تنہائی ہمیں مارے لیتی ہے۔ قیامت پر جو ہمارا ایمان ہے اسی سہارے پر ہے کہ پھر ہم سب اکٹھا ہوں گے: ایسا مجمع نہ کسی نے دیکھا نہ سنا نہ وہ صُحبت کسی کو نصیب ہوی سے

کرلوں پہلے صبح محشر کی طرح سے چاک جیب ٭ پھر کروں شب ہائے ہجراں کی شکایت آپ سے

زندگی میں تو ہم ہجوم خیال سے اپنے دل میں ایک قیامت نہ محشر بپا کیا کرتے ہیں۔ مرنے کے بعد جب خیال ہی عدم کو پہونچ جائے تو انسان کیا کرے سے

حضورِ داورِ محشر ابھی نہ لے جاؤ ٭ فرشتو لینے دو دم آئے ہیں کہاں سے چلے

سنبھلنے دے مجھے اے ناتوانی کیا قیامت ہے ٭ کہ دامانِ خیالِ یار چھوٹا جائے ہے مجھ سے

دامانِ محشر۔ دامانِ صحرا۔ دامانِ کوہ۔ دامنِ یار۔ ان سب میں بڑا دامانِ خیال سمجھنا چاہیئے۔ دامنِ یار تو بڑا نہیں ہوتا کہ چاہنے والا پکڑ نہ لے۔ دامن صحرا و دامنِ کوہ بھی محدود ہیں۔ دامنِ محشر کسی نے نہیں دیکھا۔ ہاں البتہ دامنِ خیال کی انتہا نہیں کہ رات دن صبح و شام سال و ماہ۔ گرمی جاڑے۔ ساری عمر اپنی اور پرائی اسی خیال میں گزار دو اور پھر ختم نہ ہو۔ یہ تشبیہ محشر خیال کی خاصی ہے کہ اکیلے بیٹھے بیٹھے خیال دوڑایا کیجئے جس سے خلوت میں انجمن کا لُطف آئے۔ یا **صلائے عام کا مضمون پریشان** سمجھئے کہ فانوسِ خیال کا تماشہ دکھادے سے

آنے لگے بیٹھے بیٹھے چکر ٭ فانوسِ خیال بن گیا گھر ٭

اسے بھی جانے دیجئے "خلوت در انجمن" صوفیائے کرام کی پسندیدہ ریاضتوں میں ہے۔ اس کا عکس یہہ ہے کہ انجمن در خلوت اور یہہ صورت محشر خیال کی ہے ٭

غرض محشرِ خیال سے آپ کچھ ہی معنی کیوں نہ لگائیں میرا مطلب کہیں نہیں گیا

سے داماں کہیے یا دامن

"محشرِ خیال" کی پھبتی مضمون پریشان پر فاضی ہے ؎

اب کیوں کمی کرے تجھے کسکا لحاظ ہے ٭ رونے کا نام دیدۂ خونبار ہو چکا ؛

جب مضمون پریشان کا نام "محشرِ خیال" ٹھہر گیا تو صلائے عام کے سارے مضمون پریشان غالب کے "محشرِ خیال" سمجھئے : انہوں نے ایک "محشرِ خیال" باندھا یہاں صلائے عام کا ہر پرچہ محشرِ خیال کا جواب ہو جاتا ہے ؎

شامِ شبِ فرقت ہے پریشاں نظر آتی

گیسوئے شبِ ہجر میں کیا شانہ ہوا ہے

انگریزی میں اس مضمون کو جس خوبی سے ادا کیا ہے مجھسے ادا ہونا ذرا مشکل ہے اس لئے بجنسہٖ انگریزی میں نقل کر دینا مناسب معلوم ہوا۔

The life of the Soul is different: there is more changing, more varied, more restless...to describe the incidents of one hour would require an eternity.—

JOURNAL OF ENGINE DE GUTRIN.

انسان کے ایک گھڑی کے دل و دماغ کے محشرِ خیال کا قصہ ازل ابد تک شاید ہی بیان ہو سکے ۔ اس میں زمانہ سے زیادہ نیرنگ ۔ مزاجِ یار سے زیادہ تلوّن ہے ۔ یہہ قاتل سے زیادہ سخت دل اور موم سے زیادہ نرم ہے ۔ کوہ سے زیادہ گراں اور کاہ سے زیادہ سبک : ان سب صفتوں کے ساتھ بھی آخر کو کچھ نہیں ؎

احوالِ حشر سکھہ کے پھرا سر نہ زاہدا ٭ غفلت میں اور آ گئے اس داستاں سے ہم

پھولوں کے گجرے ٹوٹے ہوئے

سیر کرنے رات کو نکلا جو یہ شوریدہ سر
بھینی بھینی بو سے تھی مہکی ہوئی راہ گذر
اللہ اللہ کیا سہانی رات تھی کیسا سماں
شمع رو دیکھا کوئی صحن چمن میں جلوہ گر
نور کا پتلا ہوں یا حور پیکر اس کو میں
مدھ بھری نینوں سے لیلے رند ساغر مانگ کر
ابروئیں دیتی تھیں محراب عبادت کا پتا
ناگنیں لہرا رہی تھیں مست ہو کر دوش پر
وہ صراحی دار گردن میں غضب گجرے پڑے
پھر ہوا بیدار تو دیکھا یکایک چونک کر
اسپہ کچھ ٹوٹے ہوئے آئے نظر پھولوں کے ہار

× × × × × × × × ×

سیج پہ مہکا رہے تم زیب گردن تھے یہی
سر کو قدموں پر جھکا کر ہاتھ دونو جوڑ کر
صبح اٹھکر جب تمہیں بستر پہ دیکھونگا نہ میں
آ بھی جائے گر تمہارا رنج فرقت بھولکر

باد فرحت چل رہی تھی ٹھنڈی ٹھنڈی جھوم کر
لوٹتی تھی چاندنی فرش زمیں پر جا بجا
وجد طاری مجھپہ قدرت کے مناظر دیکھکر
دلربائی کی ادا چھائی تھی سر سے پاؤں تک
کیا بشر ہے جان دیں پریاں بھی مکھڑا دیکھکر
گورے گورے منہ پہ اسکے ماہ کامل لوٹ پوٹ
کیوں نہو پھر سجدہ واجب منکر اسلام پر
صاف سینہ پر قیامت شوخیوں کا کچھ ابھار
پا رہے تھے سینہ زوری سے محبت کا ثمر
اک پلنگڑی خوشنما وہ اسپہ بستر ریشمی
جو حمایل تھے گلے میں ایک گھنٹہ پیشتر
ایک ادا کے ساتھ یہ شکوہ ہے اس سے بار بار
دل ہراں سے شگفتہ تھا مشام جان تر
میں سمجھتا ہوں کہ ہے پوچھے مری آغوش سے
دم بخود رہ جاؤں گا پھر تو کلیجہ تھام کر
دیکھکر بستر پہ گجرے پھولوں کے ٹوٹے ہوئے

سبزہ زاروں میں مہیا ساری سامان بہار
آسماں سے کر رہا تھا نور افشانی قمر
سیر کرتے کرتے جا پہنچا میں اک گلزار میں
اک قیامت نوجوانی حسن دلکش زور پر
تھا نشیلی انکھڑیوں میں سرخ ڈوروں موجزن
نازکی پھولوں کی قربان برگ رخسار پر
رشک سنبل گیسوؤں میں وہ بلا کے پیچ و خم
دیکھے قدسی بھی اگر رہ جائے چھاتی تھام کر
کیا سماں تھا جسنے رکھا دیر تک غافل مجھے
پیر پھیلانے لگے خود نیند جسکو دیکھکر

× × × × × × × × ×

ہاتھ کیا آیا تمہیں پھولوں کے گجرے توڑ کر
شکوہ سنکر یہ کہا اس بادہ نوش وصل نے
چھٹ پٹے تم تو وہ بے پاؤں چلے جاؤ گے گھر
یہ خطا ان کی تسکین خاطر کے لئے
صبح کو یاد آئیں گے شب بھر سے ٹوٹے ہوئے

از طبیب ابن الادیب عشق آبادی

آداب الشعرا

حضرت مولوی طباطبائی صاحب [illegible] آداب [illegible]
[illegible] آداب الشاعر [illegible]
[illegible]

شعر [illegible] پیدا کرے [illegible] آواز [illegible] عکس [illegible]
[illegible] دونوں کی ایک ہی [illegible] چاہیے [illegible]
ہو جائے [illegible] شعر کے معنی میں [illegible]
[illegible] مطلب کے تعین میں اختلاف [illegible] سمجھ [illegible] ادا نہ کر سکے [illegible]
کھلا ہوا شگوفہ اور کھلا ہوا [illegible] ہے جس کی خوشبو خود بخود دماغ تک پہنچ جاتی ہے [illegible]
ہوئے تو [illegible] ہوئی کلیاں ہیں جو دلکش صدا کے ساتھ [illegible]

ہر [illegible] شعر چلتا ہوا جادو [illegible] بولتی ہوئی تصویر ہے۔ اور یہ بات جب تک [illegible]
یکسانیت لفظ پیدا نہ ہو حاصل نہیں ہوتی۔ اس سے ظاہر ہے کہ قافیہ و ردیف جوڑ
بتا ہے جب تک غزل کو اسی راہ پر نہ جائے منزل مقصود تک نہیں پہنچ سکتا۔

شعر کا مقتضائے وقت سے مطابق ہونا ایسا ہی اثر رکھتا ہے جیسے شام کو شفق کا پھولنا ہلال کا نظر آجانا تاروں کا کھلنا صبح ہوتے نسیم صحر کا چلنا سہیل کا جھلملانا زہرہ کا طلوع کرنا کچھ کم دن رہے فواروں کا چھوٹنا پچھلے رات رہے تاروں کا ٹوٹنا پچھلی رات کی نیند۔ مینہ میں کوئل کا کوکنا آبشار کا نورتی دینا دوپہر کو ابر کا آجانا موروں کا شوروں کو بے چین کر دیتا ہے۔ × × × × × × × × × × × ×

بادل میں کبھی روشنی سی ہو کر رہ جاتی ہے جسے کوندا کہتے ہیں کبھی خون کی طرح رگ ابر میں بجلی دوڑتی ہوئی دکھائی دیتی ہے کبھی کچھ لہریا اس کی باہر بھی نکل آتی ہیں کبھی اس بھیگی کملی کو پھینک عریاں ہو کر آغوش زمین میں آجاتی ہے۔ یہ سب صورتیں معانی کی جلوہ گری میں بھی موجود ہیں کبھی گھونگٹ میں ایک جھلک نظر آگئی کبھی محمل کا پردہ اڑا کر ہوا نے بے پردہ کر دیا کبھی خود منہ نکال کر جھانک لیا کبھی ایک برہنہ تصویر سی سامنے آگئی۔ معانی کے وضوح کی یہ چاروں شکلیں دلفریب و دل آویز و دلکش و دلنشیں ہیں اگر آپ یہ کہنا چاہتے ہوں کہ جس قدر واضح اور سیدھا سادہ کلام ہوگا اسی قدر اچھا ہوگا تو ذرا سمجھ کر کہیئے۔ × × × × × × × × × × × × × × ×

شاعر کی طبیعت میں ایک ایسی کیفیت بھی پیدا کرتے ہیں جس سے نغمہ سنجی یا نوحہ گری کرنے کو اس کا جی چاہتا ہے اور یہی کیفیت شعر کہلواتی ہے اور شاعر کو تخییل کا طلسم تو طلسم دکھاتی ہے یا یہ سمجھئے کہ پرستان میں لے جاتی ہے جہاں بلبل نغمہ سنج ہے تو نسیم رقص کرتی ہے۔ قمری نوحہ گر ہے تو صرصر خاک اڑاتی ہے خاک کے ذرے کروڑوں آنکھوں کی پتلیاں ہوا کے جھونکے روحوں کے دم سرد ہیں۔ بگولوں میں دیو سیاہ آندھی میں پریوں کے تخت اوڑ رہے ہیں۔ عنادل نواگری کرتے ہیں گل گوش بر آواز ہیں۔ ہدہد نامہ بری کرتا ہے باد صبا غماز ہے۔ اس باغ میں سیر بھوٹی لالہ کی ایک پنکھڑی ہو

لالہ ایک لالڑی کا پیالہ ہے۔ ٹٹیری پانی مانگتی ہے۔ بھنبیری ساون کی خبر دیتی ہے۔ بارہا زمرد کا جام سامنے آتا ہے۔ کچھ دور میں طاؤس طناز بن جاتا ہے۔ یہاں تشبیہ ایک دوربین ہے دور کی شے کو قریب لاکر دکھاتی ہے کنایہ شعبدہ گر ہے پردہ کی آڑ میں چٹکی لے لیتا ہے۔ استعارہ پردہ دری کرتا ہے اشارہ عشوہ گری۔

برجستہ شعر فیضان الٰہی ہے اور فکر کیا ہوا شعر صنعت بشری۔ صاف صاف کہے یا نازک خیالی و بلند پروازی کرے جسکی جس رنگ میں مشق بڑھی ہوئی ہے اس سے اسی رنگ میں برجستہ اشعار نکل آتے ہیں زیادہ تدقیق کرنے سے شعر بگڑ جاتا ہے مناسبات کامل ہو جاتے ہیں بندش میں گنجلک آتی جاتی ہے برجستگی جوش طبع سے پیدا ہوتی ہے اور گنجلک فکر و آورد سے یعنی جس شعر میں گنجلک ہو وہ برجستہ نہیں ہو سکتا مضمون کیسا ہی لطیف و نازک ہو اگر لوگوں کا روندا ہوا ہے تو سارے کلام کو سست کر دے گا ناشناسوں کے مجمع میں اس پر شور تحسین بلند بھی ہو تو کیا جو وسعت نظر رکھتا ہے وہ خوب ایسے مضمون کو پہچانتا ہے سنکر ضرور افسردہ ہو جائیگا۔ اس ابتذال سے بچنے کے لیے ضرور ہے کہ جب تک متقدمین کے کلام پر عبور نہ ہو شعر نہ کہے اس کے بغیر اسے مضامین مبتذل کی پہچان نہ ہوگی۔ اس کے قریب قریب سرقہ کا حال ہے۔ کسی خاص شخص کے مضمون کو لے لینے کا نام سرقہ ہے اور ابتذال اس مضمون کے باندھنے کو کہتے ہیں جو عام ہو گیا ہو سب اسے باندھا کرتے ہوں۔ نظر وسیع ہو تو ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ بات سے بات نکل آتی ہے نظیری نے اتنا ہی کہا تھا۔ ع بزیر شاخِ گل افعی گزیدہ بلبل را۔ مگر غالب نے اس افعی کو بتا دیا۔ ع سایۂ شاخ گل افعی نظر آتا ہے مجھے۔ پھر توارد کی ٹکر سے بھی بچنا ضرور ہے۔ مرزا داغ نے غزل کہی گماں کیسے کیسے جواں کیسے کیسے ایک شعر خواجہ آتش سے لڑ گیا۔ رتوبہ سے کسی نے پوچھا کہ شاعر جید کیسا ہوتا ہے۔ اس نے کہا کہ شاعر راو یعنی قدماء معاصرین کے جوڑ کے

شعراس کی زبان پر ہوں۔ اسی طرح نقد شعر کا فن بھی پہلے حاصل کرے پھر شعر کے [illegible] جس شعر کو [illegible] دے وہی شعر شعر ہے۔ خلف الاحمر سے کسی نے کہا میں تو اپنے پسند کو پسند سمجھتا ہوں تم اس شعر کو پسند کرو نہ سہی۔ اس نے جواب دیا کہ کوئی روپیہ تمہیں پسند آجائے اور صراف [illegible] ہے تو اس پسند سے نقصان کے سوا کیا حاصل ہوگا۔ [illegible] اپنے مذاق کو [illegible] پر [illegible] آسان امر نہیں ہے کمال [illegible] خیال [illegible] ضرورت ہے۔ [illegible] گرمیاں [illegible] خوبیاں بے لطف [illegible] [illegible] اچھا ہے پر جوش بھی ہے لیکن غلطیاں [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] وہی بات ہے [illegible] [illegible] اس میں بھی جوئیں کو [illegible] [illegible] مردار۔ × × × × × × × × × ×

صلائے عام۔ مشہور ہے کہ جنکو نظم میں کمال ہوتا ہے [illegible] میں نہیں پڑتی۔ [illegible] میں دیکھتا ہوں کہ جناب طبا طبائی کی [illegible] آپ [illegible] شعر [illegible] حضرت کے کمالات علمی میں پائی جاتی ہے مجھے نظم میں دخل نہیں۔ [illegible] [illegible] بھی کچھ لکھتا۔ نثر کچھ لکھ پڑھ لیتا ہوں اس لیے نثر کا انتخاب یہاں درج کیا [illegible] اسوقت ہماری زبان میں نثر کی زیادہ ضرورت ہے ؛ اردو کی شاعری جس مرتبہ کو [illegible] گئی ہے نثر میں باستثنائے چند اہل قلم یہ بات ابھی تک نہیں ؛ میری [illegible] ہے کہ صلائے عام کی طرح اہل کمال اس طرف زیادہ متوجہ ہوں

قیس کو چھاننی منظور ہے صحرا کی جو خاک ؛ کیوں نہیں کانٹوں میں کرتا مرد داناں کی تلاش

تقدیر یا تدبیر

قدرت سے لوگوں کو تقدیر اور تدبیر پر مباحثہ کرتے پایا مگر اس بحث کو کبھی ختم ہوتے نہیں دیکھا۔ لیکن [illegible] سوال کر اٹھتے ہیں کہ تقدیر مقدم ہے یا تدبیر اور بعض کہتے ہیں کہ تقدیر [illegible] تدبیر نہیں چلتی اور بعض تدبیر کے قائل ہو گئے ہیں کہ ع

[illegible] سوال [illegible] عقلوں سے تدبیر ہی تو یہ ہے

بعض تو صاف صاف کہا کرتے ہیں کہ ابھی جو تقدیر میں لکھا ہے وہی ہو کر رہیگا لاکھ تدبیر کرو کچھ نہ ہوگا۔ اسی [illegible] سوال وجواب لوگوں میں عام ہوتے دیکھے مگر کسیکو مطمئن ہوتے نہ دیکھا جو شخص تدبیر کا قائل ہے وہ تقدیر کو نہیں مانتا اور جو تقدیر کا معتقد ہے وہ تدبیر کو دل میں بٹھاتا ہے اور یہاں تک تو نوبت پہونچی ہے کہ جو تقدیر کے قائل ہو گئے ہیں وہ کوئی تدبیر کرتے ہیں نہ ہاتھ پانوں ہلاتے ہیں جسکے معنے یہ نکلتے ہیں کہ ایک تو چلتے پھرتے ہیں اور دوسرے بیٹھے بیٹھے منہ تکتے ہیں۔

یہ تو ہم کہنے کیواسطے طیار نہیں ہیں کہ ہر کام میں تقدیر اور تدبیر دونوں اپنا عمل نہیں کرتیں مگر یہ ہمیشہ ساتھ ساتھ بھی نہیں چلتیں۔ یہ دونوں لفظیں اپنے اپنے معنے جداگانہ رکھتی ہیں اور یہ امر تو بالیقین ہے کہ تقدیر کے بغیر تدبیر ہرگز کام نہیں دیتی لیکن یہ ممکنات میں ہے کہ بلا تدبیر کے تقدیر ہی کام دیتی ہے مجھے اسی موقع پر صائب کا ایک شعر یاد آیا جس سے یہ روشن ہو جاویگا کہ تدبیر کا کوئی پہلو اسمیں کام نہیں دیتا وہ فرماتے ہیں ع

ما و مجنوں ہم سبق بودیم در دیوان عشق ٭ او بصحرا رفت و ما در کوچہا رسوا شدیم

اس بلاغتِ کلام کو دیکھنا چاہیے کہ عاشقوں کا دیوانہ پن اور انکی دل کی لگی حسن کو کس خوبی کے ساتھ عشق کے حوالہ کیا ہے جہاں تدبیر کا کوئی بس ہی نہیں چل سکتا جب عشق کی روشنی چمکتی ہے تو عقل کا چراغ بالکل گُل ہوجاتا ہے اس کی روشنی کے آگے کڑوا تیل میٹھا تیل مٹی کا تیل تو کیا جل کر روشنی دے سکتے ہیں بجلی کا کوندنا بھی بند ہوجاتا ہے اور عقل کی آنکھوں میں وہ چکا چوند لگتا ہے کہ تلملائی پھرتی ہے مگر تقدیر کی تو ہر طرح سے چڑھ بنتی ہے ایکبار حافظ شیراز رحمۃ علیہ نے بھی اپنے سر سے سودا دور کرنا چاہا تھا تو از غیب یہ جواب سنا تھا ؎ گفت کو زنجیر تا تدبیر این مجنوں کنم - میں نے اول مصرعہ اس مطلع کا اسو جہ سے چھپا رکھا تھا کہ ناظرین پہلے اس کو سمجھ لیں کہ ایک مجنوں کے پیچھے تدبیر کی زنجیر ڈھونڈھی جاتی تھی اس کے بعد معاملہ جو اس میں تھا جسکی وجہ سے حافظ ممدوح کے جکڑ بند کرنے کو زنجیر ڈھونڈھی جاتی تھی وہ یہ تھا کہ اُنھوں نے جہاں اپنی عقل کھوئی تھی وہاں سے بھی خطا کار تھے کہ سودائے رُخ بھی بھولا چاہتے تھے پس اس گنہگاری کی سزا میں قید و بند کی تدبیر لی جاتی تھی اور ایک مضبوط سی بڑی کڑی دار زنجیر ڈھونڈھی جاتی تھی مگر تقدیر تو ہر وقت ساتھ ہی ساتھ تھی اور زنجیر بھی اُسی کے وزن کی تلاش کیجاتی تھی قصور صرف اتنا ھی تو تھا کہ زبان سے یہ نکل گیا تھا کہ ع دوش سودائے رخش گفتم ز سر بیروں کنم - اس میں بھی حافظ صاحب نے پردہ رکھا معشوق کا نام نہیں لیتے مگر ضمیر ول خالی شین سے ظاہر کرتے ہیں اور سیدھا رُخ نہیں کرتے نہ یہ بتلاتے ہیں کہ آخر ش اُس شین میں چھپا کون ہے اب ہم اسکو ناظرین کی طبیعت پر چھوڑتے ہیں وہ خود اپنی اپنی سمجھ کے موافق سمجھ لین گے ہم اُنھیں کہانتک سمجھائیں گے - اور ہمارے سمجھانے سے وہ کاہیکو سمجھیں گے - خود حافظ صاحب سمجھنے کے لیے موزونیِ طبیعت کے متلاشی ہیں اور فرماتے ہیں ؎

نکتہ ناسنجیدہ گفتم دلبرا معذور دار ٭ عشوۂ فرمائے تا من طبع را موزوں کنم

شاعروں نے تقدیر کا قافیہ تدبیر سے ملا پایا ہے تب طبیعت کو موزوں کر پایا ہے ورنہ

تقدیر

تقدیر تو محض اندازہ ہے جسکو خالق مطلق کی میزان نے تول تول کر ہر چیز میں ڈال دیا ہے اور پھر بھی ایک محل پر فرمایا ہے مَا قَدَرُوا اللّٰہَ حَقَّ قَدْرِہٖ اور تدبیر تو محض سچ بچار ہے اور یہ عجب تماشا ہے کہ تقدیر اپنے آپ کو ایسے پردہ میں رکھتی ہے کہ جب ساری تدبیریں ختم ہو لیتی ہیں تب منہ دکھلاتی ہے - ایک جگہ حافظ صاحب اپنی قیل و قال میں اس کے معترف ہو چکے ہیں چنانچہ - خدا جانے کس سے مگر یہ ضرور ہے کہ کسی نہ کسی سائل سے سوال و جواب میں فرماتے ہیں ؎

گفتم کہ تو اے عمر چرا زود برفتی ؛ گفتا کہ فلانے چہ کنم عمر ہمیں بود ۔

اس شعر میں عمر کا لفظ معنی در معنی پیدا کرتا ہے - مخاطب بھی بنتا ہے اور علت تقدیر بھی بنتا ہے - یہ مباحثہ تدبیر و تقدیر کا ہم سے بھی ختم ہوتا نظر نہیں آتا مگر اسقدر کہے بغیر رہا بھی نہیں جاتا کہ اگر ان دونوں کا وزن ملا یا جاوے تو بھی اور اسکے درمیان کا حرف علت دور کیا جاوے تو بھی تقدیر زبردست ثابت ہوگی ہاں اسمیں نکتہ یہ ہے کہ تقدیر کے نقطے جوڑی جوڑی ہیں اور تدبیر کا ایک جوڑا ٹوٹا ہوا ہے بس اسی لطیفہ پر یہ مضمون ختم ہے فقط

(مرزا عرفان علی بیگ آئی - ایس اوازآگرہ)

کلام یاس

کھل گئے عیب و ہنر سب کاتبِ تقدیر کے ؛ رنگ ہیں آمادۂ پرواز ہر تصویر کے ؛ ذرّے ہی پارس تھے اپنی خاک بے تاثیر کے
آشنا تھا کون پہلے نام سے اکسیر کے ؛ ڈوب کر لائے تہِ دریائے فطرت کی خبر ؛ فکر سے جوہر کھلے آئینہ تدبیر کے
وہم باطل ہے سراسر صورت آبادِ جہاں ؛ راز کھل سکتے نہیں اس خواب بے تعبیر کے ؛ کوئی تصویر خزاں ہے کوئی تصویر بہار
دیدنی ہیں کارنامے خامہ تقدیر کے ؛ کارخانہ تھا ہوا پہ حسنِ خشتِ خاک کا ؛ کھل گئے آخر فریب اس بولتی تصویر کے
نوح کا طوفان جنکے حق میں ہو بادِ مراد ؛ وہ کبھی قائل نہوں گے گردشِ تقدیر کے ؛ شوق منزل میں زمیں پر پاؤں تک پڑتے نہیں
حوصلے پھر کیا بڑھینگے خار دامنگیر کے ؛ کوئی ؛ عشق کا پھر کوئی بندہ عقل کا ؛ پاؤں اپنے ہی نہ تھے قابل کسی زنجیر کے
خاک میں مل جائے گی سب عزت مردانگی ؛ ظلم کے ہاتھوں اگر جوہر کھلے شمشیر کے ؛ یاسؔ سر سے پاؤں تک امید ہی امید تھے
فرد جب تک ہاتھ میں تھی کاتبِ تقدیر کے

(ابو المعانی مرزا یاس از لکھنؤ)

صلائے عام کی ڈاک

جناب عالی تسلیم۔ اردو کے رسالوں میں بہت کم ایسے ہیں جو دو نقص سے خالی نظر آتے ہیں۔ (۱) بھرتی کے مضامین۔ (۲) وقت پر اشاعت کا نہ ہونا۔ الحمدللہ کہ ان دونوں نقائص سے صلائے عام پاک ہے۔ جو مضامین خاص آپ کے تحریر کئے ہوتے ہیں ان کی تو کیفیت ہی خاص ہوتی ہے علاوہ ان کے مضامین بھی منتخب اور سب دلی شوق سے پڑھنے کے قابل ہوتے ہیں۔ غرض یہ کہ رسالہ شروع سے لیکر آخر تک دلچسپی اور غور سے پڑھنے و پسند کرنے کا مستحق ہے۔ چونکہ اس رسالے کے مضامین زیادہ تر عمیق اور بلیغ اور بلند پایہ کے ہوتے ہیں کم استعداد لوگوں کی سمجھ سے باہر ہیں لیکن جنکو علمی مذاق ہے اور جو زبان اردو کو درجۂ کمال پر پہنچانے کے متمنی ہیں ان کے لیے یہ رسالہ ایک بے بدل نعمت ہے۔ اس کے مضامین جواہرات میں تولنے کے قابل ہیں۔ چھ روپے اس کی رونمائی کچھ بھی نہیں ع نرخ بالا کن کہ ارزانی ہنوز ہیں۔ چونکہ دہلی میں رہتا ہوں اور مجھے جناب کی خدمت میں خصوصیت کا درجہ حاصل ہے میں جانتا ہوں کہ یہ رسالہ طلب منفعت کے لئے نہیں نکالا گیا بلکہ لوگوں کو فیض پہنچانے کے لیے۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ مالی حیثیت سے یہ رسالہ ابھی اپنے پاؤں پر آپ کھڑا نہیں ہو سکا لیکن آپ کا ولولہ اور شوق خود ایسی قوی تحریک ہے کہ وہ اس رسالے کے زندہ رکھنے کو کافی ہے۔

میں اپنا چندہ گزرانتا ہوں۔ ع گر قبول افتد زہے عز و شرف۔ والسلام

(خاکسار بشیر)

صلائے عام۔ یہ تحریر شمس العلما جناب مولوی نذیر احمد صاحب مرحوم کے صاحبزادے کی ہے۔ مولوی صاحب مرحوم سے ایک زمانہ واقف ہے۔ انکے صاحبزادہ مولوی بشیر احمد صاحب

حیدر آباد دکن میں تعلقہ دار تھے ۔ وہاں سے پنشن لے کر اپنے وطن دہلی آگئے ہیں اور اپنے والد ماجد کی طرح مشاغل علمی میں مصروف رہتے ہیں ٭ تصنیف و تالیف میں آپکا مرتبہ بہت بڑھا ہوا ہے ۔ صلائے عام کے لیے مضامین خاص طور پر عنایت فرماتے ہیں اور جیسا کہ ان کا مضمون نگار صلائے عام قیمت سے بری نہیں ۔ تحریر بالا کے ساتھ صلائے عام کا چندہ بھی بھیجدیا ٭

اس تحریر میں قابل ذکر یہ بات ہے کہ صلائے عام اہل علم اور اہل کمال کے لیے زیادہ پسندیدہ سمجھا گیا ہے ۔ یہ پسندیدگی تو خاص ہوئی مگر عموماً ہر طرح کی لیاقت کے لوگ (لیاقت تھوڑی ہو یا بہت) صلائے عام کے شائق نظر آتے ہیں ۔ جسکو ذرا بھی اپنی زبان سے مَس ہے صلائے عام کا مشتاق ہو رہا ہے ٭

میری غرض صلائے عام سے یہ ہے کہ لوگوں کو اپنی زبان کی نازکخیالیوں اور پاکیزہ بیانیوں کی قدر ہو ۔ ہماری زبان میں جو اثر اور کمال ہے اس سے غافل نہ رہیں ٭ اپنی زبان کا مرتبہ پہچانیں اور کسی زبان سے اسے گرا ہوا نہ سمجھیں ؎

بیمار محبت ہوں مجھے دیکھنے آنا ٭ پرہیز نہ کرنا مجھے بیمار سمجھکر

ذیل کی تحریر مرزا محمد علی خاں صاحب رئیس دہلی (سابق ممبر کونسل ریاست ٹونک) کی معہ قیمت صلائے عام میرے پاس آئی یہاں میں یہ کہے بغیر رہ نہیں سکتا کہ ایسے قدر شناسان صلائے عام کے لیے ناز کا باعث ہیں ۔

صاحب تحریر صلائے عام کے ذی مرتبہ مضمون نگاروں میں ہیں ٭ یہ تحریر اس کے ثبوت میں شایع کیجاتی ہے کہ صلائے عام کے مضمون نگار بھی قیمت سے بری نہیں ٭

لاؤ آج ہم بھی مضمون پریشاں کا نمونہ لکھ ڈالیں اور خون لگا کر شہیدوں میں شامل ہوں ۔

صلائے عام کا نام اگر جہاں نما ہوتا تو زیادہ موزوں تھا اس رسالہ کے ذریعہ سے بڑی بڑی باتیں معلوم ہوتی ہیں جو واقف علوم و فنون ہیں اُنکو یہ نفع ہے کہ اس کے ذریعہ اُنکی معلومات کی شہرت ہوتی ہے اور ہم جیسے بے لکھے پڑھوں کو یہ فائدہ ہے کہ گھر بیٹھے لکھے پڑھوں کی معلومات سے فائدہ اُٹھانے کے علاوہ بڑے بڑے لوگوں سے تعارف معنوی حاصل کرتے ہیں صرف صورت آشنا ہونے کی کسر رہتی ہے۔

اِس رسالہ کی قیمت کیا بے بہا شے ہے ؎

ہر دو عالم قیمت خود گفتئی ✤ نرخ بالا کن کہ ارزانی ہنوز

صلائے عام کا نذرانہ پیش کرتے میں جھجک رہا تھا مگر اب نذرانے گذر نے لگے تو میں بھی آگے بڑھا۔

رسالہ ترقی۔ حیدرآباد (دکن)

یہ رسالہ اُن رسالوں میں ہے جن سے معلومات علمی کو فائدہ متصور ہو سکتا ہے۔ اس میں مضمون نگار اچھی لیاقت کے ہیں ✤ پہلے سال کے تین پرچے میری نظر سے گزرے۔ اگر ایسے ہی مضامین شایع ہوتے رہے تو اس رسالہ کے مفید و بکار آمد ہونے میں کلام نہیں ✤ جلد اول نمبرہ میں "حیاتِ شبلی" والا مضمون واقعی بالکل اچھوتا تھا۔ یہ مضمون اب تک کسی نے نہیں چھیڑا۔ ایسے مضامین اردو زبان میں معلومات کی جان ہیں: گو انگریزی میں اس فن کی متعدد کتابیں ہیں مگر اردو میں ایسی تحقیق میری نظر سے نہیں گزری ✤

رسالوں کی کم عمری سے میں ایسا ڈرا ہوا ہوں کہ ذرا زیادہ عرصہ کے جب اور پرچے نظر سے گزریں تو پھر جی کھول کر ریویو لکھا جائے ؎

ہر کہ آمد غم کم عمری گل کرد بباغ ✤ ہیچ کس رحم بمرغانِ گرفتار نکرد

تنقید

صلائے عام ماہِ مئی ۱۹۲۳ء

صلائے عام ماہ مئی کا ۳۱ ۔ مئی کو صادر ہوا ۔ اچھے پاکیزہ خط میں چھاپا گیا ہے ۔

مضمون پریشان میں آپ اختتام پر فرماتے ہیں کہ "موت کو منزل پر پہونچنا کہتے ہیں مگر یہ منزل پر پہونچنا قافلہ ٹٹ جانے کے بعد سمجھیئے" مجھے اس میں ذرا تکلف ہے اور تکلف اسوجہ سے کہ روحی مسافرت کے لحاظ سے جیسے کہ سُبکدوش آئے تھے ویسے ہی سُبکدوش چلے گئے نہ تو یہ خبر ہے کہ کہاں سے آے اور نہ منزل پر پہونچکر کسی نے خط بھیجا کہ کہاں جا پہونچے اور جسدی تعلقات کے لحاظ سے گور کو مسرت ضرور ہوتی ہوگی کہ اسکی گم شدہ چیزیں ملگئیں واللہ اعلم ۔ مگر اتنا تو کہہ لوں کہ جان کہو کر گور نصیب ہوتی ہے ؛

صلائے عام کی ذیل میں آپنے لکھا ہے کہ اپنی زبان کی خوبی یہ ہے کہ لب و لہجہ میں بیگانگی پاسنے پھٹکنے پاے ۔ خوبی زبان کے لحاظ سے تو میں بھی یہ پڑھ کر چہاندہ ہوگیا کہ ؎

واعظ نے میکدہ کو جو دیکھا تو جل گیا ؛ پہلا گیا چراند شراب طہور کی

لیکن واعظ بالیقین بھبکے اوڑانا نہ جانتا ہوگا اور نہ یہ سمجھتا ہوگا کہ شراب میں چراند کیسی البتہ کوئی کڑوے تیل کا چراغ دھوکے میں اوندھ گیا ہوگا تو مضایقہ نہیں ؛

آغاز و انجام دھر کا مضمون خود اپنی نظیر ہے آپ نے کیا اچھی گرفت کی ہے کہ فارسی والوں نے خوبیوں کا مدار خالق کائنات کی ذات پر رکھا اور آفات کا ذمہ دار زمانہ کو قرار دیدیا ۔

لیکن یہ میں عرض کروں گا کہ یہ ادب کے لحاظ سے ہے ورنہ وہ جانتے ہیں کہ زمانہ کی رفتار

اسی پروردگار کے ہاتھ ہے حافظ شیراز کا قول ہے ؎

گناہ اگرچہ نبود اختیار ما حافظ ٭ تو در طریق ادب کوش وگو گناہ من است

یہ بات بالکل سچ ہے کہ غم کی انتہا نہیں ہے چلا ہی آتا ہے اور راحت کا کچھ ٹھکانا نہیں ہے اِدھر آئی اُدھر گئی اور یہ اچھی سمجھ ہے کہ ع ہے ابتدائے رنج صحیح انتہا غلط ٭ میری عاقبت گو آپنے ناقبت اندیشی پہ حوالہ کر دیا ہے اور تقدیر کے اور بھور کا الزام بھی میرے سر دھرا ہے اور میں اس کو مانتا ہوں کہ دونوں مضمون مختصر ہیں مگر میں کیا کروں عمر خیام کی رباعیات اس سے زیادہ صراحت کی مجھے خواستگار نہ تھیں لیکن تقدیر تو مجھے حد سے آگے قدم بڑھانے ہی نہ دیتی تھی اور اگر میں اُس کے ساتھ اُلجھتا تو وہ اندازہ سے باہر نکل جاتی لیکن اب مجھ یہ کہنے کی جرأت پیدا ہو گئی کہ حضرت ابو المعانی مرزا یاس کے کلام سے میری آس بندھ گئی اُنھوں نے تقدیر کا قافیہ تنگ کر دیا اور ہر پہلو سے اُسے آڑے ہاتھوں لیا اور اُن کے اس بلاغت کے کلام کا معترف ہوں کہ ع اچھا نہیں نوشتۂ تقدیر دیکھنا اور پھر میرے حسب حال فرماتے ہیں ؎

باد مراد چل چکی لنگر اُٹھا دو یاس ٭ پھر آگے بڑھ کر خوبی تقدیر دیکھنا

اس یاس کے ساتھ آس کیسی بندھی ہے اجتماع ضدین ثابت ہے ٭

اختصار کی شکایت رفع کرنیکی غرض سے ایک طویل مضمون اور اتنا پورانا جتنا کہ سبکتگین کا زمانہ گذرا ارسال خدمت کرتا ہوں مگر اُس کے متعلق یہ التماس بھی ہے کہ جس طرح سے محمود غزنوی کے حملوں کا سلسلہ ہندوستان سے نہیں ٹوٹتا اس مضمون کے جملوں کا سلسلہ صلائے عام سے نہ چھوٹے کیونکہ رباعی -

مضمون تو پورانا ہے مگر تازہ زبان ہے ٭ خوبی زبان جملوں سے سب اسکی عیاں ہو
ظاہر ہو کہ ہر بات فصاحت سے بھری ہو ٭ اور لطف بیاں اسکی عبارت میں نہاں ہو

آپ اگر زبان سے نہیں تو دل میں ضرور کہینگے کہ اپنے منہ میاں مٹھو گر مجھے

جواب میں یہ عرض کر دینے کی گنجائش پھر بھی باقی رہیگی کہ میں ذکر کس کا کر رہا ہوں اُس کا کہ جس کے حملوں نے تمام ہندوستان کو تہ و بالا کر دیا تھا اور جس نے خلیفہ بغداد سے خلعت فاخرہ و خطاب پایا تھا۔

میں لکھتے لکھتے یہ بھولا جاتا ہوں کہ جناب ادیب کے اس شعر نے میری رات کو دن کر دکھایا کہ ۵

لب خبر بوسوں کی دیتے ہیں مسی چھوٹے ہوئے ؛ جو بہت سچ بولتے تھے اب وہی جھوٹے ہوئے

عجب پر لطف مصرعہ ہے کہ "جو بہت سچ بولتے تھے اب وہی جھوٹے ہوئے" ابھی نازک خیالی کی میں سید منظر علی صاحب کا تہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں کہ صلائے عام کے شیدائی خادم نہیں چھانٹ کر مجھ صف اول میں جگہ دی۔ فقط

(آپ کا نیازمند خاص عرفان علی آئی۔ ایس او
آنریری مجسٹریٹ آگرہ)

صلائے عام - یہہ غزل جناب ریاض کی رسالہ **ہمایوں** سے نقل کی گئی ہے اس سے میری غرض یہہ ہے کہ شعر کہے تو ایسے۔ خاصکر اہل پنجاب جو اسوقت اردو کی طرف زیادہ متوجہ ہیں یہ زبان پیدا کریں ؛ زبان ہو اور ایسی!

شب فرقت ابھی کٹ جائے ظالم آنکھ کے تل سے	تری تصویر دل جانے لگی ہے یہ مرے دل سے	جوانی میری رخصت ہو رہی ہے تو سے پہلے
الٰہی کارواں یہ لٹ رہا ہے دور منزل سے	زنان سا شوخ ہے کوئی نہ سمجھا کوئی دیوانہ	بہار آتے ہی اڑ جائینگے وہ مجھ کو عنادل سے
سنبھالے کیا مژہ آفت نگہ ہے چوٹ کرنے میں	ذرا سی تیغ نکلی جا رہی ہے دست قاتل سے	لحد میں کھنگی نے شکل میری اسقدر بدلی
فرشتے حشر کے دن مجھکو پہچانیں گے مشکل سے	ارے او قیس دیکھی بے اثر دیوانگی تیری	تری محمل نشیں لیلے نے جھانکا بھی نہ محمل سے
وہ خونِ بیگنہ کو اپنے دامن تک سمجھے تھے	نظر آیا رنگا محشر کا دامن خون بسمل سے	زبانِ تیغ [illegible] ہے دہانِ زخم بھی چپ ہے
سنا ہے داور محشر کے پرسش ہوگی قاتل سے	وہ باتیں کچھ تو ہیں جن کا اثر ہے شمع پر اتنا	اٹھی وہ جل کے خلوت سے اٹھی وہ رمے محفل
کسی کا لطف خضر راہ ہو تو راہ آساں ہو	لے پیچیدہ جادے یاد جب نکلا سلاسل سے	غبار راہ تو ہی کچھ مدد دے اب ذرا اٹھ کر
مجھے پہنچا دے منزل تک پڑا ہوں دور منزل سے	ریاض آئے تو کیونکر حشر میں آئے مرے قاتل	یہ دیوانہ ترا واقف نہیں آداب محفل سے

۵ یہ مضمون میں دیکھ رہا ہوں ؛

ریویو

جناب مولوی بشیرالدین احمد صاحب تعلقہ دار پنشنر ریاست حیدرآباد دکن کی عنایت سے انکی تصانیف کثیرہ میں سے **واقعات ممالک بیجاپور** اور **واقعات دارالحکومت دہلی** میرے پاس پہونچیں۔ دونو معرکہ کی تاریخیں ہیں کہ دکن میں بیجاپور کی سلطنت کی دھاک بہت بیٹھی ہوئی تھی۔ اور دہلی کی تاریخ کی نسبت معرکہ کی تاریخ کہنا ہرگز مبالغہ نہیں ؂ یہ دونو تاریخیں تین تین جلدوں میں ہیں اور جلدیں معمولی ضخامت سے زیادہ ہیں ؂ دونوں نقشہ جات مقامات سے مزین ہیں اور اچھی چھپی ہیں ؂ بیجاپور کی تاریخ تو مصنف نے ریاست میں ملازمت کے وقت لکھی اور اپنے رئیس کی نذر کی ؂ پنشن لیکر اپنے وطن دہلی میں آنے کے بعد **واقعات دارالحکومت دہلی** لکھی +

دونوں بہت اچھی تاریخیں ہیں۔ جن سے مصنف کی تاریخ دانی اور معلومات علم و فن سے پوری واقفیت ظاہر ہوتی ہے۔ دونوں میں تاریخی حالات کے علاوہ آثار قدیمہ کی تحقیق اور عمارات کے نقشے درج ہیں ؂ دونوں تاریخوں میں سے **واقعات دارالحکومت دہلی** کا حق **صلائے عام** پر زیادہ ہے کہ دہلی کی خدمت میں **صلائے عام** مصنف کا خواجہ تاش ہے ؂

اُردو میں اس طرز اور اس فن کی کتابیں بہت کم ہیں۔ سبب یہ کہ اول تو آثار قدیمہ کا فن زیادہ محنت اور زیادہ خرچ کا محتاج ہے۔ دوسرے قدیم تاریخوں کا جمع کرنا جو اب بالکل مفقود ہو چلی ہیں مشکل ہے ؂ مصنف کا احسان ہے کہ قدیم حالات مع تازہ واقعات کے ہماری زبان میں لکھدئے جو یادگار رہیں گے مجھے عجالت ہے کہ **واقعات دارالحکومت دہلی** کی تینوں جلدیں میں بالتفصیل نہیں دیکھ سکا۔ انکو دیکھ لوں تو ریویو کا حق ادا کرسکوں ؂

غالب کے کلام اُردو کی نسبت رائیں

میرے چند دوست مجھ سے دریافت کرتے ہیں کہ پچھلے دِنوں مولوی حیدر علی صاحب طباطبائی نے جو مرزا غالب مرحوم پر چند اعتراض کئے ہیں جنکا جواب مولوی بشیر الدین صاحب صدر تعلقدار دکن نے کوہ کندن کاہ برآوردن کے عنوان سے **صلائے عام** میں طبع کرایا ہے۔ اسکے متعلق تیری کیا رائے ہے۔ میں عرض کیا چاہتا ہوں کہ میں کیا اور میری رائے کیا ایسے دو بڑے اُستادوں کی نسبت میں کیا کہہ سکتا ہوں بقول شخصے۔ چہ یارا منہارا کہ از روے دانش بخورشید انور نویسید۔ تاہم میری یہ رائے ہے کہ مولانا نے بے ضرورت اِس کام کو اختیار کرکے غالب کے طرفداروں کی مفت مخالفت مول لی ہے اگر کوئی ضرورت پیش آتی تو ایسا کرنا مناسب بھی ہوتا مرزا غالب ایک مشہور و معروف استادِ سخن ہو گزرا ہے اُس کی قادر کلامی مضمون نگاری نازک خیالی کی ہزاروں مثالیں موجود ہیں ہزاروں ہزار اُس کی خوبیٔ کلام کے معتقد ہیں۔ اب اُس کی چند غلطیاں بڑی تلاش اور جستجو سے جمع کرکے پبلک کے سامنے لانا ایک بے نتیجہ اور بے کار بات ہے۔ اگر کچھ نتیجہ ہے تو یہ ہے کہ بیٹھے بٹھائے مخالفت مول لی گئی۔ غالب کے طرفدار رات دن اِس تلاش میں رہیں گے کہ مولانا کی لغزشیں اور بھول چوک تلاش کریں اور ایک پر کے سو کبوتر اُڑائیں اعتراض کرنے والوں سے تو غالب اپنی زندگی میں بھی ڈرا کرتا تھا۔ چنانچہ ایک موقع پر اِس خیال کو بڑی خوبی سے نظم کیا ہے ؎ پانی سے سگ گزیدہ ڈرے جس طرح اسدؔ ۔ ڈرتا ہوں آئینہ سے کہ مردم گزیدہ ہوں

مولانا حیدر علی صاحب اِس سے واقف ہیں کہ غالب کے ساتھ بھی بشریت لگی ہوئی تھی اور بشریت کا تقاضہ ہے سہو و خطا بھول چوک۔ ایکبار کسی نے امام رضا علیہ السلام سے عرض کیا کہ سواد کوفہ کے بعض لوگ اِس امر کے قائل ہیں کہ نبی کریم صلعم سے نماز میں سہو نہیں ہوا۔ امام نے فرمایا کہ وہ جھوٹے ہیں اُن پر خدا کی لعنت ہو۔ جو سہو وغیرہ سے پاک ہے وہ صرف ایک خدا

کی ذات پاک ہے ۔ پس جب نبی ولی اس سے نہیں بچے تو دوسرا کیوں کر بچ سکتا ہے ۔ اسی بنا پر کہہ سکتے ہیں کہ وہی بشریت مولانا کے ساتھ لگی ہوئی ہے اس کا اطمینان نہیں ہے کہ مولانا سے نہ سہو ہوا نہ آئندہ ہوگا ۔ بجائے اس کے کہ مولانا نے غالب کے مرے بعد بڑی تلاش سے چند غلطیاں جمع کیں اگر غالب کے مشکل اشعار کی شرح لکھتے تو زیادہ فائدہ تھا کہ مولانا کی قابلیت کی بھی داد ملتی اور ہم جیسے معمولی سمجھ والوں کو اس کے مشکل اشعار سمجھنے آسان ہوتے ۔ مطلق تنقید بری نہیں اعتراض کرنا گناہ نہیں مگر ضرورت پر ۔ ایک دفعہ ایک غیر مسلم نے کلام ربانی کے سہل ممتنع ہونے میں حجت کی آخر میں کہا کہ اگر قرآن سہل ممتنع ہے تو غالب نے لکھا ہے کہ سعدی کا کلام بھی سہل ممتنع ہے ان سے کہا گیا کہ سعدی کے کلام کو سہل ممتنع کہنا داخل تعریف سعدی ہے نہ حقیقی معنی ہیں وہ کہنے لگے کہ اب ہم دعوے کرتے ہیں کہ سعدی کا کلام سہل ممتنع ہے اس دعوے کو توڑ دیا جاوے ۔ ضرورت پر نظر کر کے اُن سے کہا گیا کہ دیکھو سعدی کا شعر ہے ؎ اگر دشنام فرمای و گر نفریں دعا گویم ؛ جواب تلخ می زیبد لب لعل شکر خارا ۔ اسی مضمون کو حافظ نے اس شعر میں ادا کیا ہے ؎ بدم گفتی و خورسندم عفاک اللہ نکو گفتی ؛ جواب تلخ می زیبد لب لعل شکر خارا ۔ اگر دو شعر مقابلہ سے نہ دیکھو تو سعدی کا شعر برا نہیں مگر مقابلہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ حافظ خوبی میں بڑھ گیا ہے کیونکہ محبوب کے کلام رنجش التیام اور دشنام دہی کے مقابلہ میں اپنی خوشنودی کا اظہار اس طریقہ سے کیا جاوے کہ اُسے یقین ہو جاوے کہ عاشق کو برا کہنے سے کچھ ملال نہیں بلکہ خوشی ہوئی پس سعدی نے دو لفظ دشنام دہی اور نفریں کہکر رنجش و غصہ کے کلام میں بے فائدہ تطویل کی اور اپنی خوشنودی کے اظہار اور استرضائے محبوب میں جو مقتضائے حال تھا ایک لفظ دعا گویم پر اکتفا کی جو محض عدم ملال پر دلالت کرتا ہے نہ خوشنودی پر اور اظہار خوشنودی کی صراحت بھی نہ کی صرف دعا گویم کی توجیہ مصرعہ ثانی میں کر دی اور حافظ نے رنجش اور غصہ کے کلام کے اعادہ میں اور یاد دہانی میں دانستہ ایجاز اور استرضائے محبوب میں اطناب کیا جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حافظ کو مقدم استرضائے محبوب ہے اُسی میں مستغرق اور منہمک ہے گویا حالت جذب میں ہے کہ معذرت کرتے کرتے اور محبوب کی طبیعت سے

خیال پہنچ کا دفعیہ کرتے کرتے طبیعت سیر نہیں ہوتی یہہ سنکر وہ چپ ہوئے ؛

خلاصہ یہ کہ ضرورت کے لحاظ سے ایسا ہی ہوتا ہے یہ اعتقاد ہے کہ سعدی کی معلومات کو حافظ نہیں پہونچ سکتا۔ مولانا شبلی نعمانی کو دیکھئے کہ علامہ کہلائے گئے علامہ ہوں یا نہ ہوں مگر انکی ادب اور تاریخ دانی کا تو ایک زمانہ معتقد تھا اور حقیقت میں وہ اپنی نظیر نہ رکھتے تھے۔ انہوں نے دوسری تالیف و تصنیف سے اُکتا کر مرزا دبیر اور میر انیس کے کلام کا موازنہ کیا۔ اور بڑی تکلف اور تلاش سے مرزا دبیر پر میر انیس کو ترجیح دی مگر اُنکے طرفداروں میں سے ایک واقف فن نے مولانا شبلی صاحب کا صرف جواب ہی نہیں دیا بلکہ مولانا شبلی صاحب کا کئی جگہ ضعف ادراک ثابت کیا ہے۔

مولوی بشیر الدین صاحب کا یہ لکھنا حق بجانب ہے کہ غالب مرگیا اپنے نظم و نثر کلام میں ہزاروں ایسی خوبیاں بیان کرگیا ہے کہ اُسکی مثال نہیں اب چند اعتراضوں سے اسکی شہرت اور ہر دلعزیزی کو کیا نقصان پہنچ سکتا ہے۔

عرفی نے نعت رسول کریم میں ایک قصیدہ لکھا ہے۔ تقدیر بہ یک ناقہ نشانید دو محمل ؛ سلمائے حدوث تو و لیلائے قدم را۔ اس قصیدہ کے حسن بیان کی جسقدر تعریف بیان کیجاوے وہ تھوڑی ہے۔ مگر اسی زمین میں غالب نے نواب وزیر الدولہ بہادر رئیس ٹونک کی مدح میں ایک قصیدہ لکھا ہے آج عرفی ہوتا تو اُسے دیکھکر حواس باختہ ہوتا اور وہ بھی داد دیتا۔ غالب معمولی چلتے ہوئے شعر ایسے کہہ جاتا ہے کہ دوسروں سے بڑی کوشش کے بعد بھی اُنکا جواب نہین ہوسکتا مولوی نظامی صاحب نے ساقی نامے لکھے ہیں ایک موقع پر غالب لکھتا ہے کہ ساقی نظامی شراب پنی کیا جانے اسکے دم میں نہ آنا۔ اسکو یوں ادا کیا ہے۔ ؎

فریبش مخور گو میا شام نیست ؛ ستم دیدۂ گردش جام نیست

اس دوسرے مصرعہ کی خوبی کا کچھ اندازہ ہو سکتا ہے ؟ کیا بلند مصرعہ ہے۔

مولانا حیدر علی صاحب طباطبائی باعتبار علم و فضل کے ملکِ دکن میں اپنا جواب نہیں رکھتے وہ کئی ایک فن ایسے جانتے ہیں کہ دوسرا اُس میں اُنکی مثل نہیں ہو سکتا اُنکی خدمت میں

باَدب یہہ عرض ہے کہ آئندہ ان جھگڑوں میں نہ پڑیں اور مفت کی مخالفت مول نہ لیں اور دوسرے اصحاب سے بھی یہہ عرض ہے کہ زیادہ مولانا کی فکر نہ کریں۔ مولانا کو فی زمانہ غنیمت جانیں ؎

اے زاہداں زبادہ فروشاں چرا بُد اِید ؛ ما ہم غنیمتیم و شما ہم غنیمت اید

مُلک پنجاب اور مُلک دکن میں حضرت گرامی کی ذات پاک بھی باعتبار شعر و سخن کے اس قابل ہے کہ سارا ہندوستان اُن پر فخر کرے تو زیب دیتا ہے۔ مجھے بھی اُنکی خدمت میں نیاز حاصل ہے۔ مئی ۱۹۲۳ء کے صلائے عام میں حضرت گرامی کی ایک فارسی غزل طبع ہوئی ہے حیرت ہوتی ہے کہ اس زمانہ میں ایسا کامل کیونکر پیدا ہوگیا۔ بے اختیار اُس کی نسبت غالب کا یہہ شعر زبان پر آتا ہے ؎

ترا انداز سخن شانہ زلفِ الہام ؛ تری رفتارِ قلم جنبشِ بالِ جبریل

مرزا محمد علیخاں صاحب۔ رئیس دہلی

سیرِ کوہِ طور

کی سُرخی سے جو مضمون صلائے عام نمبر جنوری ۱۹۲۳ء میں شایع ہوا تھا اُسکی نسبت ولایت سے ایک معزز صاحب انگریز نے جن کو علوم مشرقی میں بہت دخل ہے پچھلی ولایت کی ڈاک میں مجھے لکھا ہے کہ × × × × × × × ×

" *It (Salâ-i-Âm) is always interesting, but the article on Mount Sinai was particularly so. I learnt much from it which I never knew before.*" × × × × × × × × × ×

صلائے عام

زبان سے مراد یہی نہیں ہے کہ آپ میرا مطلب سمجھ لیں اور میں آپکا۔ یہ کام تو اشاروں سے بھی نکل سکتا ہے: گونگے بہرے بھی اپنا اپنا کام چلا لیتے ہیں ۞ آنسو ہر چوں سے بھی نکل آتے ہیں مگر رخصتِ جاناں کے وقت جو آنسو نکل پڑیں جان لیوا ہو جاتے ہیں۔ شگافِ نوآرہ سے بھی ہو سکتا ہے مگر چاکِ جگر کے لئے تیرِ مژگاں چاہئے ؎

تب نازِ گرانمائگیٔ[1] اشک بجا ہے ۞ جب لختِ جگر دیدۂ خونبار میں آوے

"نازِ گرانمائگیٔ اشک"۔ کتنی پاکیزہ ترکیب ہے۔ **غالب** کے اس شعر میں کسقدر عالی حوصلگی ٹپکتی ہے کہ ؎

جس زخم کی ہو سکتی ہو تدبیر رفو کی ۞ لکھ دیجیو یارب اُسے قسمت میں عدو کی

نواب مرزا والا جاہ بہادر کا شعر ہے ؎

قاتل سے پھیر لائے دل بیقرار کو ۞ دیکھو جگر ہمارا کہ لائے کہاں سے کیا

[1] گراں مایہ گی

انہیں

انہیں کا یہ شعر ہے کہ؎

خزاں کے ہاتھ سے گلشن میں خار تک نہ رہا ٭ بہار کیسی نشانِ بہار تک نہ رہا ٭

رسالہ نگار میں لطیف الدین احمد صاحب نے ایک ماہوش کی تعریف میں لکھا ہے کہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ "اُسے تیسری بار دیکھنا یہہ معنی رکھتا تھا کہ وہ تین حصہ زیادہ حسین نظر آئی" ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ بہت خوب کہا ٭ مشہور ہے کہ بار بار دیکھے سے قدر کم ہو جاتی ہے ۔ برخلاف اس کے یہاں قدر زیادہ ہو گئی؎

دیکھا نہیں تو باتیں بنانے سے فائدہ ٭ ہم سے عجب نہیں ہے جو وصفِ دہان ہو

بار بیلین[۱] نامی ایک ستم زدہ روزگار لکھتا ہے کہ "دنیا میں بہت سی فرضی چیزوں کو لوگ سچا جانتے ہیں ۔ مثلاً ۔ عنقا ۔ ہما ۔ اکسیر ۔ تریاق ۔ فرشتے ۔ جن و پری ۔ اور ہزاروں چیزیں مگر بے خبر ہیں حالات واقعی و وقوعی سے کہ مجھ جیسے فلک کے ستائے ہوؤں پر کیا گزر گئی ٭ قیس و فرہاد کے قصے تلاش کر کے پڑھے جاتے ہیں اور رانڈ بیواؤں کے حالِ زار پر کسی کو نظر نہیں ٭

گھوڑے کی سواری میں بزدل آدمی گھوڑے کے منہہ میں کڑی سے کڑی لگام لگانے کے بعد بھی سواری میں ڈرتے ہیں لیکن شہسوار جن کو سواری میں مشق ہے بے لگام صرف قرنی سے سواری لے لیتے ہیں ٭ یہہ تمثیل زاہدانِ خشک پر گویا پھبتی ہے جو دنیا کو بہت تنگ پکڑتے ہیں ۔ ابلقِ ایّام کی ذرا سی شوخی پر انکا یہ حال ہوتا ہے کہ اب گرے اب گرے ٭ برخلاف اس کے آزاد مزاج باگ کو ڈھیلا چھوڑ دیتے ہیں کہ چل کہاں چلتا ہے؎

ساقی کو کسی اور کا کھٹکا نہ رہیگا ٭ ٹوٹا ہو نہ قفلِ درِ میخانہ ہمیں سے

---

[۱] مسٹر ڈبلیو این بار بیلین مصنف کتاب The Journal of a Disappointed Man.

نظام عالم اسباب میں سعی و کوشش کوئی چیز نہیں - ہنرمند فاقہ سے مرتے دیکھے اور بے ہنر خوشحال نظر آئے - زبردست گرتے دیکھے اور ناتوان سنبھلے رہے : سارا مدار زمانہ اور نصیب پر ہے - اور یہہ کسی کے بس کے نہیں ؛

مسٹر ایچ - جی ویلس فرماتے ہیں کہ زندگی انڈے سے چڑیا کے بچے کے نکلنے کا نام ہے کہ انڈے کو ٹھنک کر جلد نکل جائے ؛ آندھی اور برق و باراں میں چڑیوں کا حال کیسا برا ہوتا ہے - لیکن آندھی اور طوفان کے بعد ہی جب دھوپ نکلے تو چڑیاں درخت کی شاخوں پر چہکتی ہوئی کیسی اچھی لگتی ہیں - کوئی اپنے پر سکھاتی ہے کوئی اپنی چونچ سے پر و بازو میں کنگھی کرتی ہے گویا دوبارہ زندگی نصیب ہوئی ؛ یہہ تمثیل مصائب روزگار سے کر کے عاقبت میں آرام سے زندگی بسر کرنے کی ہے ؎

اول کھل گیا ورقِ کائنات کا ؛ یہہ دفترِ عمل کا مرے ایک بند ہے

دنیا نام جنون کا ہے - اس جنون میں تمام عالم گرفتار ہے - جو اپنے تئیں گرفتار نہ سمجھے یہہ بھی ایک قسم کا جنون ہے : اگر جنوں سے آپ گھبراتے ہیں تو ایک قسم کا نشہ سمجھئے جو ہر شخص کے دماغ میں چڑھا ہوا ہے - تہذیب و تعلیم - ریاضت و عبادت اس نشہ کے اتارنے کا نام ہے - اس سے بحث نہیں کہ نشہ اترے یا نہ اترے - میری دانست میں اس نشہ کا اترنا خیریت ہے : خاصکر شباب میں ؛ یہہ شباب کی صورت ہوئی - آگے چلئے ؎

ہے اعتدالِ آب و ہوا ملکِ عشق میں ؛ مجنوں یہاں کے کرتے ہیں باتیں شعور کی

بار بیلن کی رائے میں بوڑھے کا مرنا گویا کام کی چیز کا ردی ہو جانا ہے - اور بچہ کی پیدائش دنیا میں بیگار پڑنا سمجھئے ؛ اسمیں شک نہیں کہ دنیا کو اچھی طرح دیکھ بھال کے دنیا سے نکالا جانا مزروعہ زمین کو گویا بنجر کر دینا ہے اور نئی زمین کو زراعت کے قابل بنانا جرثقیل کا کام ہے - بچہ کا پیدا ہونا جرثقیل سے کم نہیں کہ خدا جانے کیا کیا جھگڑے اور دردسر پیش آئیں گے ؛

لیکن مجھ جیسے بوڑھے جو زندگی پر مرتے ہیں یہ مردانگی کے خلاف ہے کہ زندگی کی ہوس کے مارنے کی طاقت نہیں رکھتے ہے

آن سے قسمت کا کچھ رونا نہیں ۔ یہہ ہمیشہ سے مجھے آزار ہے

اورنگ زیب عالمگیر بادشاہ نے اپنے بیٹے کو لکھا جس کو شکار کا شوق زیادہ تھا کہ۔ شکار کار بیکاران ست انسان اگر عاقبت کے کاموں میں محنت نہ کر سکے تو دنیا کے اور کام کیا تھوڑے ہیں۔ ان میں مصروف رہے ۔

میری راے میں عشق بھی ایسے مشغلوں میں ہے۔ یعنی بیکاری کا مشغلہ ہے کہ جب اور کوئی دہندا نہ ہو تو عشق سوجھتا ہے۔ اس عشق مجازی تو خیر از روے نیچر کچھ چیز سمجھا جا سکتا ہے۔ لیکن آج کل کے فقرا و مشائخ کا عشق حقیقی میری سمجھ سے باہر ہے ۔ جو بزرگ خدا سے عشق و محبت کا دعوے رکھتے ہیں اُنکو اُس کے بندوں سے اکثر اُلجھتے دیکھا۔ اُس محبت کی کسر ادھر نکال لیتے ہیں ۔ خدا پر آپ جان دیں یا نہ دیں۔ اُسکو ہماری جان کی ضرورت نہیں: وہ ہمیں مفت دے چکا۔ آپ اُسکے بندوں پر جان دیں اور جان سی عزیز چیز بیکار نہ جانے دیں ۔ بڑا بے وقوف ہے وہ شخص جو اپنی جان سے عاری ہو بیٹھے ہو تو چلا کے نہ دوا اور درد سر ۔ پہلے دوا بتاؤ دل نا صبور کی ۔

اِس مضمون کا مسالہ میں نے زیادہ تر مسٹر ڈبلیو این بار بیلین کے روزنامچے سے لیا ہے جسکا نام یہہ ہے :-

The Journal of a Disappointed Man,

مطبوعہ ۱۲ اکتوبر سنہ ۱۹۲۱ء

OPINIONS

Regarding "SALA-I-AM" Delhi.

The following Critique on the "SALA-I-AM," Delhi, was Published by the Pioneer in its issue of the 3rd November 1909

"The Sala-i-Am published at Delhi keeps up high character as a periodical which seeks to promote the cultivation of Urdu literature. Khan Bahadur Mir Nasir Ali, with whom loyalty and learning go hand in hand is filling the leisure hours of his retirement by devoting himself to the editing and publishing of this Magazine. His style is marked by refinement and culture, and his readers should increase in number as the merits of his work become disclosed. The Sala-i-Am is particularly well printed and European students of Urdu should find it quite worth reading."

Extract from a letter from Colonel D. C PHILLOT, Secretary Board of Examiners, Calcutta, dated 20th January 1910

"I have obtained the opinions of some of the board on the "Sala-i-Am" We think it is the best Urdu Magazine we have yet seen both in appearance and contents I shall have great pleasure in recommending it to candidates for the high Proficiency and Degree of Honour In fact, I have been doing so."

Extract from a letter from Sir Thomas GORDON WALKER L. L. K C I E Late Lieutenant Governor of Punjab Dated 15th March 1909

"The Magazine (Sala-i-Am) appears to be a very superior work one that ought to be appreciated."

SIR LUCAS WHITE KING
Kt. L. L. D., C. S. I. F. R. S.
Indian Civil Service retired writes as follows:-

"I am delighted with the style of your Magazine and am looking forward to the next number.

Dated 15th October 1908

Extract from CIRCULAR No 26 SERIAL No 5059

From the Hon'ble Mr J C GODLEY M. A. Director of Public Instruction Punjab.

TO ALL DEPUTY COMMISSIONERS INSPECTORS OF SCHOOLS, HEADS OF TRAINING INSTITUTION & MANAGERS OF AIDED and RECOGNIZED UNAIDED SCHOOLS IN THE PUNJAB.

Dated Lahore The 31st August 1910

Sir,

I have the honour to recommend the Journals noted below for the reading room of Secondary

school :—

"Sala-i-Am" edited by Mir Nasir Ali Khan and published at the Mustansir Press Delhi, annual subscription Rs. 5.

I have &c.
J. C. GODLEY
Director of Public Instruction, Punjab

Extract from a letter from R. P. DEWHURST *Esquire I. C. S. Session Judge, dated 11th January 1911.*

"I take this opportunity of saying that I entertain a very high opinion of your Magazine I will not say that I read every word of every number, but I can say with truth that I read eagerly all the articles proceeding from your own pen begining to end."

"I have always been an enthusiast with regard to Urdu literature since I come to India eighteen years ago and have read much classical verse and prose besides the more ephemeral publications but I have never yet encountered such a model of a clear and attractive prose style as I find in your articles.

Extract from a letter from the Hon'ble W. Merk Esquire, L. L. D. C. S. I. I. C. S. Late Chief Commissioner, N. W. Frontier province Written from England dated 16th August 1911

I thougt it (Sala-i-Am) a periodical that might be encouraged with for advantage. for instance to be placed in the waiting rooms for native gentleman calling on Deputy Commissionere.

Extract from a letter from A. L. GORDON WALKER Esquire I. C. S. Punjab Commission dated 11th October 1911

"I quite agree with Mr Merk that the (Sala-i-Am) ought to be in the waiting room of all Deputy Commissioners Curiously enough I have used it for the purpose myself and always find that the Indian gentlemen who read it are delighted with it."

Extract from a D. O. letter from the Deputy Commissioner of Gurgaon to the vice chancellor of the Punjab University dated 14th December 1910

"I wonder if you have any collection of receiving a letter from me last July when I sent you a copy of the Sala-i-Am, edited by Khan Bahadur Mir Nasir Ali, a most estimable old Government servant who spends his leisure hours, when not occupied in his Magisterial duties [he is an Honorary Magistrate in Delhi] in editing and publishing quite one of the best Magazines in Urdu.

"I am sending you another copy of the Magazine with a request that you will as Vice Chancellor of the University give it all your assistance and if possible, its Editor the Mir Sahib, who is a most loyal old man and a man of letters."

EXTRACT FROM THE INDIAN DAILY TELEGRAPH LUCKNOW DAILY 14th DECEMBER, 1901.

"But the chief point about which I have taken up my pen to write is the literature of Khan Bahadur S. Nasir Ali Sahib of

Farrash-khana Delhi. He has recently started an Urdu Magazine Sala-i-Am, in his own city. he is a writer of some forty years standing his writings are appreciated in Lucknow as well as in Delhi He has been congratulated for his work by the Lieutenant Governor of Punjab. He has received congratulations from all parts of India compliments from many literary men and favourable reviews from the Press, and now that great boon the appreciation of Lord Minto. His style is very simple but amphatic. He wtries philosophical essays in Urdu and is thus doing much to bring to a high level Urdu literatare. It is hoped that the paper he has started will do much for the good of our languages. The paper itself is nicely got up, the annual subscriptions only Rs 3. Those who are desirous of reading good Urdu should at once communicate with the editor, the point also I should add that the paper is much liked and purchased by Europeans both in India and Europe"

——:0.0:0——

Copy of a letter from the Private Secretary to His Honour the Lieutenant Governor of the United Provinces, dated 11th April 1913.

GOVERNMENT HOUSE.
LUCKNOW.

Sir

I am desired to acknowledge your letter of the 19th forwarding a copy of your paper "sala-i-Am." for His Honour the Lieutenant Governor's perusal; and to say that His Honour has put it a side to study an enjoy at leisure.

——oo——

The annexed Review of the SALA-I-AM Delhi, is re pub ished from the Journal of the Moslem Institute, Calcutta. No 2 Vol V. Page, 104.

——0.:0::0——

"The Sala-i-Am, publihed at Delhi is a high class Urdu periodical and in get up printing and style it is without a parallel. it has been truly remarked by the *Pioneer* that it "seeks to promote the culcivation of Urdu Literature." It is edited by Khan Bahadur Mir Nasir Ali who is a writer of 40 years standing."

Extract from the GAZETTE OF INDIA JUNE 6, 1914. EXAMINATIONS.

XVI:— The following are the text books prescribed for the PROFICIENCY EXAMINATION:—

o o o o o o

URDU:—

o o o o o o

In addition to the Grammer and Magazine recommended for the proficiency examination, the following are recommended :——

o o o o o o

Magazine

SALA-I-AM

o o o o o

Appendix B. List of authorised Text books. The following is a list of Text books prescribed for the various examination together with the places where they may be obtained.

o o o o o

URDU.

SALA-I-AM ____________ DELHI

o o o

Presentation of Mir Nasir Ali Khan Bahadur. of Delhi to his Most Gracious Imperial Majesty King Emperor.

—o.—

Extract from a letter from J. P. Thompson, Esquire I. C. S. *Dated* 13th December, 1911.

—:-0-:—

"Dear Mir Sahib,"

I enclose your invitation card for the Garden Party this afternoon, which has just reached me from the Private Secretary to His Honour."

o o o "Sir Louis Dane hopes to have an opportunity of presenting you to his Imperial Majesty." o o o o

—:0·—

Extract from a letter *from* Sir Richard Dane. K. C. I. E. (Brother of His Honour the Lieutenant Governor of Punjab)
Dated Lieut. Governor's Camp, 25th February 1912.

"Dear Mir Nasir Ali."

o o o o o o o

My Brother has told me that you had the great honour of being introduced to his Imperial Majesty the King Emperor."

I am, Yours Sincerely,

—:0:—

Extract from a letter from Major J. C. C. Angelo, Dy. Commissioner.
Dated, 18th December 1911.

'My Dear Mir Sahib.

"I Am very glad you were presented to His Imperial Majesty—it was a fitting ending to the Durbar." o o o o

Your Sincerely.

Babu Rebindra Nath Tagore of Gitanjali, writes:—

o o o o

"I have no doubt that it (Sala-i-Am) is doing a good service in promoting the cultivation of Urdu terature."

o o o o o

Extract from a Gentleman's letter Dated April 4, 1914.

o o o o o

'I conclude from the last issue of Sala-i-Am that you have been vested with a *Khilat* as Diwan of Pataudi State, will you permit as an old friend of yours and an nirer of your genius to offer you sincere congratulation,

o o o o o o o

"It like Addison you have acquired celebrity as an Essayist and a brilliant writer of Urdu prose; o o

o o o o o o

you, like him, deserve to be raised to the highest advancement in the state! Now, that is no flattery I speak as I think." o o o

"In conversation this morning with o o I brought to his notice the Sala-i-Am, and have at his request sent him your December Number, drawing his particular attention to your "Stray thoughts" مضامین پریشان and especially to your simile of

بازکی زلف پریشان

o o o o o

—o—

صلائے عام

خواجہ قمر الدین راقم کا شعر ہے ؎

مقصد تمہارے ہاتھ ہے قسمت خدا کے ہاتھ ٭ جو کچھ خدا سے ہو وہ تمہاری زباں سے ہو

صلائے عام کا بھی یہی عقیدہ ہے کہ کسی ملک وقوم کی ترقی تو پروردگار کے اختیار میں ہے لیکن ترقی کیلئے پہلی شرط اپنی زبان میں کمال پیدا کرنے کی ہے ٭ ضد کی اور بات ہے مگر اسوقت ہندستان کی زبانوں میں اُردو سے بہتر کوئی زبان میری سمجھ میں نہیں آتی جس پر جمہور اہل ہند (ہندو ہوں یا مسلمان) دونوں کی زبان کا اطلاق ہو سکے ؎

نغمۂ عشق سے ہیں سُبحہ و زنار ملے ٭ ایک آواز پہ دو ساز کے ہیں تار ملے

خلاقِ دو عالم کی طرح اُردو زبان کی تعریف سب سے پاکیزہ یہہ ہے کہ ؎

تجھسے کوئی آشنا نہ ہوا ہو ٭ پر تجھے سب سے آشنا دیکھا

یہ رسالہ اپنی زبان میں اظہار کمال کی غرض سے جاری ہے کہ اُردو لٹریچر کے لئے ہر طرز پر لکھنے کا مسالہ جمع ہو اور ادائے بیان میں ہماری زبان اور زبانوں سے اگر بازی نہ لے جا سکے تو کسی زبان سے مرتبہ میں کم نہ رہے ؎

دیکھ کر تجکو مٹے جاتے ہیں دُنیا کے حسیں ٭ جمع ہوتا ہے مسالہ تری یکتائی کا

صلائے عام میں ہر طرح کے مضمون نظم و نثر شایع ہوتے ہیں۔ زیادہ تر نثر کہ اسوقت نثر کی ضرورت ہے: اور نثر بھی ایسی جس میں زبان کی خوبی و فصاحت کے ساتھ خیال کی پاکیزگی اور نزاکت ضرور ہو ؎ دل باندھئے تو یار کے کاکل سے باندھیے ٭ بلبل کو باندھئے تو رگ گل سے باندھئے

صلائے عام اعلیٰ حکام سول و ملیٹری افسروں کے امتحان میں گورنمنٹ آف انڈیا سے

منظور

منتشر ہو چکا ہے ہندوستان کے سوا یورپ کے عالم و فاضل صلائے عام کی قدر کرتے ہیں۔ اُردو میں صلائے عام کے مضامین کو خاص مرتبہ حاصل ہے ؎

دل پر تمہارے نقش ہوا ہے بیانِ شوق ؛ کارِ قلم دکھاتی ہے میری زبانِ شوق

صوبہ آگرہ و اودھ کے سررشتۂ تعلیم کے نصاب میں صلائے عام کے مضامین اُردو فائنل (مڈل) میں انتخاب کرکے درج کئے گئے اور صاحب پریسیڈنٹ نصاب اُردو نے جو حسب ایماء گورنمنٹ بمبئی منعقد ہوئی میرے مضامین کو اُردو ریڈروں میں شامل کرنے کے لئے مجھے لکھا ؛

اکثر اصحاب نمونہ کا پرچہ مانگتے رہتے ہیں۔ اول تو ایک پرچہ سے صلائے عام کا پورا حال معلوم ہونا مشکل ہے دوسرے صلائے عام کو جاری ہوئے عرصہ ہوگیا نمونہ بھیجنے کی مجھے ضرورت نظر نہیں آتی ؎

پیری میں بھی بے ولولۂ شوق نہیں ہم ؛ رکھتے ہیں ابھی اک دلِ ہنگامہ گزیں ہم
شہرت نہیں مجنوں کے برابر یہ مسلّم ؛ پر کوئی نہ جانے ہمیں ایسے بھی نہیں ہم

صلائے عام کی قیمت پیشگی چھ روپیہ سالانہ ہے۔ چھ مہینے سے کم کی خریداری منظور نہیں ہوسکتی ؛ قیمت بذریعہ منی آرڈر عنایت فرمائی جائے۔ مضمون نگار صلائے عام کی قیمت بری نہیں : نہ یہ ضرور ہے کہ ہر مضمون خواہ مخواہ شایع کیا جائے ؛ جو مضمون شایع نہ ہوسکیں اُن کے واپس کرنے کا ذمہ نہیں : جامع اوراق کو مضمون میں کمی بیشی کا اختیار ہے ؛ پچھلے پرچوں کی قیمت بشرطِ دستیابی ایک روپیہ فی پرچہ ؛ ؛

صلائے عام کا پتہ اسقدر کافی ہے کہ :
دہلی۔ فراشخانہ : مکان میر ناصر علیخاں بہادر ؛

حسب الارشاد میر ناصر علیخاں بہادر مطبع ناصری واقع فراشخانہ دہلی میں باہتمام میر احمد چھپا اور شایع ہوا ؛ ؛

PRINTED AND PUBLISHED BY MIR NASIR ALI KHAN BAHADUR (EDITOR) AT THE NASRI PRESS
FARRASH KHANAH, DELHI.

ered No. L. 1463.



SALA-I-AM, DELHI.

A high class Monthly Magazine devoted to the cause of Urdu literature, the preservation of the old Indian, especially Mohammadan culture and refinement, and the assimilation of the best features of the new civilization.

جلد فہرست مضامین نمبر

بابت ماہ جولائی سنہ ۱۹۲۳ء مطابق ذیحجہ سنہ ۱۳۴۱ ہجری

پیرایۂ آغاز

بے تاب ہوئے یار کی چٹکی سے نکل کر ؛ تیر آپ تڑپنے لگے نخچیر سے پہلے

مضمون پریشان۔ محشر خیال اور صلائے عام کے نام کی دو سرخیوں کے مضمون یہہ معمولی مضامین ہیں جنکا انداز بیان وہی ہے جو آپ ہمیشہ ملاحظہ فرمایا کرتے ہیں۔

کفر و دین شاعرانہ مضمون ہے۔

انشاپردازی کے مضمون سے یہہ غرض ہے کہ اگلے طرز خط کتابت کے اب مفقود ہوگئے ؛

وادیٔ ایمن۔ اور گلہائے ریاض میر ضیا دہلوی کے مضامین ہیں۔ ان میں گلہائے ریاض اہل سخن کے کام کا ہے: اس کا فیصلہ شعراء ذی کمال کے ذمہ ہے ؛ جناب ریاض کے کلام کی نسبت میری رائے معتقدانہ ہے کہ ریاض کا کلام جہاں دیکھتا ہوں بے دو چار دفعہ دیکھے چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا؛

سلاطین دکن والے مضمون کا تعلق آثار قدیمہ سے زیادہ ہے جو مولوی

بشیرالدین

بشیر الدین احمد صاحب دہلی کی تاریخ بیجاپور سے لکھا گیا ؛

اودے پوری اور **آتالیق الامرا** - جناب مرزا محمد علی خاں صاحب رئیس دہلی کے مضمون ہیں - ان میں **آتالیق الامرا** لاجواب مضمون ہے - واقعی رؤسا وامرا کی تعلیم ان کے فرائض کے موافق ہونی چاہیئے - ان کے فرائض عدل و انصاف - رعایا کی بہبودی - علوم و فنون کی ترقی - اہل کمال کی قدر اور ایسے ہی طرز عمل ہیں ؛

صلائے عام کی ڈاک میں جناب **اخگر** کے خط کا خلاصہ پڑھنے کے قابل ہے ؛

زبانِ اردو کی ترقی نری مضمون نگاری سے مشکل ہے - جب تک کہ اصحابِ دولت و جاہ اس طرف متوجہ نہ ہوں یہ بیل منڈھے چڑھتی نظر نہیں آتی ؛

اِس پرچہ میں مضامین زیادہ ہیں اور اس لئے حجم بھی زیادہ ہے - مضامین کثرت سے آتے ہیں اور جگہ نہ ہونے کی وجہ سے رہ جاتے ہیں ؛ مضامین کے خیال سے **صلائے عام** کا حجم بڑھانا پڑے گا - آئندہ سے اور انتظام بھی **صلائے عام** کی ترقی کا درپیش ہو رہا ہے ؛ لیکن زیادہ ضرورت ترقی کے لئے **صلائے عام** کی قیمت وصول ہونے کی ہے - اس کا رونا شروع سے جس طرح اور رسالوں کو ہے **صلائے عام** کو بھی ہے ؎

آغازِ عاشقی میں کلیجہ دھڑک گیا
سر پھوڑنے سے پہلے ہی ماتھا ٹھنک گیا

مضمون پریشان

مضمون پریشان سے میری غرض یہہ ہے کہ متفرق و مختلف باتوں کا ذکر اس طرح ہو کہ ہر بات علیحدہ رہے اور جسطرح جی چاہے بیان کی جائے۔ کوی خاص بات نہ ہو۔ نہ ایک وضع کی ہو: اور جب اکجا جمع کی جائیں تو ایک مضمون علیحدہ بجائے خود ہو۔

~~ہوا بلند پریشانیوں کا جب رتبہ ٭ وہ جمع کرتے ہیں ٹکڑے کر کے اڑائے ہوئے~~

ہوا بلند پریشانیوں کا جب رتبہ ٭ وہ جمع کرتے ہیں ٹکڑے مرے اڑائے ہوئے

چو سے پرسم ازو حالِ دلِ ریش ٭ بمن زلفِ پریشاں مے نماید

فیضی کی مثنوی نل دمن ازروئے شاعری اہلِ سخن میں لاجواب سمجھی جاتی ہے۔ دمن کی تعریف میں فیضی نے جہاں اور شاعرانہ داد فصاحت دی ہے ایک شعر بہت ہی بے مثل کہا ہے

صد برہمنش بجنوں نشستہ ٭ در بتکدہ بت بہ بت شکستہ

اس طرز پر جناب اسماعیل منیر نے خوب کہا کہ ہے

مستوں پر بھوٹ پڑ گئی آتے ہی یار کے ٭ اڑتا ہے آج شیشہ سے شیشہ شراب کا

اسی طرح ایک نئی بات اس شعر میں پیدا کی ہے

بازار کہنہ میں نہیں تو قدرِ جنس تو ٭ مصرِ دگر یم ہو یوسف ثانی کے واسطے

سخن وران لکھنؤ سے مرزا **قتیل** کی فارسی کی بڑی شہرت تھی۔صاحب زبدۃ بہادر کی نسبت سنا کہ شکار میں ہاتھی سے گر گئے مگر خیریت رہی۔ مرزا قتیل نے صاحب عالم کی طرف سے تعزیت کا رقعہ لکھا کہ:۔

× × × × ×" از دریافت خبر وحشت اثر یعنی از فیل بے ارادہ بزمین آمدن آں والا مرتبت در شکار شیر الخ × × × × × × × × × × × × × ×

ہاتھی پر سے بغیر ارادے زمین پر آجانا۔پاکیزہ بیانی ہے ٭

زندگی ایسی بیکار چیز نہیں جو کسی حماقت سے رائیگاں جانے دی جائے (یعنی خود کشی میں) ٭ موت فقط مرنے کا نام ہے۔اس سے غرض فنا ہونا نہیں ہے: روح کا غیر فانی ہونا اگر ثابت نہ ہو تو بھی تسلی ہونے میں شک نہیں ٭ روح اگر غیر فانی نہیں تو زندگی فضول ہے

فنا کے بعد بھی ہے داغِ جستجو باقی ٭ لباسِ زیست پھٹا رہ گیا رفو باقی

زندگی کا مصرف تو ہر انسان کے ذہن میں خود بخود آجاتا ہے۔مرنے کا مصرف فقط مذہب سے ذہن میں آسکتا ہے

زندہ رہتے ہیں شبِ ہجر میں لاکھوں اے خضر ٭ جنسِ عمرِ ابد اس عہد میں نایاب نہیں۔

جس چیز کو آپ ایک عمر سے کرتے آئیں۔ گو وہ دل کش ہو یا نہ ہو۔ اُس حیثیت
آخری سابقہ سوہانِ روح ہو جاتا ہے ۔ یہ صورت زندگی سے جدائی کی ہے۔
تمام دنیا سے زیادہ عزیز ہے ؎

جنگل ہوا کہ باغ بہ رنگِ شجر رہے ۔ مہمان جس جگہ رہے ہم عمر بھر رہے

ہمیں دنیا میں اس قدر کثرت سے کام کرنے ہیں کہ کثرت کی وجہ سے جی گھبرا جاتا ہے۔ اور آخر کو تنگ اگر جی چاہتا ہے کہ کچھ نہ کرئے : جو کچھ نہیں کرتے وہ اکثر اچھے رہتے ہیں ؎ بے سبب بنتے ہیں یوں ہی بگڑتے ہیں لوگ ۔ کیا کوئی منتظم عالم اسباب نہیں ؟

فرہاد کو جان دینی منظور تھی تو تیشہ ہی سے سر پھوڑنے کی کیا ماری جاتی تھی ؟ اس پر **غالب** نے کیا اچھی بات کہی ؎

تیشہ بغیر مر نہ سکا کوہ کن اسدؔ ۔ سرگشتۂ خمارِ رسوم و قیود تھا

دنیا میں مرنے کی اور بہت تدبیریں ہیں ہم نے بے جان دئے بھی لوگ مرتے دیکھے : کمبخت نے مرنے میں جلدی ناحق کی یہ موت نہ تھی پابندی رسوم عالمِ اسباب تھی ؛ عالمِ اسباب کے سامنے نہ عقل کی چلتی ہے نہ جنوں کی ؎

کوئے یار است از پئے نیاز بہ تکبر مگذر ۔ سر بہ سجدہ کہ گبر و مسلماں اینجا ست

نیچر (عالمِ اسباب) کے آگے نہ دین کی چلتی ہے نہ دُنیا کی نہ کفر کی نہ اسلام کی۔ نہ آپ کی نہ میری ؎

مہندی لگی ہوئی ہے ابھی میرے خون کی ۔ کیا ہاتھ اُٹھائیں فاتحہ خوانی کے واسطے

انتظام عالم کے لئے سب سے پہلے اور زیادہ ضرورت انصاف کی ہے۔ معمولی سمجھ

کہ آدمی یہی سمجھ سکتا ہے کہ جب حاکم و منتظم سے انصاف کی امید نہ ہو فریادی کی کمر ٹوٹ جاتی ہے ؛ جب بیگناہ گرفتار مصائب ہوں اور مصائب بھی ہزاروں طرح کے تو امتیاز کی یہی ایک صورت ہے کہ اپنی طرف سے چپ سادھ لے۔ جو میاں کے جی میں آئے کرنے دو ؎

ایں امتیاز م از دگراں بس کہ وقتِ حشر ؛ پرسش بود قصاص گناہِ نبودہ را

کہتے ہیں کہ خدا ہر جگہ حاضر و ناظر ہے۔ بلکہ صوفیائے کرام ہر رنگ میں سمجھتے ہیں۔ اسکی ضرورت کیا ہے کہ آپ ہر بھیس میں ہر جگہ پھریں؟ معلوم ہوا کہ انہیں ہر بھیس پسند ہے۔ گویا یہ بھیس مزاجِ یار کیطرح ایک حالت پر نہیں رہتا ؎ جامۂ آدمِ خاکی جو نہ ہوتا مطلوع ؛ آپ ناحق کی نہ پوشاک بدلتے پھرتے

زہر قاتل دونوں ہیں بیمارِ ہجراں کے لیے ؛ مہربانی آپ کی نامہربانی آپ کی

پائے نازک پر جو سر رکھا تو کھائیں ٹھوکریں ؛ یہ ہماری بندگی وہ قدردانی آپ کی۔

خلاقِ دو عالم جو ہر جگہ موجود ہے تو دہریوں کے ذہن میں کیوں نہیں آتا؟ سامنے آنے سے ذہن میں آنا آسان ہے۔ ورنہ مرزا خیالی (شاعر) کے یار کیطرح یار آیا اور ہم چلدیے ؎

خیالی یار می آید بہ آئینے کہ میدانی ؛ ترا دیدار ارزانی کہ من از خویشتن رفتم

یہ بھی آنے میں آنا ہے کہ محلہ والے دیکھیں اور ہمیں نظر نہ آئے ؎

چہ آبرو ازیں بہتر شہیدِ عشق را فردا ؛ کہ از خاکِ سرِ کوئے تو گرد بر کفن دارد

گر جاں سپرد ذوقِ حیاتِ ابد گرفت ؛ از ہیچ کشتۂ قاتلِ ما شرمسار نیست

افتادگان چو تکیہ بدستِ دعا کنند ؛ صد درد را بہ قطرۂ اشکے دوا کنند

از کردہ کس خجل نہ شود روز بازخواست ؛ گر پرسشِ گناہ ز من ابتدا کنند

در آتشم ز شرمِ گنہ وائے بر دلم ؛ گر در عذابِ من بہ ہمیں اکتفا کنند

عذاب میں فقط دوزخ کی آگ پر اکتفا نہیں۔ ہزاروں روحانی دل و دماغ کے صدمے ہیں جنکے آگے آتشِ دوزخ پانی بھرتی ہے ؛

چوں موئے بمو حالِ مرا زلفِ تو داند ؛ آشفتگیٔ حالِ پریشاں چہ نویسم ؛......

اس شعر پر اس مضمون کو ختم کرتا ہوں +

صلائے عام

(زبان کا مرتبہ خاصکر اپنی زبان کا)

انسان کی زندگی کا تانا بانا اس کی زبان ہے۔ یعنی جس طرح کپڑے کا تانا بانا اگر سوتی ہے تو سوت۔ اونی ہے تو اون۔ اور ریشمی ہے تو ریشم پر موقوف ہے اور اگر ملواں جلواں ہے تو کم و بیش انہیں چیزوں کے میل جول پر منحصر ہے: اسی طرح انسان کی زندگی کا مدار زیادہ تر زبان پر ہے ؛ زبان چاہے نرم ہو یا سخت۔ خوش کن ہو یا دل آزار جھوٹی ہو یا سچی۔ اپنی ہو یا پرائی۔ بندہ کی ہو یا خالق کی۔ زندگی کا مدار زبان پر سمجھئے ؛ یہاں اپ کہیں گے کہ گونگے بھی تو جیتے ہیں؟ آپ گونگوں سے پوچھئے کہ گونگے اس کا جواب کیا دیتے ہیں؟ جس طرح باجوں میں بربط و سارنگی و ستار اور دوتارے تار پر بجتے ہیں اسی طرح انسان کی زندگی کے تار و پود کا مدار زبان پر ہے: یعنی سوت کا تار ہو یا اون کا یا ریشم کا

رسائل کا مدار تار پر ہے جو تانے بانے میں چلتا ہے اور اسی طرح کا کپڑا نکلتا ہے ؎

ترکس ہماری نظر سے حرکت سے ملکتی ہے ۔ بیمار کی نکلتی ہے بیمار سے غرض

زبان ارنی گوئے طور کی ہو یا اس کا جواب لن ترانی ۔ محبت کی زبان ہو یا غصہ کی جب چڑھی ہوا اگر کلام الٰہی پہاڑ پر نازل ہوتا تو پہاڑ کانپ اٹھتے ۔ کوہ طور سے پوچھئے کہ جلا کیوں ؟ ؎

آتی ہے یہ سوختۂ طور سے صدا ۔ نظارۂ جمال غضب ہے جلال کیا

رہا نہ لن ترانی کا نتیجہ حضرت کو غش آگیا ؎

رہا مجھ میں دم آواز لن ترانی سے ۔ کلیجہ خون ہوا میرے اس سخن سے ہوا

حضرت موسےٰ کو کلیم اللہ اس لئے کہتے ہیں کہ خدا سے ہم کلام ہوئے ۔

توریت میں ہے کہ شروع میں اندھیرا تھا ۔ خدا نے کہا کہ روشنی ہو اور ہو گئی ۔ انجیل میں ہے کہ شروع میں کلام تھا اور کلام خدا کے ساتھ تھا : اسلام کا عقیدہ ہے کہ لفظ کُن سے تمام کائنات پیدا ہوئی ۔ الہام و وحی والقا اور کُتب سماوی یہ سب کلام نہیں تو اور کیا ہیں ؟

کلام نہ صرف آغازِ عالم بلکہ انجامِ زندگی بھی ہے ۔ مرتے وقت مرنے والے سے دیکھنے والے تاکید کرتے ہیں کہ خدا کا نام لو ۔ یٰسین سناتے ہیں کلمہ پڑھواتے ہیں ۔

اگلی کتابیں اگر ہم تک نہ پہونچتیں تو ہم جانور سے بدتر رہ جاتے یہ کتابیں اگلوں کی زبانیں ہیں ۔ اور اب ہم اگر اپنے تجربے اور معلومات نہ چھوڑیں تو ہماری زندگی بیکار سمجھئے ۔ سنین ماضیہ اور روزمرّہ کے حالات و واقعات کا مدار زبان پر ہے کہ سنہ عیسوی ۱۹۲۳ اور ہجری ۱۳۴۱ ہیں ۔ پچھلے ہفتہ میں آج جمعہ تھا اس لئے آج بھی آٹھویں دن جمعہ آیا

توریت نہ ہوتی تو انجیل کا وجود مشکل تھا۔ اور قرآن شریف کی بنیاد زیادہ تر صحف انبیا پر ہے ÷ غرض کلام الٰہی و انسانی دونوں میں زبان ہی کا اثر ہے ÷ یہہ کلام نظم ہو یا نثر زبانی : اور جس طرح میں نے شروع میں سوتی و اونی و ریشمی کی تمثیل عرض کی۔ کپڑے میں جیسا تانا بانا ہوگا ویسا ہی کپڑا بنا جائیگا۔ سوت کے تانے بانے سے سوتی کپڑا۔ اون سے اونی اور ریشم سے ریشمی کپڑا نکلیگا ÷ اسی طرح زبان کا بھی نظم و نثر معمولی و نامرغوب۔ مذہبی اور تاریخی خوش کن اور پند و نصائح ہر طرح کے کلام دیکھ لیجیے ÷ نظم میں قصائد کے مقابلہ میں مرثیہ اور نثر میں الف لیلہ کے مقابلہ میں تاریخ فرشتہ۔ طلسم ہوشربا اور بوستان خیال کے ساتھ چہار درویش اور قصہ حاتم طائی موجود ہے ÷ مزاج یار کی طرح ہر زبان کی لٹریچر بھی ہیرنگی روزگار کا نمونہ نظر آتا ہے۔ اور لطف یہہ ہے کہ یار کے تلون کی طرح یہہ رنگ نہایت دلفریب معلوم ہوتے ہیں

لیکن اسی کپڑے کی مثل کے موافق میرا عقیدہ حضرت شیخ سعدی رح کی رائے سے بہت ملتا ہوا ہے کہ ؎

کہن خرقہ خویش پیراستن ÷ بہ از جامہ عاریت خواستن

اپنے گھر کا کپڑا مانگے کے لباس سے کہیں اچھا ہے۔ خانہ ساز شربت بازار سے منگائے ہوئے سے زیادہ قابل اعتبار ہے ÷ فصاحت کسی زبان کی ہو بُری نہیں۔ لیکن اپنی زبان کی خوبی کا کیا کہنا! پہلوٹھی کے بچہ کا پہلے پہل ماں کہکے پکارنا۔ ماں کے لیئے تمام دنیا کے راگ سے اچھا معلوم ہوتا ہے۔ بچوں کے منہہ سے تتلا کر مانگنا دعا گنج العرش سے زیادہ اثر کرتا ہے میرا عقیدہ ہے کہ زبان ہو اور اپنی! حضرت موسےؑ نے خدا سے اپنی زبان میں باتیں کیں اور خدا نے بھی انہیں کی زبان میں جواب دیا ÷ خدا کو بھی اپنے بندوں کی زبان کی رعایت منظور ہے کہ جو زبان بندوں کی ہو اُس میں باتیں کرتا ہے اور جس ملک میں ہادیان دین بھیجتا ہے

اسی ملک و قوم کی زبان میں اپنا کلام نازل کرتا ہے ۔ اب جو مدت سے اللہ میاں چپ ہیں اس کا سبب یہی معلوم ہوتا ہے کہ آپ ہندوستانی ہو کر اردو میں بات نہیں کرتے اپنی زبان چھوڑ بیٹھے ۔ میں اردو میں جو عرض کرتا ہوں وہ گونگے بہرے کا معاملہ ہو جاتا ہے ۔ آپ اور ہم دونوں ہندوستانی ہیں آپ میری زبان سمجھیں اور مجھے میری زبان میں سمجھائیں ۔ یہ کیا کہ میں آپ کے منہ کی طرف دیکھوں اور آپ منہ پھیر کر جواب دیں ؂

کس سے پوچھوں کہ کیوں بات نہیں کرتے اب
کیا کہوں منہ نہیں پڑتا مری گویائی کا

غزل جناب مولوی بشیر الدین احمد صاحب بشیر رئیس دہلی

وہ آج آتے ہیں ای نامہ بر یہ خوب کہی ۔ خبر یہ خوب ملی ہے ۔ خبر یہ خوب کہی ۔ کشش تھی جذبۂ دل کی جو اُن کو لائی یہاں دعا میں میری نہیں ہو اثر ۔ یہ خوب کہی ۔ تمہارے وعدے کا مجھ کو بھلا ہو کیسے یقیں ۔ لگائی شرط اگر کی ۔ مگر یہ خوب کہی یہ ہم آپ کا ہر آئی رات ہے کتنی ۔ "سحر کا بجتا ہے دیکھو گجر" یہ خوب کہی ۔ ابھی تو آئے ہو کچھ دیر بھی نہیں گزری اذانِ فجر ۔ نمازِ سحر ۔ یہ خوب کہی ۔ یہ زندگی تو خود ایک جیتے جی کی دوزخ ہے ۔ عذابِ دوزخ و نارِ سقر ۔ یہ خوب کہی پلا کے زہر یہ کہتے ہو اس کو پی جاؤ ۔ دوا یہ اچھی ہے اور زود اثر یہ خوب کہی ۔ تمہاری راہ ہے مشرق ۔ ہماری مغرب کی پھر اس پہ کہتے ہو ہیں ہم سفر ۔ یہ خوب کہی ۔ تمہیں ہے شرم نہیں ۔ جھوٹی قسمیں کھاتے ہو ۔ نشانہ کے لئے ہے میرا سر یہ خوب کہی خوشا نصیب ہوا بار ور درختِ امید ۔ یہیں سے مل گیا تجھ کو ثمر ۔ یہ خوب کہی ۔ نتیجہ ترکِ موالات کا ہے شور و شر پھر اس پہ کہنا یہ ہے بے ضرر یہ خوب کہی ۔ غزل بشیر کی ہے لاجواب ۔ کیا کہنا ۔ نہ لگے کسی کی نہ اس کو نظر ۔ یہ خوب کہی ۔

محشرِ خیال

اس سُرخی سے میری غرض وہی ہے جو **غالب** کے اس شعر سے ہے کہ ؎

ہے آدمی بجائے خود اک محشرِ خیال ؛ ہم انجمن سمجھتے ہیں خلوت ہی کیوں نہ ہو ؛

میرا مطلب یہہ ہے کہ انسان کو تنہائی میں خود بخود ایسی باتیں سوجھتی ہیں کہ خلوت میں انجمن کا لطف آجاتا ہے جسے ہنگامۂ محشر سے کم نہ سمجھنا چاہیے ؛

محشر کی بڑی تعریف یہہ ہے کہ بڑا ہجوم ہوگا - ایسا ہجوم کہ آج تک دیکھنے میں نہیں آیا - جب دیکھنے میں آئیگا اُس وقت دیکھا جائیگا : اُس سے پہلے جو کچھ ہوچکا اور ہو رہا ہے اسے دیکھ لیجیے ؛ ؎

سب کے آگے نہیں اظہارِ محبت منظور ؛ کیا کہوں حال ابھی داورِ محشر ہے نا -

نظامِ عالمِ اسباب میں یہہ سمجھ میں نہیں آتا کہ خلّاق ہیژدہ ہزار عالم نے (گو ہیژدہ ہزار سے کہیں زیادہ عالم ہیں) ہر عالم کے مناسبِ حال اسباب مُہیا کیا لیکن انسان کا معاملہ زیادہ تر ناقص رہ گیا ؛ اس پر آپ ابھی خفا نہ ہوں : پہلے میری عرض سُن لیں ؛ عرض یہہ ہے کہ انسان کی پیدایش سے لیکر موت تک عالمِ اسباب نے بچپن اور جوانی میں حسبِ حالِ انسان آرام و آسایش کے اسباب و سامان مُہیا کر دئے - بچپن میں ماں باپ کو ہماری

پھر پیری کی فکر آگاہی - جوانی میں کمال شباب کے حسن وعشق کا جوش رہا جس حسین کو
ہم نے دیکھا اور جس سنہ میں دیکھا دونوں کے دلوں پر اثر ہو گیا؛ لیکن بڑھاپے میں کوئی
صورت آرام کی نہیں ہے

نزدیک ہے خزاں کا زمانہ بھی اسے گلو ؛ یاد آئیں گی نگاہیں حسن شباب کی

عالم اسباب کا یہ نقص نہیں تو کیا ہے کہ بچوں اور جوانوں کے لئے بے
مانگے سب کچھ مہیا کیا جائے اور بوڑھوں کو مانگنے پر بھی کچھ نہ ملے؛ بہت ہوا تو فقیروں
کے سوال پر جب دینا نہ ہوا اسطرح کہہ دیتے ہیں آگے شاہ جی برکت سے ہم سے کہا جاتا
ہے کہ آگے دیکھو - بوڑھوں سے کہا جاتا ہے کہ آگے چل کر مرنے کے بعد امید کھو
مرنے کے بعد کی امید کے لئے عقیدہ کے سوا اور کوئی دلیل نہیں ہے

یہ بڑھاپا ہے وہی اس سے خوب واقف ہے؛ بڑھاپا عہد سے معبود نے جو پایا نہ ؛

انسان کے لئے بچپن اور جوانی سے زیادہ بڑھاپے میں آسایش و آرام کی
ضرورت ہے - آپ نے دیکھا ہے کہ پہاڑ کی چڑھائی پر تکلیف اور اُتار کے وقت آسانی
ہوتی ہے - برخلاف اسکے یہاں چڑھائی میں آرام اور اُتار میں تکلیف دیکھ لیجئے؛ بچے
آرام سے پالے جاتے ہیں جوانوں کو زیادہ عیش نصیب ہے - مگر بوڑھوں کو بیکار سمجھکر کوئی
انکی خبر نہیں لیتا؛ جوانوں کو سختی سے تکلیف بہت کم ہوتی ہے کہ جوانی میں قوے مضبوط
ہوتے ہیں - چنے چبا کر بھی پیٹ بھر سکتا ہے - بڑھاپے میں جب دانت رخصت ہو گئے تو
ٹھنڈی چپاتی بھی مشکل سے حلق سے اُترتی ہے؛ تعجب ہے کہ عالم اسباب ہر موسم اور حال کے
موافق ہر چیز کے لئے آرام و آسایش کا سامان پیدا کرے اور بوڑھاپے کو بے سروسامان
چھوڑ دے - ہے

گریباں پھٹتے ہیں غنچوں کے بلبل تنکے چنتے ہیں ❊ ہمیشہ موسم گل میں یہی افسانہ رہتا ہے

موسم گل تو بچپن اور جوانی کا نام ہے۔ بڑھاپا موسم خزاں ہے جس میں نہ گل کا پتہ ہو نہ بلبل کا ❊

لیکن جب عالم اسباب کا یہی طریقہ ٹھہر گیا کہ خزاں میں پھول کیا پتہ بھی نہ رہے تو اس میں دخل دینے سے کیا فائدہ؟ اس کو اپنی وضع پر چھوڑ دینا چاہئے۔ اس کو چھوڑ کر ہم بھی چل دیں گے ❊ جب تک چھوٹیں تب تک کیا کرنا مناسب ہے؟ ارسطو کے قول کے موافق آرام کی صرف ایک صورت ہے کہ نفس کی خواہشوں اور عقل کی ہدایتوں کا پلہ برابر رکھیں۔ آرام خوش حالی کا نام ہے جس کے ساتھ نیکی لازمی ہے ❊

اب دیکھنا ہے کہ آرام کی فکر اسی عالم فانی تک محدود رہے یا اس کے بعد بھی؟ اس عالم فانی میں تو آرام قطعی ضرور ہے: بعد میں گو بحث طلب امر ہے مگر وہاں کا اطمینان بھی انسان کے لئے مناسب ہے ❊ خاصکر جب کہ یہہ مسئلہ ابھی طے نہیں ہوا کہ روح کا مدار جسم پر ہے یا جسم کا مدار روح پر۔ بعض کا عقیدہ ہے کہ مکڑی کے جالے کی طرح جس طرح مکڑی اپنے لعاب دہن سے جالا پیدا کرتی ہے روح جسم پیدا کرتی ہے لیکن جب روح سے جسم پیدا ہوتا ہے تو جسم سے روح کا پیدا ہونا کیوں غلط ہے؟ اخبار پائینیر کے ریویو نگار نے اس بحث کے متعلق بہت پاکیزہ باتیں لکھی ہیں[۵]۔ روح جسم کا تعلق ساز اور ساز کی آواز سے مشابہت رکھتا ہے کہ جب ساز ٹوٹ جائے تو آواز پھر کہاں؟ اس تشبیہہ کو ناقص بتاتے ہیں کہ روح کا وجود علیحدہ ہے۔ ساز اور آواز کی طرح ایک دوسرے پر منحصر نہیں ❊ موت ایک جسمانی حرکت ہے اور ریل کے ٹرمینس کی طرح (جہاں لین ختم ہو) موت کے ساتھ جسمانی جھگڑوں کا خاتمہ سمجھنا چاہیے ❊ فلاطون نے

[۵] پائینیر کیم جولائی سنہ ۱۹۲۳ء

مئی ۱۰

یعنی روح کی تندرستی اور بدی روح کی بیماری قرار دی ہے ؛ تناسخ کا مسئلہ دل کو نہیں لگتا کہ کرے [illegible] ہی والا اور پکڑا جائے موچھوں والا ؛ انسان کے لئے موت کی فکر بیکار ہے ۔ زندگی کی فکر مقدم ہے ؛ موت کی فکر میں زندگی کے کام نہیں سنورتے

اگر روح کو فنا نہیں تو روحانی دنیا کی کوئی [illegible] نہیں ہو سکتی جس طرح مُردوں کی تعداد زندوں سے ہمیشہ زیادہ رہتی ہے ؛ خیر سے جسم جلدی گل سڑ جاتا ہے ۔ ورنہ مُردوں کے لئے ساری دنیا کی زمین متکفی نہ ہوتی ؛ اس کے متعلق یہ رائے ہے کہ عالم ارواح کی تعداد نہ گھٹتی ہے نہ بڑھتی ہے ۔ علام الغیوب نے جس قدر اپنے ذہن میں قرار دے رکھی ہے شروع سے وہی چلی آتی ہے اور چلی جائے گی ؛ نیچر کی کوئی چیز نہ گھٹتی ہے نہ بڑھتی ہے شروع عالم سے جس قدر اور جس طرح جو چیزیں بن گئیں اُن میں کمی بیشی ہو نہیں سکتی ۔ اگر آج آپ کو کسی میں کمی نظر آتی ہے تو کل اس کی کسر نکل جائیگی ۔ آج اور کل پر کیا منحصر ہے ؟ آپ کی عمر میں نہیں تو پوتے پروتوں کے وقت میں ۔ سو برس میں نہیں تو ہزار برس میں ۔ ہزار برس میں نہ سہی لاکھ میں سہی ۔ غرض ابد سے ازل تک یہی سلسلہ جاری رہیگا ؎

زندہ ہوں کہ مری خاک سے خُم بنتے ہیں ؛ پاؤں مر کر بھی نہ نکلا مرا میخانہ سے ؛

رہا اہل تصوف کا مسئلہ کہ قطرہ دریا میں مل جاتا ہے یہ معمولی خیال سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا

اس مضمون کے آخر حصہ کے چند نکات پائنیر کے ریویو نگار کے ریویو سے ماخوذ کئے گئے جو ۱۸ جولائی سنہ ۱۹۲۳ء کو اس سُرخی کے نیچے شائع ہوا کہ ۔

The Problem of Life and Death, on the "Idia of Immortality."

کفر و دین

از روئے شاعری

متاعِ کفر و دیں بے مشتری نیست ؛ گروہے ایں گروہے آں پسندند

دُنیا میں کفر و دین کا جھگڑا ازل سے چلا آتا ہے اور ابد تک چلا جائیگا۔ اور طرفہ یہہ ہے کہ دونوں اپنی اپنی حالت پر برقرار ہیں: نہ کفر میں ترقی نہ دین میں کمی نظر آتی ہے ؛ عالمِ اسباب میں دونوں کا وجود لازمی ہے ؎

محرابِ کعبہ ابروئے بت سے ہے آشکار ؛ ہیں کفر و دیں میں میل کے ساماں نئے نئے

شیخ و زاہد نے دین کی طرفداری میں دفتر کے دفتر لکھڈالے تو شاعروں نے بت و بُت کدہ کی ہیچ میں دیوان کے دیوان کہہ ڈالے۔ شعرا کا تکیہ کلام دیر و حرم ہے بلکہ شاعری کی جان ذکر بُت و صنم ہے ؛ ؎

جان کر اُس بُت کا گھر کعبہ کو سجدہ کر لیا ؛ اے برہمن مجکو بیت اللہ نے دھوکا دیا

نیکی و بدی کی طرح کفر کو سیاہی سے اور دین کو سپیدی سے تشبیہہ دیتے ہیں

دین کو اچھا اور کفر کو برا جانتے ہیں: چہرۂ یار کو مصحف اور خالِ سیاہ کو ہندو بتاتے ہیں۔ اور لطف یہ کہ دونوں کو رونقِ حسنِ خوباں سمجھتے ہیں۔ آپ نے دیکھا ہے کہ گناہ کو سیہ کاریوں سے تمثیل دیتے ہیں۔ حالانکہ حسینوں کے اسبابِ حسن میں سیاہی کو زیادہ دخل ہے۔ زلف و کاکل و گیسو۔ آنکھ کی پتلی۔ خالِ رخِ یار کی خوبی سیاہی سے ہے: بادل سیاہ اچھے۔ لیلےٰ کے رنگ کی طرح خیمہ لیلےٰ سیاہ سنا ہے اور سلاطین عباسیہ کا نشان اندھیری رات کی طرح سیاہ تھا۔ حشر کے دن جب آفتاب سوا نیزہ پر آجائیگا اُسدن بقول حضرت منیر ہماری سیہ کاریاں سایہ کا کام دے جائیں گی۔ کیونکہ سایہ کے لئے سیاہی ضرور ہے ؎

گھیرے ہوئے ہیں میری سیہ کاریاں مجھے ۞ برپا ہے دشتِ حشر میں خیمہ سحاب کا

معمولی طور پر روز مرہ کی زندگی میں کفر و دین کا دو عملہ بعض طبیعتوں کے لئے سنگِ رہِ مقصود سمجھا جاتا ہے ؎

کفر و اسلام نے مقصد پہ پہونچنے نہ دیا ۞ کعبہ و دیر کو سنگِ رہِ منزل سمجھے

مگر شاعری میں دونوں طرح سے منزلِ مقصود پر پہونچنے کا سہارا بتاتے ہیں: حضرت خواجہ میر درد فرماتے ہیں ؎

شیخ کعبہ ہوکے پہونچا ہم کنشتِ دل میں ہو ۞ درد منزل ایک تھی کچھ راہ ہی کا پھیر تھا

شعرا کے نزدیک کفر سے اسلام کی زینت ہے کہ ؎

ہوا جب کفر ثابت ہے یہ تمغائے مسلمانی ۞ نہ ٹوٹا شیخ سے زنارِ تسبیحِ سلیمانی ۞

اس زینت کی تشبیہہ اس شعر میں بھی اچھی بیان کی ؎

عالمِ بالا کی زینت میری بربادی ہوئی ۞ بوریا اُڑ کر بساطِ بامِ گردوں ہوگیا

کُفر و دین کے جھگڑے سے بچنے کے لئے آزادمنش طبایع نے دیر و حرم دونوں کو دُور سے سلام کرنا پسند کیا کہ ؎

حرم و دیر سے بچے سالک ؛ دو کھنڈر راستے میں پڑتے ہیں

اِس مضمون کو جناب منیر نے خوب باندھا ہے ؎

پیرِ طریقِ عشقِ بتاں کو جو پوچھے شیخ ؛ کلمہ کی اُنگلی سمتِ برہمن اُٹھائیے

حرم و دیر میں ہے جلوہ پُرفن اُنکا
دو گھروں کا ہے چراغ اک رُخِ روشن اُنکا

کعبہ سے مجکو لائے سوادِ کنشت میں ؛ اصلاح دی بتوں نے خطِ سرنوشت میں

پھر جائے خدائی تو بتوں سے نہ پھریں ہم
پتھر میں بھی اللہ کے اسرار بہت ہیں

کعبہ خداپرستوں نے جبراً بنا لیا ؛ اصلی صنم کدہ دلِ خانہ خراب تھا

توڑ کر کعبۂ دل خوش ہوئے اللہ اللہ
کس خدا نے یہہ کہا تھا بُت کا فر ہونا

صلائے عام - یہ مضمون محض شاعرانہ ہے: نثر سے اسے اسی قدر تعلق ہے جسقدر تصویر کو فریم سے اور نگینہ کو انگوٹھی سے ہے - یعنی **غالب** کے اُردو کے اشعار کی طرح کہ شعر میں برائے نام ایک آدھ لفظ اُردو کا آگیا تاکہ قسم کھانے

کو جگہ ہو جائے کہ شعر اُردو کا ہے

تیشہ بغیر مر نہ سکا کوہکن اسدؔ ٭ سرگشتۂ خمارِ رسوم و قیود تھا

اس میں دوسرے مصرعہ کے لفظ تھا کے سوا اُردو کا اور کیا ثبوت ہے؟ لیکن اس غزل کے مضمون کا کیا کہنا ہے

بجز قیس اور کوئی نہ آیا بروئے کار ٭ صحرا مگر بہ تنگیٔ چشمِ حسود تھا
آشفتگی نے نقشِ سویدا کیا درست ٭ ظاہر ہوا کہ داغ کا سرمایہ دود تھا
تھا خواب میں خیال کو تجھ سے معاملہ ٭ جب آنکھ کھل گئی نہ زیاں تھا نہ سود تھا
لیتا ہوں مکتبِ غمِ دل میں سبق ہنوز ٭ لیکن یہی کہ رفت گیا اور بود تھا

ڈھانپا کفن نے داغِ عیوبِ برہنگی
میں ورنہ ہر لباس میں ننگِ وجود تھا

شاعری سے غرض محض زبان نہیں۔ مضمون کی زیادہ ضرورت ہے۔ یہ چند شعر اوروں کے ہزار دیوانوں سے مرتبہ میں بہت بڑھ کر ہیں جن کو زبان کے سوا اور کچھ نہیں آتا ٭

اِنشا پردازی

تعلیم قدیم کے نصاب میں سب سے زیادہ انشا پردازی پر زور دیا جاتا تھا۔ فارسی میں اس فن کی کتابیں اسقدر ہیں کہ ان کا کتب خانہ علیحدہ جمع ہو سکتا ہے ظہیرا ے تفرشی۔ طاہر وحید۔ ابوالفضل۔ ملا طغرا۔ مادھورام۔ بڑے بڑے نامور منشی گزرے ہیں ؛ ابوالفضل نے توشاہان ایران کے مقابلہ میں ایک طرزِ خاص کی انشا پردازی ایجاد کی کہ اکبر جو پڑھا لکھا نہ تھا ابوالفضل کی وجہ سے مشہور ہوگیا ؛ شاہی خط کتابت ایک خاص فن تھا جس کے لئے غایت درجہ کی لیاقت ضرور تھی۔ ان کی تحریریں انشا و ادب کی معراج مانی جاتی تھیں ؛ اس طرز کے لکھنے والے تو درکنار سمجھنے والے بھی اب دُنیا میں بہت کم ہیں ؛ سچ پوچھیے تو اگلی انشا پردازی پر حاوی ہونے کے لئے ایک عُمر چاہیے ؛ مستند انشا پردازوں اور منشیوں کو چھوڑ کر بادشاہوں نے بھی اس فن میں کمال پیدا کیا۔ عالمگیر بادشاہ نے جو رقعے اپنے بیٹوں کو لکھے غایت درجہ کی انشا پردازی کے نمونے ہیں ؛

قدیم طرز کی خط کتابت میں حفظِ مراتب کا بڑا خیال رہتا تھا کہ بڑوں کے لئے القاب آداب علیحدہ۔ برابر والوں کے لئے علیحدہ اور چھوٹوں کے لئے علیحدہ اور علما و فضلا اور

ہر پیشہ کے آدمیوں کے لئے علیحدہ تھے: آج کل کا طرز نہ تھا کہ "ڈیر فلاں" میں سب آگئے۔

ابتدائے سلطنت انگریزی میں ہندوستان کے اُمرا و حُکام کے درمیان فارسی میں خط کتابت کا دستور تھا۔ نواب گورنر جنرل بہادر اور سب اعلیٰ حکام فارسی میں لکھتے پڑھتے تھے۔ یہہ تحریریں انشا پردازی کی اچھی یادگار ہیں: غدر سے پہلے تک سرکاری دفتر فارسی میں تھے اور فارسی کے اچھے اچھے منشی تلاش کرکے رکھے جاتے تھے:

اتفاق سے مرزا **قتیل** کی فارسی تحریریں خط کتابت کے متعلق میری نظر سے گذریں۔ متاخرین میں ان کی انشا پردازی بہت مستند سمجھی جاتی تھی: ان کے مکاتبات اور مراسلات و مکتوبات کو چھوڑکر جو نواب گورنر جنرل بہادر۔ مسٹر جان بیلی صاحب بہادر مسٹر ایڈمنسٹن صاحب بہادر۔ مسٹر سٹین صاحب رزیڈنٹ دہلی۔ اور اور اعلےٰ حُکام کے نام لکھے گئے معمولی رقعوں کی عبارت بھی نہایت پاکیزہ ہے: مسٹر بیلی صاحب بہادر کا خطاب تھا "عماد الدولہ افضل الملک جان بیلی بہادر ارسلان جنگ"۔ میکسٹن صاحب بہادر کے شُقہ کا سرنامہ یہہ ہے:۔

"امارت و ایالت مرتبت۔ حشمت و شوکت منزلت۔ طراز قبائے دانش روز افزوں و نقش نگین تدبیرات حکمت مقرون۔ یاقوت آبدار معدن والا شانی و نہال پرمیوہ بوستان عالی خاندانی۔ امیر عالیشان بلند مکان۔ عزیز تر از جان میکٹن بہادر"

مسٹر ایڈمنسٹن صاحب بہادر کے شقہ کا سرنامہ اس طرح ہے کہ۔

"امارت و ایالت مرتبت حشمت و شوکت منزلت۔ شمع افروز شبستان روشن بیانی و فتیلہ پیرائے چراغ نکتہ دانی۔ مترجم مقالات فصحائے فرنگ دہواخواہ بے ریو و رنگ مفتاح گنجینہ معانی و ہم طبع معلّم ثانی۔ امیر عالیشان بلند مکان عزیز تر از جان احتشام الدولہ محتشم الملک

مسٹر بیل بنجمین ایڈمنسٹن بہادر حشمت جنگ"؛
جناب مارکوئیس آف ہیٹنگس بہادر کے نام کے ساتھ اشرف الاشراف
اور گھڑی کو "آلہ ساعت بینی" لکھا ہے ؛

اکثر تحریریں صاحب عالم مرزا سکندر شکوہ بہادر کیطرف سے ہیں ؛
شقوں اور اور مکاتبات کی عبارت کا اس مضمون میں نقل کرنا مشکل ہے چند رقعوں کی نقل نمونہ
کے طور پر ذیل میں درج ہے ؛ انکا اختصار اور طرزِ اظہارِ مطلب نہایت پسندیدہ ہے ؛

پہلا رقعہ مشتمل برتشریف بری جناب عالی ور کوٹھی صاحب کلاں ۔
"فردا کہ روز شنبہ است انتظار اینجانب باید کشید"؛

دوسرا رقعہ ۔ "انشاءالله العزیز الحکیم صباح ہمانجا یکدگر را خواہم دید"؛

تیسرا رقعہ ۔ "ہمیں کہ دوشنبہ بگذرد مارا اول صبح نزدِ خود تصور باید نمود"؛

چوتھا رقعہ ۔ "ایں چند پاس کہ علاقہ بہ امروز دارد بسر آید کہ آں مہربان را آمدہ بینم"؛

پانچواں رقعہ ۔ "دلِ بے صبر و سکون در خانہ بے دیدار دوستاں قرار ندارد بسبیلِ علاجش
بہ ازیں نیست کہ فردا نزد آں صاحب برسیم"؛

چھٹا رقعہ ۔ "بعد نماز بامداد فردا نزد آں مہربان آمدہ چائے پانی بعمل خواہد آمد"؛

ایسے رقعے چالیس ہیں جو صاحب عالم نے بڑے صاحب بہادر کے پاس خود
تشریف لیجانے کے لئے لکھے ۔ چالیس رقعے جو صاحب ممدوح کو بلانے کے واسطے لکھے
گئے اُن کے نمونے یہہ ہیں :۔

(۱) فردا بوقت معین چشم مشتاق از روزنِ کاخ جا وید باید ساخت ؎
قدمے رنجہ کن اے دوست بہ کاشانۂ ما ؛ ہمہ تن چشم براہ تو بود خانۂ ما ؛

(۲) - فردا موافقِ معمول ... دیگران را بقدم خود رشکِ دربہارستانِ ارم نمودن ضرور است

ع باید آمد کہ دیدہ مشتاق است ؛

(۳) غنچۂ خاطر نگراں کہ بے دیدار شریف انقباض کلی دارد فردا خود آمدہ بہ سر شگفتگی

باید آورد ؎

بہارِ عمر ملاقات دوستداراں ست ؛ چہ خط بر دخضر از عمرِ جاوداں تنہا ؛

(۴) چو دریں دو سہ روز ہم دیگر را نہ دیدایم دریائے قلق در موج و ہجوم لشکرِ

بیقراری گرد قلعۂ دل فوج در فوج است فردا بقدوم خود مسرور باید کرد ع

اشتیاق از حد گزشت اے مہرباں از در درآ ؛

(۵) - کثرتِ شوق در شہرِ دل چیناً آتش افروز اضطراب نیست کہ بے زلال

کلمات فرحت آیات آں مہربان انطفا پذیرد دریں صورت فردا رنج راہ

باید کشید ع شوق را حدے تمنا را ست پا یاسنے بیا ؛

میری غرض ان رقعوں کے نقل کرنے سے یہہ ہے کہ اُس وقت کے حکام

اعلیٰ کو فارسی میں کسقدر دخل تھا جو ایسی تحریر سمجھ سکتے تھے۔ ان سے کہیں زیادہ شُقّوں

کی عبارت ہوتی تھی۔ شُقّے طوالت کی وجہہ سے نقل نہیں ہو سکے ؛

گو میں نے ابھی عرض کیا کہ اس مضمون میں شُقّوں کے نقل کرنے کی گنجایش

نہیں لیکن مثال کے طور پہ ایک شُقّہ کا خلاصہ جو نواب گورنر جنرل لارڈ منٹو بہادر کو لکھا

گیا یہاں لکھتا ہوں اور آپ کے آرام کے لئے اُردو میں ترجمہ کئے دیتا ہوں :-

× × × × بعد القاب و آداب مخفی نماند کہ ہر کام کا پورا ہونا وقت پر منحصر ہے اور وقت کا

ظہور ارادۂ آلہی سے تعلق رکھتا ہے۔ چنانچہ چاند شروع ماہ میں ترقی کرتا ہے اور آخر مہینہ میں کسی حکیم کی طاقت نہیں کہ اول شب کو بدر کرسکے اور چودھویں رات کو ہلال بنا سکے۔ یہ بات تو عالم علوی یعنی فلکیات کے متعلق ہوئی۔ عالم سفلی یعنی زمین کے متعلق بھی کوئی پھل بے موسم نہیں ہوتا: لیکن انسان مجبور ہے اس کے لئے کوشش وسعی کی شرط ہے۔ اس کوشش کا نتیجہ آرزو کے موافق ہو یا نہ ہو۔ میں سارے امور خدا کی مرضی پر چھوڑتا ہوں۔ انسان کو بے قصور سمجھتا ہوں: اگر کام مرضی کے موافق ہوگیا تو جس کے ذریعہ سے کام بن پڑے اُس کا ممنون ہوتا ہوں مگر یہہ صورت بھی بغیر تائید ایزدی ممکن نہیں" × × × × × × × × (شُقّہ صاحب عالم و عالمیان مرزا سکندر شکوہ بہادر برائے نواب گورنر بہادر)

یہہ عبارت فارسی میں نہایت فصاحت سے ادا کی گئی۔ لارڈ صاحب بہادر اور اُن کے سکریٹری صاحب واقعی بہت اچھے فارسی کے جاننے والے ہوں گے۔ شُقّہ اعلیٰ درجہ کے فلسفیانہ خیال کا نمونہ ہے۔

لہ لارڈ صاحب ممدوح کی عنایت سے صاحب عالم کو ہزار روپیہ ماہوار کا وثیقہ سرکار انگریزی سے ملا تھا اُس کے شکریہ میں یہ شُقّہ بھیجا گیا۔

وادیِ ایمن

گلی میں رہنے والے وادیٔ ایمن کے بیٹھے ہیں ؛ ذرا اُن سے یہ کہدو جو ادھر بن ٹھن کے بیٹھے ہیں

یہ حضرت **ریاض** خیرآبادی کا جوانی کا کلام ہے۔ جب گورکھپور اُن کے اخبار سے خاص شہرت رکھتا تھا۔ افسوس ہے کہ انکار دہ آلام نے انکی طبیعت ایسی پژمردہ کردی کہ اب مدتوں انکا کلام دیکھنے ہی میں نہیں آتا۔ اور اگر کوئی غزل کسی کی خاص فرمایش سے کہہ بھی دی تو وہ بات کہاں۔ ہمیں حضرت ریاض کے کلام سے جو خاص ذوق تھا اسکا قابل تسلیم ثبوت اس سے زیادہ کیا ہوگا۔ کہ اُنکا پاکیزہ کلام جسقدر ہمیں یاد ہے شاید ہی کسی دوسرے ذہن میں محفوظ ہو۔ خیر آمدم برسرِ مطلب۔ چلمن کی آڑ میں دیکھنے والے سے کسی بیخود و مدہوش کا یہ پیام ذرا چلمن اُٹھاکر تو دیکھئے گلی میں کیسے کیسے جانباز بیٹھے ہیں ارنی و لن ترانی کے واقعات کا مجمل بیان نہیں تو اور کیا ہے۔ اس مجاز میں حقیقت کا لطف ہے اور دل کو لگتی ہوئی باتیں۔ حضرت **ریاض** نے حضرت موسیٰ کے واقعات کو اکثر جگہ نظم کیا ہے اور ان کے ہر شعر میں خاص لطف پیدا ہے۔ شعر۔ دبی زبان سے میرا بھی ذکر کردیا ؛ کلیم طور پر اُن سے جو گفتگو آئے۔ اس شعر میں دبی زبان سے اپنے دردِ دل کا اظہار اور وہ بھی حضرت کلیم اللہ کی زبانی لایق داد و قابل تعریف خوبیاں ہیں جن پر زبانِ اُردو ایک حد تک بجا فخر کرسکتی ہے۔ اس شعر کا مطلع و مقطع خوبیٔ کلام کے لحاظ سے اور سنانے کے قابل ہیں

مطلع۔ لگانے باغ کہاں داغِ آرزو آئے ؛ جہاں نہ پھول نہ پھولوں میں رنگ و بو آئے :

مقطع ریاض تھی جو تصور میں بازگشتِ شباب ؛ جوان ہونے کو پیری میں لکھنو آئے ؛ اب ذرا جناب **جلیل** کی سحر آفرینی ملاحظہ فرمائیے۔ یہ دونوں شاگرد حضرت **امیر** مینائی کے لئے مایۂ ناز و فخر تھے

س سنا ہے جب سے تونے پیاس موسیٰ کی بجھائی ہے ؛ بہت امیدوارِ شربتِ دیدار بیٹھے ہیں۔ خدا جانے حضرت موسیٰ کی پیاس بجھی یا نہیں مگر طور کی ایک جھلک نے اور بہت سے دلوں میں آگ لگادی اور یہ

گلہائے ریاض یا گلکدۂ ریاض

میراں سے ہیں گلچیں کو بنانا دامن گلچیں ؛ اگر کچھ پھول مل جاتے مجھے ساحر کے گلشن سے

گلکدۂ ریاض۔ اس نام کا ایک گلدستہ مدت ہوئی حضرت ریاض نے نکالا تھا جسکی شمیم روح افزا نے ملک کے سخن فہم دماغوں کو معطر کر دیا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب حضرت ریاض کی شاعری شباب پر تھی انکا دل لولوں سے بھرا تھا۔ امنگیں زوروں پر تھیں۔ وضع میں بانکپن اور مزاج میں شوخی عجب بہار دکھاتی تھی۔ بے اختیار زبانِ قلم سے یہ الفاظ نکل جاتے تھے ع دنیا کی پڑ رہی ہیں نگاہیں ریاض پر ؛ کس نوک کا جوان ہے کس آن بان کا وہ بگڑے ہے ریاض ایک جوانِ مست خرام ؛ نہ چپے اور چھپو متا جائے۔ اس زمانہ میں انکی شاعری کے خاص اوصاف شوخیِ بیان۔ لطفِ زبان۔ آمد اور بے ساختہ پن تھے۔ اور یہی وہ باتیں ہیں جن سے کلام میں گرمی اور تاثیر پیدا ہوتی ہے اور خود بخود دل اسکی طرف کھنچ جاتے ہیں۔ گلکدہ کے بعد حضرت ریاض نے ریاض الاخبار ہفتہ وار اور فتنہ و عطرِ فتنہ نکالے اور ادھر لکھنؤ سے منشی امیر احمد صاحب **امیر** مینائی نے پہلے دامنِ گلچیں اور پھر محفلِ گلچیں کو روشناس عالم کیا۔ مگر افسوس کہ نہ دامن رہا نہ گلچیں بقول حضرت **بیدل** دامانِ نگہ تنگ و گلِ حسنِ تو بسیار ؛ گلچینِ بہارِ تو ز داماں گلہ دارد۔ حضرت **ریاض** ادھر اپنے اخبار و گلدستہ میں اپنی گلکاری کے نمونے پیش کرتے تھے ادھر اپنے استاد کے رسالوں میں داد خوش بیانی دیکر ملک سے آفریں و مرحبا سنتے تھے۔ ہمیں یاد ہے کہ ایک مرتبہ ریاض الاخبار میں ایک غزل حضرت **ریاض** نے چھوٹی بحر میں شایع کی تھی جسکا مطلع ہی چیدہ چیدہ سو غزلوں سے بہتر تھا ع خیالِ شبِ غم سے گھبرا رہے ہیں ؛ ہمیں دن کو تارے نظر آرہے ہیں۔ اب حضرت ریاض کثرت افکار آلام کے باعث سے تقریباً ترکِ سخن کر چکے ہیں ہمارے مہربان جناب **لگیر** اکبر آبادی نے عرصہ ہوا اس غیر معمولی خاموشی کے باعث سے ہمارے کرم فرما ریاض کو خدانخواستہ مرحوم ریاض کہہ کر مخاطب کیا تھا۔ ہماری محبت اسکی مقتضی نہیں کہ ہم اُن کو ایسے دلشکن

اندا کے ساتھ یاد کریں مگر وہ دل ریاض کہنے کو ضرور مجبور ہیں - سچ ہے زمانہ یکساں نہیں رہتا۔ دنیا کی گردش و پیچ شگفتہ دلوں کو بھی الٹا یاس خاطر میں مبتلا کر دیتی ہے جس سے انکی معجز بیانی میں وہ کیفیت نہیں رہتی بلبل کے نالے چمن میں آزادی کے ساتھ زمانہ اسیری سے کہیں زیادہ پرلطف ہوتے ہیں۔ کبھی حضرت ریاض یوں گلفشانی فرمایا کرتے تھے ؎ ہمارا جوش مستی میں کوئی کھل کھیلنا دیکھے ۔ وہاں ایک بوتل اور یہاں [illegible] دیگر [illegible] بغل میں شیشہ ۔ ؎ کہیں ریاض بھی پینے پلانے جاتے ہیں ۔ ایک اور شعر بھی سنیے ؎ اب اضطراب ہی ہم میں نہ صبر ہے نہ سکوں ہے نئے رفیق ملے ہیں پرانے جاتے ہیں ۔ ہزاروں تیر و نشتر کلام ریاض میں ایسے موجود ہیں جو سیدھے دل و جگر ہی کی خبر لیتے ہیں۔ کیا شعر کہا ہے سبحان اللہ ؎ ہاتھوں کا کام آج لیا ہے نگاہ سے ۔ آنکھوں میں رکھ کے لائے انہیں جلوہ گاہ سے ۔ ہائے کیا چلبلا شعر ہے ۔ دوسرے میں بالکل انھیں کا فوٹو کھینچ دیا ہے ؎ پھرتے ہیں کیسے حشر میں وہ ہنستے کھیلتے ۔ کچھ دادگر سے کام نہ کچھ دادخواہ سے ریاض کی شوخی انکو اس زمانہ کے شاعروں میں خاص طور سے ممتاز کر چکی تھی اور ہمارا خیال تھا کہ استاد داغ کے بعد اگر کچھ رنگ اگر کسی شاعر کے کلام میں مل سکتا ہے تو وہ ریاض ہیں۔ مگر نہایت افسوس و حسرت سے لکھنا پڑتا ہے کہ اب وہ ریاض ریاض نہیں رہے انکے کلام میں نہ وہ شوخی ہے نہ وہ تاثیر۔ ماہ جون کے **صلائے عام** میں جو غزل خادم نے دو نے رسالہ ہمایوں سے نقل کر کے شایع کی ہے وہ ہرگز اس پایہ کی نہیں ہے کہ اسکو ریاض کی بہترین گلکاری کہا جا سکے ۔ حضرت ریاض ہمارے پرانے مہربان ہیں اسواسطے ہم انکی لغزشوں سے درگزر کر کے صرف اتنا کہنے کو مجبور ہیں کہ اب طبیعت میں نہ وہ شوخی رہی نہ وہ آمد۔ تمام اشعار آورد کے ہیں اداے بیان میں پیچیدگی نے تاثیر کا وہ تمام لطف کھو دیا ہے۔ ہاں سے کلام ریاض شعراے حال کے افکار سے بہتر سمجھا جاتا تھا۔ اسوقت ہم ایک پرانی غزل حضرت ریاض کی عطر فتنہ سے نقل کر کے اس مضمون کو ختم کرتے ہیں آئندہ بشرط فرصت اس مضمون پر کچھ اور اضافہ کیا جائیگا ؎

۱ ہم پر جفا کریں کہ وہ ہم سے وفا کریں ۔ پائیں خدا سے ہم جو تمہیں سے دعا کریں ۔ — سبحان اللہ

۲ صیاد اڑا دیا مجھے سر سے اتار کر ۔ صدقے ترے ہما ترے سر پر اڑا کریں ۔ — خوب کہا ہے۔

۳ وہ دن خدا دکھائے کہ ہم بھی انہیں ستائیں ۔ یہ نازنین حسین ہیں ملا گلہ کریں ۔ — یہ حضرت ریاض کا حصہ ہے

۴ سمجھا دی جاکے توہی تمہیں [illegible] نگاہ یاس ۔ اب کوسنے کا وقت ہے کیا دعا کریں — [illegible] لاجواب شعر ہے

سلاطین دکن

گو سلطنت دہلی از روئے تاریخ مشہور ہے لیکن سلاطین دکن کی دھاک سلاطین دہلی سے کسی طرح کم نہ سمجھنی چاہیئے ۔ سلاطین مغلیہ کی نگاہ میں جو دہلی کے بادشاہوں میں سب سے زیادہ نامور ہوئے ہیں دکن کی سلطنتیں کھٹکتی رہیں ۔ سلاطین دکن کا اقبال و جاہ و حشم اگر سلاطین دہلی سے زیادہ نہ تھا تو کسی طرح کم نہ تھا ۔ دہلی کے اکثر سلاطین سلاطینِ دکن کے حشمت و جاہ پر از روئے رشک مدت تک دکن کے درپے آزار رہے ۔ دکن پر بہت چڑھائیاں ہوئیں اور **عالمگیر** نے تو اپنی تمام عمر اسی جھگڑے میں گذار دی ۔ سلاطین دکن کے دربار میں بڑے بڑے ذی کمال جمع رہے ۔ دکن میں دہلی سے زیادہ اہل علم و فن گزرے ہیں ۔ نیز آثار قدیمہ میں دکن کی پرانی عمارتیں بہت مشہور ہیں ۔

مولوی بشیر الدین احمد صاحب رئیس دہلی نے از راہ کرم مجھے اپنی تصانیف میں سے **تاریخ بیجانگر** دیکھنے کو عنایت کی جس سے میری اور بھی آنکھیں کھلیں ۔ مولوی صاحب ریاست حیدرآباد (دکن) میں تعلقہ دار رہے جہاں انہیں دکن کی قدیم سلطنتوں کا حال تحقیق کرنے کا اچھا موقع ملا ۔ تاریخ کے سوا مصنف کو آثار الصنادید کی تحقیق میں بہت ملکہ ہے لکھتے ہیں کہ :-

بیدر سے ایک میل کے فاصلہ پر جانبِ مغرب بریدیوں کے گنبد ہیں ۔ ان میں نہایت عالی شان اور قابلِ دید گنبد علی برید شاہ کا ہے اس گنبد کے چاروں رُخ کھلے ہوئے ہیں ہوا سے کوڑا کرکٹ اُڑ جاتا ہے ۔ علی برید کی قبر پر ایک نہایت عمدہ سنگِ موسیٰ کے نہایت صاف پتھر کا

[illegible] بخط عربی کندہ ثبت ہے۔ گنبد کے اندر چینی حروف میں اشعارِ ذیل
[illegible] خوش خط [illegible]

ای ہم تو قضا [illegible] این آمد بسر من ؛ از پائے در افتادم و خون شد جگر من
[illegible] تازہ گلے بودم اندر چمن باغ ؛ امروز فرو ریخت ہمہ بال و پر من
یاران و عزیزان ہمہ بر خاک من آیند ؛ از خاک بپرسند نشان و خبر من
گر خاکِ جہان جملہ بہ غربال بہ بیزند ؛ حقا کہ نیابند نشان و اثرِ من
رفتم بجہانے کہ باز آمدنم نیست ؛ ہم نیست امیدے کہ کس آید بہ برِ من
عطار [illegible] دارم واز درد بخون غرق ؛ حقا کہ نیاید دو جہان در نظرِ من

دنیا کہ بے ما بسے روزگار ؛ بروید گل و بشگفد نوبہار
بسا تیر و دے ماہ و اردیبہشت ؛ بیایند و بر خاکِ ما بگذرند
[illegible] در ہوا و ہوس ؛ گذشتیم بر خاک بسیار کس
کرا جاودان ماندن امید ماند ؛ چو کس را نہ بینی کہ جاوید ماند

دامن کشان کہ میرود امروز بر زمیں ؛ فردا غبارِ کالبدش بر ہوا رود
خاکت در استخوان رود اے نفسِ خیرہ چشم ؛ مانندِ سرمہ دان کہ در و توتیا رود

بانی این گنبدِ گردون مثال ؛ شاہ فرخندہ بر پایہ نیک خو
مصرعۂ آخر کہ تاریخش بناست ؛ نامِ گنبد قبۃ الانوار گو

کتبہ خواجگی شیرازی

اسی طرح اور عمارتوں کے لاجواب کتبے ہیں۔ رنگین محل کی شہ نشین کی دلیز پر یہ شعر سیپ کی پچی کاری سے لکھا ہوا ہے ؎

شاہ نشین چشم من تکیہ گہ خیال ما ؛ جائے دعاست شاہ من بے تو مباد جائے تو

محل کے اندر سیپ سے یہہ لکھا ہوا ہے :۔ یا کافی المہمات۔ یا حافظ ...

اے منظر دیدہ از جمالت روشن ؛ دست کرم تو سد ...

بخرام بہ شہ نشین خلوت کہ دل ؛ کز بہر تو آراستہ شد این منزل

اعلیٰ اللہ تعالےٰ شانہ یا مفتح الابواب ۔ المتنصر بنصر اللہ الملک المالک ۔ الجالس المکرم والہمایون الاکرم بہ ید المالک ؛

ہر ذرہ کہ در صدف و رو عشق ؛ از بہر نثار در گہت دارد عشق

عاشق شود از دیدن رویت زانکہ

گویا نہ در بام تو بار عشق

ایک عالی شان مدرسہ کی تاریخ یہہ لکھی ہے ؎

این مدرسہ رفیع محمود بنا ؛ چون کعبہ شد قبلۂ اہل صفا

آثار قبول بین کہ شد تاریخش

از آیت ربنا تقبل منا

غرض اسی طرح نہایت لاجواب کتبے عمارات دکن پر کندہ ہیں۔ ان کتبوں سے دکن کی علمی لیاقتیں ثابت ہیں

پرتھال نامی کسی زرگر کی حسین لڑکی کی تعریف میں جو شعر مصنف نے لکھے ہیں۔ نہایت پاکیزہ ہیں ؎

پری پیکر نگارے سرو قدے ؛ کہ حسن از روے وی سرمایہ بردی

زعکس عارضش رضوان بہ جنت ؛ زبہر حوریان پیرایہ بردے

لب لعلش نگین خاتم جم ؛ دہان از حلقۂ انگشتری کم

زرنگ عارضش روے ہوا لال ؛ خم زلفش در آتش کردہ صد نعل .....

اودے پوری

ماہ مئی سنہ ۲۳ء کے **صلائے عام** میں میرا ایک تاریخی مختصر مضمون مہارانا صاحب اودے پور کے متعلق طبع ہوا ہے اس میں بسبیل تذکرہ یہہ لکھا گیا تھا کہ اودے پور والوں نے دوسرے راجہ مہاراجوں کی طرح مغلیہ بادشاہوں کو بیٹی نہیں دی عالمگیر نے جو کسی موقعہ پر اپنے بیٹے کو لکھا ہے "کہ اودے پوری والدہ شما عزم رفاقت بمن دارد" اس سے یہ سمجھنا نہ چاہیئے کہ اودے پور کے خاندان کی کوئی لڑکی عالمگیر کے نکاح میں تھی بلکہ اُس کا دوسرا مطلب ہے۔ اس پر ہمارے مکرم خان بہادر میر ناصر علیخاں صاحب معترض ہیں کہ اسکو مفصل بیان کیا جاوے۔ کہ اس لکھنے سے عالمگیر کا مطلب کیا ہے میں نے تو اس کو قصہ طلب اور جھگڑے کی بات سمجھ کر گول کر دیا تھا مگر میر صاحب کے اصرار پر اُنکی تعمیل ارشاد ضروری ہے لہذا مختصر لکھتا ہوں کہ عالمگیر کے سخت مزاجی سے راجپوتانہ میں جب بغاوت ہوئی تو عالمگیر نے خانجہان کو راجپوتانہ کے انتظام کے واسطے بھیجا مگر اُس سے انتظام نہ ہو سکا اُس نے عالمگیر کو اطلاع دی کہ رانا اودے پور کے اغواء سے راجپوتانہ میں بغاوت ہو رہی ہے عالمگیر معہ فوج کے فوراً اودے پور کی طرف روانہ ہوا راستہ میں جو کچھ ملک رانا کا ہاتھ آیا اُسکو قبضہ میں لایا اور اُسکی حفاظت کا انتظام کیا اور اودے پور سے ۱۴ میل کے فاصلہ پر اودے ساگر تالاب پر جو اودے پور سے جانب مشرق ہے آکر قیام کیا اور محمد اکبر اپنے چھوٹے بیٹے کو معہ حسین علیخاں کے اودے پور بھیجا شہزادے نے میدان خالی پاکر حسین علیخاں کو رانا کی تلاش میں کوہستان میواڑ میں روانہ کیا۔ اودھر مہارانا راج سنگھ اور کنور جے سنگھ نے شاہی فوج پر چھاپے مارنے شروع کئے اودھر محمد اکبر کو بہکایا کہ تو میرا ساتھ دے میں تجھے بادشاہ بناتا ہوں تو بادشاہ بن جیسے کہ تیرا باپ

سب کو ٹھکانے لگا کر بادشاہ بنگیا محمد اکبر کو یہہ کہنا غنیمت ہوا اور باپ سے بغاوت کی۔ عالمگیر نے یہ حال دیکھ کر واک جوکے ہیں محمد معظم کو انجین سے فوراً طلب کیا اور اپنی جگہ چھوڑا اور اعظم کو چتوڑ پر مامور کیا اور خود اس خیال سے کہ راجپوت ہندوستان کا رُخ نہ کریں فوراً اجمیر آیا۔ رانا معہ محمد اکبر کے ایک لاکھ کی جمعیت سے اجمیر روانہ ہوا یہاں بادشاہ کے پاس دس ہزار سے زیادہ جمعیت نہ تھی۔ جب راجپوت کی فوج اجمیر کے قریب پہونچی تو تہور خاں افسر فوج شاہی شہزادہ سے علیحدہ ہو کر بادشاہ کے پاس آگیا اس سے اکبر کی کمر ٹوٹی اُدھر عالمگیر نے ایک جعلی خط شہزادہ کے نام کا راجپوتوں میں ڈلوا دیا جس کا مطلب یہ سمجھا گیا کہ دراصل باپ بیٹے باہم ایک ہیں راجپوتوں کو درمیان میں لا کر لقمہ کریں گے۔ اودے پور والے محمد اکبر کو سوتا چھوڑ کر چلدئے۔ یہ بدبخت بھاگا اور سنبھاجی مرہٹہ کے پاس پناہ لی اور پھر خدا جانے کہاں جا کر مر گیا یہہ لڑائی راج سنگھ اور جے سنگھ سے سوا برس تک جاری رہی۔ پھر راج سنگھ جی کا زہر دیکر سرداروں نے کام تمام کیا اور جے سنگھ مسند نشین ہوئے وہ لڑائی کے نقصانات اور عالمگیر کا اقبال روز افزوں دیکھ کر صلح کے ملتجی ہوئے اور صلح ہوئی اور پانچ ہزاری کا منصب ملا۔ عالمگیر کو دکن جانا تھا اس واسطے راجپوتانہ سے جلد فرصت حاصل کی۔ ایک بیگم برس سوا برس علاقہ اودے پور میں رہیں جب وہ واپس ہوئیں تو اودے پوری کہلائیں۔ ٹاڈ صاحب مورخ راجپوتانہ نے اسقدر اور اضافہ کیا ہے کہ عالمگیر پہاڑوں میں گھبرہ گیا اور بیگم علیحدہ ہو گئی۔ بہ احترام سے لشکر شاہی میں پہونچائی گئی اور وہ اودے پوری کہلائی۔ اودے پور والے رانا۔ جہانگیر شاہجہاں اور عالمگیر وغیرہ بادشاہوں کے مطیع رہے صرف چند روز کو جزیہ وغیرہ کے احکام جاری ہونے سے بے لطفی رہی ورنہ امیر سنگھ کے زمانہ سے مخالفت جاتی رہی تھی۔ یہ خیال کرنا کہ جب رانا مطیع اسلام ہوئے تو لڑکی بادشاہوں کو کیوں نہ دی ہوگی درست نہیں ہے کسی بادشاہ نے کسی راجہ کی لڑکی خلاف اُسکی مرضی نہیں کی بلکہ جو کچھ رشتہ داری ہوئی وہ باہمی رضامندی سے ہوا کی۔ مہارانا نے مسلمانوں سے رشتہ داری کو پسند نہ کیا اس واسطے ان کے خاندان کی لڑکی مغلیہ

خاندان میں نہ آئی۔ ایک بار مہارانا راج سنگھ کے اغوا سے راجپوتوں نے اس امر پر اتفاق بھی کیا تھا کہ مسلمانوں سے رشتہ داری نہ کی جاوے گی اس پر عمل درآمد نہ ہوا؛

بعض غلط فہمیاں پھیلانے والے کہتے ہیں کہ ہندوؤں میں پردہ کی رسم اسی وجہہ سے ہوئی کہ مسلمان ہندوؤں کی عورتوں کو زبردستی چھین لیا کرتے تھے۔ کوئی اُن سے پوچھے کہ آج راجپوتوں اور شریف خاندان ہنود میں پردہ کی پابندی کیوں ہے جبکہ مسلمانوں کی حکومت باقی نہیں رہی۔ بات یہہ ہے کہ جب دو قومیں ملتی ہیں تو اُن میں کچھ نہ کچھ میل جول ہو جاتا ہے اور ایک دوسرے کے رسم و رواج کو سیکھ لیتا ہے۔ بہت باتیں ہندوؤں نے مسلمانوں سے سیکھیں اور بہت سی باتیں مسلمانوں نے ہندوؤں سے سیکھیں۔ آج انگریزوں کی سلطنت ان اعتراضوں سے پاک ہے۔ تاہم ہمارے خیال کی تائید ضرور ہوتی ہے اکثر ہندوستانی مستورات یوروپین لوگوں کی بیبیاں نہیں اور اسی طرح بہت سی یوروپین مستورات سے ہندوستانیوں کی خانہ آبادی ہوئی بعض متعصب اصحاب یہ بھی کہتے ہیں کہ مسلمانوں نے ہندو بیبیوں کی وہ توقیر نہیں کی جو اپنی ہم قوم بیبیوں کی کرتے رہے۔ یہ بھی غلط ہے منجملہ صدہا مثالوں کے ایک مثال تاریخی پیش کرتے ہیں اس پر خیال کر لو کہ کون حق بجانب ہے۔

جہانگیر بادشاہ کی شادی راجہ مان سنگھ کی بہن سے ہوئی تھی اس سے شہزادہ خسرو پیدا ہوا۔ چونکہ خسرو کا ماموں راجہ مان سنگھ تھا اور خسرو کا خسر خان اعظم کوکلتاش تھا ان کے گھمنڈ میں شہزادہ ہمیشہ جہانگیر کی طرف سے باغیانہ خیال رکھتا تھا اور چاہتا تھا کہ اکبر کے بعد میں بادشاہ ہوں اکبر سے جہانگیر کی چند روزہ بغاوت نے خسرو کو اور دیوانہ بنا دیا تھا۔ خسرو کی والدہ اس وجہہ سے ہمیشہ اندوہ ناک رہا کرتی اور بچہ کو سمجھایا کرتی تھی جب دیکھا کہ خسرو پر نصیحت اثر نہیں کرتی اور اُسکا جنون کم نہیں ہوتا تو خودکشی کر کے مر گئی۔ جہانگیر کا اس بیگم کی مفارقت دائمی سے جو حال ہوا اُسکو تزک جہانگیری میں پڑھو کہ اس بیگم کے غم میں چار شبانہ روز کھانا نہیں کھایا۔ اکبر کو جب معلوم ہوا تو اُس نے جہانگیر کی بہت دلجوئی کی اور طرح طرح کی عنایتوں اور تحریروں سے اُسکے رنج کو کم کیا چنانچہ جہانگیر لکھتا ہے

ابن عنایت آپ نے پر آتش سوز و گداز من زد و اضطرار و اضطراب مرا فی الجملہ قرار و آرام بخشید
فی زمانہ یہ کمال درجہ کی احسان فراموشی ہے کہ شاہان مغلیہ پر اور انکی حکومت پر عیب لگائے جاتے ہیں اور مسلمانوں کو ہوا بنا کر دکھایا جاتا ہے۔ یہہ ضرور ہے کہ بعض مسلمان سخت مزاج بادشاہوں نے اپنے غیظ و غضب اور تعصب کی مثالیں بھی چھوڑی ہیں اس سے انکار نہیں ہو سکتا مگر بعض کے قول و فعل کا مذہب اور قوم ذمہ وار نہیں ہو سکتے۔ آج دنیا میں وہ کونسی قوم اور مذہب ہے کہ جس میں خود غرض اور سخت مزاج نہ ہوئے ہوں یا جنہوں نے غیظ غضب سے حکومت کے زور بازو کے ساتھ مخلوق خدا پر ظلم نہ کیا ہو۔ مہذب سے مہذب تر قوموں میں ایسے افراد پائے جاتے ہیں کہ انکے کارنامے مسلمان سخت مزاج بادشاہوں کے کارناموں سے زیادہ شرمناک ہیں کوئی دیکھنا چاہے تو ہم دکھانے کو موجود ہیں۔ مگر مسلمان بادشاہوں نے جو مساوات برتی اُس کی مثال دنیا کی تاریخ پیش نہیں کر سکتی۔ کوئی قوم ایسی مثال پیش کر سکتی ہے تو پیش کرے کہ آقا نے غلام کو اپنی بیٹی دی ہو اور غلام کو اپنی قوم کا بادشاہ بنا دیا ہو۔ خود ہندوستان کی تاریخ پر نظر کرو اور اسلامی بادشاہوں کی فہرست میں اُن غلاموں کی گنتی گنو جو بادشاہ بنائے گئے اور بخوشی کل مسلمانوں نے انکی اطاعت کی اور قرون اولے کے مسلمان بادشاہ جنکو خلیفہ کہا جاتا ہے اُن کی سادگی اور مخلوق نوازی کے حالات بیان کئے جاویں تو اور زیادہ حیرت ہو گی۔

× × × × × × × × × × × × × ×

"کل کی ڈاک سے خط بھیج ہی چکا تھا کہ **صلائے عام** پہونچا اور اپنے ساتھ ایک مژدۂ پیغام مسرت لایا۔ پرچہ کھولا تو وہی تازگی مضامین۔ وہی نفاست اور وہی زبان کا لطف جو چند اگلے پرچوں میں ملا تھا۔ تمام اراکین انجمن بالخصوص حضرت قیس عظیم آبادی کی طرف سے میں آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں" × × × × × × × ×

اتالیق الامرا

پہلے زمانہ میں عام خاص لوگ تعلیم سے تربیت کو زیادہ ضروری سمجھا کرتے تھے۔ تعلیم ہو یا نہ ہو مگر تربیت کا اہتمام امیروں میں غریبوں میں مقدم تھا۔

دیکھو ہمایوں بادشاہ کو تردداتِ پیش آنے سے اکبر جلال الدین کو خاطر خواہ تعلیم نہ دلا سکا اور شاید ضروری بھی نہ جانا ہو۔ مگر اکبر کی تربیت کے لئے اُس نے ایک لمحہ بھی غفلت نہ کی۔ اُس کی مردم شناس نظر میں جو اس کام کے واسطے بہتر سے بہتر آدمی نظر آیا (یعنی بیرم خاں ایرانی) اسی کی نگرانی میں اکبر کو دیا اور بیرم کو اکبر کا اتالیق بنایا۔ اس اللہ کے بندے نے بھی اپنے فرائض منصبی کی انجام دہی جس خوبی سے کی وہ ظاہر ہے کہ اکبر جیسا جاہل بادشاہ اُسی تربیت کی بدولت دنیا کے بادشاہوں میں مشرق سے مغرب تک ممتاز ہے۔ بیرم خاں نے اکبر کو ملا نہیں بنایا مگر بادشاہ پورا پورا بنا دیا تھا۔ مغلیہ بادشاہوں میں عام دستور تھا کہ شہزادوں پر معلم علیحدہ رکھتے تھے اور اتالیق علیحدہ۔ اتالیق کی ذمہ واری معلم سے بڑھی ہوئی تھی اور معلم اور اتالیق کی حدودِ عمل جدا جدا۔

اوسط اور ادنیٰ درجہ کے شریف خاندانوں میں بھی عدم مقدرت سے معلم اور اتالیق تو بچوں پر نہ رکھے جاتے تھے مگر اُن کا اہتمام تربیت اولاد اُمرا سے کم نہ تھا۔ اول تو بچہ کو کسی محلہ کی مسجد یا مکتب میں کچھ پڑھایا جاتا تھا پھر کسی نامی مدرسہ میں کسی لایق معلم کی خدمت میں دے دیا جاتا تھا۔ وہاں اُسکی نصابِ تعلیم کی تکمیل ہوتی۔ تربیت کا یہ انتظام تھا کہ بڑے بڑے شہروں میں کئی جگہ لوگ ایک وقتِ معین پر دل بہلانے کو جمع ہو جاتے تھے وہ بمنزلہ ایک کلب کے مجلس ہوتی تھی۔ مجلس کیا ہوتی تھی شرفا اور اہلِ کمال کا دنگل ہوتا تھا ہر ایک شخص ضرورت کے لحاظ سے اپنے پاکیزہ خیالات سے دوسروں کو فائدہ پہونچاتا تھا۔ نوجوان ان صحبتوں میں ضروری طور سے حاضر ہوتے اور بزرگوں اور اہلِ کمال

کے اقوال وافعال پر نظر کرتے برس دو برس میں ان مجالس کے بیٹھنے والے ایسے ہمہ دان ہو جاتے تھے کہ آج اس روشن زمانہ میں انکی نظیر نہیں پائے جاتے۔ چونکہ معلم اتالیق امیروں کے یہی لایق غریب ہوا کرتے تھے اسواسطے غربا کو صاحب معلومات اور صاحب کمال ہمہ داں ہونے کا بڑا شوق تھا اُمرا کی قدردانی نے غربا کے اس ہنر کو معراج کمال پر پہونچا دیا تھا فیضی ابوالفضل ٹوڈرمل سعداللہ خاں وغیرہ غریبوں کی اولاد تھے جو اپنے قدرشناسوں کے ہاتھوں آفتاب بنکر چمکے۔

میں صحیح عرض کرتا ہوں کہ پچاس ساٹھ برس پہلے میں نے اکثر لوگوں کو ایسا پایا ہے کہ وہ پڑھے لکھے نہ تھے یہاں تک کہ اپنا نام بھی لکھنا نہ آتا مگر انکی وسعت معلومات اور ہمہ دانی کو دیکھ کر سخت تعجب ہوتا تھا۔ فصل خصومات کی ان میں قابلیت تھی رسم و رواج کے واقف کار تھے حسن معاشرت میں یکتا علم مجلس میں طاق پاکیزہ اخلاق و عادات کے سرچشمہ اہل الرائے ادا شناس۔ سپہ گری کے تمام فنون ورزش۔ پٹہ۔ بنکیتی۔ علی مد۔ بن اوٹ۔ تیراندازی۔ شہ سواری۔ پیراکی کے دلدادہ۔ خوش گوئی خوش بیانی۔ بذلہ سنجی شاعری۔ کارآمد حیوانات کی شناخت اور اُن کے معالجات بھی جانتے تھے ہر فن میں کامل۔ بچوں کے لئے بہتر نمونہ جوانوں کے لئے حکیم ناصح۔ بوڑھوں کے واسطے انیس امیروں کے بہتر جلیس۔ غریبوں کے شفیق۔ دوستوں کے رفیق۔ آقا کے وفادار۔ بزرگوں کے خدمت گزار منکسر المزاج۔ خدا ترس مردم شناس غرض کہ کامل انسان کا ایک مجسمہ۔ آج وہ لوگ کہیں نظر نہیں آتے ہزاروں پیوند خاک ہو گئے نہ وہ اگلے امیر رہے نہ اگلے فقیر جو کچھ ہے تمہارے سامنے ہے۔

آج ہائی ایجوکیشن کے فدائی اپنی محدود معلومات کے نشہ میں بدمست ہیں تربیت کو غیر ضروری جانتے ہیں ادب آداب سے دور ہیں خودرائی کا نام آزادی رکھا ہے۔ حال یہ ہے کہ جو کچھ پڑھا ہے اور سیکھا ہے اُس سیکھی ہوئی شے کا آٹھواں حصہ بھی اُن کے کارآمد نہیں نہ دین میں نہ دنیا میں۔ ہر دل عزیزی کا یہہ حال ہے کہ محکوم بنکر رہیں تو حاکم متردد اور پریشان اور حاکم بنکر رہیں تو رعایا نالاں۔ نہ حاکم بننا آئے نہ محکوم بننا۔ اس سب کی وجہہ یہی ہے کہ جو کارآمد تعلیم تربیت تھی اُس سے قطع نظر کرلی ع وہ کھوئے گئے اور تعلیم پاکر۔ اعلیٰ حکومت نے بھی سخت غلطی کی ہے کہ ملازمت کی معیار ایک کاغذ کی

سند انٹرنس ایف اے۔ بی اے وغیرہ کو قرار دیا۔ اس سے بحث نہیں کہ شریف ہے رذیل ہے۔ چال چلن کیسا ہے خیالات کیسے ہیں جو غدر ۵۷ء سے پہلے شریف کی تلاش ہوتی تھی اور شریف کو اسباب شرافت کے جمع کرنے کی۔ وہ سمجھتا تھا کہ شریف کے ذاتی یہ اوصاف ہیں کہ نمک حلال ہو وفادار ہو احسان کی قدر ہو۔ خوش چلن ایماندار ہو تاکہ بزرگوں کی عزت و شہرت پر حرف نہ آئے۔ اب سرکار کو نہ شریف ملازم کی تلاش نہ ملازم کو اسباب شرافت کی۔ مابخیر شما بسلامت۔ یہی حال امیروں کا ہے اور یہی حال غریبوں کا۔

ایک رئیس صاحب مملکت میرے اوپر بہت مہربانی فرماتے تھے اُن کا بچہ ولی عہد ایک دفعہ اُن کے ہمراہ تھا۔ میں نے دریافت کیا کہ ان کی تعلیم و تربیت کا کیا انتظام ہے فرمایا فلاں کالج میں پڑھتا ہے میں نے کہا کہ جب وہاں کے نصاب تعلیم ختم کرکے واپس آئیں گے تو اِن کو کیا آجائیگا وہ فرمانے لگے کہ یہ ہی کچھ حساب کچھ اردو انگریزی جغرافیہ سائنس وغیرہ علم طبعی۔ میں نے عرض کیا کہ اتنی باتوں کے آنے سے کیا ہوگا ان سے زیادہ اِن باتوں کو آپ کی غریب رعایا کے بچے جانتے ہیں۔ میں تو یہ پوچھتا ہوں کہ ملک داری حکمرانی کے متعلق ان کو کیا سکھایا گیا ہے جو اِنکا خاص کام ہے وہ فرمانے لگے وہ تو میں بھی نہیں جانتا۔ میں نے عرض کیا کہ ہر ایک شخص کے واسطے کوئی کام ہے اور وہ کسی کام کے لئے ہے۔ مگر انکا معظم و محترم گروہ جس میں نواب راجہ بادشاہ سب شامل ہیں اور لاکھوں نفوس خلایق کے جان و مال کے محافظ اور مالک ہیں ان کا بھی کوئی ضروری کام ہونا چاہیے وہ کیا ہے۔ وہ غور کرنے لگے ایک ان کے سردار بھی تھے وہ کہنے لگے کہ امیروں کا کام انصاف کرنا ہے یہ ہی مشہور ہے۔ میں نے کہا کہ پانچ لاکھ نفوس رعایا کے یہ حاکم ہیں اگر فصل خصومات انکا کام ہو تو سال کے ۳۶۵ دن میں پانچ لاکھ مقدمے کرنے پڑیں گے یعنی ایک روز میں ۱۳۰۰ تیرہ سو کئی زاید حالانکہ آپ تو تمام ضروریات زندگی کو ترک بھی کردیں اور صرف مقدمے فیصلہ کریں تو بھی ایک دن میں اتنے مقدمے فیصلہ نہیں کرسکتے۔ جو کام کرہی نہیں سکتے وہ کام ان کا کیونکر ہوگا۔ کہا ہاں درست ہی پھر تم ہی بتاؤ کہ ہمارا کیا کام ہے۔ میں نے کہا کہ آپ کے کام کو آپ ہی کو جاننا چاہیئے میں کیوں بتاؤں

ایکبار میں ایک دوسرے رئیس کے پاس تھا وہ ایک مصاحب پر اس وجہ سے خفا ہونے لگے کہ اُن کے علم میں اُس نے کوئی جھوٹ بات بیان کی ہوگی۔ مجھ سے مخاطب ہوکر یہی فرمانے لگے کہ دیکھئے مجھ سے جھوٹ بولتے ان کو شرم نہیں آتی۔ میں نے عرض کیا کہ شرم کیوں آئے جھوٹ بولنا آپ نے سکھایا اس لئے آپ کے سامنے جھوٹ بولتے ہیں۔ کہا یہ کیا میں نے کہا کہ جب سے اُمرا نے سچ بات کا سُننا چھوڑ دیا ہے تب سے ہم لوگ جھوٹ بولنے لگے ہیں آپ میں سچی کڑوی بات کے سُننے کی طاقت نہیں رہی۔ اس لئے سچ بولنے کی طاقت ہم میں نہیں رہی کہ سچ بولیں تو دربار سے نکالے جاویں وہ امیر یہ سنکر چپ ہوگئے۔

آؤ اب مغلیہ بادشاہوں کو دیکھو کہ اُن کو تربیت نے کس نتیجہ پر پہونچایا تھا کہ سچی کڑوی بات کو کس خوبی سے سنتے تھے۔

اکبر جلال الدین متھرا سے اگرہ کشتی پر سوار ہوا مولانا عبدالقادر بدایونی ہمراہ ہیں ہوا تیز چلی کشتی کو غیر معمولی حرکت ہوئی مولانا ملا آدمی گھبرا گئے لوگوں سے کہا کہ مجھے اتار دو۔ اتنے میں اور ہوا تیز ہوئی مولوی کی گھبراہٹ اور بڑھی۔ خود اکبر سے عرض کیا کہ مجھے تو اُتر جانے کی اجازت فرمایئے اکبر نے کہا کہ میں خود کشتی میں بیٹھا ہوں گھبرانے کی کیا بات ہے۔ عبدالقادر نے کہا کہ میں اور آپ برابر نہیں۔ آپ ڈوب کر مر جائینگے صبح دوسرا تخت پر ہو بیٹھے گا بھلا نقصان کیا ہوگا۔ مگر عبدالقادر ڈوب گیا تو برسوں میں بھی ایسا نہ پیدا ہوگا۔ اکبر نے کہا کہ آپ نے سچ کہا۔ آج کل راجہ مہاراجہ۔ نواب کو یہ حوصلہ ہے کہ ایسی کڑوی مگر سچی بات کو سُن سکے۔ جہاں گیر کو دیکھو باوجود بد مزاج ہونے کے ایک بار ایک عورت آئی اور اُس طلائی زنجیر سے لپٹی جو فریادیوں کے واسطے خاص تھی۔ جہاں گیر نے کہا کیا معاملہ ہے اُس نے ہندوستان کے کسی دور دراز حصہ میں قافلہ کا لُٹنا اور اپنے بچّہ کا مارا جانا بیان کیا۔ اس کے مُنہہ سے نکلا کہ اتنے دور کا انتظام مشکل ہے عورت نے کہا کہ پھر اُسی قدر قریب قریب کا ملک رکھو لے جس کا انتظام کر سکے باقی کو کسی دوسرے کے سپرد کر دے جہاں گیر چُپ ہو گیا اور جس طرح جلد ممکن ہوا اُس کی دادرسی

کی۔ محمود غزنوی کے حالات میں بھی یہ لکھا ہے۔ شاہ جہاں کو تخت نشین ہوئے تھوڑا زمانہ ہوا تھا محلوں میں ایک نوعمر لڑکی کی کوئی ادا پسند آئی (وہ توتلی تھی) اس کی وہی ادا دیکھنے کو خلوت میں بلا یا وہ غلطی سے سمجھی کہ بادشاہ کی نیت کچھ اور ہے وہ خاوند والی تھی بادشاہ سے اُس نے کہا کہ بادشاہ ہو کر خدا کو بھول گئے جو میری عصمت دری کی فکر کی ہے۔ بادشاہ نے اپنی غلطی خیال کرکے اس کی بدگمانی کو رفع کیا۔ جب اس کو حقیقت حال سے اطلاع ملی تو وہ خوف کے مارے کانپنے لگی کہ چھوکری ہو کر میں نے اتنی بڑی گستاخی کی بادشاہ نے کہا کہ خوف نکر میری غلطی تھی کہ تجھے علیحدہ بلایا دوسروں کے سامنے بلانا تھا۔

اورنگ زیب عالمگیر کو دیکھو کہ بادشاہ وقت ہے۔ پکا سُنی ہے۔ نعمت خان عالی ہاتھی پر ہمراہ ہے وہ پکا شیعہ ہے۔ راستہ میں بادشاہ کی نظر پڑی کہ ایک قبر پر کتا پیشاب کر رہا ہے۔ بادشاہ نے کہا کہ نعمت یہہ قبر کسی شیعہ کی معلوم ہوتی ہے کہا ہاں مگر یہہ کتا سُنی معلوم ہوتا ہے ۔ اسی نعمت خان عالی نے دکن کی لڑائی میں وقایع نگاری بھی کی ہے ایک موقع پر لکھا ہے کہ ہرچہ گرد اس سگ کرد موقع کے لحاظ سے دیکھو یا دشاہ کیطرف صاف اشارہ ہے۔ آجکل کے امیر یہ صفت اپنے میں پیدا کریں اور جھوٹ خوشامد والوں کی صحبت سے باز آئیں تو بڑی بات ہے۔ فی زمانہ ایک بڑے امیر کا حال سُنا ہو گا کہ ایک معزز کو عین دربار میں حق گوئی کا صلہ یہہ ملا کہ دربار سے نکالدیا گیا۔ باقی آئندہ۔

نوٹ۔ ہم دکھلانا چاہتے ہیں کہ اتالیق کس قسم کی تربیت کرتے تھے کہ جو تعلیم سے پوری نہیں ہو سکتی ہے ایک رسالہ کی شکل میں لکھنے کو ہیں مگر کون قدر کریگا۔ فیضی سے کسی ایرانی نے کہا کہ اکبر کی نام آوری میں تم دونو بھائیوں کا بھی حصہ ہے۔ اُس نے کہا کہ یہ خیال غلط ہے ہم اور ہمارے جیسوں سے کبھی زمانہ خالی نہیں رہا۔ مگر ہماری تلاش کو اکبر کی آنکھ چاہیئے۔ اُس کی ہر جگہ کمی ہے۔ فقط

مرزا محمد علیخان۔ دہلی

صلائے عام کی ڈاک

× × × × × × × × × × × ×

"سچ پوچھئے تو جس قوم کی زبان نہیں وہ قوم ہی کیا؟ میں ذاتی طور پر ایسی قوم کو جو بے زبان ہو مردہ سمجھتا ہوں۔ انجمن ترقیٔ اردو کے کتب خانہ میں ہر قسم کے رسالے اخبارات آتے ہیں مگر مجھے نہایت افسوس کے ساتھ لکھنا پڑتا ہے کہ کوئی پرچہ جو واقعی اس قابل تھا کہ کتب خانہ کی میز اُس سے مزین کی جاتی نہیں آتا ہے۔ اس کی تلافی کے لئے رسالہ صلائے عام کے متعلق آپ سے استدعا کی گئی تھی۔ آپ پر یہ روشن ہے کہ آج کل ادبی مسائل میں دلچسپی لینے والے حضرات اِکے دُکے ہی رہ گئے ہیں۔ بیہودہ مشاغل اور لغویات میں تو نہ پوچھئے کتنے گھرانے تباہ و برباد ہو گئے۔ مگر قوم و زبان کے واسطے تباہ ہونا کوئی بدقسمت بھی پسند نہیں کرتا۔ یہ انتہا درجہ کی مردہ دلی ہے۔ × × × × × × ×

اصل مطلب پر آئے تو یہ ہے کہ آپ کو اس انجمن سے خاص دلچسپی لینی چاہئے۔ کیونکہ آپ جیسے علم دوست اور نکتہ رس حضرات تو اب عنقا ہیں۔ × × × × × ×

صلائے عام کے پرچے واقعی قابل دید ہیں۔ اور اُردو زبان کی ترقی دینے کے لئے ایک مفید ترین اور اعلیٰ ترین ذریعہ ہے۔ میں آپ کو واقعی مبارکباد دیتا ہوں کہ آپ ایک بہت بڑا کام انجام دے رہے ہیں۔ خدا آپ کو اپنے مقصد میں کامیاب بنائے اور آخر میں میری یہی دعا ہے کہ خدا زبانِ اُردو کو ترقی دے۔ × × × ×

نیازمند قاضی محمد فرید۔ معتمد کتب خانہ

انجمن۔ از پٹنہ

× × × × × × × × × × × × × × ×

× × "ماہ مئی کا صلائے عام کس پیارکیطرح درمیان سے غائب ہے (جون کا پہونچ گیا)۔ مجھے خیال تھا کہ تعویق اشاعت اسکا باعث ہوئی ہے۔ مگراب معلوم ہوا کہ آپ کے تغافل نے مجھے اُس کے دیدار سے محروم رکھا۔ کہیں یہ بے التفاتی مشتاق دید کی آزمایش کے لئے تو نہیں ہے؟ بقول حضرت ریاض سے

شروع اہل محبت کے امتحان ہوئے ؛ اب اُنکو ناز ہوا ہے کہ ہم جوان ہوئے

× × × × × × × × × × × × × مئی کا صلائے عام جلد مرحمت فرمائیے ورنہ سلک مروارید میں سے ایک دُرِ شاہوار کم ہو جائے گا اور لڑی ناقص رہ جائے گی"؛

نیازمند میر ضیا دہلوی۔

صلائے عام کی ڈاک میں ایک خط خاص ذکر کرنے کے لایق آیا۔ جس کا مضمون یہہ ہے کہ :۔

صاحب تحریر کو اپنے اِکلوتے بیٹے کے مرنے کا سخت صدمہ ہوا کہ حواس بجا نہیں رہے۔ دماغ مختل ہوگیا: رات دن رونے سے کام رہا بہت کچھ دل پر جبر کرنے سے بھی نہیں آیا لکھتے ہیں :۔

× × × × × × × × × × "ایسی حالت میں جون ۲۳ء کے صلائے عام نے آکر جیسا دل بہلایا ہے کچھ عرض نہیں کر سکتا"؛ × × × × × × × × ×

× × × × × اللہ جلشانہ نے آپ کی زبانِ مبارک میں بہت بڑا اثر بخشا ہے۔ آپکی تحریر اگر معجزہ نہیں تو کرامت ضرور ہے ؛ چاہتا ہوں کہ ماہِ آئندہ میں کوئی ایسا مضمون تحریر فرمایا جائے جو مجھ غم زدہ کے بیتاب دل کو تسکین دے"؛ × × × ×

× × مئی کا صلائے عام مجھے نہیں مِلا جسکے واسطے دل بیچین ہو کر تڑپ رہا ہے۔ جلد بھجوائیے"؛ × × ×

ناچیز برشتہ جگر۔ شمشیر بہادر۔ افسر۔

صلائے عام

صلائے عام ۔کسی کے غم والم میں (وہ کونسا دل ہے جو رنج والم سے خالی ہو) اگر **صلائے عام** کے مضامین سے تھوڑی بہت بھی تسلی ہو جائے تو اس سے زیادہ میری محنت کا صلہ اور کیا ہو سکتا ہے ؟

مجھے افسوس ہے کہ ماہ مئی سنہ رواں کے پرچہ کے نہ پہونچنے کی شکایت اکثر جگہ سے آئی ۔ میر **ضیا** ر دہلوی لکھتے ہیں کہ مئی کا **صلائے عام** کمرِ یار کی طرح درمیان سے غائب ہو گیا ۔یعنی اپریل اور جون کے پرچے پہونچے مئی کا پرچہ نہیں پہونچا ؛

یہ شکایت میں پہلے کر چکا ہوں کہ **صلائے عام** کے پچھلے پرچوں کا پتہ دہن یار کی طرح شکل سے ملتا ہے ۔ ارادہ ہے کہ مئی کا پرچہ دوبارہ چھپوایا جائے : دوبارہ چھپنے کے بعد جو صاحب لکھیں گے اُن کی خدمت میں بھیجدیا جائیگا ؛

× × × × × × × × × × × × × ×

× × "ماہ جون کے صلائے عام میں ایک تو فقرہ ایکا ایسا ہے جسے لٹریچر کی روح کہنا بیجا نہیں اس سے زیادہ نازک خیالی اور کیا ہو سکتی ہے ۔کہ ہندوستان کی لٹریچر اور تاریخ وعدۂ یار کی طرح ذہن میں بھی نہیں ان کی طرف سے اپنی زبان کی پاکیزہ خیالیاں حسینوں کی کمر کا جواب ہیں اور سراسر لطف خوبی و پاکیزہ خیالی و اخلاق پسندیدہ سے بھرا شستہ زبان میں وہ سارا کا سارا مضمون ہے جس کو مرزا محمد علیخاں صاحب رئیس دہلی نے (غالب کے کلام اُردو کی نسبت رائیں) کے تحت میں لکھا ہے ۔ اُردو زبان کی خوبی کا بہترین نمونہ ہے اور نفس کلام اور طرز بیان سے سراسر تہذیب برستی ہے ۔ ایسے خوش بیان شیریں کلام نیک نفس اور ذی لیاقت لوگ اس زمانہ میں شاذ و نادر ہیں ۔ اُن کے کلام سے اُن کے ذاتی اوصاف حمیدہ کا اظہار ہو رہا ہے اس سے زیادہ کیا عرض کروں" فقط

آپکا نیازمند ۔ عرفان علی ۔

زبان اردو

زبان اُردو

کیوں کر ترقّی کر سکتی ہے

زبانِ اُردو کی ترقی یا توسیع کس طرح ہو سکتی ہے یہ ایک مُشکل اور غور طلب امر ہے۔ قبل اس کے کہ ہم اس پر کچھ لکھیں اُردو زبان کی مختصر تاریخ کا اقتباس کرتے ہیں۔

جاننا چاہیے کہ زبانِ فارسی مُلکِ فارس کی بولی ہے جو ہندوستان سے مغرب مائل بہ شمال ڈیڑھ ہزار کوس کے فاصلے پر واقع ہے۔ ہندوستان ہمیشہ زرخیز سیرحاصل مُلک رہا ہے۔ بادشاہانِ روئے زمین کا دانت ہمیشہ سے اس پر رہا ہے کہ کسی نہ کسی طرح سے اس سونے کی چڑیا کو اپنے قبضے میں لائیں لیکن صانعِ قدرت نے اس خزانۂ عامرہ یا کانِ دولت کو ایسی حفاظت سے محصور و مصئون کر دیا ہے کہ اس پر چڑھائی کرنا لوہے کے چنے چبانا ہے۔

شمال کی طرف کوہِ ہمالیہ کا سر بفلک پہاڑ حصنِ حصین ہے جو دو ہزار کوس لمبی اور چار سو کوس چوڑی اور دو کوس بلند نہایت مستحکم سدِ سکندری کھڑی ہے یہ پہاڑ سرحدِ کابل میں ہندوکش پہاڑ سے شروع ہو کر پورب میں مُلکِ برہما کی سرحد پر سمندر سے جا ملا ہے۔ اس پہاڑی سلسلے کے شمال میں مُلکِ چین تبت اور تاتار واقع ہیں اور اسی پہاڑ نے ہندوستان کو بادشاہ چین کی یورش سے محفوظ رکھا ہے۔ اس پہاڑ میں چند جگہ ناہموار اور دشوار گزار گھاٹیوں کے سوا جو دار پار ہیں اور کہیں سے عبور و مرور کا رستہ نہیں۔ ان گھاٹیوں میں سے لاؤ لشکر۔ سامانِ حرب و جدال کا لانا بہت دشوار ہے۔ اس وجہ سے ہندوستان کو شمال کی جانب سے بہت کم خطرہ ہے۔

پورب اور جنوب میں سمندر کی موجوں نے ہندوستان کو اپنی گود میں لے لیا ہے وہ بھی ہمالیہ

کچھ کم سد نہیں۔ صرف ایک پچھم کا رُخ خالی ہے کہ اُدھر کوئی زبردست روک نہیں۔ اسی وجہ سے ہندوستان پر ہمیشہ پچھم کی طرف سے آفتیں نازل ہوتی رہیں۔ جس بادشاہ کو ذرا بھی موقعہ ملا وہ اسی طرف سے ہندوستان پر چڑھ آیا۔ البتہ صرف انگریز سمندر کی راہ سے بغرض تجارت آکر بتدریج قابض ہوگئے ورنہ سوائے ان کے جو بادشاہ آیا پچھم ہی سے آیا۔ ہندوستان کے پچھم میں کابل۔ بخارا۔ ایران۔ غزنی کے مشہور ملک ہیں جو پیغمبر صاحب صلعم کی بعثت کے تھوڑے دنوں بعد مسلمان ہوگئے۔ غزنی کے بادشاہوں نے بے شمار حملے ہندوستان پر کئے یہاں تک کہ آخر کار سلطان محمود غزنوی نے ہندوستان کے راجاؤں کو مغلوب کرکے سلطنتِ اسلام کی بنیاد قایم کی اور سلطنت تیموریہ شروع ہوئی جس کا ٹمٹماتا ہوا چراغ ۱۸۵۷ء کے غدر کے بعد دہلی میں بہادر شاہ کے عہد میں گُل ہوگیا ؎

سراج الدین ظفر بہادر جو سوئے جنت ہوئے روانہ ؛ کہ جن کی باعث مٹی خوشی سے چمک رہا تھا چراغ دہلی
جلوس اُن کا چراغ دہلی سو اب بھی دیکھو مطابق اس کے ؛ سروش غیبی نے سال رحلت کہا بجھا ہے چراغ دہلی

یہ لوگ ذات کے مغل تھے[۱] اور قریب قریب سات سو برس ہندوستان پر ان بان سے سلطنت کرتے رہے کہ اِن کا زمانہ آج تک بھی صفحۂ تاریخ پر آفتاب عالمتاب کی طرح چمک رہا ہے۔ انہیں کے سبب سے زبانِ فارسی ہندوستان میں مروّج ہوئی ورنہ اس ملک کی اصلی بولی بھاکا تھی جو اب بھی کچھ بدل بدلا کر متھرا۔ بندرابن مقامات کے نواح میں بولی جاتی ہے۔ اور جس طرح مسلمانوں میں عربی کی قدر و منزلت ہے۔ اس مُلک کے اصلی باشندے جو ہندو ہیں سنسکرت کی عزت کرتے ہیں اور یہ دونوں زبانیں "کلاسیکل" کہلاتی ہیں اور بڑے مرتبے اور پایہ کی زبانیں ہیں۔ اُردو ہندوستان کی اصل بولی نہیں ہے۔ اکبر بادشاہ (۹۶۳ھ-۱۰۱۴ھ) کے عہد میں جو عظیم الشان ٹڈی دل لشکر تھا اُس میں ہر ملک کے لوگ کثرت سے تھے اور اُن کو رعایا سے ملنے جلنے کی اس سبب سے ممانعت تھی کہ لشکر کے سپاہی جب رعایا سے اختلاط بڑھا لیتے ہیں تو اُن کو خاص شہر سے ایک گونہ موانست ہو جاتی ہے۔ پھر اُن کا دل باہر جانے اور لڑنے مرنے کو نہیں چاہتا۔ اکبر نے اپنے لشکر والوں کو رعیت سے ملنے نہ دیا۔ اُس لشکر میں بلحاظِ ضرورتِ وقت رفتہ رفتہ یہ اُردو بولی پیدا ہوگئی۔ جو لوکل بولی اور کھچڑی ہے جس میں ہر ملک کے الفاظ ہیں۔ یہ نادر معجون سنسکرت۔ فارسی۔ عربی۔ ترکی۔ کشمیری۔ چینی۔ مرہٹی۔ تلنگی وغیرہ سے

[۱] [illegible]

البرہ

مرکب ہے۔ اور اس کو سب زبانوں کا ست یا جوہر یا لُبِ لباب یا انس کہنا بے جا نہ ہوگا۔ اس طرح سب بولیاں گڈمڈ ہو کر یہ ایک نئی زبان پیدا ہو گئی۔ یہ امر مسلّم اور تاریخ سے بدایۃً ثابت ہے کہ حکومت کا اثر زبان پر ضرور ہوتا ہے۔ مسلمانوں کی سلطنت کے عروج کے ساتھ زبان بھی کینچلی بدلتی گئی۔ زبان اُردو میں بیرونی اثر کی گنجایش تھی کیوں کہ وہ بالذات کوئی مستقل زبان نہ تھی اس لئے لوکل زبان پر اُس نے اپنا گہرا اثر ڈالنا شروع کیا۔ یہ امر کسی تحریک یا ارادے یا کسی شاہی حکم یا دباؤ سے نہیں ہوا بلکہ ہماری اُردو کی طبیعت ہی کچھ ایسی ملنسار اور مہماں نواز واقع ہوئی ہے کہ جو آیا اُسے آغوشِ محبت میں لے لیا۔ سنسکرت آئی اُس سے مل گئی۔ عربی فارسی آئی اُس سے شیر و شکر ہو گئی اب انگریزی کا دور دورہ ہے اُس کے الفاظ دریا کی موج کی طرح اُمڈے چلے آتے ہیں اور اس بحرِ بیکراں میں آن کر گھل مل جاتے ہیں۔

ہندو شعرا کے دوہرے برج بھاشا میں ہیں مگر اُن میں بھی صاف ہماری زبان کی بو نی نظر آتی ہے۔ دیکھئے کبیر شاعر کا کلام کہ وہ بھی فارسی عربی کے غلبہ سے محفوظ نہ رہ سکا بے اختیار اُس کی زبان سے بھی غیر زبان کے الفاظ برج بھاشا میں ایسے آن ملے کہ غیریت کی بو تک نہیں آتی۔ ہم صدہا مثالیں اس قسم کے امتزاج کی دے سکتے ہیں جو غلبہ اور اثر کی کھلی مثالیں ہیں مگر یہ ایک مثال بھی ہمارے استدلال کے لئے کافی ہے۔

دین گنوایو دنی سے دنی نہ آیو ہاتھ ؛ پیر کلہاڑی ماریو گافل اپنے ہاتھ ؛ کبیر سر پر سرا ہی کیوں سوئے سکھ چین کوچ نگارا سانس کا باجت ہے دن رین ؛ اس میں غافل۔ سرائے اور نقارہ عربی فارسی کے الفاظ ایسے جگمگا رہے ہیں جیسے اندھیری رات میں جگنو۔ اُردو ہی کو ریختہ بھی کہتے ہیں۔ کیونکہ مختلف زبانوں سے پختہ کی گئی جیسے چونے گچی کی دیوار۔ اگرچہ اُردو زبان ہندوستان کے بیشتر حصص میں بولی جاتی ہے اور ملک ہندوستان کی ہے لیکن دہلی اور لکھنؤ دو ہی جگہ کی اُردو فصیح تر اور رشستہ مانی جاتی ہے اور یہ بات ٹھیک بھی ہے کیونکہ دہلی میں تو اُردو کی نال گڑی ہے چنانچہ داغ مرحوم فرماتے ہیں۔

(۱) اُردو ہے جس کا نام ہمیں جانتے ہیں داغ ؛ ہندوستاں میں دھوم ہماری زباں کی ہے۔

(۲) غیروں کا اختراع و تصرف غلط ہے داغ ؛ اردو ہی وہ نہیں جو ہماری زباں نہیں۔

اب رہا لکھنؤ وہ بھی مسلمان بادشاہانِ اودھ کا دار الخلافہ رہا ہے وہاں والوں نے بھی اس عروسِ نو بہار کو

پسند

بہت بنا سنوار کر آراستہ کیا ہے۔ ملاحظہ ہو کلام امیر مرحوم ؎

دعویٰ زبان کا لکھنؤ والوں کے سامنے ⁂ اظہار یہ موئے مشک غزالوں کے سامنے۔

بعض لوگ اعتراض کرتے ہیں کہ یہ نری دلّی اور لکھنؤ والوں کی شیخی ہے ہر جگہ کی اُردو مقامی اعتبار سے فصیح ہے۔ لیکن اہلِ زبان دلّی اور لکھنؤ والوں کے محاورات سے مدراس اور دکن اور بنگال اور پنجاب کی اُردو میں آسمان زمین کا فرق ہے۔ جو روانی۔ سلاست اور مٹھاس ہماری اُردو میں ہے وہ ہم دوسری جگہ نہیں پاتے۔ میری مراد اس سے پبلک کی زبان ہے دلّی اور لکھنؤ والے خواہ وہ پڑھے لکھے نہوں مگر جب بولیں گے ٹکسالی اُردو لیکن دوسری جگہ یہ بات نصیب نہیں۔ ہاں یہ بات دوسری ہے کہ تعلیم یافتہ اصحاب خواہ وہ مدراس میں ہوں یا پنجاب میں یا کسی حصۂ ہند میں وہ اب ویسی ہی اُردو لکھنے پر قادر ہوتے چلے جاتے ہیں جیسی کہ دلّی اور لکھنؤ والے لکھتے ہیں پھر بھی دلی اور لکھنؤ والوں کی زبان آمد ہے اور وہ آورد۔ اس میں کچھ بُرا ماننے کی بات نہیں دلّی اور لکھنؤ کی اُردو کی بادشاہان اولوالعزم نے آبیاری کی ہے یہ نعمت خداداد۔ یہ اثر۔ یہ سوسائٹی۔ یہ صحبت ماؤ شما کو کب نصیب ہو سکتی تھی۔ وکفیٰ بہٖ فخراً۔ دیکھئے انگریزی زبان کو جو فصاحت اور بلاغت اور نفاست خاص لندن کی زبان میں ہے وہ انگلستان بھر کو نصیب نہیں۔ اسی طرح جو دلّی اور لکھنؤ والوں کی اور اُن میں بھی قلع والوں۔ مقربان و متوسلان شاہی شہزادیوں اور بیگمات کی زبان ہے وہ ہر کس و ناکس کی نہیں۔ یہیں شہر کے شہر میں ایسا فرق ہے تو دیگر دیار و امصار کی بھلی چلائی ؎ این سعادت بزورِ بازو نیست ⁂ تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

سنہ ۱۸۳۵ء سے دفاترِ سرکاری میں اُردو نے قدم بڑھایا اور آج تک برابر رہی ہے لیکن چند دنوں سے ہندی کی چندی اس کو بے دخل کرنا چاہتی ہے ہم کہتے ہیں ع گر گُرد سے مرد۔ دمِ ہر لیوں دے۔ انگریز اس طرح "کلام الملوک ملوک الکلام" کا جھنڈا لئے ہوئے رو کا طرس گرجتی برستی چلی آتی ہے کہ اُردو اگر ماند شبے ماند شبِ دیگر نمی ماند۔ یہ اُردو ہندی سب کے چاؤ دکھا کر رہے گا۔ بر لمالے رانواسے۔ لیکن جب تک اُردو کی جان میں جان ہے یا یوں کہئے کہ مسلمانوں کی جا..ں جان ہے۔ ہماری جان سے لگی ہوئی ہے۔ ہم کو اُردو کہاں پیدا۔ ہم اس کی ترقی میں ..مے قدمے قلمے کوشاں رہیں گے اور ہیں۔

ہم اُوپر لکھ آئے ہیں کہ حکومت کا اثر زبان پر لازمی طور سے پڑتا ہے۔ اب بھی اُردو میں صدہا لفظ انگریزی کے جزو اُردو ہو گئے ہیں۔ ڈپٹی۔ ریل۔ سٹیشن۔ ٹکٹ۔ کارڈ۔ رجسٹری۔ سٹامپ۔ نوٹ۔ کوٹ۔ واسکٹ۔ کنٹر۔ کلاس۔ تھیئٹر ہزارہا الفاظ لوگوں کی زبان پر چڑھے ہوئے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ اُردو کے الفاظ بھی انگریزی میں بیسیوں داخل ہو گئے ہیں مثلاً بازار۔ جنگل۔ ایک دم۔ خاکی۔ وغیرہ وغیرہ۔ انگریزی زبان کی جو جدید ڈکشنری نکلتی ہے اُس کے ساتھ ایک ضمیمہ اُن نئے الفاظ کا ہوتا ہے جو بضرورت اپنی زبان میں لے لئے گئے ہیں۔ پس کیا وجہ ہے کہ ہم فارسی عربی ترکی وغیرہ کے الفاظ تو بلاغل وغش اپنی زبان میں لے لیں اور نہ لیں تو انگریزی کے۔ کوٹ پہنیں پتلون پہنیں نک ٹائی لگائیں بوٹ پہنیں صرف زبان ہی بیچاری نے کیا قصور کیا ہے کہ اُس کے اضافے اور توسیع کو اِس سختی سے روکیں یہ تو وہی بات ہوئی کہ "گڑ کھائیں گلگلوں سے پرہیز"۔ جب میں حیدرآباد میں تھا تو ایک دن مولوی سید علی صاحب بلگرامی مرحوم مجھے ملے اور فرمانے لگے کہ "آپ کے والد کے لکچروں میں بے ضرورت انگریزی کے لفظ ٹھونس دیئے گئے ہیں"۔ میں نے والد مرحوم (مولوی نذیر احمد صاحب) سے ذکر کیا انہوں نے فرمایا کہ "مولوی سید علی صاحب کی زبان سے تو یہ اعتراض بھلا نہیں لگتا کہ جن کا اوڑھنا بچھونا انگریزی ہے۔ جن کے گھر کو جا کر کوئی مسلمان دیکھے تو سرے سے مسلمان کا گھر ہی نہ معلوم دے"۔ پس جو لوگ اُردو کا گلا گھونٹتے ہیں اور ۔۔ زمان کے الفاظ اُس میں شامل ہونے سے کراہت کرتے ہیں اُن کی خدمت میں عرض ہے کہ زبان کی ۔۔ وسعت موقوف ہے دوسری زبانوں کی امداد پر۔ اُسی دریا کا پاٹ بڑھتا ہے جس ۔۔ ندی ۔۔ لے کثرت سے شامل ہوں ورنہ منبع کے پاس دیکھیے تو اُس کی حیثیت ایک معمولی چشمے سے ۔۔ زیادہ نہیں ۔۔ ترقی خواہان زبان اُردو کو ہر ممکن ذرائع سے جن سے زبان کو تقویت ہو استفادہ ۔۔ حاصل کرنا چاہئے۔ اِتنی مغایرت اِتنا پرہیز ایسی تنگ خیالی کیا ہے چلتی ہوئی گاڑی میں روڑا اٹکانا ہے

خاکسار بشیرالدین احمد۔ از دہلی۔

صلائے عام - یہہ مضمون مولوی نذیر احمد صاحب مرحوم کے صاحب زادے کا ہے - اِس پتہ کی ضرورت اس لئے ہوئی کہ اُردو سے محبت اور اسکی ترقی کی فکر صاحب مضمون کی میراث میں آئی ہے - سید احمد خان - محسن الملک - مولوی چراغ علی اور مثل انکے اور نامور اصحاب کی صحبت کے یہہ لوگ ہیں: انکا اُردو پر احسان ہے اور اُردو پر ان کا حق ہے ؛ اپنی زبان کی ترقی کی فکر ہر شریف پر فرض ہے - جب تک یہ ادا نہ ہو باقی دعوے قومی و ملکی خیر خواہی کے غلط ہیں ؛ مجھے اس مضمون سے بالکل اتفاق ہے لیکن محض صلاح و مشورہ سے کام نکلنا مشکل معلوم ہوتا ہے ؛ آپ کی رائے بہت درست ہے کہ غیر زبانوں کے الفاظ سے جو اُردو میں آسکیں زبان کی ترقی ضرور ہوگی - لیکن زبان سے سو پچاس لفظ نکلجانے یا آجانے سے اُردو کی قسمت چمک نہیں سکتی ؛ خود مصوری یا معماری اختیار کرنے سے تعمیر یا تصویر کے فن کو ترقی ممکن نہیں - جب تک کہ آپ اُس فن کے اہل کمال کی قدر نہ کریں - اور قدر نری واہ واہ ! خوب کہا - کیا کہنا - شاباش - مرحبا سے ممکن نہیں ؛ جس چیز کی تعریف کیجئے اور جس سے اپنا جی خوش ہو اُس پر خرچ کرنا مقتضائے شرافت ہے ؛ اُردو کے اخبار اور رسالے نکالنے والوں کے دلوں سے پوچھئے کہ کس قدر زیر باریاں اُٹھا رہے ہیں - کسی شریف کا جمع خرچ منگا کر دیکھیے کہ حضرت نے اپنی زبان کے اخبار و رسالوں پر کس قدر خرچ کیا ؛ زبانی جمع خرچ سے زبان کی ترقی خیریت ہے - اپنے ملک کے رسالوں پر جسقدر ہو سکے خرچ کیجئے اور اچھے لکھنے والوں کو فکر معاش سے مستغنی کر دیجئے ؛ ہر شریف اپنی آمدنی کا چوتھا حصہ اپنی زبان کی قدر شناسی کے ثبوت میں خرچ کرے - اس کے بعد اگر جی چاہے قومی اور ملکی جھگڑوں میں پڑے ؛ جب تک آپ اپنی زبان کی لٹریچر پر روپیہ خرچ نہ کریں گے زبانی خرچ سے کچھ فائدہ نہیں ہو سکتا ؛

رہا دوسرا مسئلہ کہ دلّی کی زبان اچھی ہے یا لکھنؤ کی یہہ اُردو لٹریچر کے لئے ضروری نہیں ہے محض زبان تو خدا نے جانوروں کو بھی دی ہے اور آواز رعد و آندھی و پہاڑ میں بھی پیدا ہوتی ہے

کوہ طور کی آواز سے تو تمام دنیا ہل گئی: گرامو فون میں بھی آواز ہی کا کھیل ہے۔ مگر محض زبان سے غرض نری آواز نہیں ؛ زبان کے لئے پاکیزہ خیالی کی بھی ضرورت ہے۔ اسے مضمون کہتے ہیں۔ یعنی زبان کے ساتھ کوئی پاکیزہ خیال بھی پیدا ہو ؛ اگر آپ کو اور زبانوں سے بازی لینی ہے یا کسی زبان سے کم رہنا منظور نہیں ہے تو اپنی زبان کے ساتھ خوبیٔ خیال بھی پیدا کیجئے ؛ لٹریچر یعنی انشا و ادب کے لئے محض الفاظ کا اجماع بے کار ہے یہ بات تو فرہنگ و لغت کی کتابوں سے حاصل ہو سکتی ہے۔ لٹریچر سے غرض یہہ ہے کہ پاکیزہ خیال پاکیزہ طرز پر ادا کیا جائے۔ زبان سنسکرت کے سمجھنے والے اب نہیں رہے۔ مگر اُس زبان کی پاکیزہ خیالیاں دنیا میں یادگار ہیں۔ اور جب تک دنیا میں دل دماغ کی قدر رہے خیال کی پاکیزگی زبان فنا ہونے کے بعد بھی باقی رہیگی۔ اس لئے ضرور ہے کہ زبان کے ساتھ خیال کی پاکیزگی پر زیادہ زور دیا جائے ؛

(بقیہ صفحہ ۳۵)

صلائے عام ۔ یہ مضمون مورخانہ ہے اور ایک فروری مسئلہ کے حل کرنے کے لئے چھیڑا گیا۔ سوال یہ ہے کہ رقعات عالمگیری میں عالمگیر بادشاہ نے اپنے بیٹے کو لکھا کہ "مادر شما اودے پوری ارادہ رفاقت دارد"۔ یہہ اُودے پور کے خاندان سے کیا تعلق رکھتی تھیں؟ صاحب مضمون نے ایک خوش کن بات پیدا کی ہے کہ بیگمات میں سے ایک بیگم "اودے پوری" اس وجہ سے مشہور ہوگئیں کہ بادشاہ کو سوا برس اودے پور اور نواح اودے پور میں گزرا۔ اس عرصہ میں بیگموں میں سے کسی بیگم کا لب و لہجہ اُس ملک کا سا ہو گیا۔ بات تو خاصی نکل آئی۔ مگر اور بیگمات میں سے کوئی مارواڑن یا راجپوتانی مشہور نہ ہوئی۔ اسی بیگم کو یہہ خصوصیت کیوں حاصل ہوئی؟ دوسرے عالمگیر سا محقق شخص عامیانہ الفاظ کا پابند ہو نہیں سکتا۔ خاصکر آخیر وقت میں جب کہ بیٹے کو خط لکھنے بیٹھے ؛ رہا مؤصاحب کا بیان۔ صاحب موصوف کو رطب و یابس سے غرض نہیں جو بھاٹوں نے کہا لکھدیا ؛

لیکن اس مضمون میں بڑے کام کی بات یہ طے ہوئی کہ ڈولہ کی رسم شاہان مغلیہ کے وقت میں جس

صلائے عام کی ڈاک

جناب مرزا انجم آفندی اکبرآبادی ارقام فرماتے ہیں کہ × × × × × × ×

"جناب مجھسے واقف نہیں ہیں لیکن آپ سے ایک دُنیا واقف ہے اور ہر شخص ضرورت کے وقت آپکی طرف دوڑتا ہے۔ آپ کی وسیع الاخلاقی نے مجھے جرأت دلائی ہے کہ میں آپسے امداد کا طالب ہوں جس سے ایک زمانہ مستفیض ہو رہا ہے × × × ×

مختصراً گذارش ہے کہ پہلے رسالہ[1] کے لئے کوئی مضمون مرحمت فرما کر مجھے شکریہ کا موقع عنایت کیجئے × × × × یقیناً میں ایسا بدقسمت نہیں ہوں کہ میرا رسالہ آپ کے غیر فانی مضامین سے خالی نظر آئے × × × × × × × × × × ×

صلائے عام

ہر مُرغ کہ پر زد بہ تمنائے اسیری ❊ اوّل بہ گُلوں کرد طوافِ قفسِ ما

مضمون نگاری کی پرانی شق کیوجہ سے اکثر مجھسے تقاضے ہوتے ہیں کہ مضمون لکھ لیکن یہ خیال نہیں رہتا کہ کہنہ مشقی کے ساتھ کہن سالی کا عیب بھی ہونا ضرور ہے۔ اور کہن سالی کے لئے کاہلی لازمی ہے: ع ضعف یکسر فراغ می خواہد۔ مجھے صلائے عام کے لئے ہی مضمون لکھنے مشکل ہو رہے ہیں۔ خدا سے چاہتا ہوں کہ میرے کرم فرما اگر مجھے صلائے عام سے سبکدوش کردیں تو احسان ہوگا ؎

بلا سے گر نگہِ یار تشنۂ خوں ہے ❊ رکھوں کچھ اپنی بھی مژگانِ خوں فشاں کیلئے

[1] آگرہ سے تسنیم نامی ایک رسالہ جاری ہونیوالا ہے

صلائے عام سے فرصت ملے تو میں تعمیل ارشاد کے لئے حاضر ہوں ؛

صلائے عام

باقی ڈاک کا جواب میں یہاں دینا مناسب سمجھتا ہوں۔ سید منظر علی صاحب (فرزند مولوی **اشہری** صاحب مرحوم) حیدر آباد سے لکھتے ہیں۔ × × × × × × × × ×

× × × "جی چاہتا ہے کہ **صلائے عام** روزانہ ہو جائے اور میں روز دیکھا کروں" × × × ×

آپ اسے ماہواری ہی رہنے دیں۔ اسکا خرچ ماہواری ہی نکل سکے تو غنیمت ہے ؛

سید عبد الرؤف شاہ صاحب کی خدمت میں عرض ہے کہ صلائے عام کی قیمت بذریعہ منی آرڈر عنایت فرمائیں

جمعیۃ الاصلاح (ندوۃ العلما۔ لکھنؤ) کے صاحب سکریٹری چاہتے ہیں کہ "**صلائے عام** انجمن کے نام آنا چاہیئے۔ کسی صاحب کے نام کی تخصیص نہ ہو" × × × × × × × × ×

صلائے عام ٹٹولوان بھیجنا مجھے پسند نہیں۔ انجمن کے ممبر صاحبوں سے میں واقف نہیں۔ انجمن کے افسروں میں سے کسی عہدہ دار کے نام سے مجھے مطلع فرمایا جائے ؛

اب کی دفعہ باوجود حجم بڑھا دینے کے اکثر مضامین رہ گئے۔ خاصکر جناب مرزا عرفان علی بیگ صاحب آئی ایس او۔ کا مضمون ؛ مضمون بڑا ہے۔ گنجایش کا انتظار رہے ؛ امید ہے کہ یہ عذر قبول فرمایا جائیگا ؎

گو داغِ جگر میں نہ بھرا جائے بہت مشک ؛ پر کم تو نہ ہو نافِ غزالِ ختنی سے

عقائد اسلامیہ میں ہے کہ **لیس الانسان الا ما سعیٰ** - اور انگریزی میں حصول مطلب کے لئے کوشش وسعی پر ہر انگریز خواں کا ایمان ہے۔ لیکن سعی و کوشش سے مطلب نکلے؟ یہ میں عرض نہیں کرسکتا ؛ قیس سے زیادہ کیا کوئی جانفشانی کریگا؟ اور فرہاد نے کوشش میں کیا کمی کی؟ دونوں کی محنت بیکار گئی۔ محنت کا ٹھکانے لگنا پروردگار کے فضل پر موقوف ہے ؏ کار بہ فضل باقی بہانہ ؎

کوشش طلبِ وصل میں ہے شرط مگر کیا؟ ؛ فرہاد کو کچھ ہاتھ لگا کوہ کنی سے ؛

صلائے عام

(چند ضروری باتیں)

جس طرح یہہ نام خاص و عام کے لئے تکیہ کلام ہو رہا ہے مجھے بھی جو کچھ کہنا ہوتا ہے اکثر اسی عنوان سے عرض کرتا رہتا ہوں پہلے عرض کر چکا ہوں پھر عرض کرتا ہوں ؎

بازکارم بہ جگر کاوئی مژگاں اُفتاد ؛ نوبتِ خندہ ام از لب بہ گریباں اُفتاد

آپ دیکھتے ہیں کہ معمولی رسالوں سے صلائے عام نے ایک خاص طرز اختیار کر رکھی ہے ۔ مجھے پسند نہیں کہ انگریزی کے محض ترجمے لکھے جایا کریں۔ یہ ہم اصل زبان میں دیکھ سکتے ہیں: آپ تو وہ بات لکھیں جو اور جگہ میسر نہ ہو ؛ پند نامے (کریما مامقیماں) نقل نہ کئے جائیں۔ معمولی پند و نصایح کی کتابوں سے کتب خانے کے کتب خانے

بھرے پڑے ہیں ؛ ناولوں کی ضرورت نہیں کہ انگریزی میں تو ناول سے کوئی نتیجہ خیز بات پیدا ہوتی بھی ہے اُردو کے ناول عورت و مرد کے نیچرانہ تعلق کے سوا اور کچھ نہیں جانتے ؛

نظم میں غزلوں کے سوا شاعری سے اور کوئی غرض سمجھی نہیں گئی۔ غزلوں سے سیکڑوں دیوان بھرے پڑے ہیں ؛ آج کل کی شاعری سے اساتذہ کا کلام کہیں بہتر ہے۔ بہت کم کوئی نیا مضمون آجکل دیکھنے میں آتا ہے ؛ معلومات علمی و تاریخی میں جو بات کتابوں اور تاریخوں سے معلوم ہو سکے اُس کا ذکر تحصیل حاصل ہے کہ اِس فن کی کتابوں اور تاریخوں میں آپ کے اور میرے مضامین سے زیادہ درج ہے۔ اِس کی تمثیل کونسل کے سوالوں سے سمجھ میں آجائیگی ؛ کونسل کے ممبر سرکاری ممبروں سے کبھی کبھی بڑے بڑے نقشے اور بڑی بڑی تفصیلیں طلب کرتے ہیں جس کے جواب میں یہہ کہنا پڑتا ہے کہ یہہ اطلاعیں مطبوعہ سرکاری رپورٹوں سے بخوبی معلوم ہو سکتی ہیں۔ آپ اُن میں ملاحظہ فرما لیجیے ؛

رہا بات بات پر گورنمنٹ سے اُلجھنا یا حُکاّم کی شکایت جو بعض اخباروں کا طریقہ ہے یہہ ہندستانی تہذیب کے خلاف ہے۔ ہماری تہذیب و تعلیم میں ادب اداب مقدم ہے آپ اپنی طرز معاشرت اور اباءو اجداد کی وضع پر چلیں۔ ازادی اور بے باکی میں فرق ہے

گر گشت غمزۂ تو مرا بے سبب نہ بود ؛ اظہار درد پیش تو شرطِ ادب نہ بود

میری التجا ہے کہ آپ نظم و نثر میں جو بات لکھیں وہ اور جگہ نہ نکلے۔ آپ کے ادائے بیان میں وہ خصوصیّت ہو جو ادائے حسیناں کی طرح اور کہیں نظر نہ آئے ؛ یہ میں ازروئے تعلّی نہیں کہتا

ازروئے ضرورتِ حال عرض کرتا ہوں ؎

دُنیا کے سخن سنجوں سے ہوجائیں برابر ؏ ہم بھی جو کہیں کوئی نہیں ہم سے زیادہ

یہہ ایک گونہ تعلی سہی - لیکن تعلی ہماری زبان کی جان ہے ؎

اس درجہ بےخودی نے دکھائیں تعلیاں ؏ گردوں غبارِ قافلۂ ہوش ہوگیا

صلائے عام میں زیادہ تر ایسے مضامین ہوتے ہیں جن سے نظامِ عالمِ اسباب پر غور کرنے کی سوجھتی ہے - جو انسان کے رنج والم مصیبت و تکلیف میں کم و بیش تسلی کا باعث ہوں ؏ دنیا کے جب اکثر کام بگڑتے دیکھے بلکہ اچھے خاصے بنے بنائے بگڑتے نظر آئے تو بقول جناب **منیر** یہہ کہنا بیجا نہیں ؎

ہے بود جہاں نقش سرِ آب نظر میں ؏ یہہ کھیل ہمیں بنکے بگڑتا نظر آیا

نیچر (عالمِ اسباب) نے انسان کو بچپن سے اخیر تک جس محبت و محنت سے پالا پوسا ممکن نہ تھا کہ ہر چیز پہلے سے مُہیا کردی کہ مانگنے کی ضرورت نہ رہے - آنکھ - ناک - کان - گوشت استخوان حُسن و جمال - خط و خال جہاں جس طرح مناسب تھا عطا فرمایا - لیکن اسقدر تکلف کے بعد بلا وجہ ہمارا فنا کرنا ہماری سمجھ سے باہر کیوں رکھا - پل پلا کر جب ہم کسی لایق ہوئے تو قربانی کے دُنبہ کی طرح ہمارے گلے پر چُھری پھیردی ؏ میں نے دیکھا ہے کہ اکثر دُنبہ کو بچہ سا لیکر بڑے تکلف سے پالتے ہیں - روز نہلاتے ہیں - چنے کی دال - جلیبیاں اور ترکاریاں کھلاتے ہیں کہ ازروے فربہی دیکھنے کے لایق ہوتا ہے - مگر آخر کو ذبح کرنے کے سوا اور کوئی نتیجہ نہیں ؛ اسی طرح انسان کس تکلف سے پلتا ہے اور آخر کو اسطرح فنا ہوجاتا ہے کہ کوئی نشان باقی نہیں رہتا ؏ چند روز کے لئے مقبرہ یا کوئی یادگار جو بنائی جاتی ہے اس سے مرنے والے کو کیا تعلق ؟ ہمارا دم تو چُھری کے نیچے نکل چکا اب آپ جانیں آپ کا کام جانے ؎

پرورش تقدیر کرتی ہے مجھے بہر قضا ؏ ذبح کو پروردہ کرنا کام ہے قصاب کا

دُنیا کس طرح بنی - کیوں بنی - کبھی فنا ہوگی یا یوں ہی چلی جائے گی ؟ ان سوالوں کے جواب آج

تک اسطرح نہ دئے گئے کہ سب کو تسلّی ہو جاتی۔ تسلّی ہو جاتی تو مرنیکا خوف ہی کیوں ہوتا؟ انسان کے ساتھ باوجود لاچاری جوابدہی کی شرط کیوں لگائی گئی؟

یہہ اسرار ازل مضمون پریشان میں سالہا سال سے لکھے جا رہے ہیں لہٰذا اور مضامین کو چھوڑ کر صرف یہی مضمون جمع ہو جائیں تو عالم اسباب کی فلاسفی کا خاصہ ذخیرہ سمجھئے سه

شاد مانم ز پریشانیٔ دل زانکہ مدام ؎ خبر از حالت دلہائے پریشان دارم

اس کے ثبوت میں آپ صلائے عام کی ڈاک میں جناب اخگر کے خط کا خلاصہ ملاحظہ فرمائیں :-

قطع نظر اس کے۔ صلائے عام کے مضامین میں خوبیٔ زبان کا بھی خیال رکھا جاتا ہے بیگانہ لب ولہجہ سے اسطرح احتراز رہتا ہے جس طرح بیماری میں بدپرہیزی سے ؛ ہماری زبان کی خوبیاں اگر دہنِ یار کی طرح پوشیدہ رہیں تو زبان بیکار ہو جائے۔ اُس ساز کی طرح جو کبھی بجایا نہ جائے یا اُس نغمہ کی طرح جو کبھی گایا نہ جائے سه

زخمے بنوا تازہ نہ کردیم دریں باغ ؎ افسوس ازاں نغمہ کہ در پردہ کہن شد

زمانۂ حال کے لئے صلائے عام کی ضرورت زیادہ ہے کہ دل و دماغ کے واسطے اس سے بہتر رسالہ نظر نہیں آتا۔ بلکہ جو رسالے دل دماغ خوش کرنے کے لئے ہیں اور ان سے زیادہ کی ضرورت ہی ؛ دوسرے۔ رسالوں کی وجہہ سے مضموں نگار ایسے ایسے ذی کمال پیدا ہو گئے ہیں کہ اور کسی صورت سے میسر نہیں آسکتے۔ یہہ لوگ تمام قومی وملکی خیر خواہوں سے ملک و قوم کی زیادہ خدمت کر رہے ہیں ؛ ہندوستان کے اردو رسالوں کے طفیل سے آپکی زبان کی آواز آپ کے کانوں تک پہونچ جاتی ہے کہ کوئی حرف آشنا کچھ کہہ رہا ہے ورنہ آپ کی زبان اور ملک گونگے کا خواب ہو جاتا سه

کوچۂ یار میں سرگرم تماشا ہیں مست
باغ فردوس میں میلا ہے گنہگاروں کا

Presentation of Mir Nasir Ali Khan Bahadur of Delhi to his Most Gracious Imperial Majesty King Emperor.

—:o:—

Extract from a letter from J. P. Thompson, Esquire I. C. S. Dated 13th December, 1911.

—:o:—

"Dear Mir Sahib"

I enclose your invitation card for the Garden Party this afternoon, which has just reached me from the private Secretary to His Honour."

o o o "Sir Louis Dane hopes to have an opportunity of presenting you to his Imperial Majesty." o o o o

—:o:—

Extract from a letter from Sir Richard Dane. K. C. I. E. (Brother of His Honour the Lieutenant Governor of Punjab) Dated Lieut. Governor's Camp, 25th February 1912.

"Dear Mir Nasir Ali"

o o o o o o o o

My Brother has told me that you had the great honour of being introduced to his Imperial Majesty the King Emperor"

I am, Yours Sincerely,

—:o:—

Extract from a letter from Major J. C. C. Angelo, Dy. Commissioner, Dated, 18th December 1911.

"My Dear Mir Sahib.

"I Am very glad you were Presented to His Imperial Majesty—it was a fitting ending to the Durbar." o o o o o

Your Sincerely,

Babu Rebindra Nath Tagore of Gitanjali, writes:-

o o o o o

"I have no doubt that it (Sala-i-Am) is doing a good service in promoting the cultivation of Urdu literature."

o o o o o o

Extract from a Gentleman's letter Dated April 4, 1914.

o o o o o o

"I conclude from the last issue of the Sala-i-Am that you have been invested with a *Khilat* as Diwan of the Pataudi State, will you permit me as an old friend of yours and an admirer of your genius to offer you my sincere congratulation.

o o o o o o

"It like Addison you have acquired celebrity as an Essayist and a brilliant writer of Urdu prose; o o

o o o o o o

you, like him, deserve to be raised to the highest advancement in the state' Now, that is no flattery I speak as I think." o o o

"In conversation this morning with o o I brought to his notice the Sala-i-Am, and have at his request sent him your December Number, drawing his particular attention to your "Stray thoughts" مضمون پریشان o and especially to your simile of

یار کی زلف پریشان

o o o o o o

Farrash-khana Delhi. He has recently started an Urdu Magazine Sala-i-Am, in his own city. He is a writer of some forty years standing His writings are appreciated in Lucknow as well as in Delhi He has been congratulated for his work by the Lieutenant Governor of Punjab. He has received congratulations from all parts of India compliments from many literary men and favourable reviews from the Press, and now, that great boon the appreciation of Lord Minto. His style is very simple but emphatic. He wtries philosophical essays in Urdu and is thus doing much to bring to a high level Urdu literatare. It is hoped that the paper he has started will do much for the good of our languages. The paper itself is nicely got up, the annual subscriptions only Rs. 3. Those who are desirous of reading good Urdu should at once communicate with the editor, the point also I should add that the paper is much liked and purchased by Europeans both in India and Europe."

:0:0:0

Copy of a letter from the Private Secretary to His Honour the Lieutenant Governor of the United Provinces, dated 11th April 1913.

GOVERNMENT HOUSE.

LUCKNOW.

Sir

I am desired to acknowledge your letter of the 19th forwarding a copy of your paper "sala-i-Am." for His Honour the Lieutenant Governor's perusal; and to say that His Honour has put it a side to study an enjoy at leisure.

oo

The annexed Review of the SALA-I-AM Delhi, is re published from the Journal of the Moslem institute. Calcutta. No 2 Vol V. Page, 104.

0:.0:.0

"The Sala-i-Am, publihed at Delhi is a high class Urdu periodical and in get up printing and style it is without a parallel, it has been truly remarked by the Pioneer that it, "seeks to promote the cultivation of Urdu literature." It is edited by Khan Bahadur Mir Nasir Ali who is a writer of 40 years standing."

Extract from the GAZETTE OF INDIA JUNE 6, 1914. EXAMINATIONS.

XVI:— The following are the Text books prescribed for the PROFICIENCY EXAMINATION:—

o o o o o o

URDU:—

o o o o o o

In addition to the Grammer and Magazine recommended for the proficiency examination, the following are recommended :—

o o o o o o

Magazine

SALA-I-AM

o o o o o o

Appendix B. List of authorised Text books. The following is a list of Text books prescribed for the various examination together with the places where they may be obtained.

o o o o o

URDU.

SALA-I-AM——————DELHI

o o o

school :—

"Sala-i-Am" edited by Mir Nasir Ali Khan and published at the Mustansir Press Delhi, annual subscription Rs. 5.

I have &c.

J. C. GODLEY

Director of Public Instruction, Punjab

Extract from a letter from R. P. DEWHURST Esquire I. C. S Session Judge, dated 11th January 1911.

"I take this opportunity of saying that I entertain a very high opinion of your Magazine I will not say that I read every word of every number, but I can say with truth that I read eagerly all the articles proceeding from your own pen begining to end."

"I have always been an enthusiast with regard to Urdu literature since I come to India eighteen years ago and have read much classical verse and prose besides the more ephemeral publications but I have never yet encountered such a model of a clear and attractive prose style as I find in your articles.

Extract from a letter from the Hon'ble W. Merk Esquire, L. L. D. C. S. I. I C. S, Late Chief Commissioner, N.W. Frontier province Written from England dated 16th August 1911

I thongt it (Sala-i-Am) a periodical that might be encouraged with for advantage. for instance to be placed in the waiting rooms for native gentleman calling on Deputy Commissionere.

Extract from a letter from A L GORDON WALKER Esquire I C S Punjab Commission dated 11th October 1911

"I quite agree with Mr. Merk that the (Sala-i-Am) ought to be in the waiting room of all Deputy Commissioners. Curiously enough I have used it for the purpose myself and always find that the Indian gentlemen who read it are delighted with it."

Extract from a D. O letter from the Deputy commissioner of Gurgaon to the vice chancellor of the Punjab University dated 14th December 1910

"I wonder if you have any collection of receiving a letter from me last July when I sent you a copy of the Sala-i-Am, edited by Khan Bahadur Mir Nasir Ali, a most estimable old Government servant who spends his leisure hours, when not occupied in his Magisterial duties [he is an Honorary. Magistrate in Delhi] in editing and publishing quite one of the best Magazines in Urdu.

"I am sending you another copy of the Magazine with a request that you will as Vice Chancellor of the University give it all your assistance and if possible, its Editor the Mir Sahib, who is a most loyal old man and a man of letters."

---o---

EXTRACT FROM THE INDIAN DAILY TELEGRAPH LUCKNOW DAILY 14th DECEMBER, 1901.

"But the chief point about which I have taken up my pen to write is the literature of Khan Bahadur S. Nasir Ali Sahib of

OPINIONS

Regarding "SALA-I-AM" Delhi.

The following Critique on the "SALA-I-AM," Delhi, was Published by the Pioneer in its issue of the 3rd November 1909

"The Sala-i-Am published at Delhi keeps up high character as a periodical which seeks to promote the cultivation of Urdu literature. Khan Bahadur Mir Nasir Ali, with whom loyalty and learning go hand in hand is filling the leisure hours of his retirement by devoting himself to the editing and publishing of this Magazine. His style is marked by refinement and culture, and his readers should increase in number as the merits of his work become disclosed. The Sala-i-Am is particularly well printed and European students of Urdu should find it quite worth reading."

ooo

Extract from a letter from Colonel D. C. PHILLOT, Secretary Board of Examiners, Calcutta, dated 20th January 1910

"I have obtained the opinions of some of the board on the "Sala-i-Am" We think it is the best Urdu Magazine we have yet seen both in appearance and contents I shall have great pleasure in recommending it to candidates for the high Proficiency and Degree of Honour In fact, I have been doing so."

oo

Extract from a letter from Sir Thomas GORDON WALKER L. L. K. C. I. E. Late Lieutenant Governor of Punjab Dated 15th March 1909

oo

"The Magazine (Sala-i-Am) appears to be a very superior work one that ought to be appreciated."

SIR LUCAS WHITE KING
Kt. L. L. D., C. S. I. F. R. S.
Indian Civil Service retired
writes as follows:-

"I am delighted with the style of your Magazine and am looking forward to the next number.

Dated 15th October 1908

o

Extract from CIRCULAR No 26 SERIAL No 5059

From the Hon'ble Mr J. C. GODLEY M.A. Director of Public Instruction Punjab.

TO ALL DEPUTY COMMISSIONERS INSPECTORS OF SCHOOLS, HEADS OF TRAINING INSTITUTION & MANAGERS OF AIDED and RECOGNIZED UNAIDED SCHOOLS IN THE PUNJAB.

Dated Lahore The 31st August 1910

Sir,

I have the honour to recommend the Journals noted below for the reading room of Secondary

صلائے عام

خواجہ قمرالدین راقم کا شعر ہے ؎

مقصد تمہارے ہاتھ ہے قسمت خدا کے ہاتھ ٭ جو کچھ خدا سے ہو وہ تمہاری زباں سے ہو ٭

صلائے عام کا بھی یہی عقیدہ ہے کہ کسی ملک و قوم کی ترقی تو پروردگار کے اختیار میں ہے لیکن ترقی کے لئے پہلی شرط اپنی زبان میں کمال پیدا کرنے کی ہے ٭ ضد کی اور بات ہے مگر اس وقت ہندوستان کی زبانوں میں اُردو سے بہتر کوئی زبان میری سمجھ میں نہیں آتی جس پر جمہور اہل ہند (ہندو ہوں یا مسلمان) دونوں کی زبان کا اطلاق ہو سکے ؎

نغمۂ عشق سے ہیں سجدۂ زنار سلے ٭ ایک آواز پہ دو ساز کے ہیں تار سلے

خلاقِ دو عالم کی طرح اُردو زبان کی تعریف سب سے پاکیزہ یہ ہے کہ ؎

تجھسے کوئی آشنا نہ ہو یا ہو ٭ پر تجھے سب سے آشنا دیکھا

یہ رسالہ اپنی زبان میں اظہارِ کمال کی غرض سے جاری ہے کہ اُردو لٹریچر کے لئے ہر طرز پر لکھنے کا مسالہ جمع ہو اور ادائے بیان میں ہماری زبان اور زبانوں سے اگر بازی نہ لے جاسکے تو کسی زبان سے مرتبہ میں کم نہ رہے ؎

دیکھ کر تجکو مٹے جاتے ہیں دنیا کے حسیں ٭ جمع ہوتا ہے مسالہ تری یکتائی کا

صلائے عام میں ہر طرح کے مضمون نظم و نثر شایع ہوتے ہیں۔ زیادہ تر نثر کا اسوقت نثر کی ضرورت ہے: اور نثر بھی ایسی جسمیں زبان کی خوبی و فصاحت کے ساتھ خیال کی پاکیزگی اور نزاکت ضرور ہو ؎ دل باندھئے تو یار کے کاکل سے باندھئے ٭ بلبل کو باندھئے تو رگِ گل سے باندھئے

صلائے عام اعلیٰ حکام سول و ملیٹری افسروں کے اِمتحان میں

گورنمنٹ آف انڈیا سے منظور ہو چکا ہے ہندوستان کے سوا یورپ کے عالم و فاضل صلائے عام کی قدر کرتے ہیں: اُردو میں صلائے عام کے مضامین کو خاص مرتبہ حاصل ہے ؎

دل پر تمہارے نقش ہوا ہے بیانِ شوق ⁂ کارِ قلم دکھاتی ہے میری زبان شوق

صوبۂ آگرہ و اودھ کے رشتۂ تعلیم کے نصاب میں صلائے عام کے مضامین اُردو فائینل ریڈر میں انتخاب کر کے درج کئے گئے اور صاحب پریسیڈنٹ نصاب اُردو نے جو حسب ایمار گورنمنٹ بمبئی منعقد ہوئی میرے مضامین کو اُردو ریڈروں میں شامل کرنیکے لئے مجھے لکھا:

اکثر اصحاب نمونہ کا پرچہ مانگتے رہتے ہیں۔ اوّل تو ایک پرچہ سے صلائے عام کا پورا حال معلوم ہونا مشکل ہے دوسرے صلائے عام کو جاری ہوئے عرصہ ہو گیا نمونہ بھیجنے کی مجھے ضرورت نظر نہیں آتی ؎

پیری میں بھی ہے ولولۂ شوق نہیں ہم ⁂ رکھتے ہیں ابھی اک دلِ ہنگامہ گزیں ہم
شہرت نہیں مجنوں کے برابر یہ مسلّم ⁂ پر کوئی نہ جانے ہمیں ایسے بھی نہیں ہم

صلائے عام کی قیمت پیشگی چھ روپیہ سالانہ ہے۔ چھ مہینے سے کم کی خریداری منظور نہیں ہو سکتی قیمت بذریعہ منی آرڈر عنایت فرمائی جائے۔ مضمون نگار صلائے عام کی قیمت سے بری نہیں: نہ یہ ضرور ہے کہ ہر مضمون خواہ مخواہ شایع کیا جائے ⁂ جو مضمون شایع نہ ہو سکیں اُنکے واپس کرنے کا ذمہ نہیں: جامع اوراق کو مضمون میں کمی بیشی کا اختیار ہے ⁂ پچھلے پرچوں کی قیمت بشرط دستیابی ایک روپیہ فی پرچہ ⁂

صلائے عام کا پتہ اِسقدر کافی ہے کہ:

دہلی۔ فراشخانہ: مکان میر ناصر علیخاں بہادر ⁂

حسب الارشاد میر ناصر علیخاں بہادر مطبع ناصری واقع فراشخانہ دہلی میں باہتمام میر احمد چھپا اور شایع ہوا ⁂ ⁂

PRINTED AND PUBLISHED BY MIR NASIRALI KHAN BAHADUR (EDITOR)
AT THE NASRI PRESS FARRASH KHANAH, DELHI.



SALA-I-AM, DELHI.

A high class Monthly Magazine devoted to the cause of Urdu literature, the preservation of the old Indian, especially Mohammadan culture and refinement, and the assimilation of the best features of the new civilization.

جلد ۱۱ فہرست مضامین نمبر ۸

بابت ماہ اگست سنہ ۱۹۲۳ع مطابق محرم سنہ ۱۳۴۲ھ

پیرایۂ آغاز

پچھلے صلائے عام کے پیرایۂ آغاز میں یہہ شعر زیبِ عنوان تھا کہ

بے تاب ہوے یار کی چٹکی سے نکل کر ✤ تیر آپ تڑپنے لگے نخچیر سے پہلے ✤

اِس میں تڑپ کر نکلنے کا مضمون پاکیزہ تھا ہر پرچہ کے مضامین کا حال پہلے سے بتا دینا گویا بے تابی کی تمثیل ہے : بیقراری میں انسان کے دل کا حال پہلے سے کھل جاتا ہے ۔ بیقراری گویا افشائے راز کا باعث سمجھی گئی ✤ اسی طرح یہ شعر ہے کہ

کرتے ہو ذکر میرے دلِ بیقرار کا ✤ منہہ سے کہیں زبان نہ باہر نکل پڑے

جس طرح بے قراری میں رازہائے پنہاں کھل جاتے ہیں اسی طرح پیرایۂ آغاز سے پرچہ کے مضامین کا حال پہلے سے معلوم ہو جاتا ہے ✤

اس پرچہ میں مضمون پریشان کی صورت بدل گئی کہ ایک نہایت نامور مورخ

ابن خلقان کی تصنیف سے چند پاکیزہ پریشان خیالیاں بیاض کے طور پر نقل کی گئیں۔ فرق یہہ ہے کہ بیاض میں اکثر کلام نظم انتخاب کے طرز پر جابجا سے لکھا جاتا ہے۔ میرے مضمون میں جوکچھ انتخاب کیا گیا نثر میں ہے ؛

اس کے بعد **محشر خیال** میں ہو بہو وہی بات ہے جو عرصہ سے **مضمون پریشان** میں پائی جاتی ہے ؛ "مضمون پریشان" معمولی نام ہے اور "محشر خیال" شاعرانہ نام سمجھئے ؛

"**ایک لاجواب خط**"۔ خوش بیانی کا نہایت پاکیزہ نمونہ ہے۔ یہ طرز بیان اعلیٰ درجہ کی انشا پردازی کی جان ہے ؛

بیگم صاحبہ کا خط اور **مضمون** دونوں پڑہنے اور غور کرنے کے لایق ہیں ؛

مشاعرہ کی شاعری کے متعلق جناب یاس نے بہت مفصل لکھا تھا جسکا اقتباس یہاں نقل کیا گیا ؛ مشاعرہ میں ہر کلام کی خوبی ازروئے انصاف فوراً سمجھ میں آجانی مشکل ہے اچھے کلام کو جب تک اطمینان سے غور کرکے نہ دیکھئے داد دینی بیکار ہے ؛ مشاعرہ کی غزلیں ایک رسالے کے طور پر علیحدہ شایع ہوں تو سخن فہم اپنی رائے سوچ سمجھکر دے سکتے ہیں ؛

صلائے عام کی ڈاک روز بروز بڑہتی جاتی ہے اور ساری ڈاک کی نقل کرنی مشکل ہے مگر بعض تحریریں ازروئے انشا پردازی ایسی ہوتی ہیں کہ ناظرین صلائے عام کے دکھانیکو جی چاہتا ہے ؛ جس مضمون کی سرخی **صلائے عام ہے** (صفحہ ۲۸) پر صلائے عام کے طرز بیان کا معمولی نمونہ ہے

اندھا ہے وہ جسنے مرا مضمون نہ دیکھا ؛ بہرا ہے وہ جسنے نہ سنا میرے سخن کو

مضمون پریشان

متعلق بہ

ابن خلقان

سر سید احمد خاں بہادر نے ایک دفعہ انشاء اللہ کے متعلق بہت معقول مضمون لکھا کہ آج کل کس غرض، اور کس مطلب سے لوگ اسے کام میں لاتے ہیں: یعنی جس ارادے اور کام کے کرنے کو جی نہ چاہے تو انشاء اللہ سے کام نکال لیتے ہیں، مثلاً اگر کسی کی خاطر سے آنے کا وعدہ کیا (خاطر سے میں مصلحتاً کہتا ہوں کہ جی میں وعدہ پورا کرنے کا ارادہ نہیں) تو وعدہ کے ساتھ انشاء اللہ ضرور کہا جائیگا: غرض زبان و دل میں جب بیگانگی ہو تو انشاء اللہ کہنا ضروری سمجھا جاتا ہے۔ انشاء اللہ سے روزمرہ میں غرض یہہ رہ گئی کہ اب ایفاء وعدہ میں شُبہہ کرنے کا سامان ذہن میں سمجھ لینا چاہئے جس طرح

کثرت سے قسم کھانے والے کے قول میں سُننے والے کو شُبہہ پیدا ہو جاتا ہے اسی طرح اُن کے قول میں جن کا تکیہ کلام انشاء اللہ ہے ؎

نہ جھوٹ بول کہ ہم شام سے کل آئیں گے ؛ قسم نہ کھا ارے جھوٹے کبھی جو تو آئے

اسی طرح مورخانِ صحیح البیان جب ساری کہانی لکھ جاتے ہیں تو اخیر میں (واللہ اعلم بالصواب) پر تان توڑتے ہیں۔ یہہ اعتراض لوکس صاحب نے ابن خلقان کی تاریخ کی نسبت کیا کہ حضرت مورخ جب کوئی خاص بات بیان کرتے ہیں تو ساتھ ہی یہہ بھی ارقام فرماتے ہیں کہ واللہ اعلم بالصواب (خدا بہتر جانتا ہے)[1]

حضرت سے پوچھئے کہ جب خدا ہی کو علم ہے (اور اس عقیدہ سے انکار کسے ہے؟) تو آپ تحقیق کرکے کیوں نہیں لکھتے؟ آپ نے کیا تیر مارا جو بلا تحقیق کوئی بات جس میں شُبہہ ہو لکھ ماری؟ پھر رطب و یابس میں امتیاز کرنیکا اور جھوٹ سچ سمجھنے کا طریقہ معمولی سمجھ کے آدمی کے لئے کیا رہ گیا؟ اسی طرح یہہ فقرہ ہے کہ "راست و دروغ برگردنِ راوی"۔ اس تدبیر سے آپ نے تو اپنا پیچھا چھڑا لیا۔ اب میں کس سے پوچھنے جاؤں؟ آپ نے تحقیق کرکے لکھا ہوتا۔ تحقیق نہ ہو سکا تو لکھنے کی کیا ضرورت تھی: تاریخ نہ ہوئی اگلی بڑھیوں کی کہانی ہوئی کہ "آنکھوں کی دیکھی نہیں کہتے کانوں کی سُنی کہتے ہیں: ایک بادشاہ تھا۔ ہمارا تمہارا خدا بادشاہ: خدا کا بنایا رسول بادشاہ"؛

میں نے دیکھا ہے کہ سرکاری تحریروں میں جب مُلازمانِ ماتحت سے کسی امر کی

[1] منقول از کتاب المسمے بہ ...... "A Boswell of Baghdad".

تحقیق کے لئے رائے طلب ہوتی ہے تو سارا قصہ بیان کرکے لکھدیتے ہیں کہ "آگے جو مرضی حضور کی"۔ حضور کی مرضی میں شک کسے؟ مگر تم سے تمہاری رائے پوچھی ہے۔ تم اپنی رائے میں شک کیوں پیدا کرتے ہو؟" واجب تھا عرض کیا"۔

ابن خلقان کی تاریخی معلومات جس قدر کہ حضرت نے اپنی تصنیفات میں لکھیں لاجواب ہیں۔ ان کی تحقیق و واقفکاری کا سارا زمانہ قائل ہے۔ حضرت کی مورخانہ تصانیف کے مرتبہ کو کسی زبان کی تاریخ پہونچ نہیں سکتی ہے

کوئی افسانہ نہیں تیرے فسانے کی طرح ۔ سب تواریخیں پڑہیں سیکڑوں دفتر دیکھے

لوکس صاحب نے جن کا ذکر پہلے آیا۔ حضرت کے ذکر میں ایک خاص کتاب انگریزی میں لکھی جس کا نام "*A Boswell of Baghdâd*" ہے۔

باسویل صاحب کا نام انگریزی میں اس کمال کے لئے ہر شخص کی زبان پر ہے کہ ڈاکٹر **جانسن** کی ہر لحظہ و ہر گھڑی کی ہر بات جو اُن کے مُنہ سے نکلی اور جو کچھ اُنہوں نے دیکھا اور سُنا اس تفصیل کے ساتھ لکھا کہ **باسویل** گویا **جانسن** کے سایہ تھے۔ بلکہ سایہ رات کو جُدا ہو جاتا ہے یہہ رات دن کسی وقت جدا ہی نہ ہوئے۔ یہ خوبی **ابن خلقان** میں تھی کہ جو کچھ لکھا نہایت جانفشانی سے لکھا۔ بہت لکھا۔ اور کوئی بات چھوڑی نہیں۔ اس خوبی کی وجہہ سے **ابن خلقان** کو بغداد کا **باسویل** قرار دیا۔

ابن خلقان کی تصانیف کی داد کا حق ایک دو مضمون میں درکنار دو چار جلدوں میں بھی پورا نہیں ہو سکتا۔ لیکن چونکہ یہاں اُن کا نام آگیا ہے یہہ نام سنکر چپ رہنا شرافت

جعفر بن یحییٰ برمکی کے ذکر میں جن کے خاندان سے ابن خلقان کو واسطہ داری کا دعوائے تھا لکھا ہے کہ یحییٰ کے اقوال میں ہے کہ:-

جب بخت و دولت تیرے موافق ہو تو داد دہش میں کمی نہ کر۔ کیونکہ جب تک بخت موافق ہے تیری داد دہش سے دولت میں کمی آ نہیں سکتی: جب بخت کا ساتھ چھوٹا تو داد دہش میں کمی کرنی بے کار ہے کیونکہ یوں بھی اس حالت میں دولت کا رہنا ناممکن ہے: اس لئے ہر حالت میں جتنا تجھسے دیا جائے دے؛

بھلائی کرنے کا ارادہ اور جو لاچاری اُس ارادہ کے پورا کرنے میں ہو کہ ارادہ قوۃ سے فعل میں نہ آسکا دونوں تجھے خدا کی نگاہ میں مقبولیت سے باز نہیں رکھ سکتے؛

یحییٰ کا انتقال ۵۰۸ھ میں قید خانہ میں ہوا؛ ہاروں رشید یحییٰ کو باپ کہکے پکارتا تھا۔ مگر مزاج یار کی طرح بادشاہوں کا اعتبار نہیں۔ یحییٰ قید میں مرا؛

یحییٰ کا بیٹا جعفر خلیفہ ہاروں رشید کے عہد میں جس مرتبہ کو پہونچا دوسرا پہونچ نہیں سکتا۔ مگر انجام کار خلیفہ نے جعفر کے قتل کا حکم دیا: قاتل نے جب جعفر کا سر خلیفہ کے سامنے لاکر ڈالا تو خلیفہ نے سر کو دیکھ کر جلاد کو حکم دیا کہ جعفر کے قاتل کا سر اس کے تن سے جدا کر دے کہ میں جعفر کے قاتل کو زندہ دیکھ نہیں سکتا؛

شاہزادہ عبدالملک نے جس کو عشق و محبت کا دعوائے تھا قطیر سے کہا تجکو تیری قسم ہے اگر تو نے مجھسے زیادہ کسی کو مبتلا محبت دیکھا ہو۔ اُس نے بیان کیا:-

ایک دن میں جنگل میں جارہا تھا۔ جنگل میں ایک ناتوان کو دیکھا کہ جال ڈالے بیٹھا ہے

میں نے پوچھا کہ "یہاں کیوں بیٹھا ہے"؟ اُس نے جواب دیا کہ "فاقہ سے مرا بُرا حال ہے۔ جال میں کوئی شکار آ جائے تو کل تک زندگی ہو جائے"۔ میں نے کہا کہ "اگر میں تیرا ساتھ دوں تو مجھے شکار میں حصہ دیگا؟ جواب ملا کہ "ہاں"۔ اتنے میں ایک ہرن جال میں آکر پھنس گیا۔ ہم دونوں دوڑے مگر وہ مجھسے آگے پہونچ گیا اور پہونچ کر ہرن کو جال سے نکال کر چھوڑ دیا۔ اس پر مجھے غصہ آیا اور میں نے پوچھا کہ "اتنی محنت کے بعد تو نے ہرن کو کیوں چھوڑ دیا"؟ اُس نے جواب دیا کہ "مجھے ہرن پر رحم آگیا کہ اس غزالِ رعنا کی آنکھیں لیلےٰ کی آنکھوں سے ملتی تھیں"۔

یہ قصہ قیس کا ہے۔ جس کو **غنیمت** نے اپنی لاجواب مثنوی میں اس طرح لکھا ہے۔

شنیدستم کہ صیادِ ہوس جوش ۔ بہ رنگِ زلفِ لیلےٰ دام بردوش

اس میں صیاد کی تعریف میں "ہوس جوش" اور جال کی تعریف میں **ع** "برنگِ زلفِ لیلےٰ دام بردوش"۔ کہنا میرے بس کا نہیں: آپ کے یا کسی اور کے بس کا ہو تو مجھے یقین نہیں۔

صیاد نے جب ہرن پکڑ لیا تو ذبح کرنے کا ارادہ کیا۔ قیس نے دیکھکر کہا کہ:

آہو کُشتن از انصاف دُور است ۔ بکُش گر کُشتنِ مجنوں ضرور است

چہ میگوئی بیاباں زادۂ را ۔ حریفِ سر بہ صحرا دادۂ را

ز گلزارِ جہاں یکسر بریدہ ۔ بزیرِ شاخِ بے برسر کشیدہ

دلت از وے کباب را طلبگار ۔ کبابِ اوست مجنونِ جگر خوار

ترا آہو مرا ہم چشمِ لیلےٰ است ۔ ترا وحشی مرا عینِ تسلےٰ است

زوست وپائے او ایں بند واکن :: مرا از دام ایں تشویش رہا کن

شنیدن یار عرض مدعا شد

ز بند دام او آہو رہا شد

مجھے معلوم نہ تھا کہ حضرت مولانا محمد اکرم المتخلص بہ **غنیمت** نے یہہ حکایت ابن خلقان سے نقل کی۔ **غنیمت** قصبہ کنجاہ علاقہ پنجاب کے رہنے والے اور مفتی زادہ تھے ::

ابن خلقان کی نامور تصانیف میں کتاب وفایات الاعیان ہے۔ اور اسمار الرجال جس میں سے چند اذکار جا بجا سے یہاں نقل کرنے کو جی چاہتا ہے ::

کسی خوش بیان نے اپنی لونڈی سے ایک ذکر چھیڑ کر پوچھا کہ "تم کو میرا طرز بیان پسند آیا کہ نہیں"؟

لونڈی نے جواب دیا کہ "تمہارا بیان مجھے پسند آیا۔ مگر تم ایک ایک بات کو بار بار بیان کرتے ہو"؛ مالک نے کہا "میں ایک بات کو بہ تکرار اس غرض سے کہتا ہوں کہ جس کی سمجھ میں نہ آیا ہو وہ سمجھ جائے"؛ لونڈی نے کہا کہ "جو نہیں سمجھتے اُن کے واسطے تو آپ نے اس قدر تکلیف گوارا کی۔ جن کی سمجھ میں ایک دفعہ کہنے سے آپ کا مطلب ذہن میں آگیا اُن کو آپ نے مفت میں تکلیف دی: بے وقوفوں کی خاطر سے سمجھ دار لوگوں کا خون ہوا"؛

ابن السماق کا قول ہے کہ انسان خدا تعالےٰ سے اس طرح ڈرے گویا کبھی خدا تعالےٰ کی اطاعت ہی نہیں اور اُس کی رحمت سے اس طرح امید رکھے گویا کبھی اُس کی نافرمانی نہیں کی :: یہہ خوف و رجا کی اچھی تمثیل ہے اور خوف و رجا کا عقیدہ عقائد اسلام

حضرت یحییٰ رح کا قول ہے کہ کوئے جاناں کا راستہ کبھی نہیں اکھرتا نہ اُس راہ میں تکان ہوتی ہے جو دریار تک پہونچادے ؛ حضرت یحییٰ رح کا انتقال ۲۰ مارچ ۲۵۸ھ میں ہوا

حضرت معروف کرخی رح کے ذکر میں ہے کہ ایک دن حضرت بازار میں جا رہے تھے سقہ مشک میں پانی بھرے آواز لگا رہا تھا "سبیل ہے - پیاسے نہ جائیو : خدا کی رحمت ہو اُس پر جو پانی پیئے" ؛ حضرت گو روزہ سے تھے اور روزہ بھی دو پہر سے زیادہ گذر چکا تھا مگر سقے کی دل شکنی کے خیال سے پانی پی لیا اور روزہ توڑ دیا ؛ کسی نے کہا کہ آپ نے یہہ کیا کیا کہ روزہ توڑ دیا - آپ نے فرمایا کہ میں نے روزہ عمداً توڑا کیوں کہ مجھے سقے کی دعا پر بھروسہ ہے کہ "خدا کی رحمت ہو اس پر جو پانی پیئے" ؛ حضرت معروف کرخی رح نے بغداد میں ۲۰۰ھ میں وفات پائی ؛

حضرت ابو العلا کا مقولہ ہے کہ بے ضرورت چیزوں کا خریدنا ضرورت کی چیزوں کا بیچنا ہے ؛

حضرت ابو جعفر ترمذی سے کسی نے سوال کیا کہ حدیث میں آیا ہے کہ خدا ساتویں آسمان پر اُترا - یہہ سمجھ سے باہر ہے ؛ حضرت نے جواب دیا کہ اونچے سے نیچے کو آنے کا نام اُترنا ہے اس کا سمجھنا کیا مشکل ہے ؟ اُترنے کا طریقہ نامعلوم ہے : حدیث پر ایمان لانا فرض ہے - رہا تمہارا شبہہ کرنا یہہ البتہ گناہ ہے ؛

الحماز کا بیان ہے کہ ایکدن صبح کو گھٹا گھر رہی تھی اور ہلکی ہلکی بوندیں پڑ رہی تھیں میری بی بی نے مجھسے پوچھا کہ آج کا دن کیسا ہے - آج کیا کرنا چاہیئے ؟ ص

معالم

معاشرانہ سوائے زدوستاں دارم ؎ برائے ماہ شماایں ہوا چہ می خواہد

الممّاز فرماتے ہیں اس پر میں نے کہا کہ آج کا دن بدمزاج بی بی کو طلاق دینے کا ہے

کہ ع تقویم کہنہ نہ آید بکار ؎ اس پر وہ چپ ہو کر رہ گئیں ؎

ابن الظہر کا قطعہ شراب کے مضمون میں ہے۔ شعرا کا کمال اس میں دیکھا جاتا ہے

جو مضمون کثرت سے باندھا جائے اور شراب کا مضمون کم و بیش سب نے باندھا ہے:

اس پامال مضمون میں کوئی نئی بات پیدا کرنی اظہار کمال میں داخل ہے ؎ عربی کا قطعہ اصل

میں لاجواب ہے۔ مگر مضمون یہہ ہے کہ ایکدن میرا گذر محفلِ رنداں میں ہوا۔ شریکِ محفل

شراب کے نشہ میں بے ہوش اوندھے سیدھے پڑے ہوئے تھے بشیشہ و ساغر

بھی بادہ خواران بدمست کی طرح کوئی کہیں اوندھا پڑا تھا کوئی کہیں ؎ میں نے بھی خم میں جو

مے بچی کھچی تھی پی لی۔ یہاں تک کہ میں بھی ہوش میں نہ رہا اور نشہ میں خم لڑھکا دیا۔ اور آپ

بھی لڑھک گیا: جب ہوش آیا تو معلوم ہوا کہ شراب بھی منتقم حقیقی یا مجازی کی طرح اپنا

بدلہ لئے بغیر نہیں رہتی۔ ہم نے نشہ میں خم و سبو لڑھکا دئے اور شراب نے ہمیں لڑھکا دیا؎

ایسی حکایتیں کہانتک لکھی جائیں۔ **لوکس** صاحب نے بہت سی انتخاب کی ہیں۔ اس

انتخاب سے چند میں نے یہاں عرض کیں ؎ ماخوذ از تصنیف مسٹر لوکس صاحب۔

A. Boswell of Baghdad, by E. V. Lucas.

جب مسلمانوں کا اقبال تھا اُن کی تاریخیں اس زمانہ کی عجیب عجیب باتوں سے بھری پڑی

نظر آتی ہیں۔ خدا کا شکر ہے کہ گو وہ لوگ نہ رہے اپنا ذکر تو چھوڑ گئے ؎

گریباں پھٹتے ہیں غنچوں کے بلبل تنکے چنتے ہیں ؎ ہمیشہ موسم گل میں یہی افسانہ رہتا ہے۔

محشر خیال

میں دیکھتا ہوں کہ مضمون پریشان کی طرح محشر خیال والا مضمون بھی پسندِ خاطرِ احباب ہونے لگا۔ آج اس پرچہ میں جو ایک بیگم صاحبہ کا خط اور مضمون شایع ہوا میرے اس دعوے کا گواہ ہے ؎

شورِ محشر ہوا بدنام فغاں بھرنے کی ؛ باعثِ برہمیٔ بزمِ خموشاں ہوں میں

جس طرح محشر میں صورِ سرافیل سے تمام عالم جاگ اُٹھے گا۔ محشر خیال سے پڑھنے والوں کے رازِ پنہاں سبزۂ خوابیدہ کی طرح سر اُٹھانے لگے ؛ تشبیہ سبزۂ خوابیدہ کی میں نے اس لئے دی کہ زندگی و موت کی مثال بہار و خزاں کی سی ہے کہ جو پھول پتے خزاں میں برباد جاتے ہیں۔ برباد نہیں جاتے۔ بہار میں سر اُٹھاتے ہیں: ان میں سبزہ سب سے پہلے زمین سے سر اُٹھاتا ہے ؛ مزاجِ یار کی طرح بہار و خزاں۔ موت و زندگی۔ اقبال و ادبار۔ بُرائی بھلائی۔ ترقی و تنزل۔ حشر و نشر یہ سب عالمِ اسباب کی تلون مزاجیاں ہیں ؎

تو بہ کہ شوخیِ حسنت نمید ہد آرام ﷺ بدل قرار نہ گیرد بہ دیدہ جانہ کنی

مومن خان نے یار کے لاش پر آنے کی وجہ کتنی پاکیزہ لکھی ہے

ہم جانتے ہیں لاش پہ آنے کا مدعا ﷺ آسودگی پسند تری شوخیاں نہیں

یار کے گھر میں رہا نہ گیا۔ لاش دیکھنے چلے آئے: اسی طرح نیرنگِ روزگار کو ایک رنگ پر رہنا پسند نہیں۔ پیدا کیا تو مٹانا ضرور ہوا؛ یعنی ہستی کی شکل حضر کی محتاج ہوئی کہ میاں کی نگاہ میں جس طرح پیدا کرنا ایک تماشہ ہے۔ اس کا مٹانا تماشا کی دوسری شکل ہے

جگر سے سینہ سے دل سے گذر گئی دم میں ﷺ تری طرح تری تلوار کو قیام نہیں

ہمارے لئے زندگی ہو یا موت دونوں صورتیں مصیبت کی ہیں۔ پیدا ہونے کی مصیبتیں ہر انسان جانتا ہے کہ بے جرم ۹ مہینہ کی قید۔ اپاہج سے زیادہ رات دن پڑا رہنا بے دوسرے کے ہاتھ لگائے ہلنا جلنا مشکل۔ دانتوں کے نکلنے کی تکلیف: خدا خدا کر کے بچپن سے نجات ہوئی تو مدرسہ ومکتب کی آفت کہ سبق کے نام سے جان نکلتی تھی ﷺ جیوں تیوں اس سے پیچھا چھٹا تو حسن وعشق کے جھگڑوں میں گرفتار ہوئے۔ اس سے جان بچی تو بڑھاپے کا حال ناگفتہ بہ سمجھئے

زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے ﷺ ہم تو اس جینے کے ہاتھوں مر چلے

رہی موت۔ یہ ایسی بلائے بے درمان ہے جس کے نام سے رستم کی روح بھی کانپتی ہے غرض زندگی ہو یا موت ایک سے ایک بڑھ کر مصیبت ہے ﷺ

جنت میں جائیں یا ہمیں دوزخ نصیب ہو۔ یہہ پرسش عمل تو ہمیں اک عذاب ہے یہی وجہ ہے کہ مہاراج گوتم نے زندگی کو تمام دُنیا کی مصیبتوں کی جڑ سمجھکر اسی کے فنا کرنے کا نام نجات ابدی قرار دیا۔ اُن کی رائے میں انسان کے لئے سب سے بڑی اور پہلی مصیبت زندگی ہے۔ میں اگر اس قدر بلند پروازی نہ کروں تو زندگی و موت دونوں کو انسان کی ذات خاص کے لئے بےکار سمجھوں۔ ایک اگر بےمعنی تو دوسری ناخدا ترس ہے۔ زندگی کا نتیجہ آج تک کسی کو معلوم نہ ہوا کہ ہمارے پیدا کرنے سے پیدا کرنے والے کی کیا غرض تھی؟ اور اپنی سمجھ کے موافق اگر ہمنے کچھ کیا بھی تو موت نے اس پر پانی پھیر دیا۔ اور اگر کچھ نہیں کیا تو چپ رہنا کیوں موجب باز پرس ٹھہرا؟ ؎

نہیں ارادہ طاعت کو پیشوا درکار ۔ قضا نماز کو کچھ حاجت امام نہیں

اس میں شک نہیں کہ یہ باتیں ناگوار ہیں۔ مگر الحق مُر کی طرح سچ بولنا ہمیشہ ناگوار معلوم ہوتا ہے: میں تو یہی کہتا اور سُننا پسند کرتا ہوں کہ زندگی کا کیا کہنا! زندگی عجیب نعمت ہے اور نعمت بھی غیر مترقبہ کہ بغیر مانگے مجھے ملی۔ خدا کا ہزار شکر ہے جسنے مجھے یہہ نعمت عطا فرمائی۔ اوّل تو نعمت جو بے تمنا ملے اُس میں دینے والے کا بہت احسان سمجھا جاتا ہے لیکن جب یہ نعمت بے سبب اور جب میرا جی نہ چاہے چھینی جائے تو آپ کو اگر رنج نہ ہو مجھے ضرور ہو رہا ہے۔ چھپکلی نے جورات کو چراغ کے سامنے کیڑے (پتنگے) کو مُنہہ میں رکھ لیا آپ پتنگے سے پوچھیں کہ تجھے کیا لطف آیا؟ حالاں کہ پتنگا (کیڑا) محض بہ تقاضائے نیچر جو خدا نے اُس کے دل میں ڈال دیا تھا

بے اختیار چراغ کی طرف دوڑا اور یہہ حرکتِ مذبوحی بے چارہ کی موت کا باعث ہوئی۔
خدا کی مرضی کی تعمیل نے کمبخت کی جان لی۔ اور آپ ہی فرمائیں کہ چراغ کو دیکھکر پتنگا
چراغ کیطرف دوڑنے کے سوا اور کیا کرسکتا تھا ؟ ؎
ہوں منحرف نہ کیوں رہ و رسمِ ثواب سے ٭ ٹیڑھا لگا ہے قط قلمِ سرنوشت میں
نہ پیدا ہونے سے پیدا ہو کر مرنا قیامت کا سامنا ہے ؎
اب کہتے ہیں کہ باغِ جہاں بے ثبات ہے ٭ اپنی جو اس چمن میں طبیعت ذرا لگی
ہمیں یوں ہی اور یہیں رہنے دیا ہوتا تو ہم پر احسان تھا۔ مرنے کے بعد
ہمیں بہشت ملی تو جنگل میں مور ناچا کس نے دیکھا ؟ ؎
مرگیا لیکن نہ میں منت کشِ گردوں ہوا ٭ خاک سے پیدا ہوا اور خاک میں مدفوں ہوا
لیکن اس سے اُسی غزل کا یہہ شعر مجھے زیادہ پسند آیا کہ ؎
اپنے گھر میں خوفِ رسوائی سے دفن اُس نے کیا ٭ حُور نے گاڑا مجھے فردوس میں مدفوں ہوا
نعوذ باللہ۔ ہمیں محشر سے انکار نہیں : خستہ دلوں کا یہی تو ایک سہارا ہے
ہمیں اختیار ہو تو ہم روزِ محشر کا انتظار بھی نہ کریں۔ قیامت سے پہلے سر اٹھائیں
لیکن کس بھروسہ پر ؟ پہلے آپ ہمیں ہماری عمرِ رفتہ منگا دیں ؎
پھر نکل آؤں لحد سے سرکنانے کے لئے ٭ بھیج دیکھو عمرِ رفتہ کو بلانے کے لئے

پھر روح کو ہے جسم میں آنے کا اشتیاق
اُس نے مرے جنازہ کو کاندھا دیا نہ ہو

اس زندگی کے برابر بھی اگر ہیں مرنے کے بعد آرام کی امید ہو تو موت سے
کسی بے وقوف کو خوف ہو۔ مگر وہاں تو اتنا بھی سہارا مشکل ہے ؎
حال اس غفلت کدہ کا تھا عیاں روزِ الست ٭ خواب دیکھا بعد پہلے سُن لیا تعبیر کو
زندگی اگر خواب ہے تو اس کی تعبیر اور بھی الجھن میں ڈال رہی ہے ٭
ایسی نیند چاہتے ہیں جس میں خواب کی شکل دیکھنے میں نہ آئے۔ ہماری زند
گونگے کا خواب یا اندھے کے لئے تھیٹر اور بہرے کے لئے نفیری کی آواز
اس پر طرہ یہہ کہ ایک ہی چیز کسی کے لئے کچھ اور کسی کے لئے کچھ اثر رکھتی ہے جو
میں مرنا جینے سے بہتر۔ افتاب ہمارے لئے ضروری اور کرمک شب تاب کے لئے بر
زلف جاناں جو پریشانی کا سبب سمجھی جاتی ہے۔ چاہنے والوں کے لئے ع
دل جمعی بھی یہی ہے ؎
راحتِ جاں کہتے ہیں عشاق زلفِ یار کو ٭ یہہ وہ شب ہے جو نہیں بھاری کسی بیمار
دوست دشمن ہیں برابر چرخِ کجرفتار کو ٭ پھول دیتا ہے سپر کو اور پھل تلوار
عیاں است بیداد و عدلِ جہاں
نہ حجاج ماند و نہ نوشیرواں
ہمیں دُنیا سے جُدا کرتا گویا چمن میں بُلبُل کے پر و بال اُکھیڑنا ہے کہ گو باغ
کے سامنے سہی مگر ہیں کیا؟ مرنے کے بعد آپ نے سرو کے سایہ میں گاڑا یا تنو
پھینک دیا ہمارے لئے یکساں ہے ٭ آپ ہمیں یہیں دُنیا کے مصائب و آلام میں

رہنے دیں کہ ان کی عادت ہوگئی ہے - نئی جگہہ کے آرام - سے (غدجانے آرام نصیب ہو یا نہو) وہاں سے یہاں کے مصائب اچھے ہے

نہیں ہے شمع یہہ تربت پہ کہہ دبیر نالاں ہے ؛ اُمید قتل میں پھر قبر سے گردن نکالی ہے

کاسہ سر ہاتھ میں لیکر میں نکلوں قبر سے

اب بھی گر ساقی بلائے مے پلانے کیلئے

رسالہ ہمایوں لاہور

اس رسالہ کے اچھے ہونے میں شک نہیں کہ از روئے اہتمام او رمضامین اس سے زیادہ باوجود ناقدری زمانہ دوسرے سے مشکل ہے - اگست سنہ رواں کے پرچہ میں سب سے پہلے ہمایوں کی آمدنی وخرچ کا ذکر تھا کہ رسالہ کے نکالنے میں خسارہ بہت رہتا ہے ؛ اس کے ثبوت میں سارے رسالے نکالنے والے ہم زبان ہیں - اور صلائے عام بھی بلاشک گواہی دینے کے لئے حاضر ہے ؛ اسوقت ملک کے سچے خیر خواہ رسالے نکالتے ہیں کہ دل ودماغ کے ساتھ جیب سے بھی دریغ نہیں کرتے ؛

ہمایوں نے **بزم ادب** کا طرز بہت اچھا نکالا ہے - اس میں ادب زبان اردو کے اعلیٰ درجہ کے انتخاب درج ہوتے ہیں ؛ جہاں مجھے اس طرز کی تعریف منظور ہے ایک مختصر شکایت بھی ہے کہ انتخاب بہت مختصر ہوتا ہے - یہ انتخاب محض نوٹ کی وضع پر ہوتا ہے جسطرح قدیم انشا پرداز حاشیہ پر لکھتے تھے یا آجکل کے فٹ نوٹ میں لکھنے کا رواج ہے : انتخاب ذرا زیادہ ہوسکے تو لاجواب ہے ؛

لیکن زمادہ میں بھی مجھے شکایت ہے کہ ڈسٹرکٹ بورڈ گونڈہ کے اخبار میں **صلائے عام** کے **محبت** اور **لطف صحبت** کے مضامین مراسلات کے نام سے پورے کے پورے بتبدیل چند الفاظ نقل کئے گئے لیکن پڑھنے والا یہ نہ سمجھ سکا کہ دونوں مضمون رسالہ **صلائے عام** سے نقل ہیں !

ایک لاجواب خط

× × × × × × × × × × × × ×

ع مے کشوں کے سر پہ یارب پیر مے خانہ رہے

آپ کا انداز بیان دل کش ہے اور آپ کی زبان کوثر سے دُھلی ہوئی زبان ہے۔ میرا خیال یہ ہے کہ جو شخص آپ کی سحر طرازی پر ایمان نہ لائے وہ کافر ہے ؛ ہندوستان میں بکثرت اُردو رسالے شائع ہو رہے ہیں اور اُن میں سے زیادہ تر بلحاظ ادب بلند پایہ رکھتے ہیں۔ لیکن ادائے بیان اور خوبیٔ زبان کے دیکھنے کے لئے آنکھیں صلائے عام کو تلاش کرتی ہیں ؎

ہزار بلبل و قمری نے مشق پیدا کی ؛ نہ اُس کو آئی۔ نہ اس کو تری زباں آئی۔

جُون کا صلائے عام بھی مِلا۔ دنیائے محبت میں انتظار کا مٹانا ایک قسم کا احسان سمجھا جاتا ہے۔ دو ماہ کے مسلسل انتظار کے بعد میں نے آپ کو وہ خط لکھ ڈالا تھا۔ جس کے جواب میں گرامی نامہ اور صلائے عام دونوں ملے ؎ ع ادھر خیال چلا۔ اور اُدھر چلی لیلےٰ۔ آپ اندازہ نہیں کر سکتے کہ صلائے عام کے انتظار میں۔ میں کس قدر مضطرب رہتا ہوں گا۔ اور عجیب ہو کہ آپ کو دوسروں کی شدتِ انتظار کا احساس نہ ہو ؎

تری رہ میں اِس بہانے مجھے دِن کو رات کرنا ؛ کبھی اِس سے بات کرنا کبھی اُس سے بات کرنا

آپ تحریر فرماتے ہیں کہ "صلائے عام کے لئے کوئی مضمون جس قدر جلد ہو سکے بھیجیے"۔ تعمیلِ ارشاد کے لئے حاضر ہوں ؎ ع کون ٹالیگا بھلا آپ کے فرمانے کو۔[1]

---

[1] یہ مضمون میرؔ نے خوب ادا کیا ہے فرماتے ہیں ؎ بدنام ہوگے جانے بھی دو امتحان کو ؛ رکھیگا کون تم سے عزیز اپنی جان کو

ب۔ بلے

میں ایک مبتدی اور نو آموز ہوں۔ اور آپ کے قول کے مطابق۔ ہاتھ پاؤں مارنے کو خرامِ ناز نہیں کہتے۔ اس لیئے اگر مجھے اس سے معافی دیدی جائے تو بہتر ہو۔ مجھے تو زیادہ تر اوروں کے خاصکر آپ کے مضامین پڑھنے اور اُن سے بہرہ اندوز ہونے کا شوق ہے ؛

ذرا آپ اپنے ان جملوں کو تو پڑھیئے۔ اسی کو نثر میں شاعری کرنا کہتے ہیں :-

× × × × "چھوٹی عمر کی لڑکیاں گڑیوں میں اس قدر محو دیکھیں کہ نپولین کو لشکر آرائی کا اس قدر شوق نہ ہوگا"۔ "حسینوں کے مُنہ موڑنے سے بھی اُنکی کمر سے نزاکت کا پتہ چل جاتا ہے"؛ "جہاں دونوں محبّت زدہ مل لیئے پھر افسانہ کا لطف نہیں شادی کے بعد گو دونوں عمرِ نوح کو پہونچیں مگر پھر کوئی ذکر دلچسپ نہیں رہتا"؛

آپ میرے طرز کو لاجواب بتلاتے ہیں لیکن آپ اپنی اُس مخصوص شوخئی تحریر کی طرف نگاہ اُٹھاکر بھی نہیں دیکھتے جس سے دوسروں کے کلیجوں میں چُٹکی کے نیل بنگئے ہیں

غضب ہیں تری چُٹکیاں ای فراق ؛ کلیجہ گلِ نیلوفر ہوگیا ؛

میری آپ سے بیمود بانہ التجا ہے کہ آپ اپنے خاص اندازِ تحریر میں کمی نہ فرمائیں۔ بلکہ صلائے عام میں آپ کے مضامین جس قدر زیادہ ہوں اُسی قدر اچھا ہے۔ تاکہ ہم لوگ اُن سے فائدہ حاصل کر سکیں سہ

ساقی ہی کے ہاتھ سے پئیں گے ؛ رہ جائے گی ضد میں پارسائی

پیرایۂ آغاز میں آپ نے یہ مثال خوب دی ہے۔ قدیم دستور ہے کہ بڑی حویلیوں کے دروازہ پر اکثر قندیل لٹکائی جاتی تھی کہ آنے جانے والوں کو آرام رہے ؛ انگریزی تعلیم یافتہ اپنی زبان سے اکثر بے پروا ہوتے ہیں۔ ان کے متعلق لکھنے والا یہ لکھتا کہ یہ ہندوستان کے لٹریچر اور تاریخ سے قطعی ناواقف ہیں اور اپنی زبان کی پاکیزہ خیالیوں سے قطعی نا آشنا۔ اور ان سے مذاقِ شعر و سخن مفقود ہے ؛ لیکن بجائے اس کے

آپ تحریر فرماتے ہیں کہ:۔ "ہندوستان کی لٹریچر اور تاریخ وعدۂ یار کی طرح ذہن میں بھی نہیں۔ ان کی طرف سے اپنی زبان کی پاکیزہ خیالیاں حسینوں کی کمر کا جواب ہیں۔ شعر و سخن دہنِ یار کی طرح کہیں نظر نہیں آتا" یہ بے پناہ طرزِ تحریر ہے۔ اور اسی کا نام فصاحت و بلاغت ہے۔ بے اختیار یہ کہنا پڑتا ہے ع آج تم سا نہیں زمانہ میں

پدماوت میں ملک محمد جایسی نے یہ خوب کہا ہے :۔ "زوجۂ بادل نے بادل کے پاؤں پر گر کر اپنے سر کے بال بادل کے پاؤں میں باندھ دئے اور کہا کہ پہلے مجھ سے لڑ لو کہ میں نے لڑنے کے لئے سنگار کیا ہے" انہیں پڑھ کر جذبات میں ایک لرزشِ خفی پیدا ہو جاتی ہے۔ کسی کی زلفِ مشکیں کی اس سے زیادہ اور کیا تعریف ہو سکتی ہے کہ مورنے غلطی سے اُن ہی سانپ سمجھا۔ اور جب اُسے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ تو وہ مر گیا۔ یہ ادائے بیان صلائے عام ہی تک موقوف ہے۔ سچ تو یہ ہے ع

کہ یہ رنگیں بیانی ناصرِ رنگیں بیاں تک ہے

جنوری کے صلائے عام میں ایک مضمون مثنوی بمقابلہ ڈراما کے عنوان سے شائع ہوا ہے نہایت خوب ہے اور مجھے بہت زیادہ پسند ہے۔ میری رائے میں اُردو زبان کی مثنویاں مغربی ڈراموں سے زیادہ قابلِ قدر اور لائقِ داد ہیں۔ آج کل عوام میں مثنوی زہرِ عشق کا زیادہ چرچا ہے۔ دُنیا اس کا کسی خیال سے مطالعہ کرے۔ لیکن بلحاظِ ادب مصنف کی کوشش قابلِ قدر ہے۔ ایک مرتبہ محبوبہ اپنے عاشق کے گھر چوری چھپے ملنے گئی۔ یہ آخری ملاقات ہے اور اُس نے زہر کھا کر جان دیدینے کا ارادہ کر لیا ہے۔ رخصت ہوتے وقت وہ یہ کہتی ہے سہ یاد اتنی نہیں دلاتے جائیں ہاں کل کے لئے لگاتے جائیں دل میں لیکر تمہاری یاد چلی باغِ عالم سے نامراد چلی حسرتِ دل کچھ تھوڑی باقی ہے اور یاں رات تھوڑی باقی ہے ڈالدو پھر گلے میں ہاتھوں کو پھر گلوری چبا کے منہ میں دو

سہ پھول جب جھڑنے لگے رنگیں بیانی سے مری رہ گئی حیرت سے بلبل کھول کر منقار کو

پھر ہم اُٹھنے لگیں بٹھالو تم ٭ پھر بگڑ جائیں ہم منالو تم

انہیں پڑھئے اور وجد کیجئے۔ آہ! یہ اس قابل ہیں کہ ان پر ہزاروں ڈرامے نثار کردئے جائیں آپ کا یہ فرمانا ان اشعار پر صادق آتا ہے کہ "اِن کی داد دینے کے لئے اُردو میں نہایت اعلیٰ درجہ کی لیاقت درکار ہے"۔٭

جولائی کے صلائے عام کے لئے منتظر ہوں۔ اسی طرح یاد فرماتے رہیں ع

مجھکو بھی پوچھتے رہو تو کیا گناہ ہو[سہ]

نیازمند ڈاکٹر محمد عبدالغفور (بسمل بریلوی)

صلائے عام ۔ یہ خط صلائے عام کی ڈاک کے متعلق ہے مگر فصاحت کا ایسا اچھا نمونہ ہے کہ اس کو علیحدہ جگہ دینی زیب دیتی ہے ٭ صاحبِ تحریر اِس طرز پر جس قدر لکھ سکیں احسان ہے **صلائے عام** جو کچھ کر رہا ہے ایسے ہی سخن فہم و سخن سنج کمال والوں کی داد کے سہارے سے کر رہا ہے ؎

خون رو کر زخمِ دل سے میں تو بیدم ہوگیا
رہ گیا سوفار تیرا شکرانے کے لئے

[سہ] اس کا پہلا مصرع یہ ہے ع تم جانو تم کو غیر سے جو رسم و راہ ہو ٭ یہ وضع بیانِ عشق و محبت کے خلاف ہے کہ محبت میں شانِ ایزدی کی طرح غیر کا خیال بھی کبیرہ ہے نہ کہ یار کو غیر سے واسطہ رکھنے کی تاب لاتی ٭

اُردو ذریعۂ اتحاد

اِتحاد کے تمام واقعی اور خیالی ذریعوں میں زبانِ اُردو سب سے زیادہ معتبر ذریعہ ہے۔ یہہ مسئلہ رسالہ مصلح سے یہاں نقل کیا جاتا ہے جو واقعی غور طلب ہے۔

× × × × × × × ہندوستان کا ہر ایک صوبہ جُداگانہ زبان رکھتا تھا اور اب بھی یہ اختلاف السنہ موجود ہے۔ جب ایک علاقہ سے دوسرے علاقہ میں جائیے نیا دانہ نیا پانی دنیا ہی اور نظر آتی تھی۔ ترک۔ ایران۔ اور عرب کے قیام سے ایک درمیانی مرکب زبانِ اُردو وجود میں آئی جسے تمام ہند نے اختیار کیا۔ یہ زبان خالص نہ صرف مُسلمانوں کی ہے نہ اس کے مالک صرف ہندو ہیں دونوں کی مشترکہ زبان کہی جاسکتی ہے دونوں کے استعمال میں ایک مدت سے چلی آتی ہے۔ تمام مختلف علاقوں کو باہم ملاتی اور ایک زنجیر میں کستی ہے اُردو کا وجود امیر خسرو کے عہد سے مکمل صورت میں پایا جاتا ہے کہ انکی تصنیفات اسی اُردو میں بکثرت اور مستقل طور پر رائج ہیں لیکن عام طور پر ڈیڑھ دو صدی سے نثر و نظم میں اور غدر کے بعد سے دفاتر میں کامل طور پر اُردو مستعمل ہے۔ اس کی آسانی اور مقبولیت کا یہ ثبوت ہے کہ تمام ہند بلکہ بیرون ہند بھی اردو بولنے والا اپنے مطلب کے اظہار میں کسی زبان کا محتاج نہیں ہو سکتا ؎

ہر زباں سے ہے کم وبیش علاقہ اس کو ۔ سب زبانوں کا خلاصہ ہے زبانِ اُردو

اُردو کے لئے یہ بھی باعث افتخار ہے کہ جنت نشین حضرت ملکہ معظمہ نے اس کی تحصیل وتکمیل کی جانب خاص توجہ فرمائی اور محنت شاقہ گوارا فرما کر حاصل کر لی۔ حضور ملکہ معظمہ کے دستِ خاص

کی تحریر تاج التواریخ میں ملاحظہ ہو۔ اسی طرح دربار لارڈ کرزن سنہ ۱۹۰۳ء اور دربار سنہ ۱۹۱۱ء اعلیٰ حضرت ملک معظم میں جو تمغہ جات یادگار دربار تقسیم فرمائے اُن میں بھی اُردو خط اور اُردو زبان تھی۔ مزید برآں یہ کہ دربار کے موقع پر اعلیٰ حضرت ملک معظم جارج پنجم کی تقریر کا ترجمہ بھی اُردو میں پڑھ کر سنایا گیا جو اس کی اصل زبان ہونے کی ترجمانی کرتا ہے۔ × × × × × × × × ×

× × × × × اُردو زبان کے مقابلہ میں ہندی بے اثر اور کمزور ہے کیوں کہ اُردو کے محاورے اسکی ترکیبیں ادبی ونحوی فصاحت وبلاغت۔ جوش۔ طبعی قوت۔ نطق وگویائی پر خاص اثر رکھتی ہیں اُردو کی تحریر میں وقت کم صرف ہوتا ہے بمقابلہ ہندی جلد آسانی سے اور تھوڑی سی جگہ میں لکھی جا سکتی ہے علاوہ اس کے اُردو زبان پر ملک کا بیحد وقت اور روپیہ صرف ہوا ہے۔ گورنمنٹ نے بھی بہت سا روپیہ اور اپنا قیمتی وقت وقتاً فوقتاً اسکی تربیت میں خرچ کیا ہے وہ سب اکارت ہو جائیگا۔ × × × × × × × × × × × × × × × × × ×

سب سے بڑی خرابی اور زحمت یہ پیش آئیگی بلکہ در پیش ہے کہ بادشاہی عہد میں اقتصادی جنگ جو فی الحال قائم ہے۔ قائم نہ تھی اور نہ میل جول کی اس قدر ضرورت تھی جسقدر ایک صوبہ کو دوسرے صوبہ سے تعلقات سیاسی وتجارتی کے باعث اب ہے اور نہ آمد ورفت کی سہولت ایسی تھی جیسی کہ فی الحال ریل۔ جہاز اور موٹر کار وغیرہ کی وجہ سے حاصل ہے۔ تبدیلی زباں سے ان میں اجنبیت اور مغائرت پیدا ہو جائیگی۔ کاروبار میں ہرج عظیم واقع ہوگا۔

مختصر یہ کہ تمام ہندوستان کے لئے ایک زبان عام کی حاجت تھی جس کے ذریعہ سے تبادلہ خیالات اور کاروبار ہو سکے۔ × × × × × × × × سیاست کا ابجد خواں بھی سمجھ سکتا ہے کہ جو زبان سات آٹھ سو سال سے مروج ہو وہ چند روز میں کیونکر خارج ہو سکتی ہے اور جو زبان کم سے کم ایک صدی سے مستعمل ہو اسکی تبدیلی کتنا ہرج ملکی متصور ہے خصوصاً اس ملک میں جہاں جمہوریت کی شان پیدا ہونے کو ہے۔ وہ تمام الفاظ عربی فارسی جو اصطلاحات کی شکل میں ہیں اور ہندوستانی نطق میں اُنہوں نے گھر کر لیا ہے وہ سینکڑوں شمار میں ہیں مثلاً اصول۔ تحقیقات۔ عدالت۔ دفتر۔ فیصلہ۔ تجویز۔ ہرجانہ۔

ایک بیگم صاحبہ کا خط اور مضمون

× × × × × × × × × × × × × ×

میں صلائے عام کو بڑے شوق سے پڑھا کرتی ہوں۔ آپ کے صلائے عام میں دو مضمون مجھے از بس پسند آئے۔ ایک تو اتالیق الامرا جو نہایت خوبی کے ساتھ لکھا گیا ہے اور سب کا سب لائق تحسین و آفریں ہے۔ دوسرے **محشر خیال** جس نے مجھے بہت بیتاب کیا اور آخر ش مجھسے نہیں رہا گیا اور میں نے بھی اپنا خیال ایک پرچہ پر لکھ مارا اور وہ ارسال خدمت ہے بشرط پسند درج صلائے عام فرمائے گا۔ فقط زیادہ ادب

آپکی بہی خواہ ضعیفہ عثمانی بیگم۔ از آگرہ۔

محشر خیال

مجھکو صلائے عام ماہ جولائی میں **محشر خیال** کا مضمون پڑھ کر بہت بڑی مسرت اس وجہ سے ہوئی کہ اپنی حقیقت اُس سے کھُلتی ہے اور محشر موعود تو جب ہوگا تب ہوگا۔ خیالات کا محشر تو ہر دم برپا ہے پھر بھی تو مثل قصہ روح و جسد کے یہ ہماری سمجھ سے باہر ہے کہ خیالات ہمکو برپا کرتے ہیں یا ہم خیالات کو برپا کرتے ہیں۔ بہرحال ابتو خیالات کا وہ جنگل ہے کہ جس میں جاکر راستہ کھو بیٹھتے ہیں یہ بھی تو نظر نہیں آتا کہ پورب کدھر ہے اور پچھم کدھر ہے

اور ع

اورہم جاکدھر رہے ہیں۔ محشر خیال کی نرغی ویکر خان بہادر صاحب نے تمام دنیا میں شفق پھیلا دیا ہے۔ بچپن اور جوانی پر بڑھاپے کو صدقہ کردیا ہے۔ اچھے اچھے گرما گرم فقرے دیکر عالم اسباب کے نقص دکھلائے ہیں مگر آفریدگار نے تو پہلے ہی اپنی مصلحتیں سوچ لی ہوں گی۔ اگر یہ چیدہ ہزار (بلکہ زاید ازیں) عالم کو ناقص ہی رکھنا ہوتا تو آفرنیش کا کیا پھل تھا۔

مجھے جو جو باتیں اس مضمون میں از بس دل سوز اور دلچسپ نظر آئیں انکو فقرہ بہ فقرہ لکھ لوں تو پھر آگے عرض کروں کہ کہاں تک یہ خیالات انمول ہیں۔ وہ حسب ذیل ہیں اور ناظرین کی خدمت میں یہ گذارش ہے کہ صلائے عام کے مضمون کو پڑھتے جاویں اور ان فقرات کا لطف اٹھاتے جاویں۔ گو پائنیر کے نامہ نگار کے خیالات سے بھی خان بہادر نے تمتع اٹھایا ہے مگر آپ کے طرز بیان اور آپ کے خیالات نے اور ہی ستم ڈھایا ہے۔ باتوں باتوں میں آپ فرماتے ہیں۔

۱- محشر... جب دیکھنے میں آئیگا دیکھا جائے گا اس سے پہلے جو کچھ ہوچکا اور ہورہا ہے اسے دیکھیے۔
۲- خلاق.. عالم نے... مناسب حال اسباب مہیا کیا مگر انسان کا معاملہ زیادہ تر ناقص رہگیا۔
۳- بڑھاپے میں کوئی صورت آرام کی نہ ملی۔
۴- بوڑھوں کو مانگنے پر بھی.... کہہ دیتے ہیں شاہ جی برکت ہے آگے دیکھو۔
۵- بوڑھوں کو بے کار سمجھ کر کوئی ان کی خبر نہیں لیتا۔
۶- تعجب ہے کہ عالم اسباب .... بڑھاپے کو بے سروسامان چھوڑ دے۔
۷- بڑھاپا موسم خزاں ہے۔
۸- بعض کا عقیدہ ہے کہ ..... روح جسم پیدا کرتی ہے۔
۹- موت کی فکر میں زندگی کے کام نہیں سنورتے۔
۱۰- مُردوں کی تعداد زندوں سے ہمیشہ زیادہ رہتی ہے۔

قبل ازیں کہ آگے بڑھوں حافظ شیراز کے دو شعر جس میں سے ایک مطلع ہے نذر ناظرین کرتی ہوں تاکہ انہیں اس دار فانی میں بسنے بسانے کی کیفیت کھل جاوے اور یہ معلوم ہوجاوے کہ یہاں آباد

ہو کر کیا کرتے رہے اور پھر آرزو ہمیں کدھر لے گئی ؎

گداخت جاں کہ شود کار دل تمام نشد ؛ بسوختیم دریں آرزوے خام نشد
فغاں کہ در طلبِ گنج گوہر مقصود ؛ شدم خراب جہانے ز غم تمام نشد

جب ہم دنیا میں آتے ہیں تو کیا کچھ کم حشر برپا کرتے ہیں۔ گھر بھر میں جان پڑ جاتی ہے محلہ بھر کو گھر خبر ہو جاتی ہے۔ تو دوڑ میں دوڑ کا ہنگامہ برپا ہو جاتا ہے۔ گھر میں ڈھولک تو باہر نقارے بجتے ہیں۔ اور دل لگی یہ ہے کہ ہم روتے ہیں تو ساری دنیا ہم پر ہنستی ہے۔ کہو یہ ستم ہے کہ نہیں ہمکو گھر بھر کی عورتیں اور مرد دیکھتے ہیں کوئی کہتا ہے لڑکا ہے کوئی کہتا ہے لڑکی ہے کوئی کہتا ہے کہ بالکل باپ کی صورت ہے کوئی کہتی ہے اجی ہو بہو اپنی اماں سی ملتی ہے۔ الغرض سارا ہجوم ہمپر ہوتا ہے ایک میلہ سا لگ جاتا ہے۔ کوئی نہلاتا ہے کوئی دھلاتا ہے مگر ہم کو صبر جب آتا ہے جب ماں کی چھاتی سے لگ جاتے ہیں۔ یہ تو سچ ہے کہ ہماری خدمت کرنے پر سب مستعد ہو جاتے ہیں مگر ہم بھی تو کوئی چیز ہیں کہ سارے زمانے کو اپنا شیدا بنا لیتے ہیں اور سب کو خوش کر دیتے ہیں لوگ کھل کھلا کھل کھلا کر ہنستے ہیں اور گھور گھور کر ہمکو دیکھتے ہیں۔ پھر اگر ہم فرحت افزا اور مسرت بخش حرکات و سکنات نہیں رکھتے تو کیوں ہمیں گودوں میں لئے پھرتے ہیں۔ کوئی ہنڈولے میں سلاتا ہے کوئی جھولے میں جھلاتا ہے کوئی چھاتی سے لگاتا ہے آخر ش ہماری حرکتیں اچھی اور صورت پیاری نہ ہوتی تو کاہیکو کوئی ہمارا ایسا گرویدہ ہوتا۔

بہرحال ہم ناز و نخروں میں پالے جاتے ہیں تو ہم چیز بھی ایسی ہی ہیں اس میں کسی کا احسان کیا۔ رہی جوانی وہ جیسی ہماری ایسی اور کی۔ ضرور بالضرور ہم لطف جوانی اٹھاتے ہیں مگر کیا بغیر صدمے اٹھائے لطف نصیب ہو جاتا ہے۔ یہ غیر ممکن ہے اور جب رنج اٹھائیں گے تو راحت کے بھی مستحق بن جائیں گے اور جب ہم کسی کی خدمت کریں گے تو اس کے صلے کے بھی منتظر رہیں گے۔ بچپن بے بسی کا عالم تھا مگر جوانی اپنی بس میں ہے ؎

جو ہست آبِ حیات بدست تشنہ ممیر ؛ فلا تمت ومن الماء کل شئی حی

۱۵۷

اجی بوڑھوں کو بچپن اور جوانی کی حسرتوں میں جان کھونا عبث ہے۔ اب وہ زمانہ کہاں جب یہ زباں پر تھا سے

شممت روح وداد شممت برق وصال ÷ بیا کہ بوے ترا میرم اے نسیم شمال ÷

ہر شے کی ایک انتہا ہوتی ہے جوانی بڑھاپے کے دروازہ تک پہونچا کر رخصت ہوگئی کیونکہ آگے حد ادب تھی اب بڑھاپے میں دار فانی کے رخصت کرنے یا دار فانی سے رخصت کے دن آگئے۔ اب خان بہادر صاحب پوچھتے ہوں گے کہ کہاں جاؤ گے۔ جواب میں سوائے سکوت کے اور ہم کیا کہہ سکتے ہیں اور اگر کچھ جواب بھی دے سکتے ہیں تو یہ کہ جہاں اور سب گئے ہیں وہاں ہم بھی جاتے ہیں مگر پھر بھی ہمارا پلہ بھاری رہا یعنی ہم بغیر بلائے نہیں جاتے ہیں اور جب سے اللہ میاں نے دنیا میں سیر کو بھیجا تھا جب ہی سے ہماری طلبی بھی ہو رہی ہے اور ہم مچل رہے ہیں کہ نہیں جاتے بالآخر غیب سے فرشتہ ہمارے لینے کو آتا ہے اور کہتا ہے کہ تم نہ چلو گے تو ہم تو لے چلیں گے۔ پھر بھی ہم میں وہ اکڑ مکڑ باقی رہتی ہے کہ اپنے پانوں پانوں نہیں جاتے بلکہ ہمارے لینے کو جب بہت سے انسان از کہ تا مہ۔ بچے جوان اور بوڑھے جمع ہو جاتے ہیں تو ہم چارپائی پر آرام سے لیٹ ان کے کندھوں پر چڑھ کر پہلی منزل طے کرنے کو قبر تک جا پہونچتے ہیں۔ اب آگے ہوش رہا تو پھر لکھوں گی فقط راقم عثمانی بیگم۔ از آگرہ۔

غزل جناب مولوی معین الدین احمد صاحب قیس رضوی

کروں الفت نہ لاؤ بالی کی ÷ بس خداوند گوشمالی کی

آرزو یوں نکال دی دل سے ÷ تشتری جس طرح سے خالی کی

مے دیدار چھن کے آتی ہے ÷ منہہ پہ ہے اک نقاب جالی کی

دیکھ لو مسکرا کے گل کی طرف ÷ شرم رہجائے منہہ کی لالی کی

پاؤں کیوں کر رکھوں نہ میں پر قیس ÷ یاد ہے اپنی پائمالی کی۔

مشاعرہ کی شاعری

مشاعروں کے بعض مفید پہلوؤں پر آپ نے جو روشنی ڈالی ہے اُسے میں نے شوق سے پڑھا۔ اس سلسلہ میں اور بھی بہت کچھ قابل غور باتیں کہی جا سکتی ہیں مگر میں اس عریضہ میں اُس ناقابل تردید حقیقت کی نسبت کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں جس کی طرف آپ نے اشارہ فرمایا ہے اور وہ یہی کہ مشاعرہ میں حاضرین وسامعین سے سخن فہمی کی پوری امید رکھنا ذرا مشکل ہے۔ مگر میں تو آپکے ارشاد پر کچھ اور اضافہ کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ میں دبی زبان سے نہیں بلکہ بے تکلف یہ عرض کروں گا کہ حاضرین مشاعرہ سے بہ حیثیت مجموعی پوری سخن فہمی کی اُمید رکھنا ہی فضول ہے۔ مشاعروں کی صحبتوں میں جو لوگ جمع ہوتے ہیں اُن میں ایسے لوگوں کی تعداد (جو صحیح معنی میں سخن فہم اور باریک بین کہے جا سکیں) اقل قلیل ہوتی ہے۔ زیادہ تر ایسے ہی لوگ ہوتے ہیں جو محض سطحی اور پیش پا افتادہ مضامین پر اُچھل پڑتے ہیں۔ محض الفاظ کی شیرینی و ترنم کے غرے میں اسقدر ڈوب جاتے ہیں کہ اُنہیں شعر میں اعلیٰ درجہ کے حقایق و معارف ڈھونڈھنے کی ضرورت محسوس ہی نہیں ہوتی۔ عامیانہ مذاق کے شعر سنے۔ جذبات ہوس پرستی میں تحریک ہوئی یا ایسا کوئی مضمون سنا جس سے محض اچنبھا سا ہو کر رہ گیا بس اُسی کو کمال شاعری سمجھنے لگے۔ ایسے لوگ اس امر سے قطعی ناآشنا ہوتے ہیں کہ حقیقی شاعری وہ ہے جو انسان کو اپنے مرتبہ سے بلند کرے کائنات کے اسرار پوشیدہ کو معرض شہود میں لائے۔ ایسے لوگوں سے مشاعروں میں سخن فہمی کی اُمید رکھنا تو کجا مگر وہ لوگ جو فی الحقیقت نقاد اور سخن فہم ہیں اُن سے بھی مشاعرہ میں بیٹھ کر سخن فہمی کا پورا حق ادا نہیں ہو سکتا کیونکہ کثرت

سے شعر سُنتے سُنتے سخن فہموں کا دماغ بھی تھک جاتا ہے۔ ایسی حالت میں سخن فہم حضرات بھی مضامین کی بلندی و نزاکت کی داد خوب پہونچکر نہیں دے سکتے۔ دوسری بات یہ ہے کہ شاعر مضامین عالیہ و معانیٔ بیگانہ کو حوالۂ قلم کرنے میں جس قدر غور و فکر کے بعد جامع و مانع الفاظ سے شعر کو مکمل کرتا ہے اور اس میں جتنا وقت صرف کرتا ہے ایک ایک لفظ کو شطرنج کے مُہرہ کی طرح ایسے مقام پر بٹھا دیتا ہے کہ اُسکا رُخ ہر طرف ہوتا ہے۔ جس طرح شطرنج کے ایک مُہرہ سے (جو مناسب مقام پر بٹھا دیا گیا ہو) چاروں طرف کے مُہروں کو زور پہونچتا ہے اُسی طرح شاعر کے بٹھائے ہوئے ایک لفظ سے شعر کے دیگر الفاظ کی کڑی سے کڑی ملی رہتی ہے ایسی سنجیدہ نشست الفاظ سے شعر میں جو معنوی استحکام پیدا ہو جاتا ہے اُس کی صحیح قدر و قیمت کا اندازہ کرنے کے لیئے سخن فہم کو بھی کچھ وقت ملنا چاہیئے یا نہیں۔ بہتر سے بہتر سخن فہموں سے بھی ہر مشاعرہ میں یہ اُمید نہیں کی جا سکتی کہ شاعر نے شعر کو رتبۂ کمال پہونچانے میں اتنا وقت صرف کیا ہے اور جس قدر محاسن صوری و معنوی پیدا کئے ہیں اُن سب کی داد ہمیں ایک شعر سُنتے ہی دے سکیں گے اِن سب مراحل کو غور کرنے کے لیئے شعر کو محض ایک بار کان سے سُن لینا کافی نہیں ہے ؛

مرزا یاس لکھنوی

صلائے عام۔ حضرت **یاس** کا مضمون جو انہوں نے اِس بحث میں لکھا اِس سے زیادہ ہے جو یہاں نقل کیا گیا۔ واقعی محض کانوں (یعنی سُننے) سے شعر کے حُسن و قبح کا فیصلہ کرنا مشکل ہے۔ از روے تحقیق جلدی میں رائے لگا دینے کا اعتبار نہیں۔ عُرفی نے دربار میں جب یہ قصیدہ پڑھا جسکے ایک شعر کا یہ مصرع ہے کہ ع اقبال و دولت بر سرت از ابتدا تا انتہا۔ اسپر فیضی نے کہا کہ اِس کی تقطیع تو کرو۔ عُرفی نے کہا کہ مجھے تقطیع کرنی نہیں آتی۔ تقطیع میں "لت بر سرت" نکلتا تھا۔ یہ عُرفی کی ذلت و خواری کا سبب ہو جاتا کہ بادشاہ "ولت بر سرت" ؛ فیضی اور ابو الفضل کی دربار میں بہت چلتی تھی۔ یہ دونو بھائی عُرفی کی ذلت چاہتے تھے عُرفی کی ذلت

تنقیدِ صلائے عام

× × × × × × × × × × × ×

صلائے عام جولائی کا خوش خط نفیس کاغذ پر بہت ضخیم آیا۔ یقیناً وزن میں بھاری تھا پھر بھی ڈاک والوں کو شاباش ہے کہ اپنے وقت پر مجھے پہونچا یا بلا مبالغہ پڑھتے پڑھتے دو دن لگ گئے اور پھر بھی جی لگا ہے کہ بعض مضامین کو مکرر سہ کرر پڑھ کر خوش بیانی اور شیریں زبانی کا لطف اٹھاؤں۔

اس مرتبہ زبان کا مرتبہ بیان کرنے میں آپ نے یہ غضب ڈہایا ہے کہ اللہ میاں کی خاموشی کو اپنی زبان میں یوں بیان کر دکھایا ہے کہ "اب جو اللہ میاں چپ ہیں اس کا سبب یہی معلوم ہوتا ہے کہ آپ ہندوستانی ہوکر اردو میں بات نہیں کرتے"۔ اچھی سوجھی۔

اودے پوری والا مضمون مورخانہ ہے پس اس کے اوپر قیاسات کا دوڑانا عبث ہے ہمکو تو ضروری ماننا پڑیگا گو خان بہادر صاحب اپنا اعتراض جڑ دیں کہ اور بیگمات میں سے کوئی مارواڑن یا راجپوتانی مشہور نہ ہوئی۔ اسی بیگم کو یہ خصوصیت کیو حاصل ہوئی۔ فقط عالمگیر کا یہ لکھنا اور اپنے لڑکے محمد اکبر کو یوں مخاطب کرنا کہ "اودے پوری والدۂ شما غمِ رفاقت بن دار د" تو با تحقیق یہ معنی پیدا کرتا ہے کہ محمد اکبر اودے پوری لڑکی سے پیدا تھا نہ یہ کہ اودے پوری لڑکی عالمگیر کے حسل نکاح میں گانٹھ جوڑی نہ تھی۔ پس کوئی معقول وجہ نہیں ہے کہ ہم تاریخی واقعہ کو غلط سمجھ لیں۔

مرزا محمد علی خاں صاحب کا مضمون **آتالیق الامرا** بہت بڑے پایہ کا ہے۔ مرزا صاحب کی زبان اور تربیت کا بیان نوراً علیٰ نور ہے۔ مجھے پھر کہہ لینے دیجئے کہ صلائے عام بڑا خوش

قسمت سے ہے جو ایسے اہل زبان کی قلم سے اُس کے صفحات مزین ہیں۔

بشیر الدین احمد صاحب کا مضمون زبان اُردو سلیس اُردو کا اعلےٰ نمونہ ہے اور مجھے تو اُن کے دلائل سے پورا اتفاق ہے۔ جناب خان بہادر صاحب ہم کب تک قوم فاتح کی زبان سے اپنی زبان کو مخلوط نہ ہونے دیں گے۔ یقیناً یہ اختیاری فعل نہیں ہے اور اُردو کی ترقی یہی معنی رکھتی ہے کہ ہر جگہ کے لفظ بھرتی ہوتے چلے جاویں۔ ہاں اس قدر احتیاط تو ہم بھی روا رکھتے ہیں کہ جب اپنی زبان میں کافی الفاظ ہمارے مطالب کے اظہار کو موجود ہیں تو ہمیں خواہ مخواہ دوسری زبان کے لفظ مول لینے کی کیا ضرورت پڑی ہے۔ اس فقرہ کا تو میں بھی قائل ہو گیا کہ "ہماری اُردو کی طبیعت ہی کچھ ایسی ملنسار اور مہمان نواز واقع ہوئی ہو کہ جو آیا اُسے آغوش محبت میں لے لیا۔ سنسکرت ..... عربی فارسی ..... شیر و شکر ہو گئیں اب انگریزی کا دور دورہ ہے اس کے الفاظ دریا کی موج کی طرح اُمڈے چلے آتے ہیں ..... اور گھل مل جاتے ہیں"۔ یہ امر حق ہے۔ آپکا نیاز مند خاص (مرزا عرفان علی بیگ۔ آئی۔ ایس او۔ از آگرہ)

غزل

کیا لگائیں دل محبت کا مزا جاتا رہا | بیوفائی رہ گئی نام وفا جاتا رہا | ہمنشینوں دل مرے پہلو سے کیا جاتا رہا

زندگی کا لطف الفت کا مزا جاتا رہا | وہ اُمنگیں ہیں نہ اب دل میں وہ جوش شباب | اک جوانی کیا گئی سارا مزا جاتا رہا

راحت و آرام کھو بیٹھے ہیں جبکے عشق میں | ہائے اتنا بھی نہ پوچھا اُس نے کیا جاتا رہا | یہ کہیں گے وہ کہینگے دل میں ٹھانے تھے بہت

چار آنکھیں ہوتے ہی سارا گلا جاتا رہا | اور کیا کہیں ہم اے نازک ادا تجھسے سیہ | جھوٹی باتوں کا تری جب آسرا جاتا رہا

تم جو آئے پاس بس اتنی تسلی ہو گئی | مضطرب ہونا دل بیتاب کا جاتا رہا | دوستی دنیا میں ہے جتنی وہ خود غرضی کی ہے

سب سے اب ملنے ملانے کا مزا جاتا رہا | رک گئے آنسو مرے جب کم ہوا دلکا نجار | گھٹ گئی گرمی برسنا ابر کا جاتا رہا

بیخودی ایسی بھی کیا اخگر کسی کے عشق میں
آدمیت سے بھی اے مرد خدا جاتا رہا

کلام جناب مولانا مولوی معین الدین احمد صاحب قیسؔ رضوی عظیم آبادی

وہی ہے ربط مرے دل کو جان جاں کے لئے
بچا کے کون رکھے عمر جاوداں کے لئے
دو روزہ خندۂ گل ہی دو روزہ عیش و نشاط
سوا بہار سے ہے قلب ناتواں کے لئے
دلِ ستم زدہ کا حال کچھ نہ پوچھو تم
بناؤ شیخ کی مندیل بادباں کے لئے
یہ کیا غضب ہے کہ لیلیٰ سو دوں سے تشبیہ
کہ ہم بنائے گئے جورِ آسماں کے لئے
عیاں ہو حال مرے دل کا خلق پر او راہ
تری گلی میں مری قبر ہو نشاں کے لئے
تری نگاہ ہے قاتل اُٹھی ہوئی تلوار
یہ تیر تھے اسی دو تانگ کی کماں کے لئے

مجھے پسند کیا آپ نے کہاں کے لئے
ہم آج کیوں نہیں نقدِ حیات کھو بیٹھیں
ہمارے شوق سے بوسے ہر دہاں کے لئے
خدا ہی کاٹے تو کٹتی ہے یہ شبِ ہجراں
یہ دھوکا کم بھی نہ تھا میرے امتحاں کیلئے
پسندِ کشتیِ مے کا جو ہو رواں کرنا
کہ سب مکین بنے ہیں اسی مکاں کے لئے
بنی ہے گردشِ نُہ آسماں ہمارے لئے
"صلائے عام" ہے یارانِ نکتہ داں کیلئے
کوئی نہ راہِ محبت کی منزلیں بھولے
سپرد کام یہی ہے مری زباں کے لئے
اشارہ خمِ ابروئے یار صلِّ علیٰ

مفید بہرِ زمیں ہوں کہ آسماں کے لئے
ہے چار خلط کو جو اختلاط جاں کے لئے
میں کُشتہ کون ہے خاقانِ حُسن کا تھا فلک
بہار آئی ہے اے باغبانِ خزاں کے لئے
اُٹھا کے آنکھ نہ دیکھا شرارِ طور کی سمت
میں کیا کہوں کہ یہ بیتاب ہے کہاں کیلئے
عجب مقامِ تجلّی ہے کنجِ تارِ لحد
جگہ گرفت کی ہے میرے بدگماں کے لئے
ادائے خاص سے ناصرؔ نے کی گل افشانی
حقیقتاً کوئی پردہ نہیں کتاں کے لئے
تری ثنا سے یہ رطب اللساں رہے تا عمر
ترا شباب پُر آشوب ہے جہاں کے لئے

اُسی کو بادِ حوادث نے پائمال کیا ÷ پسند شاخ جو کی قیسؔ آشیاں کے لئے

قطعہ

سفر بخیر یہ جو بیسویں ہے منزلِ عمر
پر اتنی بات تو کہنے کی ہے کہ "کیا پہونچے"
نحیف و زار تو ایسے ہو اور یہ سختیِ راہ
کٹی یہ راہ تو منزل پہ اپنی جا پہونچے

کہ قیسؔ سلمہ اللہ کو دعا پہونچے
بہت سی راہ میں بیماریاں تھیں صعب تھے
خضر سا کوئی نہ جب تک کہ رہنما پہونچے
بڑی کٹھن ہے اب آگے سفر ہے وحشت ناک

لکھا ہے مجھکو یہ اس سال کے محرم نے
یہاں پہونچ تو گئے گو شکستہ پا پہونچے
یہاں سے آگے تو بڑھنا ہی سخت ناممکن
رسول آئیں مدد کرنے کو خدا پہونچے

پیام سن کے یہ دل نے کہا مبارک ہو ÷ حضور ملکِ عدم کے قریب آ پہونچے

صلائے عام کی ڈاک

جناب صاحب کمشنر بہادر جوز یا نہایت مشرقی کے علوم و فنون میں خاص مرتبہ رکھتے ہیں صلائے عام کی نسبت ارقام فرماتے ہیں کہ × × × × × ×

" I am receiving your paper 'Sala-i-Ām' regularly for which many thanks. Some of the articles which have appeared in it have a great educational value and I feel delighted to find that those which touch a high water mark in elegance and originality are contributed by your own erudite pen." × × × × × × × × × × × × × × ×

صلائے عام۔ یہہ داد صلائے عام ایسے عالمِ متبحر کی قدر دانی کا نتیجہ ہے جس پر جس قدر ناز کیا جائے تھوڑا ہے ؟

× × × پرچہ مجکو برابر مل رہا ہے۔ × × × × × × × دورِ اول سے دورِ ثانی ہزار گنا زیادہ عمدہ ہے ظاہر و باطن۔ اللہ کی شان۔ اللہ تعالے نظرِ بد سے بچائے × × × × مجھ پر جو غیر معمولی عنایت ہے اللہ تبارک تعالے جزائے خیر دیگا × × ×

ماسٹر محمد حمزہ خاں، از بلڈانہ (برار)۔ جولائی

× × × × × جولائی کا صلائے عام آیا۔ مضامین ایک سے ایک اعلیٰ و افضل ہیں کن کن کی تعریف کی جائے ؎

تسخیر کا اثر تری میٹھی زباں میں ہے ٭ سحرِ حلال پردۂ حسنِ بیاں میں ہے

وادیٔ ایمن کی سرخی سے جو مضمون درج ہے اُس میں حضرت ریاضؔ کا یہ شعر غلط چھپ گیا ہے ؎

ریاضؔ تھی جو مقدر میں بازگشت شباب ٭ جوان ہونے کو پیری میں لکھنؤ آئے۔

بجائے مقدر تصور چھپ گیا ہے جس سے مصرع مہمل ہوگیا ٭

ریاضؔ کا نام دیکھکر آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ دہلی دربار کے زمانہ میں آپکی کوٹھی کی نشست اور بزمی یاد آگئی ہائے! اتنے دن کیا لطف سے گزرے جو عمر بھر یاد آئیں گے واقعی میں ہندوستان میں اب ریاضؔ سے بہتر شاعر نہیں۔ دیکھئے تو کیسا بے مثل شعر لکھا ہے ؎ تیور میں تیغ یار کی سب ہیں کھچاوٹیں ٭ کس بل شباب میں اجل ناگہاں کے ہیں

اب ذرا شوخی بھی ملاحظہ ہو جو ریاضؔ کا حصہ ہے ؎

آنکھوں میں شرارت ہے کہ روکے نہیں رکتی ٭ شوخی ہے کہ بے چین ہے آغوش حیا میں

فرصت کم ہے اس لئے آیندہ ریاضؔ کے شعر لکھوں گا۔ × × × × × × × × × ×

مئی کے صلائے عام کا انتظار ہے جو میرے ہوش و حواس کی طرح گم ہوگیا۔ ناچیز شمشیر بہادر انگر

× × × × × کتب خانہ انجمن ترقیٔ اردو پٹنہ کی وساطت سے آپ کے رسالہ صلائے عام کا نظارہ کیا کرتا ہوں۔ غالباً یہ لکھنا مبالغہ نہیں سمجھا جائیگا کہ اس کا ہر ایک فقرہ چست۔ مضامین اعلیٰ۔ خیالات پاکیزہ اور زبان ستھری اور ٹکسالی ہوا کرتی ہے ٭ جولائی نمبر میں مرزا محمد علی خاں صاحب دہلوی کا مضمون اتالیق الامرا خاصکر قابلِ تعریف ہے۔ میرے خیال میں اگر جناب موصوف اس عنوان پر مسلسل بحث فرماتے رہیں تو طبقہ امرا کی

بہار...

لئے بالخصوص اور عوام کے لئے بالعموم مفید ثابت ہوگا ؛

حضرت استاذی قیس مدظلہ کا یہ فرمانا کہ " اس کے ہر فقرے اور سطریں سلکِ مروارید ہیں " ۔ میں اس کی حرف بہ حرف تائید کرتا ہوں ۔ اور آپ کو دلی مبارکباد دیتا ہوں کہ آپ کا رسالہ پسندِ خاص و عام ہے ۔ خدا آپ کی زبان میں اثر بخشے اور رسالہ کی اشاعت میں دن دونی اور رات چوگنی ترقی ہو ۔ آمین : × × × × × × × × × × × ×

(سید شاہ) اختر اقبال ۔ اختر (صاحبزادہ جناب سید شاہ محمد اقبال صاحب)
رئیس عظیم آباد

× × × × × × × صلائے عام کے مئی کے پرچہ کے بعد جون و جولائی کے پرچے اب تک نہیں ملے ۔ × × × × × × میں چشم براہ ہوں ؎

تم نہ دیکھو کہ مرے چہرہ پر ؛ اک تمنا سی پائی جاتی ہے

میں آپ کے حسنِ بیان پر مِٹا ہوا ہوں ۔ اور یہ ہی وجہ ہے کہ صلائے عام کا زیادہ انتظار گوارا نہیں ؎

تم ہاتھ رکھ کے دیکھ نہ لو اضطرابِ دل ؛ ہم اور کچھ کہیں گے نہ اپنی زبان سے "

صلائے عام ۔ یہ عبارت ڈاکٹر محمد عبد الغفور صاحب کے پوسٹ کارڈ سے نقل کی گئی ۔ اس میں مجھے صرف ایک شکایت ہے کہ مختصر ہے : کارڈ کی وجہ سے زیادہ لکھنے کی گنجایش نکل نہ سکی ۔ ورنہ یہ اندازِ بیان جس قدر زیادہ ہو تھوڑا ہے ؛

× × × × × " جس روز سے صلائے عام نکلا ہے اس وقت تک کل پرچے میرے پاس مجلد موجود ہیں جو شاید ہندوستان میں کسی کے پاس نہ نکلیں اور نہ آج تک کوئی پرچہ تلف ہوا

ماہ بماہ مجھے ملتا رہا ہے اس مرتبہ البتہ مئی کا صلائے عام مجھے نہیں ملا جسکے لیئے بیحد نہایت بے چین ہوں ایسی حالت میں مجھپر رحم فرماکر تلاش کرکے مجھے بھجوا دیجئے ورنہ کسی سے چند روز کے واسطے لیکر بھجوا دیجئے میں وعدہ کرتا ہوں کہ کل مضامین اپنے ہاتھ سے نقل کرکے فوراً پرچہ واپس کردوں گا سر مو فرق نہ ہوگا"

× × × × × × × × × × × × ×

ناچیز - شمشیر بہادر اخگر - از ریاست اجے گڑھ -

صلائے عام - میں چاہتا ہوں کہ مئی سنہ ۱۹۲۲ء کے صلائے عام کے پرچے جو صاحب قیمتاً یا عاریتاً دینا چاہیں عنایت فرماکر مجھے بھیجدیں :-

---

قطعہ جناب نواب صاحب بہادر فرمانفرمائے ریاست لوہارو

شمع و پروانے کی اعظم گفتگو ۔ اتفاقاً رات کو میں نے سنی ۔ آتش الفت سے جلتا دیکھکر
شمع پروانے سے یہ کہنے لگی ۔ جان کیوں ناداں یوں دیتا ہے تو ۔ قدر بھی معلوم ہے کچھ جان کی
جاکے وہ اک بار پھر آتی نہیں ۔ سن لے مجھسے گر نہیں ہے آگہی ۔ اور جلنا بھی تو میرے عشق میں
عمر صرف اک رات کی جس کو ملی ۔ عمر بھی کیسی کہ رو رو کر جلوں ۔ چین ملنے ہی نہیں پاتا کبھی
صبح تک ہوجاؤنگی ختم اے عزیز ۔ مجھسی درماندہ ہے اور یہ عاشقی ۔ ہے مری تقدیر کا لکھا یہی
جل کے تو کرتا ہے کیوں یہ خودکشی ۔ آہ کھینچی سن کے یہ پروانے نے ۔ اور کہا میں نے حکایت یہ سنی
جانتا ہوں خوب میں اے جان جاں ۔ تو نہیں دیکھے گی دن کی روشنی ۔ پر کروں کیا تیرا دلدادہ ہوں میں
تو نہیں تو خاک ہے پھر زندگی ۔ زندگی میں تیری میرا ہے یہ حال ۔ بعد تیرے ہوگی کیا حالت مری
تجھ سے پہلے ہی میں ہوجاتا ہوں ختم ۔ میری قسمت میں بھی لکھا ہے یہی ۔ جان وہ ہے جو ہو جاناں پر فدا
گر نہ اس کام آئے تو کس کام کی ۔ جل گیا پروانہ یہہ کہتا ہوا ۔ عاشقاں را مرگ باشد زندگی

اعزالدین احمد - لوہارو

صلائے عام

اس پیشانی کے سہارے سے مجھے بار بار لکھنے کی عادت ہوگئی ہے۔ نئی نئی پیشانیان لوحِ تقدیر کی طرح میرے بس کی نہیں: یہہ قدرت کاتبِ تقدیر کو ہے کہ ہر شخص کی لوحِ پیشانی علیحدہ علیحدہ مختلف المضامین لکھی کہ ایک کا نصیب دوسرے سے نہ ملے۔

عنوانِ مضمون۔ مضمون کی سُرخی (قلمی کتابوں میں اگلے خوشنویس مضمون کی پیشانیاں شنجرف کی روشنائی سے لکھتے تھے) اب انگریزی خوان مضمون کی پیشانی کو ھیڈنگ کہتے ہیں: ان الفاظ سے مضمون کی پیشانی مجھے زیادہ پسند ہے کہ انسان کی نظر پہلے چہرہ پر جاتی ہے اور چہرہ میں شعر کے مطلع کی طرح اور جسطرح مکتب کے لڑکوں کی تختی مشق سے پہلے سادہ و صاف ہوتی ہے انسان کی پیشانی پر سب سے پہلے دور سے نگاہ پڑتی ہے۔ خواجہ وزیر کا شعر ہے ؎

ادا سے پنجۂ پُر نور ماتھے پر نہیں رکھا ✤ یہہ اُس نے لوح پر قرآن کے اللہ لکھا ہے

دُنیا کے رنج و آلام میں جب زیادہ پریشانی ہو تو انسان ماتھا پکڑ کر بیٹھ جاتا ہے

اوہیومانکار میں جب درد سر ہو تو پیشانی پر صندل لگایا جاتا ہے ؛
صبح کو برہمن پوجا کرکے ماتھے پر صندل سے نشان لگاتے ہیں جسے ہاری والے قشقہ کہتے ہیں۔ یہہ نشان پیشانی پر عبادت کی نشانی ہے ؛ غرض انسان کے اکثر رنج راحت کے کاموں میں پیشانی کو زیادہ دخل ہے

لوحِ پیشانی کی طرح انسان کے بُرے بھلے میں گردشِ ایام کا دخل سمجھا جاتا ہے۔ گردشِ ایام زیادہ تر مصائب کا باعث سمجھی جاتی ہے : لیکن جو چیز ہمارے واسطے بُری ہو ہمارے دشمن کو وہی نصیب ہو تو ہمیں خوشی ہوتی ہے ؛ مثلاً ہمارے دن بُرے ہوں تو خدا کرے وہی بات ہمارے دشمن کو پیش آئے۔ گردشِ ایام ہمیں یار سے جدائی دکھائے تو یہی دن خدا ہمارے دشمن کو دکھائے تو ہماری خوش نصیبی ہے ؛ یہہ عجیب اتر ہے کہ ہمارے لئے جب ہو تو مصیبت کا باعث ہے۔ غیر کے لئے جب ہو تو ہماری خوش قسمتی ؛ اب آپ ہی فرمائیں کہ گردشِ ایام کو کیا کہا جائے ؟ سے

میری طرح جو غیر سے وہ آنکھ پھیر لے ؛ دوں میں دعائیں گردشِ لیل و نہار کو

انسان کے لئے غلامی بُری چیز سمجھی جاتی ہے۔ لیکن یہہ رائی میرے آپ کے واسطے ہے : حضرت یوسف کو غلامی ہی راس آئی کہ زلیخا کی محبت نصیب ہوئی اور عزیزِ مصر کے مرتبہ کو پہونچے : ہندوستان میں ایک نامور خاندانِ سلاطین غلاموں کا تاریخ میں موجود ہے۔ ایاز غلام نہیں تو کیا تھا ؟ سے

جو خاص بندے ہیں وہ بندۂ عوام نہیں ؛ ہزار بار جو یوسف بکے غلام نہیں ؛

انسان غلام

انسان غلام ہو یا آزاد ہر حالت میں نیک رہ سکتا ہے۔ پیشانی میں جو لکھا ہے لکھا رہنے دو۔ ہم نے پیشانی میں خود نہیں لکھ لیا ہے۔ لکھنے والا جانے اور پیشانی جانے۔ ہم کو اس سے کیا تعلق؟ اسی طرح گردشِ ایام کا اثر ہم کیوں مانیں؟ گردشِ ایام میں ہم مبتلا ہوئے تو چیخ اُٹھے۔ دشمن مبتلا ہوا تو خوشی ہوئی۔ یہ عجیب بات ہے کہ فرقت میں گردشِ ایام درازیٔ شبِ ہجراں کا باعث ہو اور شبِ وصل گردشِ ایام سے مختصر ہو جائے۔ یہ اثر ہمارے خیال کا ہے کہ وہی چیز ہمارے لئے کچھ اور دوسرے کے لئے کچھ ہو جائے۔ ورنہ خدا نے کوئی چیز بیکار نہیں پیدا کی۔ دہنِ یار کو معدوم بنایا تو چشم کو سخن گو کہ آنکھ کے اشارہ سے ہزاروں کام نکل آئے: محبت میں زبان سے زیادہ نگاہ سے کام نکلتا ہے ع

گلہ ہے چشمِ سخن گو سے خامشی کا ہمیں ٭ دہن کے ہونے نہ ہونے میں کچھ کلام نہیں

تقدیر و تدبیر کے بارہ میں آپ نے اور اگلوں نے بہت کچھ لکھا کہ انسان کی پیشانی پر جو ازل سے لکھ گیا وہی پیش آتا ہے۔ لیکن آپ کو کیا معلوم کہ کیا لکھا ہے؟ از روئے عدل و انصاف شبہ کا فائدہ ہمیں (ملزم کو) پہونچنا چاہئے۔ آپ اس شبہ سے فائدہ اُٹھائیں کہ خدا جانے اچھا لکھا ہے یا بُرا۔ آپ اچھا سمجھ لیں اور اپنی بریت کا جو ثبوت ہے وہ پیش کئے جائیں۔ انسان کے بس کی جو تدبیریں ہیں وہ کئے جائے باقی خدا پر چھوڑے ٭

یہ سمجھ لینا کہ تقدیر میں جو لکھا ہے وہ ہو کر رہیگا اوہامِ باطلہ کی گویا پرستش ہے۔ چھینک آئے تو سمجھ لیں کہ کام بگڑا۔ "دہی مچھلی" سے سفر راس آیا۔ قدیم رومیوں اور یونانیوں

میں شگون پر ہر کام کا مدار تھا۔ بنی اسرائیل میں قربانی کے مقبول ہونے کی علامت تھی کہ ذبیحہ کو آگ کھا جائے۔ بچہ فلانے دن فلانے مہینہ کی پیدایش کا اقبال مند۔ بُرے دن بُری ساعت کا منحوس۔ یہاں تک کہ بہت روتے بچے کو محرم کی پیدایش کہتے ہیں ٭ مذموم کاموں میں جب فائدہ ہوتا ہے تو تقدیر اچھی بتاتے ہیں۔ مثلاً قمار بازی میں جو ہار جیت ہو اُس کا مدار بالکل قسمت پر رکھا جاتا ہے ٭ میں دیکھتا ہوں کہ غفلت اور کم ہمتی کا سہارا تقدیر پر سمجھا جاتا ہے کہ تقدیر میں نہ تھا: تقدیر و تدبیر دونوں کو ملا دینا میری سمجھ سے باہر ہے۔ آپ صرف تدبیر کے جواب دہ ہیں تقدیر سے آپ کو کیا واسطہ ؟

یہہ مضمون جھگڑے کا ہے۔ آپ بھی لکھیں میں بھی لکھوں ؎

یہہ سر جھکانا یہہ منہہ پھیرنا ہے مانع دید ٭ مری نماز میں سجدہ نہیں سلام نہیں

والئے کعبہ ابرو سے منہہ کو کیا پھیروں

نماز ختم نہ ہو جب تلک سلام نہیں

Journal of the Panjab Historical Society.

رسالۂ پنجاب ہسٹاریکل سوسائٹی

تاریخ و تحقیق کی غرض سے یہ سوسائٹی کئی سال سے قایم ہے - اس کی کارروائیوں کی نویں جلد نہایت پاکیزہ ابھی شایع ہوئی ہے : مضامین بہت بکارآمد اور محنت سے لکھے گئے ہیں ؛ ازروے زبان ہندوستانی اور یورپ کی نسل کے دُنیا میں پھیلنے کے اسباب بڑی خوبی سے لکھے گئے - سکندر کی پنجاب میں آمد و واپسی کی تحقیق اچھی کی گئی - آتشی شیشہ کی تاریخ گو مختصر ہے مگر دلچسپ ہے - احمد شاہ ابدالی اور سوامی جی کی ملاقات زیادہ تر قیاسی معلوم ہوتی ہے - قیاسی سے میرا مطلب یہ ہے کہ احمد شاہ کی تاریخوں سے اس کا پتہ نہیں چلتا ؛ ہاشم شاہ کی شاعری اہل پنجاب کے سوا اور کہیں سُننے میں نہیں آئی ؛ باقی مضمون بھی دلچسپ ہیں ؛ ایک آنریبل جے پی ٹامسن صاحب کا فرانسیسی زبان سے لوئیس بورکوئین کے خود نوشتہ حالات کا ترجمہ - دوسرا دلی کے راے پتھورا کی آخری لاٹ کے متعلق روایتیں ازروئے قیاس و تحقیق ؛

لوئیس بورکوئین کے حالات سے ہندوستان کی آخری تاریخ پر بڑی روشنی پڑتی ہے - اس شخص کو اُس وقت کے فرانسیسی اور انگریزی حکمت عملیوں میں دخل رہا - ہندوستان میں فرانسیسیوں کے زوال اور انگریزوں کے اقبال کے اسباب سے اس شخص کو خاص واقفکاری ہے ؛ تاریخ و تحقیق کے لئے ایسے مسالے بہت ضروری ہیں کہ ہندوستان سے فرانسیسوں کے قدم اُکھڑنے کیا اسباب ہوے ؟ ہندوستان کی معمولی تاریخوں میں ان باتوں کا ذکر بہت کم ہے - خاص ہماری زبان (اُردو) کی تاریخیں ایسے ذکراذکار سے خالی ہیں ؛ میرا ارادہ ہے کہ اس ترجمہ شدہ مضمون کا خلاصہ ایک نمبر صلائے عام میں لکھوں - اس وقت یہ ارادہ پورا نہیں ہو سکتا کہ پرچہ تیار ہو چکا ہے اس میں گنجایش نہیں ؛ اگلے مہینہ کے پرچہ میں مفصل عرض کیا جائے گا ؛

Presentation of Mir Nasir Ali Khan Bahadur of Delhi to his Most Gracious Imperial Majesty King Emperor.

—o.—

Extract from a letter from J. P. Thomoson, Esquire I. C. S.
Dated 13th December, 1911.

—:-o-:—

"Dear Mir Sahib"

I enclose your invitation card for the Garden Party this afternoon, which has just reached me from the Private Secretary to His Honour."

o o o "Sir Louis Dane hopes to have an opportunity of presenting you to his Imperial Majesty." o o o o

—:o.—

Extract from a letter from Sir Richard Dane. K. C. I. E. (Brother of His Honour the Lieutenant Governor of Punjab)
Dated Lieut. Governor's Camp, 25th February 1912.

"Dear Mir Nasir Ali"

o o o o o o o

My Brother has told me that you had the great honour of being introduced to his Imperial Majesty the King Emperor."

I am, Yours Sincerely,

—:0:—

Extract from a letter from Major J. C C. Angelo, Dy. Commissioner, Dated, 18th December 1911.

"My Dear Mir Sahib.

"I Am very glad you were presented to His Imperial Majesty—it was a fitting ending to the Durbar." o o o o

Your Sincerely.

Babu Rebindra Nath Tagore of GITANJALI, writes:-

o o o o

"I have no doubt that it (Sala-i-Am) is doing a good service in promoting the cultivation of Urdu literature"

o o o o o o

Extract from a Gentleman,s' letter Dated April 4, 1914.

o o o o o o o

"I conclude from the last issue of the Sala-i-Am that you have been invested with a *Khilat* as Diwan of the Pataudi State, will you permit me as an old friend of yours and an admirer of your genius to offer you my sincere congratulation.

o o o o o o

" If like Addison you have acquired celebrity as an Essayist and a brilliant writer of Urdu prose; o o

o o o o o o

you, like him, deserve to be raised to the highest advancement in the state! Now, that is no flattery I speak as I think." o o o

"In conversation this morning with o o I brought to his notice the SALA-I-AM, and have at his request sent him your December Number, drawing his particular attention to your "Stray thoughts" مضمون پریشان o and especially to your simile of

چارکی زلف پریشان

o o o o o o

—oo—

Farrash-khana Delhi. He has recently started an Urdu Magazine Sala-i-Am, in his own city. He is a writer of some forty years standing His writings are appreciated in Lucknow as well as in Delhi He has been congratulated for his work by the Lieutenant Governor of Punjab. He has received congratulations from all parts of India compliments from many literary men and favourable reviews from the Press, and now, that great boon the appreciation of Lord Minto. His style is very simple but amphatic. He wtries philosophical essays in Urdu and is thus doing much to bring to a high level Urdu literatare. It is hoped that the paper he has started will do much for the good of our languages. The paper itself is nicely got up, the annual subscriptions only Rs. 3. Those who are desirous of reading good Urdu should at once communicate with the editor, the point also I should add that the paper is much liked and purchased by Europeans both in India and Europe."

:o:o:o

Copy of a letter from the Private Secretary to His Honour the Lieutenant Governor of the United Provinces, dated 11th April 1913.

GOVERNMENT HOUSE.

LUCKNOW.

Sir

I am desired to acknowledge your letter of the 19th forwarding a copy of your paper "Sala-i-Am." for His Honour the Lieutenant Governor's perusal; and to say that His Honour has put it a side to study an enjoy at leisure.

The annexed Review of the SALA-I-AM Delhi, is re published from the Journal of the Moslem Institute, Calcutta. No 2 Vol V. Page, 104.

o:o:o

"The Sala-i-Am, published at Delhi is a high class Urdu periodical and in get up printing and style it is without a parallel. it has been truly remarked by the *Pioneer* that it, "seeks to promote the cultivation of Urdu literature." It is edited by Khan Bahadur Mir Nasir Ali who is a writer of 40 years standing."

Extract from the GAZETTE OF INDIA JUNE 6, 1914. EXAMINATIONS.

XVI:— The following are the Text books prescribed for the PROFICIENCY EXAMINATION:—

URDU:—

In addition to the Grammer and Magazine recommended for tha proficiency examination, the following are recommended :—

Magazine

SALA-I-AM

Appendix B. List of authorised Text books. The following is a list of Text books prescribed for the various examination together with the places where they may be obtained.

URDU.

SALA-I-AM ______________ DELHI

school :—

"Sala-i-Am" edited by Mir Nasir Ali Khan and published at the Mustansir Press Delhi, annual subscription Rs. 5.

I have &c.

J. C. GODLEY

Director of Public Instruction, Punjab

Extract from a letter from R. P. DEWHURST Esquire I. C. S Session Judge, dated 11th January 1911.

"I take this opportunity of saying that I entertain a very high opinion of your Magazine I will not say that I read every word of every number, but I can say with truth that I read eagerly all the articles proceeding from your own pen begining to end.'

"I have always been an enthusiast with regard to Urdu literature since I come to India eighteen years ago and have read much classical verse and prose besides the more ephemeral publications but I have never yet encountered such a model of a clear and attractive prose style as I find in your articles.

Extract from a letter from the Hon'ble W. Merk Esquire, L, L, D. C, S I, I C. S, Late Chief Commissioner, N W. Frontier province Written from England dated 16th August 1911

I thougt it (sala-i-Am) a periodical that might be encouraged with for advantage. for instance to be placed in the waiting rooms for native gentleman calling on Deputy Commissionere.

Extract from a letter from A L GORDON WALKER Esquire I C S Punjab Commission dated 11th October 1911

"I quite agree with Mr. Merk that the (Sala-i-Am) ought to be in the waiting room of all Deputy Commissioners. Curiously enough I have used it for the purpose myself and always find that the Indian gentlemen who read it are delighted with it."

Extract from a D O letter from the Deputy commissioner of Gurgaon to the vice chancellor of the Punjab University dated 14th December 1910

"I wonder if you have any collection of receiving a letter from me last July when I sent you a copy of the Sala-i-Am, edited by Khan Bahadur Mir Nasir Ali, a most estimable old Government servant who spends his leisure hours, when not occupied in his Magisterial duties [he is an Honorary Magistrate in Delhi] in editing and publishing quite one of the best Magazines in Urdu.

"I am sending you another copy of the Magazine with a request that you will as Vice Chancellor of the University give it all your assistance and if possible, its Editor the Mir Sahib, who is a most loyal old man and a man of letters."

EXTRACT FROM THE INDIAN DAILY TELEGRAPH LUCKNOW DAILY 14th DECEMBER. 19..

"But the chief point about which I have taken up my pen to write is the literature of Khan Bahadur S. Nasir Ali Sahib of

OPINIONS

Regarding "SALA-I-AM" Delhi.

The following Critique on the "SALA-I-AM," Delhi was Published by the Pioneer, in its issue of the 3rd November 1909

"The Sala-i-Am published at Delhi keeps up high character as a periodical which seeks to promote the cultivation of Urdu literature. Khan Bahadur Mir Nasir Ali, with whom loyalty and learning go hand in hand is filling the leisure hours of his retirement by devoting himself to the editing and publishing of this Magazine. His style is marked by refinement and culture, and his readers should increase in number as the merits of his work become disclosed. The Sala-i-Am is particularly well printed and European students of Urdu should find it quite worth reading."

Extract from a letter from Colonel D. C. PHILLOT, Secretary Board of Examiners, Calcutta, dated 20th January 1910

"I have obtained the opinions of some of the board on the "Sala-i-Am" We think it is the best Urdu Magazine we have yet seen both in appearance and contents I shall have great pleasure in recommending it to candidates for the high Proficiency and Degree of Honour In fact, I have been doing so."

Extract from a letter from Sir Thomas GORDON WALKER K. L. L. K C I E Late Lieutenant Governor of Punjab Dated 10th March 1909

"The Magazine (Sala-i-Am) appears to be a very superior work one that ought to be appreciated."

SIR LUCAS WHITE KING

Kt. L. L. D., C. S. I. F. R. S.

Indian Civil Service retired writes as follows:—

"I am delighted with the style of your Magazine and am looking forward to the next number.

Dated 15th October 1908

Extract from CIRCULAR No 26 SERIAL No 5059

From the Hon'ble Mr J. C. GODLEY M. A. Director of Public Instruction Punjab.

TO ALL DEPUTY COMMISSIONERS INSPECTORS OF SCHOOLS, HEADS OF TRAINING INSTITUTION & MANAGERS OF AIDED and RECOGNIZED UNAIDED SCHOOLS IN THE PUNJAB

Dated Lahore The 31st August 1910

SIR,

I have the honour to recommend the Journals noted below for the reading room of Secondary

قواعد و مقاصد

صلائے عام

خواجہ قمرالدین راقمؔ کا شعر ہے ؎

مقصد تمہارے ہاتھ ہے قسمت خدا کے ہاتھ ❊ جو کچھ خدا سے دو وہ تمہاری زبان سے دو

صلائے عام کا بھی یہی عقیدہ ہے کہ کسی ملک و قوم کی ترقی تو پروردگار کے اختیار میں ہے لیکن ترقی کے لئے پہلی شرط اپنی زبان میں کمال پیدا کرنے کی ہے ❊ غیروں کی اور بات ہے مگر اس وقت ہندوستان کی زبانوں میں اُردو سے بہتر کوئی زبان میری سمجھ میں نہیں آتی جس پر جمہور اہل ہند (ہندو ہوں یا مسلمان) دونوں کی زبان کا اطلاق ہو سکے ؎

نغمۂ عشق سے ہیں سبحہ و زنار ملے ❊ ایک آواز پہ دو ساز کے ہیں تار ملے

خلاقِ دو عالم کی طرح اُردو زبان کی تعریف سب سے پاکیزہ یہ ہے کہ ؎

تجھ سے کوئی آشنا ہو یا ہو ❊ پر تجھے سب سے آشنا دیکھا

یہ رسالہ اپنی زبان میں اظہار کمال کی غرض سے جاری ہے کہ اُردو لٹریچر کے لئے ہر طرز پر لکھنے کا مسالہ جمع ہو اور ادائے بیان میں ہماری زبان اور زبانوں سے اگر بازی نہ لے جا سکے تو کسی زبان سے مرتبہ میں کم نہ رہے ؎

دیکھ کر جلوے جاتے ہیں دنیا کے حسیں ❊ جمع ہوتا ہے مسالہ تری یکتائی کا

صلائے عام میں ہر طرح کے مضامین نظم و نثر شایع ہوتے ہیں ۔ زیادہ تر نثر کی اس وقت نثر کی ضرورت ہے : اور نثر بھی ایسی جس میں زبان کی خوبی و فصاحت کے ساتھ خیال کی پاکیزگی اور نزاکت ضرور ہو ؎

دل باندھئے تو یار کے کاکل سے باندھئے ❊ جس کو باندھئے تو رگ گل سے باندھئے

صلائے عام اعلیٰ حکام سول و ملیٹری افسروں کے امتحان میں گورنمنٹ آف انڈیا

[illegible] سے منعقد ہو چکا ہے۔ ہندستان کے سا ہو رپ کے ماہو وار کل صلائے عام [illegible] کرتے ہیں
اُردو میں صلائے عام کے مضامین کو خاص مرتبہ حاصل ہے ؎

دل پہ تمہارے نقش ہوا ہے بیان شوق ❁ کہہ تو سکا نہیں ہے [illegible] زبان شوق

صوبہ آگرہ و اودھ کے سررشتۂ تعلیم کے نصاب میں صلائے عام کے مضامین اُردو فائنل [illegible]
میں انتخاب کر کے درج کئے گئے اور صاحب پریسیڈنٹ نصاب اُردو نے بموجب ایما [illegible]
بھی منعقد ہوئی ہے مضامین کو اُردو ریڈروں میں شامل کرنے کے [illegible] ہے ؎

اکثر احباب نمونہ کا پرچہ مانگتے رہتے ہیں۔ اوّل تو ایک پرچہ سے صلائے عام کا پورا حال [illegible]
ہونا مشکل ہے۔ دوسرے صلائے عام کو جاری ہوئے عرصہ ہو گیا نمونہ بھیجنا کی بے ضرورت [illegible]

[illegible] ہیں بے ولولۂ شوق نہیں ہم ❁ رکھتے ہیں ابھی تک دل ہنگامہ گزیں ہم
شہرت نہیں مجنوں کے برابر یہ مسلّم ❁ پر کوئی نہ جانے ہمیں ایسے بھی نہیں ہم

صلائے عام کی قیمت پیشگی ۱ روپیہ سالانہ ہے۔ چھ مہینے سے کم کی خریداری [illegible] نہیں ہو سکتی [illegible]
بذریعہ منی آرڈر عنایت فرمائی جائے۔ مضمون نگار صلائے عام کی قیمت سے بری نہیں: نہ یہ ضرور ہے کہ ہر
مضمون خواہ مخواہ شایع کیا جائے ؎

کس قدر ہے فرق یوسف میں اور اپنے یار میں ❁ گھر خریدار اس کے آئیں وہ بکے بازار میں

جو مضمون شایع نہ ہو سکیں ان کے واپس کرنے کا ذمہ نہیں: جامع اوراق کو مضمون میں کمی بیشی کا اختیار ہے ❁
پچھلے پرچوں کی قیمت بشرط دستیابی ایک روپیہ فی پرچہ ❁

صلائے عام کا پتہ اس قدر کافی ہے کہ:

دہلی۔ فراشخانہ۔ مکان میر ناصر علی خاں بہادر ❁

حسب الارشاد میر ناصر علی خاں بہادر مطبع ناصری واقع فراشخانہ دہلی میں باہتمام میر [illegible] چھپا اور شائع ہوا ❁ ❁ ❁ ❁ ❁

PRINTED AND PUBLISHED BY MIR NÂSIR ALI KHÂN BAHÂDUR (EDITOR) AT THE NÂSRI PRESS, FARRÂSH KHANA, DELHI.

صلائے عام

SALA-I-AM, DELHI.

A high class Monthly Magazine devoted to the cause of Urdu literature, the preservation of the old Indian, especially Mohammadan culture and refinement, and the assimilation of the best features of the new civilization.

حسب الارشاد ناصر علی مدیر [illegible] دار المطبع واقعہ [illegible] چھاپا

جلد ۱۱ نمبر ۹

فہرست مضامین

بابت ماہِ ستمبر سنہ ۱۹۲۳ء مطابق صفر سنہ ۱۳۴۲ ہجری

پیرایۂ آغاز

جناب جنوں کا شعر ہے ؎

نالہ اب تک نہیں پہونچا کہ اثر دکھلایا ✣ گولی لگتی ہے نشانے پہ صدا سے پہلے

لیکن "پہلے" کا مضمون حضرت رنج نے خوب باندھا ہے ؎

بس جی میں رہنے دیجے نہ کھلوائیے ہمیں ✣ کھلجائیں پہلے آپ کے بندِ قبا سے ہم

پرچہ کے مضمونوں کا حال پہلے سے کہدینا صلائے عام کا پُرانا طریقہ ہے۔ اِس سے دلّال کی طرح خریدار و بایع میں تعارف ہوجاتا ہے یا مشاطہ کی طرح پڑھنے و لکھنے والوں میں رابطہ اشتیاق پیدا ہوجاتا ہے یا مضمون کا ذکر پہلے کردینا قافلہ کی صدائے درا سے مشابہ ہے کہ ؎

ہاں قافلہ والو کوئی واماندہ نہیں ہم ✣ پہلے ہی پہونچ جائیں گے آوازِ درا سے

اسی سے ملتی جلتی یہہ تشبیہہ ہے کہ محملِ لیلےٰ کی اوازِ جرس جو قیس کے دل پر اثر کرتی تھی یہی اثر پیرایۂ آغاز سے صلائے عام کے پڑھنے والوں پر ہونا چاہیے۔ یا لیلےٰ کی نگاہ ہے جو محمل کے پردہ سے لگی ہوئی ہے ؎

اے لیلےٰ اگر قیس کی مشتاق نہیں تو ✣ کیوں آنکھ تری پردۂ محمل سے لگی ہے

لیکن پہلے کا مضمون شاعرانہ جو سب سے زیادہ مجھے پسند آیا یہ ہے ؎

ہر صبح کو مسجد میں اذاں ہوتی ہے پیچھے ؛ پھر آتے ہیں ہم خانہ خمار سے پہلے

اور مضامین آپ پیچھے دیکھیں پہلے پیرایۂ آغاز کی سنئیں ؛

اس پرچہ میں مضمون **پریشان** اور **محشر خیال** کے بعد مورخانہ اور محققانہ مضمون زیادہ ہیں - **بیانِ واقع** میں نادر شاہ کے دلی میں قتلِ عام کا بیان تاریخ سے لکھا گیا ہے ؛ **لوئیس بورکین** کا خود نوشتہ تذکرہ پہلے آنریبل **جے پی طامسن** صاحب بہادر نے فرانسیسی زبان سے انگریزی زبان میں ترجمہ کرکے پنجاب ہسٹاریکل سوسائٹی کے رسالہ میں شایع کیا۔ اُس کا اقتباس صلائے عام میں لکھا گیا ؛ **اکبر کی مذہبی تحقیق**۔ اکبر بادشاہ نے اپنے عہد میں ایک نامور پادری فادر مانسٹریٹ صاحب ایس جے کو مذہب عیسائی کے عقائد دریافت کرنے کے لیئے بلایا تھا۔ اُن کا سفرنامہ لاطینی زبان میں تھا اور اب انگریزی میں ترجمہ ہوکر شایع ہوا ہے۔ میں نے اُس سفرنامہ سے یہہ مضمون لکھا ہے ؛ اس مضمون **امرؤالقیس** والا مضمون عربی شاعری کی خوبیوں کے ثبوت میں ہے۔ مگر عربی زبان کی شاعری کا مرتبہ کیسا ہے یہہ کام صاحب مضمون سے بہتر اور کوئی نہیں کر سکتا۔ کیونکہ آپ کو شعر کی تحقیق میں بہت اچھا دخل ہے ؛ **صلائے عام کی ڈاک** اب کی دفعہ عمداً زیادہ نہیں رکھی کہ زیادہ تر مضمون واحد تھا یعنی صلائے عام کی تعریف ؛ یہہ ضروری نہیں ؛

پریشان مضمون

مضمونِ پریشان

حضرت خواجہ عصمت بخاریؒ کا شعر ہے ؎

ہر کجا قصۂ آں زُلفِ دوتامے گذرد ٭ سخن اوّل ز پریشانیٔ ما مے گذرد

لیکن پریشانی کا لُطف اپنی پریشانی کے ذکر میں نہیں۔ عالم اسباب کی پریشانیاں دیکھنے کے لایق ہیں اور انہیں کا ذکر جوابِ زلفِ پریشاں سمجھنا چاہئے: اوروں کی پریشانیوں میں شریک ہونا گویا اپنی پریشانی کا علاج ہے کہ بقول حضرت حافظؒ ؎

خوشتر آں باشد کہ سرِ دلبراں ٭ گفتہ آید در حدیثِ دیگراں

ہزاروں گلاب کے پھول نچوڑے جائیں تو مشکل سے ایک قرابہ عرقِ گلاب کا نکلے گا۔ اور لاکھ انگور کے دانوں کا نچوڑ بھٹی میں کھینچیے تو ایک بوتل مئے دوآتشہ کی کھچے ٭ انسان کی طبیعت کچھ ایسی خود مطلبی پیدا ہوئی ہے کہ اپنی ایک معمولی پریشانی کے آگے تمام دُنیا کی پریشانیوں کو پاسنگ کے برابر نہیں جانتا ؎

باز ش بہ سرِ زلفِ پریشانِ تو یابد ٭ ہر جا کہ گریزد دلِ سودا زدہ از من

بلکہ میرا عقیدہ تو یہ ہے کہ دُنیا میں ہزار پریشانیوں کے بعد بھی انسان کو شاید ہی جمعیت خاطر نصیب ہو٭ گُولر کے اندر ہزار بھُنگے نہیں جانتے کہ اس درخت میں گولر لگے ہیں کتنے پتے ہیں اور ریچھ نہیں جانتا کہ اس کے بدن پر کتنے بال ہیں؟ تنکا جو گنگا کے سیلاب میں بہا جارہا ہے کیا جانے کہ پانی کی تھاہ کتنی ہے؟ باغ کی دیوار کو کیا خبر کہ مُرجھائے ہوئے پھولوں پہ کیا گذری؟ خزاں سے پوچھئے کہ پت جھڑ کی پتیاں کہاں گئیں؟ ؎

صبا میکرد قسمت گردے از کوئے تو در گلشن ٭ گُل از من پیشتر واکرد آغوشِ تمنا را

انسان کے لئے یہہ ذکر اور فکر دونوں بیکار ہیں۔ انسان اپنے جسم سے باہر نکل نہیں سکتا: جو شخص اپنے گھر سے باہر نہ نکلے وہ باہر کا حال کیا جانے؟ اس کی واقف کاری کا سارا مدار حواسِ خمسہ پر ہے جب یہہ روزن پتھرائی ہوئی آنکھوں کی طرح تیغہ کردیئے گئے تو اب خاک دکھائی دے؟ یہ آپ اور کسی کو سمجھائیں کہ جب تک دیوار کے روزن کھلے رہے کچھ نظر نہ آیا۔ روزن بند ہوتے ہی میری آنکھیں کھُل گئیں ٭ اپنی قیاسی بینائی کے لئے خدا کے واسطے میری آنکھیں نہ پھوڑئے: میری ہانہیں کم نگہی آنکھوں سے میرا بہت کام نکل رہا ہے ع ضایع مکن بدلقِ گدایاں گلاب را ٭ ؎

دامانِ یوسف کردہ جیب و گریبانِ مرا ٭ شوقِ دل از کف دادہ را دستِ زلیخا کردہ

زندگی رات دن کے اِک ہنگامۂ جاں ستاں کا نام ہے: زیست کا مرگ کے ساتھ۔ راحت کا رنج کے ساتھ۔ تندرستی کا بیماری کے ساتھ۔ دین کا کفر کے ساتھ۔ علم کا

جہالت کے ساتھ۔ بیداری کا غفلت کے ساتھ۔ فارغ البالی کا تنگ دستی کے ساتھ۔ آزادی کا پابندی کے ساتھ۔ صلح کا جنگ کے ساتھ۔ وصل کا ہجر کے ساتھ۔ رات کا دن کے ساتھ دلجمعی کا پریشانی کے ساتھ۔ ہنگامہ چلا آتا ہے اور لطف یہہ ہے کہ آغازِ عالم سے آج تک ایک دوسرے کو فنا نہ کر سکا۔ اور آپ یا میں اگر زندہ رہے تو دیکھ لیجئے گا قیامت تک اور قیامت کے بعد یہی ہنگامہ برپا رہیگا: بہشت کا دوزخ سے۔ عابدوں کا گنہگاروں سے۔ رحمت کا غضب سے خوف کا رجا سے۔ غرض اسی ہنگامہ پر ہمارا جینا مرنا موقوف رہا ؎

ایک ہنگامہ پہ موقوف ہے گھر کی رونق ٭ نوحۂ غم ہی سہی نغمۂ شادی نہ سہی ٭

انسان خوش ہو یا نہ ہو مگر جہاں تک ہوسکے رنج سے بچا رہے۔ یہ اچھی زندگی کا کمال ہے اسی طرح مرنے کے بعد ہمیں بہشت نصیب ہو یا نہ ہو دوزخ سے بچے رہیں یہی غنیمت ہے پس ہم نیکی ہوسکے یا نہ ہوسکے معصیت سے خدا بچائے تو یہی اس کا بڑا فضل ہے ٭ جسطرح کپڑے میں عرض جتنا زیادہ ہو سینے والیاں گنجایش سمجھتی ہیں۔ سارے تھان کی لمبائی نہیں دیکھتیں۔ اسی طرح زندگی میں یہ دیکھنا ہے کہ تھوڑی ہوئی یا بڑی جو کچھ ہوئی کیسی گذری ٭ آپ نے نہیں دیکھا کہ برسات کے کیڑے جو شام کو پیدا ہوئے اور صبح کو فنا ہو گئے زندگی کا لطف اٹھانے میں حضرت خضرؑ سے بازی لے جاتے ہیں ؎

وہ زندہ ہم ہیں کہ ہیں روشناسِ خلق اے خضرؔ ٭ نہ تم کہ چور بنے عمرِ جاوداں کے لئے ٭

تصوف میں فقرا کا دعوے ہے کہ انسان عشقِ الٰہی میں خدا سے اس طرح جا ملے جسطرح قطرہ دریا میں ملجاتا ہے مگر آپنے دیکھا ہوگا کہ بہت کم قطرے دریا تک پہونچتے ہیں۔ لیکن

ہر کیڑا جو مٹی میں پیدا ہوتا ہے بلا تامل مٹی میں مل جاتا ہے۔ اور مُنہہ سے اُف نہیں نکالتا: کیڑے سے پوچھیے کہ مٹی میں مل جانے سے تجھے کیا ملا؟

زندگی محض کھانے پینے اور اولاد پیدا کرنے کا نام نہیں ہے۔ انسان بے اولاد مر نہیں جاتا اور اولاد والے ہمیشہ زندہ نہیں رہتے: یہ کیا کہ ہم نہیں تو ہمارا نام ہی رہ جائے۔ شراب نہیں تو شراب کے نام سے کیا فائدہ؟ ؎

محفی نہ گشت از نظرِ نکتہ سنجِ من ٭ دیوانِ عُمر گر ورقِ انتخاب داشت

زندگی سے غرض دُنیا میں از روئے دل و دماغ کچھ کرکے جانا ہے۔ انسان محض اتفاق سے دُنیا میں نہیں آگیا۔ عالمِ اسباب نے خدا جانے کیا کیا کیا اور خدا جانے کیا کیا سوچا تب کہیں دنیا نے ہماری اور ہم نے دُنیا کی صورت دیکھی ٭ دُنیا میں ہم آئے تو دیکھنا ہے کہ ہمیں کیا کرنا ہے کیا نہیں کرنا ہے؟ جو کرنا ہے وہ یہہ ہے کہ ہماری زندگی سے دُنیا کو کیا فائدہ ہوا؟ جو نہیں کرنا ہے وہ یہ کہ دنیا میں کسی کا نقصان تو ہماری ذات سے نہیں ہوا؟ جب تک ہم کو یہہ معلوم نہ ہو کہ ہمیں کیا کرنا اور کیا نہیں کرنا ہے اُس مسافر کی سی مثال ہے جو گھر سے تو نکل کھڑا ہوا مگر معلوم نہیں کہاں جانا ہے؟ ہوا کیسی ہی موافق کیوں نہ ہو جب تک ناخدا یہ نجانے کہ کشتی کہاں لیجانی ہے بادبان بیکار ہے۔ اور ناؤ کا کھینا فضول دردِ سر ہے ٭

بیج میں یہ طاقت نہیں کہ خود بخود اُگے۔ مٹی اور پانی کی ضرورت ہے: اور نری مٹی میں رنگ و بو کہاں سے آئی جو لالہ و گل میں پیدا ہوگئی۔ پسِ پردہ کوئی اور چیز بھی ہے جس کی ہمیں خبر نہیں یہ خیال خالقِ کائنات کے ثبوت میں ہے۔ اور چونکہ اسبابِ عالمِ بالا کا دلفریب ہے خالق کے

اچھے ہونے میں شک کرنا کفر سے بدتر ہے ☆

غمگیں نیم کہ لب نہ کشودی بہ پرسشم ☆ ایں بے زباں کجا سر و برگ جواب داشت

دُنیا میں انسان کے برابر کوئی بیوقوف نہیں۔ یہہ سب سے زیادہ بے سر و سامان پیدا ہوا اور اس بے بضاعتی پر اسے سب سے زیادہ غرہ ہے ☆ کُتّی کیطرف ہاتھ لے جایئے تو بے بتائے بے گردن ہونے سے جان جاتی ہے کہ آپکا کیا ارادہ ہے؟ مُرغی کے بچوں نے چیل پہلے نہیں دیکھی مگر چیل اوپر سے ہوا میں اُڑتی نکل جائے تو بچے دوڑ کر ماں کے پروں میں چھپ جاتے ہیں ☆ ہرن شکاری کو پہچان لیتے ہیں اور دہاڑ کی دہاڑ بھاگتی ہے۔ مچھلیاں بنسی کو پہچان کر پانی میں دور نکل جاتی ہیں؛ مگر انسان اکثر دھوکے میں مارا جاتا ہے۔ اور دھوکے میں اسے مزہ آتا ہے ☆ جانتا ہے کہ نفس کی خواہشیں بُری ہیں مگر نفس کی خواہشوں سے باز نہیں آتا۔ دیکھتا ہے کہ باپ دادا جو مرے کچھ ساتھ نہیں لے گئے مگر اسے جوڑنا ضرور۔ جوئے میں ہزاروں برباد گئے مگر جوا بند نہوا ع مارا ہے جوئے کے نام سے بیل ☆ شراب کی مذمت میں نبی ولی تمام دُنیا تھک گئی مگر کسی نے نہ مانا۔ کفر و دین کے جھگڑوں میں لاکھوں جانیں کام آئیں مگر ختم ہونا معلوم۔ تمام دُنیا دُنیا کو ناپائدار کہتی چلی آئی مگر جہانتک ہوسکا ہر شخص قیامت اور قیامت کے بعد تک کی فکر میں رہا ☆

قیامت اور قیامت کے وعدے برحق خاص کر جنت میں عیش و آرام اور حور و غلمان کے وعدوں کا کیا کہنا مگر مرتے وقت انسان کو حور و غلمان سے زیادہ اپنے بال بچے یاد آتے ہیں۔ جسطرح حج میں خدا کا گھر دیکھکر ہمیں اپنا گھر یاد آتا ہے۔ بڑہاپے میں جوانی یاد آتی ہے اور خمار میں صبوحی کی سوجھتی ہے ☆

صبح محشر شد و افسانہ زلفش باقی است ☆ شب دریں قصہ بسر رفت و سخن ماندہ است

خم خانہ

محشرِ خیال

آشوبِ محشر ہست دلش نام کردہ اند — ایں قطرہ کہ شورشِ دریا گرفتہ است

محشر کی بڑی تعریف یہ ہو کہ قیامت میں بُرے بھلے چھوٹے بڑے امیر وفقیر گنہگار و بیگناہ اس کثرت سے میدان حشر میں جمع ہونگے کہ زندگی میں کبھی دیکھنے میں نہیں آئے۔

یہی حال بعینہٖ انسان کے دل و دماغ کا ہو کہ خدا جانے کیا کیا اس کے ذہن میں آتا ہو اور کیا کیا اُسے سوجھتا ہو۔

اگلے انشا پرداز مختصر عبارت کو جس میں مضمون زیادہ ہو اور الفاظ کم دریا کو کوزہ میں بند کرنے سے تشبیہہ دیتے تھے۔ دل و دماغ کی شورش کے لیے یہ تشبیہہ بھی خاصی ہے مگر مجھے محشر کی تمثیل زیادہ موزوں معلوم ہوتی ہے کہ جس طرح محشر میں خلوت ممکن نہیں شورِ محشر سے زیادہ انسان کے دل و دماغ میں خواندہ و ناخواندہ مہمانوں (خیالوں) کا ہجوم رہتا ہے۔ قیامت میں تو سب خواندہ مہمان ہونگے۔ زندگی میں جو خیال آتے ہیں بُلائے اور بے بُلائے سب کا ہجوم رہتا ہو۔ گویا مداری کا پٹارا ہی جس میں ہر طرح کے کھیل تماشے بھرے ہوے ہیں۔ اک محشرستانِ خیال ہو جو ہر وقت رات دن

اُٹھتے بیٹھتے چلتے پھرتے سوتے جاگتے بیار رہتا ہے۔ فرق اتنا ہے کہ حشر کا دن مُقرر ہے اور محشرِ خیال بیداری اور خواب میں ہر وقت دیکھ لیجئے۔ "بیداری و خواب" میں نے عمداً کہا کہ بیداری میں جو خیال آتے ہیں اس سے زیادہ خواب میں دکھائی دیتے ہیں۔ خواب میں اور کوئی دھندا تو رہتا ہی نہیں دماغ گویا فانوسِ خیال بن جاتا ہے:

خوابِ اجل کے آتے ہی بیدار ہو گئے ٭ غفلت سے ہم تو اور بھی ہشیار ہو گئے

حضرت یوسفؑ کی شہرت تعبیرِ خواب سے ہوئی اور عشقِ زلیخا کی بنیاد خواب سے پڑی۔ روزمرہ میں خواب و خیال کا ساتھ زباں زد ہے:

دیکھا تھا ایک روز کہیں اُن کو خواب میں ٭ محشر بھی ہو گیا ہے مگر آنکھ بند ہے (اللہ رکھی خیال)

دُنیا میں تو ہمیں زاہدانِ خشک کے ڈرانے سے کبھی کبھی محشر کا خیال آتا ہے۔ محشر میں دُنیا کا خیال نہ آئے تو تعجب ہے: جس طرح بڑھاپے میں جوانی یاد آتی ہے۔ جدائی میں ملاقات کی قدر ہوتی ہے۔ سفر میں گھر کا آرام یاد آتا ہے۔ حج میں خدا کا گھر دیکھکر ہمیں اپنا گھر یاد آتا ہے۔ محشر میں ہمیں زندگی کے لطف ضرور یاد آئیں گے:

اکبار اور میری عیادت کو آیئے ٭ اچھی طرح سے میں ابھی اچھا ہوا نہیں

والٹیئر نے افسانہ میں لکھا ہے کہ عرب میں ستی کی رسم اس طرح مٹی کہ ایامِ جہالت میں عورتیں جب زیادہ ستی ہونے لگیں تو ملک میں یہ قانون جاری ہوا کہ جو بیوہ ستی ہونیکا ارادہ کرے پہلے کسی نوجوان سے مل کر کامل ایک پہر باتیں کرے۔ سُنا ہے کہ پھر کوئی بیوہ ستی نہ ہوئی: سبب یہ کہ بیوہ کو شوہر کے ساتھ کے عیش یاد آ گئے ۔

مانا تمہارے دل میں کچھ ارماں نہیں مگر ٭ جاتی ہے بار بار یہہ نیچی نظر کہاں

ہم کو مرنے کے بعد ایک دن کے لئے بھی اگر میاں دنیا میں بھیجدیں تو پھر ہم کبھی جو محشر کا نام لیں تو گنہگار ے

ڈر ہے کہ وہ نہ طعنۂ آرام دے مجھے ٭ میں موت تک خدا سے کبھی مانگتا نہیں

زندگی کتنی ہی احتیاط سے بسر کی جائے آخر کو بیکار سی چیز معلوم ہوتی ہے۔ اور سمجھدار لوگ اسے بے معنی بتاتے ہیں: لیکن اسکی بے کاری ہی اس کی دلچسپی کی خاص وجہ ہے کہ جسطرح بچوں کا دل ایسی کہانیوں میں زیادہ لگتا ہے جن کا کچھ نتیجہ نہ ہو۔ یعنی بے معنی و بیکار ہوں۔ یہہ تمثیل بھی والٹیر کے صادق نامی افسانہ سے لیگئی جس کا ریویو پائنیر میں شایع ہوا ہے۔ زندگی خراب جاننے اگر نقصان ہے تو جسم کا کہ فنا ہو جائے گا۔ موت سے جسم و روح دونوں کا نقصان ہے کہ روح مُفت میں خراب جاتی ہے: ایک قصور میں دو کو سزا اسلئے انصاف کا خون ہے۔ یہ تیسرا مارا گیا (یعنی انصاف) ے

محشر بپا ہے رخصتِ لیلےٰ میں قیس پر ٭ یہہ صور پھُنک رہا ہے صدائے درا نہیں

گر جُور ہو اتنا تو ترحّم بھی ہو یاں تک

پوشاک کو رنگیں بھی تو خونِ شُہدا سے

حشر کی طرف سے مجھے جہاں اور شکایتیں ہیں ایک یہ بھی ہے کہ اسکا وقت مقرر نہیں حشر سے گھبرانے کی کوئی بات نہیں: تکلیفِ انتظار مارے ڈالتی ہے ٭ یار کا وعدہ پورا ہو یا نہو

ے پائنیر ۲۰ ستمبر ۱۹۲۳ء

انتظار کی

انتظار کی تکلیف قیامت کا سامنا ہے۔ محشر اگر خوفناک چیز ہے تو ع کل جو آنی تھی آج ہی آئی ہوتی
اور اگر آرام و آسایش کی امید ہے تو ے

یہ مانا ہم نے کہ اب حشر کو ملو گے تم ؛ مگر یہ بات تو کہہ دو کہ عنقریب بھی ہو

دیکھا گئے وہ دار پہ ہم کو کھچا ہوا
مرنیکے بعد ہم بھی طرحدار ہو گئے

"کھچا" خوب کہا کہ تصویر بھی کھچتی ہے جسے لوگ دیکھا کرتے ہیں ؛

رہا پھر وہی محشر کا خیال۔ اگر محشر نہیں جیسا کہ بدھ، جین اور غیر مذاہب والوں کا خیال ہے تو ایک نہ ایک طرح کا تناسخ ارواح کا عقیدہ ذہن میں آتا ہے ؛ اس میں کچھ ایسی بڑی تسلی نظر نہیں آتی : میری نگاہ میں تو یہہ انسان کا پردہ ڈھکنا ہے۔ روح گویا عیب سے مشابہ ہوئی کہ دوسرے قالب میں جانے سے اس کا پردہ ڈھک گیا ؛ اس سے تو محشر ہی کا عقیدہ اچھا ہے کہ چاہنے والوں کی معراج کوچۂ جاناں میں جان دینا ہے ؛

محشر کا حال میں اُس سے پوچھا چاہتا ہوں جو بتا دے کہ پروانہ شمع پر کیوں دوڑتا ہے ؟ اگر روشنی پر مرتا ہے تو آفتاب سے مُنہ کیوں چھپاتا ہے ؟ حربا (گرگٹ) آفتاب میں کیوں رنگ بدلتا ہے ؟ چکور چاند کی طرف کیوں دوڑتا ہے ؟ حالانکہ اور مرغان چمن سورج کو دیکھ کر چہکتے ہیں۔ سورج مکھی کا پھول سورج کے ساتھ کیوں پھرتا ہے ؟ قطب نما کا مُنہہ اُتر ہی کی طرف کیوں رہتا ہے ؟ چکوہ چکوی رات کو کیوں جُدا ہو جاتے ہیں ؟ نیولا سانپ کی جان کا دشمن کیوں ہے ؟ سیماب کی بیقراری کا کیا سبب ہے ؟ ایسی ہی لاکھوں باتیں ہم دیکھ رہے

ہیں اور سمجھ میں نہیں آتیں ۔ سائنس نے عالم اسباب کی چند باتیں سمجھائیں مگر سب کے ذہن میں نہ آئیں۔ آپ کے ذہن میں اگر آگئیں تو میرے ذہن میں کیوں نہ آئیں؟ جبکہ میری اور آپ کے ذہن کا صانع ایک ہی تھا۔ جب مجھے اپنی زندگی کے اسرار سے بے خبری ہے زندگی کے بعد کا حال بیان کرنے کا دعوے ضرور مجھے زیب دیتا ہے؟

تُرا بالائے جسم و جاں مقامے دادہ اندای دِل ۔ مکن در جسم و جاں منزل کہ ایں دونست آں والا

درونِ اہلِ عرفاں نیست جائے دینی و عقبے

قدم زیں ہر دو بیروں نہ اینجا باش نے آنجا

فرمائشی مضمون

بعض اصحاب مجھسے دریافت کرتے ہیں کہ جس خاص موضوع پر مضمون لکھوانا پسند ہو وہ بتادو۔ اُن سے عرض ہے کہ جو مضمون مجھے درکار ہیں یہ ہیں:-

(۱) اور زبانوں کی شاعری سے اپنی زبان کی شاعری کا مقابلہ۔ اپنی سے مراد جس زبان کو آپ پسند کریں اس طرح کہ فارسی کا عربی سنسکرت و ہندی سے۔ یا عربی کا اور زبانوں سے یا ہندی کا اور زبانوں سے علیٰ ہذا القیاس ۔ آپ کسی زبان کے وکیل بن جائیں اور اُسکی طرف سے اور زبانوں سے مقابلہ کریں ۔ مثلاً آنکھ کی تعریف عربی میں شاعروں نے اسطرح لکھی ہے اور دیگر زبان والوں نے اسطرح تمثیل میں چوٹی کے شعر ہوں: معمولی کلام بیکار ہے ۔

(۲) شعراء زبانِ اُردو میں یہ دیکھنا منظور ہے کہ ایک مضمون مثلاً حیا و شرم کا مضموں متقدمیں نے یوں باندھا اور متاخرین نے یوں ۔ اساتذہ میں وہی مضمون ایک اُستاد نے اسطرح باندھا اور دوسرے نے اسطرح

"بیانِ واقع"

یہ تاریخ فارسی میں مُلا عبدالکریم کشمیری نے اپنے سفر کے حالات میں نادرشاہ کے زمانے میں لکھی۔ مُصنّف کو دعوے ہے کہ ع قلندر ہرچہ گوید دیدہ گوید۔ اس تاریخ میں زیادہ تر اُنہیں حالات کا ذکر ہے جو مُصنّف نے بچشم خود دیکھے۔ نادرشاہ کے حال میں اکثر تاریخیں مُشکل و مُجمل لکھی گئیں۔ دُرّہ نادرہ تو مُشکل کا نمونہ ہے اور مجمل ذکر ہر تاریخ میں موجود ہے۔ "بیانِ واقع" میں نادرشاہ کا حال بہت صاف اور مُفصّل ہے۔

نادر کا نام دراصل نادر قُلی بیگ تھا۔ اس کا خاندان خوش حال لوگوں میں نہ تھا۔ طہماسپ شاہ بادشاہ نے نادر قلی بیگ کو اس کے حُسنِ خدمات کے صلہ میں طہماسپ قلی خاں کا خطاب دیا۔ اور لوگ "خانِ بزرگ" بھی کہتے تھے۔ اور جب طہماسپ قلی خاں کو ایران کی سلطنت نصیب ہوئی تو اس نے اپنا نام نادرشاہ رکھا اور نادرالسلطان بھی کہتے تھے۔ اور ہندوستان فتح کرنے کے بعد شاہ شاہاں لقب ہوا ؎

تارپود سے قطبک امسال گشتی قطب دین ۔ سال دیگر گر بمانی قطب حیدر میشوی

ہندی مثل ہے: مایہ کے تین نام۔ پرسا۔ پرسو۔ پرس رام ؎

اولیں حجام بودم بعد ازاں گشتیم شیخ ÷ غلہ گر ارزاں شود امسال سید میشوم

نادر شاہ کی تخت نشینی کی تاریخ ہے ؎

بریدیم از مال و از جان طمع ÷ بتاریخ الخیر فی ما وقع (۱۱۴۸ ہجری)

اس تاریخ یعنی بیان واقع سے اور ذکر چھوڑ کر میں نادر شاہ کے ہندوستان پر حملہ کرنے خاصکر دلی کے قتل عام کا ذکر کیا چاہتا ہوں ÷

یوں تو دلی (دہلی شاہ جہاں آباد) قدیم زمانہ سے بمقابلہ اور مشہور شہروں کے مورد آفات رہی لیکن جس قدر زیادہ آفتیں اس پر آئیں اسی قدر بصورت شمع یہ سر اٹھائے رہی۔ سب سے بڑی آفتوں میں نادر کا دہلی کا قتل عام تھا ÷

نادر کے دہلی میں داخل ہونے کے بعد تیسری رات کو شہر کے آوارہ لوگوں نے خبر اڑائی کہ واہ رے محمد شاہ! نادر شاہ کا خوب کام تمام کیا! اس خبر کے مشہور ہوتے ہی شہر کے لوگوں نے قزلباش سپاہیوں کو قتل کرنا شروع کر دیا۔ نادر شاہ کے لشکر کے سپاہی یہ سمجھکر کہ نادر شاہ مارا گیا گھبرا گئے۔ بلکہ تعجب اسبات کا ہے کہ نادر شاہ کے مسلح سپاہی دلی کے عوام بازاری لوگوں کے ہاتھ سے قریب تین ہزار کے جان سے کس طرح مارے گئے؟ آدھی رات کے قریب نادر شاہ کے اہلکاروں نے نادر شاہ کو سپاہیوں کے مارے جانے کی اطلاع کی ÷ مورخ کا بیان ہے کہ "سلطان معقول پسند" یعنی نادر شاہ نے غصہ ہو کر کہا کہ یہ فقرہ میرے لشکر کا ہے تاکہ دلی والوں پر بہتان لگا کر شہر کو لوٹیں ÷ لیکن جب پے در پے یہی خبر پہونچی تب نادر شاہ نے متفکر ہو کر اپنے معتمد افسروں میں سے ایک افسر واسطے تحقیق حال کے بھیجا۔ یہہ

بیچارہ قلعہ سے باہر نکلتے ہی قلعہ کے دروازہ پر شہر والوں کے ہاتھ سے مارا گیا۔ دوسرا افسر بھی جو اس تحقیق کے لئے آیا وہ بھی شہر والوں کی نذر ہوا۔ اسی طرح اور بہی ع آنرا کہ خبر شد خبرش باز نیامد۔ آخر کو نادر شاہ کو جب قرائن سے اس فساد کا یقین ہوگیا اُس وقت حکم دیا کہ ہزار سوار قلعہ سے باہر نکل کر مفسدوں کو پراگندہ منتشر کردیں۔ اس کی تعمیل ہوئی مگر پھر بھی جیسا چاہیئے امن کی صورت نظر نہ آئی۔ پہر رات باقی رہی تھی کہ فی الجملہ اطمینان ہوا۔ لیکن صبح ہوتے ہی پھر اُسی طرح فساد ہوگیا۔ یہانتک کہ ۳-۴ گھڑی دن چڑھے نادر شاہ خود سوار ہوکر قلعہ کے باہر آیا اور نواب روشن الدولہ کے مدرسہ (مسجد) میں جو کوتوالی چبوترہ کے متصل ہے آکر تین ہزار سواروں کو حکم دیا کہ دلی والوں کو جہاں ملیں جان سے مار دیا جائے اور شہر کو جس طرح کہ لازمۂ بے رحمی و سخت دلی ہے لوٹ لیا جائے ؎

فتادند در شہر خیلِ مغل ۔ برافتاد بنیاد ہندی بکُل ۔ بہ قتل و بغارت کُشادند دست

سراسر سراں حملہ کردند پست

چنانچہ چار گھڑی دن رہے تک قتل عام جاری رہا اور وہ اوباش و مفسد جو باعث فساد تھے رات کی طرح غائب ہوگئے اور شہر کے بیگناہ و شریف بیچارے مارے گئے اور تباہ ہوئے۔ کوتوال شہر کی تحقیق سے معلوم ہوا کہ شہر کے آٹھ ہزار آدمیوں کے قریب مارے گئے۔ اور زر و مال جو بادشاہ کے سپاہیوں کے ہاتھ لگا اُس کا حساب مشکل ہے: کیونکہ یہ فساد گو قلعہ کے قریب مقاموں میں واقع ہوا مگر دور کے محلہ والوں نے قلعہ کے قریب مقاموں کو زیادہ محفوظ سمجھکر اپنا مال و اسباب قلعہ کے متصل رہنے والوں کے ہاں رکھوا دیا تھا۔ یہیں

صرافوں جوہریوں اور بڑے بڑے سوداگروں کی دکانیں اور مکان تھے۔ یہاں سے اس کثرت سے مال و اسباب مغلوں کو لوٹ میں ملا جس کا لیجانا اور اٹھانا مشکل ہوگیا اور چونکہ قتل عام کے ساتھ گھروں میں آگ لگادی گئی ہزاروں ہندو مسلمان زندہ و مردہ جل گئے۔ اگر یہ ہنگام شام تک رہتا تو ایک آدمی دلی کا نمونہ کے طور پر بھی دکھائی نہ دیتا۔ کہا جاتا ہے کہ نادرشاہ کی نیت اس قدر قتل و غارت کی نہ تھی لیکن فساد میں مفسد و بے گناہ کا امتیاز ناممکن ہے۔ اور بغیر سختی کے نادرشاہ کا اس قدر رعب اہل ہند پر نہ ہوتا: کیونکہ اس قتل عام سے پہلے دلی والے خاصکر بازاری نادرشاہ کے سپاہیوں پر جو اکثر دہقانی تھے ہنستے تھے۔ اس قتل سے شہر والوں پر نادرشاہ کے لشکر کا بہت رعب غالب آگیا: دوسرے۔ اس قدر زر و مال و اسباب مغل سپاہیوں نے خواب میں کبھی نہ دیکھا تھا جو لوٹ میں ہاتھ لگا تو پھر تمام شہر سے اسی قیاس پر مطالبہ وصول کرنا شروع ہوگیا۔

اُن محلّوں کی تفصیل جو اس بلا میں گرفتار ہوئے یہہ ہے:۔

حدود غربی۔ بادشاہی قلعہ کے دروازہ سے پرانی عیدگاہ تک: دلسوے شمال تا منڈوی چوب (لکڑیوں کی ٹال): و بجانب جنوب۔ دہلی دروازہ کے باہر شہر پناہ تک: اور پہاڑ گنج[سلہ] سے کہ اصل فساد یہاں سے شروع ہوا تھا۔ کثرت سے بہت آدمی فساد کے شبہہ میں گرفتار ہو کر جمنا کے کنارے گردن مارے گئے۔

سلہ میں جانتا ہوں کہ اب جہاں پہاڑ گنج مشہور ہے یہ نہ ہوگا۔ کالی مسجد اور جامع مسجد کے متصل جو محلّے بھوجلا پہاڑی وغیرہ کے نام سے مشہور ہیں شاید یہ ہوں۔ کیونکہ آج کل کے پہاڑ گنج سے یہ پہاڑی محلّے قلعہ کے قریب ہیں۔

قصہ کوتاہ۔ ڈیرہ پہر دن رہے محمد شاہ نے شہر والوں کی جان بخشی کی سفارش کی

کسے نماند کہ دیگر بہ تیغ ناز کشی ٭ مگر تو زندہ کنی مُردہ را و باز کشی

کہتے ہیں کہ یہہ امر عالم کے عجیب و غریب امور میں سے ہے کہ خونخوار سپاہی جو اس قدر قتل و غارت میں مصروف تھے ایک آواز سے امان کی فوراً قتل و غارت سے رک گئے ٭

یہ تاریخ میرے پاس قلمی ہے۔ مجھے یقین نہیں کہ ابھی کہیں چھپی ہو: اتفاق سے میرا قلمی نسخہ اخیر میں ناقص ہے اگر کسی صاحب پاس کامل ہو تو براہ کرم مجھے مطلع فرمائیں تو یہہ تاریخ چھاپ دیجائے کیونکہ "بیان واقع" سے نادر شاہ اور محمد شاہ کے زمانہ کا اکثر حال معلوم ہوتا ہے

لسان الملک حضرت ریاض

وہ کوسنا مجھے اُنکا مراد پا دینا	بڑے نہ بات یہ ہے آگ کو ہوا دینا	کہاں اُڑیگی نہ زاہد کو کچھ پتا دینا	چمن میں آئے تو رندو ہوا بتا دینا
تمہارے کوچہ میں کچھ طور دل لے بیٹھے ہیں	ذرا تم آکے لب بام مسکرا دینا	بلا ہی قبر کی شب ہے بڑہ کے حشر کا دن	نہ آؤں ہوش میں اتنی مجھے پلا دینا
رہیگا یاد مجھے بھی اُنہیں بھی وصل کی شب	وہ انکے ہار کی کلیوں کا مسکرا دینا	مزا ہو تنگ جو خانقہ میں شیخ بیٹھے	بڑا سا خم کوئی رندو گلے لگا دینا
نہ لالہ زار بنا مزار کو نہ سہی	چراغ آکے کبھی شام کو جلا دینا	ہزار بار میں اس التفات کے صدقے	ہمیشہ داغ مرے دل کو لگا دینا
کریں وہ اور بھی پامال خون شدہ دلکو	گلی میں جاکے حنا اور تو لگا دینا	ہزاروں عیب چھپاتی ہے میری ریش دراز	چرائے کوئی غم سے مجھے بتا دینا
مرے سوا نظر آئے نہ کوئی دوزخ میں	کسی کا جرم ہو مالک مجھے سزا دینا	چمک ہی میں لگا ہو نہیں بجلیاں ہیہم	حریم ناز سے پردہ ذرا اُٹھا دینا
جہاں تہاں بہت آنے لگا ہے منہ واعظ	زرا اُسے کہیں رندو مزہ چکھا دینا	سنا ہے ہم نے بہت کچھ کلیم کے منہ سے	ہم آئیں تو ہمیں آواز ہی سنا دینا
زبان ہو بند مری تو بھی کروں میں توبہ	دم اخیر مجھے بادہ جاں فزا دینا	حرم ہی جائے اور کام دیکی جنت میں	فرشتو طاق سے بوتل ذرا اُڑا دینا
گراں ہو تو بہ کو مینا کا شور قلقل بھی	یہ غل مچائے تو اس کا گلا دبا دینا	نہ روکے طور تو ہم جائیں عرش سے آگے	ہماری راہ سے پتھر ذرا ہٹا دینا
	شراب ناب سخن کا یہ دور آخر ہے	غزل ریاض کی یارو انکو تم سنا دینا	

(از اخبار دسٹرکٹ گزٹ گونڈہ)

An Autobiographical Memoir of Louis Bourqien.

لوئیس بورکین

کے خود نوشتہ حالات

یہ حالات فرانسیسی زبان سے انگریزی میں آنریبل جے پی طامس صاحب بہادر نے ترجمہ کئے + یہ شخص سلطنت مغلیہ کے اخیر یعنی زوال کے زمانہ میں ہندوستان میں آیا۔ یہاں آکر دولت راؤ سیندھیا کے لشکر میں مرہٹوں کی فوج کا معزز افسر ہوا۔ مرہٹوں کے اقبال کے زمانہ میں فرانسیسی اور انگریزی حکمرانوں میں جو کارروائیاں پیش آئیں اُن میں یہہ شریک رہا ٭ اس کی رائے میں فرانسیسیوں کی ہندوستان میں بد اقبالی کا باعث جنرل پیراُن تھا ٭

مجھے فرانسیسی عروج و زوال سے غرض نہیں۔ لیکن اُس وقت کے اکثر حالات جو معمولی تاریخوں میں نظر نہیں آتے انکا پتہ لوئیس بورکین کے خود نوشتہ تذکرہ سے چل جاتا ہے ٭

شمرو کی بیگم۔ ہندوستان میں اس شخص نے شمرو کی بیگم کی ملازمت اختیار کی اور چھ برس تک ملازم رہا ٭ سلطنت مغلیہ کے اخیر زمانہ میں شمرو کی بیگم کا تعلق دلی سے زیادہ رہا۔ قلعہ معلّے کے متصل آغاز چاندنی چوک میں بیگم کا باغ اور عالیشان کوٹھی تھی: اس کوٹھی میں ابھی حال تک دہلی لندن بنک کا دفتر تھا ٭ شاہ عالم بادشاہ کے دربار میں شمرو کی بیگم کا بڑا رسوخ تھا: بادشاہ کی طرف سے انکو ہمشیرہ عزیز لکھا جاتا تھا ٭ بورکین کا بیان ہے کہ شمرو (دراصل سومبر) جرمنی کا باشندہ تھا اور بیگم نکاح سے پہلے شمرو کی لونڈی تھی ٭ بیگم کے قبضہ میں گیارہ لاکھ روپے کی جاگیر وسیع علاقہ تھا ٭

جاری

جارج طامس نامی (ایک انگریز) کی بیگم کے مزاج میں بڑی رسائی تھی۔ تیں سال تک سارا اختیار جارج طامس کا رہا۔ یہاں سے نکل کر اس شخص نے ہانسی حصار کے علاقہ میں اپنی حکومت علیحدہ قایم کی[1]۔ جھجر کے پاس جہازگڈہ نامی ایک مقام اس کے نام سے مشہور ہے۔ (جہازگڈ ضلع رہتک میں واقع ہے۔ یہاں ایک بڑا میلہ مویشی کا ہوتا ہے۔ جہازگڈہ کے رئیس اعظم ریاست جودہ پور کے ٹھاکر ہیں۔)

اس مضمون سے میں ایسے معاملات کا اقتباس کرنا چاہتا ہوں جن کا تعلق کم وبیش دہلی اور نواح دہلی سے ہے۔

شاہ عالم بادشاہ دہلی۔ بورکین نے لکھا ہے کہ سترہ دن کے محاصرہ کے بعد دہلی کا قلعہ ہمارے ہاتھ آیا اور ایک مہینہ تک قلعہ کا انتظام میرے اختیار میں رہا۔ بہ حیثیت افسری قلعہ معلّےٰ میں شاہ عالم بادشاہ کا محافظ قرار پایا جنکو مادھوجی سیندھیا نے گویا پھر بادشاہ بنایا تھا۔ میرے فرائض منصبی میں نہایت اہم فرض زندانِ "سلاطین" کی نگرانی کا کام تھا۔ زندانِ "سلاطین" میں بادشاہ کے بیٹے اور عزیز و اقارب شمار میں پانسو ممبران خاندان شاہی معہ عیال و اطفال کے محبوس بطور نظربند کے تھے۔ ازروئے رسم سلطنت بادشاہ کو نو[2] بیگمیں نکاحی جائز ہیں۔ حرموں کی تعداد کا مدار بادشاہ کی مرضی پر ہے۔ تین سو چار سو تک حرموں کا اختیار ہے۔ شرعی منکوحہ بیگم سے بڑے بیٹے کو سلطنت کا حق پہونچتا ہے۔ بادشاہ کے بعد بادشاہ کا بڑا بیٹا تخت نشین ہوتا ہے۔ تخت نشین فرزند کے بال بچے رہا ہو جاتے ہیں باقی بدستور زندانِ "سلاطین"

---

[1] اپنے نام کا سکّہ چلایا۔　[2] تعداد میں ۹ نکاحی بیگموں کی شرط کا ثبوت مجھے نہیں ملا۔

میں مقید رہتے ہیں ۔ مجھے حکم تھا کہ میں ان "مقید سلاطین" کی سخت نگرانی رکھوں۔ ان کی ہر حرکت کی رپورٹ روزمرہ صبح کو میرے پاس پہونچ جائے۔ یہانتک کہ بادشاہ بھی اگر کچھ انہیں لکھیں تو پہلے میں دیکھ لوں اور گورنمنٹ (مرہٹہ) کو اطلاع کردوں۔ جو بات قابل اطلاع ہوتی میں جنرل پران کے پاس بھیجدیتا ۔ قلعہ کے دروازوں پر جو پہرہ چوکی کے ملازم و محافظ تھے اور یہ ہر شخص کی جو اندر جائے یا باہر آئے تلاشی لے لیتے تھے ان کے سوا خواجہ سرا بھی مقرر تھے جو پردہ کی سواریوں کو دیکھ لیتے تھے تاکہ کوئی تحریر یا شبہہ کی بات دشمن کے متعلق وقوع میں نہ آئے ۔

بادشاہ جو نابینا ہیں محل کے باہر کبھی نہیں نکلتے۔ صرف قلعہ کی مسجد یا شہر کے قریب کی مسجد کو نماز کے لئے جاتے ہیں ۔ ایسے موقعوں پر بادشاہ اور بادشاہزادوں کے ساتھ سوار اور پیادوں کے ہمراہ میں خود جاتا ہوں کہ کوئی نکل نہ جائے ۔

(کم و بیش ماخوذ از تحریر لوئیس بورکین)

ریاست جھجر کی نسبت لکھا ہے کہ جھجر اُس علاقہ کا شہر ہے جو جارج طامسن صاحب نے اپنے لئے اپنی قوت بازو سے پیدا کیا ۔ والی جھجر نے شکر کی سو گاڑیاں زبردستی لوٹ لیں۔ میں نے بہت چاہا کہ واپس آجائیں مگر والی جھجر نے نہ مانا ۔ جھجر میں تین ہزار آدمیوں کا لشکر تھا۔ مگر میں نے پندرہ روز کے محاصرہ کے بعد جھجر فتح کرلیا ۔

جارج گڈھ ۔ جارج گڈھ کا قلعہ ریاست جودھ پور (مارواڑ) کے ماتحت تھا۔ یہ قلعہ ایک چھوٹی پہاڑی پر واقع ہے: اسکا محاصرہ سخت نکلا ۔ پانچ ہزار راجپوتوں نے تہیہ کیا کہ ہم نکلکر غنیم پر حملہ کرینگے

اور جان دیدیں گے - چنانچہ سات سو آٹھ سو راجپوت اس ارادہ سے نکلے اور سب کے سب تہ تیغ ہوگئے ؛ ہم دوسری طرف سے قلعہ میں داخل ہوگئے اور ایک گھنٹہ کے قتل و غارت کے بعد جارج گڈہ فتح ہوا ؛ قلعہ کی فوج میں سے جو زندہ رہے وہ آزاد کردئے گئے ؛

ہندوستان کے ضوابطِ جنگ میں رسم ہے کہ جو لوگ جنگ کا خرچہ ادا کرنے کی حیثیت رکھتے ہوں وہ قید کرلئے جاتے ہیں باقی معہ اپنے سامانِ اسلحہ کے رہا کردئے جاتے ہیں

یہ رہا شدہ سپاہی فاتح کا اچھا سلوک دیکھکر فاتح کی ملازمت اختیار کرلیتے تھے -
اس صورت میں فاتح کا لشکر ہر فتح کے ساتھ بڑہتا چلا جاتا تھا ؛

ہانسی کے محاصرہ میں جارج طامس صاحب نے صُلح کرلی اور ڈیڑھ لاکھ روپیہ کی دولت کے ساتھ سرکار انگریزی کے علاقہ میں پہونچا دئے گئے - اسکے بعد صاحب موصوف نے بنگال میں ایک انگریزی میم صاحبہ سے شادی کرلی اور شادی کے تین مہینے کے بعد انتقال ہوگیا ؛

یہہ شخص نہایت عجیب کمال کا تھا کہ محض اپنی قوت بازو سے ایک خاصی حکومت قایم کی اور سکہ چلایا - ان کی خط و کتابت سے جو حکام انگریزی سے رہی ثابت ہوتا ہے کہ ان کا قصد تھا کہ بہت جلد تمام ہندوستان کو فتح کرکے گورنمنٹ انگریزی کے حوالہ کردیا جائے یہہ بات ممکنات میں تھی کہ صاحب موصوف کے طرفدار اکثر والیان ملک و امراء ہند تھے ؛ یہہ شخص واقعی بڑے حوصلہ کا گذرا ہے ؛

پنجاب - صاحب تذکرہ اپنا تعلق پنجاب سے اس طرح بیان کرتے ہیں کہ پنجاب کے

رئیسوں نے اپنے مُلک کی مال گذاری وصول کرنے کے لئے مجھے بلایا۔ چنانچہ میں نے سات لاکھ روپیہ وصول کرکے جنرل پران کے پاس پہونچا دیا ؛ اس وصولی کی وجہ سے میں دریائے ستلج تک پہونچگیا جو مواجہ صوبجات لاہور و کشمیر کے ہے ؛ یہان کے چار ہمسایہ والیان ملک نے اُن کے علاقہ کی مال گذاری وصول کرنے کے لئے مجھے مدعو کیا۔ ان میں راجہ تارا سنگھ کی عمر اس وقت نوّے برس کی ہے ؛ راجہ کا مُلک دریائے ستلج کے دونوں کناروں پر دریائے سندھ تک پہونچتا ہے۔ راجہ نے اپنے مُلک کی مالگذاری وصول کرنے کے واسطے چالیس لاکھ روپیہ مجھے دینے کہا ؛

اس کے بعد بورکین اپنے اقبال کی تعلیاں لیتے ہیں۔ اور تعلیوں کے بعد اپنے زوال کا ذکر کرتے ہیں اور زوال کا باعث جنرل پران کو سمجھتے ہیں ؛

(ماخوذ از تذکرہ لوئیس بورکین مترجمہ آنریبل جناب۔ جے پی۔ طامس صاحب بہادر۔ مطبوعۂ رسالہ پنجاب ہسٹاریکل سوسائیٹی)

مختصر عرض

صلائے عام جب سے دوبارہ جاری ہوا ہے عشق زلیخا کی طرح خدا نے اسے دوبارہ جوانی بخشی ہے بلکہ پہلے سے زیادہ خوبیاں جمع ہو رہی ہیں : ترقی کے اسباب روز بروز ترقی پر ہیں۔ چڑھتے چاند کی طرح سامنے آتے جلتے ہیں ؛ اہتمام میں کوئی وقیقہ فروگذاشت نہیں ہوتا۔ مضامین اس کثرت سے آرہے ہیں جنکا وقت پر نکلنا مشکل ہو رہا ہے : میں زیادہ لکھنے کا ارادہ کر رہا ہوں اور مضمون نگار بھی زیادہ لکھ رہے ہیں ؛ یہ عرض اس لئے ہے کہ

اکبر کی مذہبی تحقیق

اکبر بادشاہ کی جہاں انتظام سلطنت کی تعریف ہے وہاں اُن کے مذہبی خیالات کی طرف انہماک کا بھی ذکر اکثر سنا گیا۔ لکھا ہے کہ بادشاہ نے اکثر مذاہب کے عُلما و فُضلا دور دور سے بلا کر اپنے دربار میں جمع کئے اور اُن سے مذہبی بحث مباحثہ رہتا تھا۔ غیر مذاہب کے عالموں میں پنڈت۔ سکھ گرو۔ پارسی۔ یہودی۔ عیسائی اپنے اپنے مذہب کی صداقت میں بادشاہ کے سامنے دلیلیں پیش کرتے اور اپنے عقاید کی خوبیاں بیان کرتے تھے۔ عیسائی مذہب کے علما میں فادر مانسٹریٹ صاحب ایس۔ جے کا روزنامچہ اکبر بادشاہ کے دربار کا مشہور ہے۔ پادری صاحب نے یہہ روزنامچہ لاطینی زبان میں لکھا تھا جس کا ترجمہ ابھی حال میں انگریزی زبان میں ہوا[لہ] اس مضمون کا مسالہ زیادہ تر اس ترجمہ سے لیا گیا ہے۔

مذہب کے معاملہ میں اکبر کا ڈھنگ مزاجِ یار کا سا تھا کہ ایک وضع پر قائم نہ رہا۔

لہ *Translated from the original Latin by J. S. Hoyland, M.A., Hislop College, Nagpur, and annotated by S. N. Banerjee, M.A., Professor of History, Mahindra College, Patiala.*

کبھی تو یہہ حسن عقیدت کہ پیادہ پا اجمیر شریف کی زیارت کو جانا - حضرت سلیم شاہ چشتی رح کے ہاں جہانگیر کی ماں کو بھیجدینا کہ جہانگیر کی ولادت وہیں ہو - کبھی غیر مذاہب کے بزرگانِ دین کا معتقد ہونا - کبھی اپنے تئیں پجوانا - پارسیوں کے اثر سے آفتاب کی پرستش اور آتش پرستی پسند کرنی - بودھ مذہب کی تلقین سے کم و بیش ذبیحہ ناپسند کرنا : پادریوں کو گمان کہ بادشاہ اب عیسائی ہوتا ہے اب عیسائی ہوتا ہے - بلکہ صاحب روزنامچہ نے لکھا ہے کہ بادشاہ آپ پرتگیزی لباس میں ہم سے ملا اور شاہزادوں کو پرتگیزی لباس پہنایا :: اہلِ ہنود کی تقلید میں اکبر ماتھے پر قشقہ لگاتا تھا - اور مسلمانوں کو ڈاڑھی منڈانے کی تاکید تھی لباس میں جامہ و دستار کا شوق زیادہ تھا - اور کبھی اہلِ اسپین کی وضع :: کوئی نہیں کہہ سکتا کہ ایسے شخص کا عقیدہ کیا سمجھا جائے ؟

جو شخص جاہل ہو اور خود دینی کتابوں کے دیکھنے اور سمجھنے کی لیاقت نہ رکھتا ہو تو اہلِ غرض اُسکی سمجھ کے موافق اگر سمجھا دیں تو وہ اپنی سمجھ کے مواق مُرغی کی ایک ہی ٹانگ نہ سمجھ لے تو اور کیا کرے ؟ اکبر کو گھر کی عقل تو تھی ہی نہیں اوروں کی سمجھ پر چلتا تھا : یہہ بادشاہ کی خوش نصیبی تھی کہ انتظامِ مُلک میں اسے اچھے اچھے آدمی مل گئے ورنہ تمام سلاطینِ خاندانِ تیموریہ میں اکبر ہی جاہل رہ گیا ::

اکبر نے مذہب کا مسئلہ جی بہلانے کا مشغلہ سمجھ رکھا تھا - دینِ الٰہی کی ایجاد محض دل لگی تھی ورنہ کوئی مذہب ایسا نہیں جس کے ماننے والے اُسے خدا کی طرف منسوب نہ کرتے ہوں - مذہب کو خدا سے وہی علاقہ ہے جو بچّہ کو ماں سے ہے :: آپ کتنا ہی مذہب اور خدا سے

انکار کریں دونوں لازم ملزوم ہیں۔ ایک کا معتقد دوسرے کو ماننے بغیر رہ نہیں سکتا +

بہر حال پادری صاحب کو اُمید ہوئی کہ اکبر کو عیسائی مذہب سے رغبت ہے۔ ایسی رغبت بادشاہ کو بودھ مذہب۔ آتش پرستی سے بھی تھی ؛ جہالت کی وجہ سے اکبر کو ہر نئی چیز کا شوق پیدا ہوجاتا تھا۔ جس طرح بچے نئے کھلونوں کے سامنے پُرانے کھلونے پھینک دیتے ہیں۔ گو پُرانے زیادہ قیمت کے ہوں ؛ اکبر کی نگاہ میں اسلام "گھر کی مُرغی دال برابر" کے مصداق تھا۔ حالانکہ اسلام کے سوا اسوقت کے اور مذہب جن کا شوق بادشاہ کو ہوا سب اسلام سے پُرانے تھے : مگر اکبر کو اتنا علم کہاں کہ خود کتابوں سے تحقیق کر سکے۔ اہلِ غرض نے اسے دھوکے میں رکھا تھا

پادری فادر مانسیریٹ صاحب جن کو اکبر نے بلایا معمول سے زیادہ اسلام اور اور مسلمانوں کی طرف سے متعصب معلوم ہوتے ہیں۔ اپنے سفرنامہ میں شہر مانڈو کے ذکر میں ارقام فرماتے ہیں کہ

× × × × × "مسلمان جن کی خصلت دراصل وحشیوں کی سی ہے ایسی باتوں (آثار قدیمہ) کی تحقیق سے دلچسپی نہیں رکھتے۔ ان کی کتب تواریخ بہت کم اور غیر مستند ہیں۔ بڑھیوں کی کہانیوں سے بھری پڑی ہیں"[1] × × × × × × × × × × × × × ×

مسلمانوں کی طرف سے اس تعصب کا شخص اکبر کو مذہبی تحقیق سمجھانے آئے۔ حالانکہ پادری صاحب کو اسباب کی خبر نہیں کہ تواریخ ہی میں مسلمانوں کے کمال کی شہرت ہے اور آثار قدیمہ کی تحقیق بمقابلہ اور قوموں کے مسلمانوں میں زیادہ ہے ؛ یہ میں چُپکے سے کہا چاہتا ہوں کہ ان کے سفرنامہ سے تو پادری صاحب کی معلومات آج کل کے طفل مکتب سے زیادہ نہیں ؛ لکھتے ہیں کہ دربار

[1] صفحہ ۱۶

میں پہلی ملاقات کی ذرا دیر کے بعد بادشاہ نے پادری صاحب کو معہ انکے ہمراہیوں کے محل میں بلایا کہ انہیں اپنی بیگموں کو دکھائے[1]۔ جس شخص کو اصولِ اسلامی سے اس قدر لاعلمی ہو کہ پردہ کی تاکید سے بھی ناواقف ہو وہ تحقیق مذاہب کے لئے تشریف لائے۔ لکھا ہے کہ بادشاہ نے حضرت مریمؑ کی تصویر کا بڑا ادب کیا۔ تصویر کا ادب نہیں حضرت مریم کے نام کا ادب سمجھنا چاہئے۔ رہا اکبر کا حضرت عیسٰےؑ اور حضرت مریمؑ کو سجدہ کرنا۔ یہہ از روے عبادت ممکن نہیں: یوں تو صوفیائے کرام نے شطحیات کے طور پر خلاف شرع اکثر باتیں کیں جن کا تعلق مذہب سے نہیں۔ یہاں تک کہ مرشد کو سجدہ تعظیمی کا بھی پتہ چلتا ہے۔ معدن المعانی ملاحظہ ہو کہ حضرت جنیدؒ فرماتے ہیں لیس فی جبتی سوا اللہ۔ بایزید بسطامیؒ کا قول ہے ما اعظم شانی۔ علیٰ ہذا القیاس اور مشائخ کے شطحیات۔ دین و عقائد میں ان کی سند نہیں۔

میں اس بات سے بہت خوش ہوا کہ فادر مالسریٹ نے فارسی زبان کی تعریف لکھی ہے کہ زبان فارسی بہت پاکیزہ زبان ہے۔ فارسی الفاظ و محاورے عالمانہ و فلسفیانہ مضامین و تعلیم کے لئے بہت موزوں ہیں[2]۔

اُس وقت کے پادریوں کی خوش نصیبی تھی کہ مذہبی بحث مباحثہ میں ابوالفضل پادریوں کا طرفدار ہو جاتا تھا۔ اور اکبر ابوالفضل کا از روے عقاید بندہ تھا: رہے ابوالفضل کے عقاید یہ اُس وقت بھی اسلام میں مغالطہ اور فساد کا باعث سمجھے جاتے تھے۔ اس کا حال آپ منتخب التواریخ کے مُصنّف سے پوچھئے۔ بہر حال جہاں ابوالفضل۔ فیضی۔ اور ان کے والد ماجد شیخ مبارک کی چلے (کیوں کہ یہ زیادہ تر دہریہ اگر نہیں تو مہدوی تھے) وہاں عقائدِ اسلام کی خیریت

[1] صفحہ ۲۰ [2] صفحہ ۹۴۔

سمجھئے۔ یہ لوگ علانیہ اسلام کے سوا ہر مذہب کی ترویج میں سرگرم تھے اور اکبر ان کے زیر اثر تھا۔ یہ لوگ پہلے سے پادریوں سے مل لیتے تھے یا پادری ان سے مل لیتے تھے اور ملی بھگت ہونے سے مذہبی بحث میں علماء اسلام سے ظاہرا بازی لے جاتے تھے۔ اس کی قلعی کھلجانے سے یہ مذہبی مباحثے چند روز کے لئے بند ہو گئے۔ ابوالفضل کے مکر کا ثبوت پادری صاحب کے اس فقرہ سے ملتا ہے کہ:- × × × × × × × × × × × ×

ابوالفضل عیسائی مذہب کی طرف اس قدر راغب تھا کہ جب عیسائی عبادت[1] خانہ میں آتا تو کہتا کہ میرے دل میں بہت اثر پیدا ہوتا ہے اور جب مسجد میں جاتا ہوں تو یہ بات پیدا نہیں ہوتی۔

اس میں شک نہیں کہ اکبر اور اکبر کے امرا و مصاحب پادریوں سے نہایت اخلاق اور تملق سے پیش آئے جس سے پادری صاحب (مصنف روزنامہ) کو یقین ہوا کہ بادشاہ کو عیسائی مذہب سے محبت ہے اور آخر کو بادشاہ عیسائی ہو کر رہیگا۔ پادریوں نے عمداً اپنی جان کو دھوکے میں رکھا کہ حقیقت حال سے دھوکے میں دل کا خوش رکھنا قرین مصلحت ہے۔ (صفحہ ۱۸۴)

لیکن یہ اُمید ان کی بیکار گئی۔ آخر کو ثابت ہوا کہ بادشاہ کا یہ مشغلہ صرف جی بہلانے کا تھا: اکبر کو اپنا ایک مذہب علیحدہ قایم کرنا تھا۔ اس مذہب کا نام **دین آلٰہی** قرار پایا۔ اور اس میں اکبر کی پوجا لازمی ٹھہری[2]۔ یہ آپ کو معلوم ہے کہ اکبر ایک حرف پڑھا نہ تھا۔ جاہلوں کی طرح ہر مذہب کی باتیں کم و بیش اُلٹی سیدھی سن سنا کر اس کے ذہن میں یہ بات سمائی کہ ہندوستان ایسا ملک ہے جس میں نیا مذہب آسانی سے چل سکتا ہے۔ اس میں علمیت

---

[1] یہ عبادت خانہ بی بی مریم کی کوٹھی کے نام سے مشہور تھا۔ [2] صفحہ ۱۸۴ اور ۱۹۲

اور تحقیق عقائد کی ضرورت نہیں ؛ اکبر کی نگاہ میں کوئی مذہب کیوں نہ ہو محض ڈھکوسلا تھا۔ اسے اپنا خبط جو ابوالفضل اور ابوالفضل کی پارٹی کی صحبت سے پیدا ہوا کہ خود کو پُجوانا مناسب ہے پورا کرنا تھا ؛

خود پادری فادر مانسریٹ صاحب کی مذہبی تحقیق بچوں کے کھیل سے زیادہ نہ تھی۔ جو اعتراض پادری صاحب نے اسلام اور مسلمانوں پر کئے ان میں تعصب سے زیادہ ناواقفی ثابت ہوتی ہے ؛ ہاں یہ ضرور ہے کہ عام مسلمانوں کے مقابلہ میں پادری صاحب نے اسلام کی معاندانہ کتابیں زیادہ دیکھی تھیں۔ مسلمانوں نے کبھی عیسائی مذہب کی کتابیں نہ پہلے دیکھیں نہ اب دیکھتے ہیں۔ ورنہ پادری صاحب نے جو اعتراض اسلام پر اکبر کے سامنے کیے آج کل کے طفلِ مکتب اُن کا جواب دے سکتے ہیں ؛ اکبر کو جاہل سمجھ کر پادری صاحبوں کو اس قدر اعتراضوں کی جرأت ہوئی ورنہ اس سے زیادہ اعتراض اُن پر آ سکتے تھے ؛

مذہبی تحقیق کی رو سے تو پادری فادر مانسریٹ صاحب کی تصنیف محض بے کار ہے۔ ہاں اس وقت کے سفر کی چند باتیں اُن کے سفر نامے سے ترجمہ کرنے کے لایق ہیں ؛ کوئی صاحب اس کام کے لئے ہمت کریں تو معلومات کیلئے بہت مفید ہے ؛

اس کتاب سے پادری صاحب کے مزاج کی ایک خاص خصوصیت کا پتہ لگتا ہے جو یورپ کے اکثر قدیم مصنفوں میں پایا جاتا ہے کہ مذہب اسلام کو ذلت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ پادری صاحب نے اپنی اس تصنیف میں اسلام اور مسلمانوں سے خفگی میں دلیل کی بہ نسبت دشنام دہی سے زیادہ کام لیا ہے ؛ عیسائی مذہب کے عالم ہو کر مسلمانوں کے ساتھ اس قدر

درشت

درشت زبانی سے پیش آنا تعجب ہے * یہ درشت زبانی زیادہ تر پادری صاحب کی مذہبی و تاریخی ناواقفی پر محمول ہوسکتی ہے *

پادری صاحب مسلمانوں کو "ھاجرانی" کے نام سے تحریر کرتے ہیں کہ بی بی ہاجرہ جو حضرت اسمٰعیلؑ کی ماں تھیں دراصل لونڈی تھیں۔ اس سے اہانت منظور ہے کہ مسلمان لونڈی کی اولاد ہیں: حالانکہ ہمارا عقیدہ ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے جو قربانی خدا کے نام پر پیش کی وہ حضرت اسمٰعیل کی تھی *

پادری صاحب ہندوستان میں عیسائی بادشاہوں کی سلطنت بہت پرانی بتاتے ہیں کہ ہندو مسلمانوں سے پہلے ہندوستان میں عیسائی بادشاہ گذرے ہیں۔ یہ از روئے تاریخ میں نہیں کہہ سکتا کہ کس قدر صحیح ہے۔ اس کی صحت کا ثبوت پادری صاحب کے ذمہ تھا *

عقائد یونانیان قدیم

یونانیوں کی فلاسفی میں شروع میں خلا تھا۔ خلا سے دو چیزیں پیدا ہوئیں۔ زمین اور محبت یعنی مادہ و روح یا یوں کہئے کہ جسم و جاں * پہلا بچہ جو پیدا ہوا اُس کا نام آسمان قرار پایا۔ پھر سمندر اور پہاڑ کا وجود ہوا * دنیا میں تاریکی تھی۔ تاریکی کا نام رات ٹھہرا: اس کے توام دو بچے پیدا ہوئے یعنی روشنی و دن * اس کے بعد خواہش پیدا ہوئی * دنیا یکبارگی پیدا نہیں ہوئی۔ رفتہ رفتہ دنیا نے یہ صورت اختیار کی جو اب نظر آتی ہے * دنیا میں تین صورتوں کے اسباب ہیں۔ پہلے محض قوتیں۔ پھر دیبی دیوتا اور آخر میں انسان *

فلسفۂ یونان میں شل اور بت پرستوں کے قیاس کو دخل زیادہ تھا۔ قدیم یونانیوں میں مذہب فلاسفی دونوں ایک چیز تھے: برخلاف ان کے خدا پرستوں میں وحی والہام پر عقائد کا مدار ہے۔ فلاسفی سے تعلق نہیں *

امرؤالقیس کا ایک مشہور قصہ

اَلَا رُبَّ یَوْمٍ لَکَ مِنْھُنَّ صَالِحٍ ۔ وَلَا سِیَّمَا یَوْمٍ بِدَارَۃِ جُلْجُلٖ

مطلب تیرے کتنے ہی دن لطف کے اُن نازنینوں کے ساتھ گذر چکے ہیں خصوصاً اس تالاب والے جلسہ کا دن جسکا نام دارۃ جلجل ہے (کیا عیش کا دن تھا)

قصہ ایام عرب کی روایتوں میں یہ ذکر آیا ہے کہ شرجیل کی بیٹی عنیزہ امرؤالقیس کی بنت عم تھی۔ یہ اِس پر فریفتہ تھا وہ اسے منہ نہ لگاتی تھی۔ ایک دن قبیلہ کی کچھ ہم سن اور کم سن عورتیں دارۃ جلجل پر نہانے گئیں۔ یہ سب سے پیشتر وہاں پہنچ گیا اور چھپ رہا۔ اُنھیں عورتوں میں عنیزہ بھی تھی سب کپڑے اُتار اُتار کر پانی میں پاؤں لٹکائے کنارہ پر بیٹھی ہوئی تھیں۔ مگر اللہ ری نگاہ شوق ہر ایک کو وہم ہوتا تھا جیسے کسی نے چٹکی لے لی۔ پھر دیکھیں تو کوئی بھی نہیں ؎

چھپ چھپ کے بھی دیکھوں تو چبھی جاتی ہیں نظریں ۔ اتنی بھی نہ ہو طاقت دیدار کسی کی

شاہزادہ نے دور سے دیکھا کہ سب کی سب تالاب میں اُتر گئیں۔ اب یہ کمیں گاہ سے نکل کر گھاٹ پر آیا سب کے کپڑوں کو دبا کر بیٹھ گیا۔ قسم کھالی کہ جب تک برہنہ نکل کر سب کی سب میرے سامنے نہ آؤ گی اور اپنا حُسن بے پردہ نہ دکھاؤ گی میں کپڑے نہیں دینے کا معلوم ہوتا تھا کنھیا جی نے تالاب کے کنارے جنم لیا ہے گوالنوں کی چیزیاں دبائے بیٹھے ہیں۔ گوالنوں کا شرمانا لجانا آنکھ دکھانا ہاتھ جوڑنا پاؤں پڑنا کچھ اثر نہیں کرتا۔ عورتوں کو پانی میں پہروں گذر گئے۔ منت کے مقابلے میں حجت۔ تکرار کے جواب میں اصرار ایک عرصہ تک ہوتا رہا۔ آخر ان سب میں جو بہت ہی بے باک تھی تالاب سے نکل آئی۔ اس نے سر سے پاؤں تک

ایک نظر دیکھ کر کپڑے اس کے دے دیئے۔ پھر تو ایک سے ایک پری زاد اپنے حسن کا مرقع اپنے شباب کی تصویر دکھانے لگی ہر ایک اپنے ہی کپڑے انعام میں پانے لگی سب کے آخر میں غنیزہ مُنہ بنائے تیوری چڑھائے گردن جھکائے کوسنے دیتی ہوئی نکلی اُدھر یہ قطعہ زبان سے نکلا

قطعہ

عالم نور دکھاتا ہے تیرا جوشش شباب ٭ دو کنول پھر گئے بلور کے روشن ہو کر
سینہ آئینہ تھا اس میں اُبھر آئے جو حباب ٭ عکس مستی کا پڑا غنچۂ سوسن ہو کر

نازنین ساقد جیسے شاخ یاسمین اس پر شباب کا یہ عالم کہ ہر طرف سے اُبلا پڑتا ہے اس بیت میں تصویر کھنچی ہوئی ہے۔

کن کن نخروں کو قد نازک نے سنبھالا ٭ کس بوجھ کو موئے کمر یار نے کھینچا

پہلے سرو لب جو کی طرح ٹھٹکی گھڑی رہی آخر نگاہ شوق اپنا کام کر گئی چلی اور عجب انداز سے چلی

بیت

ہے اس کی ادا قاتل عالم دم رفتار ٭ تلوار لگا دی ہے نزاکت نے کمر میں

سر جھکائے تھی لیکن۔

مطلع

کبھی تیوری چڑھا کے دیکھ لیا ٭ اور کبھی مسکرا کے دیکھ لیا
مجھ پہ احسان ہوا نزاکت کا ٭ تو نے گر آنکھ اُٹھا کے دیکھ لیا

کنارِ آب سے آغوش مشتاق تک آنا ہر ہر قدم پر شرمانا شرما کر قدم اُٹھانا قیامت کر رہا تھا ؎

پھٹتے ہیں گریباں جو چلنے پہ صبا کے ٭ شاید یہ اڑا لائی ہے رفتار کسی کی

اس غزل میں یہی مضمون مسلسل آگیا ہے۔

غزل

بکھری ہوئی وہ کاکلِ خمدار کسی کی ؛ چھپی ہوئی وہ نرگس بیمار کسی کی
وہ جوشِ سخن لب سے عیاں وقتِ خموشی ؛ وہ موج تبسم دم گفتار کسی کی
یہ آنکھ جھکی پڑتی ہے وہ آنکھ ہی مرتی ؛ کس طرح خبر لے کوئی میخوار کسی کی
ابرو کے اشارہ سے نکلتا ہے یہ مطلب ؛ موت آئی ہے پڑجائیگی تلوار کسی کی
حسرت ہے جو دیکھوں تو کہیں ترچھی نگاہیں ؛ ہوجائیگی سینہ سے سناں پار کسی کی
عشوے تو اس آفت کے ہیں وارسی پہ اصرار ؛ اوپر نہ اٹھے آنکھ خبردار کسی کی
سو آرزوئے بوسہ کا خوں میں نے کیا ہے ؛ دیتی ہے خبر سرخی رخسار کسی کی
چورنگ کیے تیغ نگہ سے جگر و دل ؛ اور لطف یہ ہے آنکھ نہیں چار کسی کی

آخر وہ راہ شب وصل کی طرح کوتاہ ہوگئی خواہش دید اپنی مراد کو شیریں فرہاد کو پہنچی۔ عنیزہ نے کپڑے پہنکر پھر شکایت آغاز اور زبان ملامت و رازکی قلم بند گالیاں اور اسی وہ چند کوسنے دیئے شاہزادہ **انجم** مرحوم فرماتے ہیں۔

مطلع

پاؤں ہم اُن کے ایک بار پڑے ؛ کوسنے ہم پہ دو ہزار پڑے

تالاب کا کنارہ پریوں کا اکھاڑہ سب کی سب نہائی دھوئی نکھری چوٹیاں مشک و عنبر میں بسی ہوئی۔ کپڑوں میں بوئے نیاد و قرنفل گلے میں درع اور مجول اس پر جزع یمانی کی ہیکل۔ پازیب اور چھاگل اس پر لوٹتے ہوئے آنچل۔ کبھی سبزہ پر مشق خرام کبھی درختوں کے سایہ میں مقام بنی کندہ کی شہزادیاں یمن کی امیرزادیاں اس میدان میں غزالان صحرائی کی طرح کلیل کر رہی ہیں چوکڑی بھر رہی ہیں بستی سے ذرا جنگل میں آکر وہ لطف آزادی مل رہا ہے جس بدویت کے آگے مدینت کے ہزار عیش و آرام کو عرب بے حقیقت سمجھتا ہے کہ اس میں طرح کی بندشیں ہزار طرح کی پابندیاں سد راہ ہوجاتی ہیں۔ اور کوچیں کاٹ کر انسان کو کنج حسرت وناکامی میں قید کردیتی ہیں۔

وَيَوْمَ عَقَرْتُ لِلْعَذَارَىٰ مَطِيَّتِيْ
فَيَا عَجَبًا مِنْ رَحْلِهَا الْمُتَحَمَّلِ

مطلب جس دن میں نے دوشیزہ عورتوں کے لیے اپنے اونٹ کو نحر کیا تھا اور کیا اچھا معلوم ہوتا تھا کہ اس کا پالان وہ اپنے اوپر لادے ہوئے تھیں۔

قصہ تالاب پر پھرتے پھرتے سب کو بھوک بھی لگ آئی پیاس کی بھی شدت تھی امرؤالقیس کے ساتھ ایک مشکیزہ میں شراب تھی وہ سے آیا۔ کباب لگانے کے لیے اپنے اونٹ کو نحر کر ڈالا۔ ان سے کہا اب یہ پالان تمہیں کو لاد کر لیجانا ہوگا اور ایسا ہی ہوا۔ سیر و سفر کی یہ زحمتیں عزلت گزینوں کی تن پروری و تن آسانی سے کہیں بہتر ہیں۔

فَظَلَّ الْعَذَارَىٰ يَرْتَمِيْنَ بِلَحْمِهَا
وَشَحْمٍ كَهُدَّابِ الدِّمَقْسِ الْمُفَتَّلِ

مطلب وہ نازنیں عورتیں اس اونٹ کا گوشت اور چربی لگیں اچھالنے جیسے بٹے ہوئے سفید ریشم کی جھالر۔

قصہ امرؤالقیس نے اونٹ کو نحر کیا اور سب عورتوں نے مل کر اسے بنایا کباب لگائے کہ دور شراب بے گزک کے مزہ نہ دیتا زیادہ مزے کی بات یہ تھی کہ خود پکانا پڑا۔

وَيَوْمَ دَخَلْتُ الْخِدْرَ خِدْرَ عُنَيْزَةٍ
فَقَالَتْ لَكَ الْوَيْلَاتُ إِنَّكَ مُرْجِلِي

مطلب جس دن میں ہودج میں گھس گیا ہوں ہودج بھی کس کا عنیزہ کا۔ تو کہنے لگی

بجھ پر آفت پڑے۔ تو مجھے پیدل پھرانا چاہتا ہے۔

قصہ وہ جلسہ جس میں مشک بھر شراب اور ایک اونٹ کے کباب صرف ہوئے جب ختم ہوگیا سب اپنے اپنے اونٹوں پر سوار ہونے لگیں عنیزہ اپنے محمل میں بیٹھی امرؤالقیس کے پاس اونٹ اب کہاں تھا عنیزہ کے ساتھ سوار ہوگیا وہ کوسنے دینے لگی کہ ترے بوجھ سے میرا اونٹ مرجائیگا تو مجھے اتنی دور پیدل جانا پڑے گا۔

تقُولُ وَقَدْ مَالَ الغبيطُ بنَا معًا

عقرتَ بعيري يا امرَءَ القيس فَانزل

مطلب محمل تو ہم دونوں کو لے کر ایک طرف جھک پڑی اور وہ کہتی جاتی تھی اُتر امرؤالقیس تونے میرے اونٹ کو مار ڈالا۔

قصہ جدھر سے امرؤالقیس محمل میں داخل ہوا ہے لامحالہ اسی طرف محمل جھکی ہے اور عنیزہ اس کے اوپر آپڑی ہے۔ دونوں کا بوجھ ایک ہی طرف ہوجانے سے محمل کے اولٹنے کا اور اونٹ کے زخمی ہوجانے کا ڈر تھا۔ اسی حالت میں اس نے کہا اُتر امرؤالقیس تونے میرے اونٹ کو مار ڈالا۔

فقلتُ لہا سیری وَارْخی زمامہا

وَلا تُبْعِدِی بلنی مِنْ جَنَاكِ المعلل

مطلب (جب میں اچھی طرح بیٹھ گیا) تو میں نے اس سے کہا چل اونٹ کی مہار ڈھیلی کردے مجھے اپنے میوۂ شاداب سے محروم نہ رکھ۔

قصہ امرؤالقیس مدت سے عنیزہ پر مفتوں تھا۔ آج اسے یہ موقع ملا کہ ایک ہی اونٹ پر

دونوں

دونوں سوار ہیں۔ دونوں پیئے ہوئے ہیں وہ کونسا میوہ ہے جو اس نے نہ توڑا ہوگا۔ اور حقیقت میں میوہ توڑنے کی تشبیہ نہایت ہی پر لطف اور اہل ادب میں مشہور ہے عنیزہ نے اونٹ کو روک لیا تھا کہ یہ اتر جائے۔ ہیری وارخی اسس امر پر دلالت کرتا ہے۔

سید علی حیدر طباطبائی
(نواب حیدر یار جنگ)
حیدر آباد

صلائے عام اس مضمون کے ساتھ مضمون کے متعلق نواب صاحب نے اپنے نوازشنامہ میں لکھا ہے کہ:۔ × × × × × × × × ×

صلائے عام ہر مہینے میں گلفشانی کر رہا ہے میرا جی چاہا کہ کچھ میں بھی لکھوں امرؤالقیس کے دیوان کی میں شرح لکھ رہا ہوں اس کے اکثر مقامات درج کرنے کے قابل ہیں قمار بازی و میخواری و عیاشی کو یہ باعث افتخار سمجھتا ہے مگر اخلاقی و شہسواری و لشکر کشی و شجاعانہ مضامین بھی اس نے بہت کہے ہیں عرب قحطانی ہے ملوک کندہ کا آخری بادشاہ ہے قرآن کے لغات و محاورات کی سند مفسرین و اہل لغت نے اس کے کلام سے دی ہے اس کا ایک قصہ دارۃ جلجل کا بہت مشہور ہے چند شعروں میں اس نے اس واقعہ کی طرف اشارہ کیا ہے اور میں نے اردو میں شرح اور اس واقعہ کی تفصیل کر دی ہے۔

نیازمند سید علی حیدر طباطبائی

لطفِ سخن

سلامی لطفِ زباں ہم زباں اُٹھاتے ہیں ٭ مرے سخن کا مزہ قدرداں اُٹھاتے ہیں
مونسِ عالی جناب خان بہادر صاحب دام مجدہم - بعد سلام مسنون - آپ حیران ہوں گے کہ میں کہاں غایب ہوگیا جو آپ کی خدمت میں حاضر نہ ہوسکا - بات یہی کہ میں عشرہ محرم میں دہلی سے باہر رہا اور دو ہفتے کے بعد آج واپس آیا تو صلائے عام کا اگست کا پرچہ ختم ماہ سے پہلے ہی موجود پایا - میں خود حاضر نہیں ہوتا اس لئے کہ مجھے شرم آتی ہے کہ خالی ہاتھ کیا جاؤں مضمون کوئی لکھا نہیں کہ نذر کروں - صلائے عام کے فدائیاں برابر اس کی تعریف میں رطب اللسان ہیں جو مضمون نکلتا ہے دل چسپ - جو ادا ہے دلفریب -
اب میں ان ناظرین سے خطاب کرتا ہوں جو دور بیٹھے صلائے عام کے مطالع کا لطف اٹھاتے ہیں - شاید ان کو معلوم نہیں کہ ہمارے خان بہادر صاحب کو رسالے کی ایک دھن ہے اُٹھتے بیٹھتے سوتے جاگتے اسی کی ترتیب صاحب موصوف کی پیش نظر ہے - ؎
پھرتا ہوں اُسی خوابِ پریشاں میں ابھی تک ٭ جلوے ہیں وہی دیدۂ حیراں میں ابھی تک
پہلے پہل آپ نے اس رسالے کو اپنے بھتیجے کے مطبع میں چھپوایا - صاحبِ مطبع خان بہادر کے تقاضے کی تاب نہ لاسکے - ان کو وقت پر کام چاہیئے دیر سویر کا یہاں نام نہیں یہاں کل کا کام آج ہونا چاہیئے - آخرکار مجبور ہوکر صرف اس ماہانہ رسالے کی خاطر آپ نے پریس خرید اپنا مطبع کھولا - کاتب پریس مین سب نوکر رکھے - بلامبالغہ آپ ان سب کے سر پر سوار ہیں یعنی آپ بالاخانے پر تشریف رکھتے ہیں مطبع نیچے ہے - رسالے کے نکلنے کی دیر ہے کہ دوسرے رسالے کی فکر شروع ہوجاتی ہے - غرض پورا مہینا اسی تگ و دو میں گزرتا ہے - ریل لیٹ ہو تو ہوجائے مگر رسالے کی اشاعت کی ایسی سخت پابندی ہے کہ مہینا ختم ہوا یا نہ ہوا رسالہ موجود اور یہ بھی جاننے والے جانتے ہیں کہ

آپ اکیلے اس کام کو اس پیرانہ سالی میں اس ہمت مستعدی اور اہتمام بلیغ سے چلاتے ہیں کہ جوانوں کو شرم آنی چاہیئے۔ آمدم برسر مطلب اگست کا رسالہ دیکھ رہا تھا کہ مولوی معین الدین صاحب قیس کی غزل نظر پڑی۔ اُس کے اس شعر پر میں ٹھٹکا۔ ؎

سے دیدار چھن کے آتی ہے ٭ منہ پہ ہے اک نقاب جالی کی

اسی سفر میں لکھنؤ کے ایک مشہور مرثیہ خواں میر عابد حسین صاحب عرف منجھو صاحب سے ملاقات ہوئی۔ باتوں باتوں میں جناب میر ببر علی صاحب انیس بادشاہِ سخن کا تذکرہ چھڑا میر صاحب مرحوم و مغفور کو کون نہیں جانتا اُن کا کلام شک نہیں کہ لاثانی تھا اور ہے۔ مرثیہ گوئی کو اُنھوں نے ایک خاص فن کر دیا اور اپنے پُر زور کلام کی غیر فانی یادگار چھوڑ گئے چنانچہ خود فرماتے ہیں ؎

کسی نے تری طرح سے ای انیس ٭ عروسِ سخن کو سنوارا نہیں

پھر ایک جگہ فرماتے ہیں۔ گھٹا زورِ مشقِ سخن بڑھ گئی ٭ ضعیفی نے ہمکو جواں کر دیا

اور لیجیے:۔ سبک ہو چلی تھی ترازوے شعر ٭ مگر ہم نے پلّہ گراں کر دیا

یہ تو خود اُن کا فرمانا ہوا۔ اب ملاحظہ ہو کہ اور قدردان کیا فرماتے ہیں:۔

انیس کا نہیں اردو زباں میں مثل کوئی ٭ لٹا گئے وہ معانی کے گوہرِ شہوار ٭ کلام اُنکا جوابِ کلامِ فردوسی بیان اُن کا بیانِ کلیمِ خوش گفتار ٭ لکھی جو صبح تو کاغذ پر روشنی پھیلی ٭ لکھی جو شام تو گیسوئے حور تھے اشعار تمام طرزِ بیاں سہلِ ممتنع اُن کا ٭ جو تھا انیس کو آساں وہ غیر کو دشوار ٭ زبان کوثر و تسنیم سے دُھلی اُن کی وہاں معدنِ گوہر بیاں لولو بار ٭ عرب عجم میں ہیں گزری بہت سے مرثیہ گو ٭ مگر کسی نے نہ پائی انیس کی رفتار بڑے بڑے علما اُن کے حاملِ معنی ٭ بڑے بڑے اُدبا اُن کے ناقلِ گفتار ٭ بڑے بڑے فصحا اُن کے قائلِ بندش بڑے بڑے بلغا اُن کے واصفِ اشعار ٭ وہ فنِ مرثیہ گوئی کو علم کر کے گئے ٭ ہیں اس پہ حجتِ قاطع انیس کے اشعار

انہیں کہ ہم پلہ مرزا دبیر مرحوم و مغفور بھی ہو گئے ہیں۔ ہمارے خیال میں دونوں ایک سے ایک بہتر ہیں۔ کسی ایک کو دوسرے پر ترجیح دینا اور مفت کا جھگڑا نکالنا کہ سلیم شاہ کی ڈاڑھی بڑی تھی یا شیر شاہ کی

حجت بے کار اور سعیِ لاحاصل ہے۔ دونوں صاحب اپنی اپنی طرز میں لاجواب اور عدیم المثال استاد ہو گزرے ہیں۔ ع۔ ہر کسے را رنگ و بوئے دیگر است۔ میر صاحب اگر سلاست میں یگانۂ روزگار ہیں تو مرزا صاحب بلاغت میں سرمایۂ ناز ہیں۔

بقول شخصے ہمارے دونوں میٹھے۔ ہاں تو آمدم برسرِ مطلب، میر عابد حسین صاحب ناقل ہیں کہ ایک دن میر صاحب مرحوم اپنے چند دوستوں کے ساتھ سیر کو چلے جا رہے تھے۔ چوک میں جب پہنچے آدمی تھے بڑے خوش مذاق اور سجیلے اور لکھنؤ کے مشاہیر میں کسی طوائف نے کوٹھے پر سے اُن کو جھانکا مگر کس طرح کہ دوپٹے کی آڑ میں سے۔ میر صاحب نے تو دیکھا نہیں اُن کے کسی ساتھی کی نظر دوچار ہوئی۔ عورت تھی جوان اور خوب صورت۔ ایک برچھی جگر کے پار ہوتی۔ ؎

جب نظر سے نظر دوچار ہوتی ؛ ایک برچھی جگر کے پار ہوتی

آگے بڑھ کے میر صاحب کو متوجہ کیا کہ جناب آج ایسا واقعہ ہوا۔ میر صاحب کو متانت خاموش رہے۔ تھوڑی دور جا کر یہ شعر فی البدیہہ فرمایا:۔

عاشق کو دیکھتی ہو دوپٹے کو تان کر ؛ دیتی ہو ہم کو شربتِ دیدار چھان کر

جناب معین الدین صاحب کے شعر کا بھی ماحصل اور مفہوم قریب قریب اسی کے ہے (میر انیس) اور اس کے پڑھتے ہی میر انیس صاحب کا شعر مجھے یاد آگیا میں نے کہا کہ لاؤ لگے ہاتھوں یادِ رفتگاں کا ذکرِ خیر بھی آجائے اور توارد خیالات کے ساتھ توازنِ کمالات بھی ہو جائے۔ فقط خاکسار

بشیر الدین احمد تعلقہ دار پنشنر
از دہلی

فِتنہ[۱]

(از روے لٹریچر)

فتنہ کا لفظ تو ذرا سا ہے مگر بہت رایج ہے اور طرح طرح کے معنی پیدا کرتا ہے۔ ہندوستان میں تو اکثر اسکا ساتھ فساد کے ساتھ ہوتا ہے جسکی زبان سے سُنو وہ فتنہ و فساد کہتا ہوا نظر آویگا۔ اس لفظ کا کچھ ٹھیک ٹھکانا نہیں ہے اچھے اور برے دونوں محل پر اسکا استعمال موجود ہے کبھی عاشق کے لیے مستعمل ہوتا ہے تو کبھی معشوق کے واسطے بھی استعمال کیا جاتا ہے عشق کے ساتھ اُسکو خاص مناسبت ہے کہیں آزمایش کے معنے بھی دیجاتا ہے اور کہیں عذاب اور کہیں دیوانگی کے معنے دیتا ہے۔ آخرش فتنہ ہی تو ٹھیرا ہر محل میں اسکی گذر آسانی سے ہو جاتی ہے۔ اکثر جو تیز و طرار شخص ہوتے ہیں اُنکو بھی فتنہ کا خطاب دیا جاتا ہے مگر اسی عمر تک اس خطاب کی موزونی باقی رہتی ہے کہ جب تک پختگی عقل کا زمانہ نہ آجاوے۔ بہرام گور کی ایک لونڈی کا نام فتنہ اسی وجہ سے رکھا گیا تھا کہ وہ حرّافہ خود بہرام گور سے بھی طمطراق کرنے میں باز نہ آتی تھی اور ہنر اس میں یہ تھا کہ تیر انداز بلا کی تھی۔ یہ مثل تو صرف کانوں ہی سے سُنی ہے کہ ایک ڈھیلے سے دو فاختہ مارتے ہیں مگر اُسکو تو بچشم خود سب نے دیکھا تھا کہ ایک ہی تیر سے دو جانور شکار کرتی تھی۔ اسی لونڈی کا یہ قصہ مشہور ہے کہ پوری گائے کو گود میں اُٹھا کر کوٹھے پر لے جاتی تھی

[۱] روزمرہ میں فتنہ چھوٹے قد کے ساتھ شرارت کا نام ہے۔ ریاض نے گورکھپور سے ایک پرچہ اس نام کا نکالا تھا جسکی تقطیع بہت چھوٹی اور چٹکلے کی باتیں زیادہ تھیں عطر فتنہ بھی مشہور ہے۔ چھوٹے قد کی عورت جسمیں اپنی عمر سے زیادہ شوخی اور تیز طراری ہو روزمرہ میں فتنہ سمجھی جاتی ہے۔ غرض فتنہ سے مراد یار کی شوخی سے ہے۔ (صلائے عام)

ہو۔ یہ کرتب اس کو مشق کرنے سے حاصل ہوا تھا۔ وہ گوسالہ کو جیسے کہ وہ ذرا سا تھا کوٹھے پر گود میں اُٹھا کر لیجایا کرتی تھی حتی کہ وہ پوری گائے ہو گیا مگر وہ بدستور گود میں لیجاتی تھی فساد کے معنوں میں اس کا استعمال زیادہ ہے۔ ماوراءالنہر کا ایک شاعر ناصری تخلص شمس الدین التمش بادشاہ کے زمانے میں جب دہلی آیا تھا تو اُس نے بادشاہ کی مدح میں ایک قصیدہ لکھا تھا جسکے اول ہی مطلع میں فتنہ کے لفظ کو فساد عظیم کے معنوں میں اُسنے استعمال کیا تھا وہ مطلع یہ ہے ؎

اے فتنہ از نہیب تو زنہار خواستہ ؛ تیغ تو مال و فیل ز کفار خواستہ

شیخ سعدی علیہ الرحمۃ نے بھی فتنہ کو فساد عظیم کے معنوں میں استعمال کیا ہے چنانچہ اُنہوں نے ایک منظوم حکایت میں تحریر فرمایا ہے ؎

وقتے افتاد فتنۂ در شام ؛ ہر کس از گوشہ فرا رفتند

اور ایک محل پر ظلم کرنیوالے کے معنوں میں استعمال فرمایا ہے۔ چنانچہ ایک محل پر لکھتے ہیں ؎

ظالمے را خفتہ دیدم نیم روز ؛ گفتم ایں فتنہ است خوابش بردہ بہ

ایسے محل پر جہاں غمزہ اپنا تیر نگاہ پھینکتا ہوا راہ چلتوں کو متوالا بنا کر چھوڑتا ہے تو تیر مژگاں کا گھائل پڑا اسِسکتا رہتا ہے اور زبان حال سے جہاں ہائے ہائے کرتا ہے وہاں یہ کہتا جاتا ہے کہ ؎ چہ فتنہ بود کہ مشاطۂ قضا انگیخت ؛ کہ کرد نرگسِ مستش سیہ بہ سرمۂ ناز

بہت ایسے نگاہ کے مارے گوشہ عافیت ڈھونڈتے پھرتے ہیں مگر فتنہ چشم اُنکو قرار سے بیٹھنے ہی نہیں دیتا اور ایک سے وہ یہ شکایت کرتے پھرتے ہیں کہ ؎

گوشہ گیری و سلامت ہوسم بود و لے ؛ فتنۂ میکند آں نرگس فتاں کہ میرس

سچ تو یہ ہے کہ فتنہ نگاہ بھی قیامت زا ہے اس سے نہ حضر ہے نہ کسی پہلو قرار ہے حافظ شیراز رحمۃ اللہ علیہ تو اس فتنہ کے مارے ایسے قائل ہوئے کہ فتنہ آخرت کو بھی اُنھوں نے مات دیدی اور فرمانے لگے ؎

ازاں زماں کہ فتنہ چشمت بہ مارسید ؛ ایمن ز شر فتنہ آخر زماں شدم

بلرخی

ایک محل پر حافظ رحمۃ اللہ علیہ آسمان کا رخ دیکھکر بھاگے تھے اور بقول شخصے ملا کی دوڑ مسجد تک یہ سمجھے کہ اگر پناہ کہیں ملسکتی ہے تو میخانہ کے چھپر تلے سمجھے یہ کہ اگر آسمان سے اولے برسیں تو بھی اور بجلی گرے تو بھی میخانہ کا چھپر ضرور روک لیگا چنانچہ اپنے ہمراہی کا بھی ہاتھ پکڑ کر اُٹھایا اور میخانہ کا راستہ لیا اور فرمانے لگے ؎

فتنہ مے باردازیں طاق مقرنس برخیز ٭ تا بمیخانہ پناہ از ہمہ آفات بریم

حافظ رحمۃ اللہ علیہ کا تو قول ہے کہ معشوق ہمہ تن فتنہ ہی ہوتا ہے اور جدھر چلتا ہے فتنہ ہی برپا کرتا چلتا ہے خود اپنے معشوق سے جو لب دریا بیٹھا تماشا دیکھ رہا تھا آپ نے فرمایا کہ تم تو یہاں اپنی خوشی سے جم کر ایسے بیٹھ گئے ہو جیسے سرو کا درخت لب جو کھڑا رہتا ہے اگر چل پھر کر دیکھو تو تم کو معلوم ہو کہ جتنی آفتیں برپا ہیں سب تمہاری بدولت ہیں ؎

تو مگر بر لب جوے ز ہوس بنشینی ٭ ورنہ ہر فتنہ کہ بنی ہمہ از خود بینی

فتنہ کے معنے آزمایش و امتحان کے بھی آئے ہیں خود کلام باری تعالی میں اس محل پر جہاں ہاروت و ماروت ساحر چاہ بابل میں قید تھے اُنکی زبان سے نقل فرمایا ہے۔ کہ اِنَّمَا نَحْنُ فِتْنَةٌ فَلَا تَكْفُرْ یعنے وہ مبتلائے عذاب ہر شخص سے یہ کہتے تھے کہ ہماری آزمایش ہوئی ہے پس انکار مت کرو ایک شعر حافظ کا بھی حسب حال یاد آگیا اُنھوں نے بھی اس معنی میں فرمایا ہے کہ ؎

این چہ شوریست کہ در دور قمر مے بینم ٭ ہمہ آفاق پر از فتنہ و شر مے بینم

اس محل پر بلا کے معنے بھی موزوں ہوتے ہیں۔

بعض خدا کے بندے مال و اولاد بھی فتنہ قرار دیتے ہیں حالانکہ دُنیا تو انہیں دو چیزوں سے دنیا کہلاتی ہے ورنہ دنیا آباد کا ہیکو ہوتی یہ دونوں مخلوق تو خاص دنیا کو قایم کرتی ہیں ورنہ نیستی سے یا عدم سے کون آتا اور کا ہیکو آتا اور وہ خالق مطلق ہماری ہستی کو وجود میں کیوں لاتا دراصل اس آیت کے مطلب سمجھنے میں غلط فہمی ہو جاتی ہے کہ اِنَّمَا اَمْوَالُكُمْ وَاَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ جہاں تک عقل انسانی سمجھ سکتی ہے اس کا مطلب اور مفہوم صرف یہ ہے کہ مال و اولاد کی وجہ سے طرح طرح کے

فتنے پیدا ہوتے ہیں یا ہوتے رہتے ہیں اور ظاہر ہے کہ وہ معاملات ہیں کہ جنکی حد نہیں اسکی صورتیں جو پیش آتی تھیں اور جو ہنوز پیش آتی چلی جاتی ہیں وہ بیشمار ہیں ہر معاملہ ایک نئی صورت رکھتا ہے اور ایک ہی معاملہ بہت سے فتنوں کا باعث بنجاتا ہے اور یہی معاملات کے فتنہ ہیں جنسے وہ اشخاص جو مبتلائے فتنہ ہو جاتے ہیں ذلیل وخوار ہو جاتے ہیں۔ اپنے ہم جنسوں کی نگاہ سے گرجاتے ہیں۔ کشت وخون بھی آپ کے باہم ہو جاتے ہیں۔ ہر قسم کی خرابیاں فتنوں کے سبب سے پیدا ہوجاتی ہیں راہ راست سے انسان بہک جاتا ہے۔ ایمان فراموش ہو جاتا ہے بے ایمانی کا سہارا ڈھونڈنے لگتا ہے۔ اس تقریر سے یہ ظاہر ہو گیا ہوگا کہ نہ تو مال خود فتنہ ہے نہ اولاد خود فتنہ ہے مگر انہیں کی بدولت فتنہ پیدا ہوجاتا ہے۔ اگر بے ایمانی کا دخل نہ ہو اور معاملات سیدھے سیدھے رہیں تو حیات دنیا ہمارے واسطے جنت سے کم نہو جیسا کہ خداوندکریم اپنی شان کریمی سے ارشاد فرماتا ہے کہ المال والبنون زینۃ الحیوۃ الدنیا دنیاہیں زندگانی بسر کرنے کیواسطے مال اور اولاد کیسی کچھ زینت ہیں اگر کسیکو دنیامیں جی کر اور رہ بس کر فخرو ناز ہوتا ہے تو انہیں یہی دو چیزیں پیش نظر ہوا کرتی ہیں۔ یعنی مال اور اولاد۔

ایک محل پر اللہ تعالی نے فتنہ کو قتل سے بھی زیادہ بزرگ قرار دیا ہے چنانچہ ارشاد ہے

الفتنۃ اکبر من القتل۔ (پارہ سیقول رکوع گیارہ)

الغرض فتنہ عجب چیز ہے ہر محل وموقع پر اسکی مداخلت ہے مگر جہاں جہاں فتنہ برپا ہے وہاں سے خیریت رخصت ہے چاہے وہ عشق ہو چاہے فساد ہو۔ چاہے بلا ہو چاہے آزمائش ہو چاہے یہ شکل عاشق نمودار ہو چاہے معشوق بنے اور عربدہ بازی کرے فقط راقم

(مرزا عرفان علی بیگ ای ایس او از آگرہ)

صلائے عام کی ڈاک

صلائے عام تو اپنے وقت پر ۳۱ اگست کو آپہونچا تھا مگر آگرہ کی ہوا بگڑی ہوئی تھی جابجا سے فتنہ و فساد کے چرچے سنائی دیتے تھے۔ میرا جی تو ادھر نہیں لگا تھا مگر کان لگے ہوئے تھے اور اطمینان طبیعت ایسا نہ تھا کہ **صلائے عام** کی نازک خیالیوں کو ذہن نشین کرتا۔ بہرحال **مضے امضے** آپکو پولیٹکل معاملات سے حتی الامکان اجتناب ہے لہذا اس کا ذکر بھی چھوڑتا ہوں مگر **فتنہ** پر مضمون لکھکر نذر کرتا ہوں :-

اس دفعہ **صلائے عام** ماہ اگست میں مراسلت کا اندراج زیادہ ہے گو آپ کا فرمانا حق بجانب ہے کہ از روے انشاپردازی بعض تحریریں ایسی ہوتی ہیں کہ . . . . دکھانیکو جی چاہتا ہے۔

مضمون پریشان میں حضرت معروف کرخی ؒ کے اخلاق میں یہ مضمون چھپتا ہوا ہے کہ روزہ شکنی گوارہ ہے مگر دل شکنی گوارا نہیں۔ سمجھنے والے پر بہت بڑا اثر ڈالتا ہے :

محشر خیال میں عجب پرمذاق بات یہ ہے کہ آپ محشر میں ایک بیگم صاحبہ کا خط اور مضمون گزہی میں پیش کرتے ہیں اور گواہی اس بات کی دلانا منظور ہے کہ ع باعثِ برہمیٔ بزم خموشاں ہوں میں۔ خانبہادر صاحب آپ کا طرز کلام عجب خوبی رکھتا ہے جس کا اثر دل پر بالیقین ہوتا ہے مگر زبان اس کے اظہار سے قاصر ہے۔ جیسے زبان خود تو میٹھے اور نمکین کا مزہ لیتی ہے مگر یہ نہیں بتاتی کہ میٹھا کیسا ہوتا ہے :

آپ کے طرز بیان کو ڈاکٹر محمد عبدالغفور صاحب بسمل بریلوے نے اختیار کیا ہے اسی وجہ سے اُن کا خط "**واقعی لاجواب خط**" ہے :

اگر میرے ذہن کی رسائی وہاں تک پہنچتی ہے تو میں شکایتاً جناب مولانا معین الدین احمد صاحب

بقیہ ادھوری

قیس رضوی عظیم آبادی سے یہ عرض کروں گا کہ یہ مصرعہ رسول آئیں مدد کرنے کو خدا پہونچے۔ اپنے کمال کو پہنچا ہوا ہے اور دونوں رُخ لیئے ہوئے ہے مگر اسکو مصرعہ اولی اس کے ہم پلہ نہیں ملا۔ (یہ شعر جناب قیس کے قطعہ کا ہے) **صلائے عام** کی ڈاک میں جناب شمشیر بہادر صاحب اخگر کا یہ خیال ہے کہ ریاض کے اس شعر میں ؎ ریاض تھی جو **مقدر** میں بازگشتِ شباب ؛ جوان ہونیکو پیری میں کہنو آئے۔ لفظ **مقدر** کی جگہ **تصور** چھپ گیا ہے خدا جانے کیونکر صحیح ہو سکتا ہے میری نظر میں **تصور** ہی جم سکتا ہے اور **مقدر** محال عقلی ہوا جاتا ہے۔ پس مصرع کسی طرح مہمل نہیں ہوسکتا بلکہ پر از معنے ہے اور دلائل علمی وعقلی کے موافق ہے (خان بہادر صاحب مجھے اپنی دلیل کے حق ہونے کا اس قدر یقین ہے کہ میں واللہ اعلم بالصواب کے لکھنے سے اس موقع پر گریز کرتا ہوں) ہسٹاریکل سوسائٹی کی ایک شاخ آگرہ میں بھی ہے اور میں اُس کا ممبر ہوں مگر کیا آپ اس کو باور فرمالینگے کہ ؎ دفتر تمام گشت و بہ پایان رسید عمر۔ ماہچناں در اول صفِ تو ماندہ ایم۔ میں آج تک یہ نہ سمجھا کہ اس کی علت نمائی کیا ہے۔ تواریخ کے مطالعہ دنیا سمجھتی ہے کہ کس لیے کئے جاتے ہیں پر یہ سمجھ میں نہ آیا کہ یہ لیکچر کیوں دیئے جاتے ہیں فقط

آگرہ میں بہ خوش انتظامی حکام ضلع وکمشنر صاحب بہادر ہر طرح سے امن ہے فقط

آپ کا نیازمند

مرزا عرفان علی بیگ (آئی۔ ایس۔ او) از آگرہ

صلائے عام

(از روئے پاکیزہ بیانی)

کہتے ہیں کہ کسی صحرا نورد نے مجنوں کو ریگِ بیابان پر انگلیوں سے کچھ لکھتے دیکھا۔ (صحرا نورد کے سوا اور کسی کو مجنوں کا دیکھنا کب نصیب ہو سکتا تھا۔ گھر بیٹھے مجھے یا آپ کو حضرت کی زیارت کہاں نصیب؟) دیکھنے والے نے پوچھا کہ حضرت یہہ خط کس کے نام لکھا جا رہا ہے؟ یہہ تکلیف آپ کس لئے گوارا کر رہے ہیں؟ ہوا کے ایک جھونکے میں یہ ساری محنت برباد جائیگی: اسے کون پڑھنے آئیگا؟ ریت پر لکھنا اپنی محنت خاک میں ملانا ہے ؎

کے بہ لوحِ خاک باقی ماندش ۔ تا کسے دیگر پس از تو خواندش

پیچھے تو پڑھنے کون آتا ہے؟ ابھی دیکھتے دیکھتے یہ حرف مِٹ مِٹا جائیں گے۔

مجنوں نے جواب دیا کہ میں حُسنِ لیلےٰ کی شرح لکھ رہا ہوں۔ متنِ حُسن لیلےٰ ہے اور شرحِ حُسن یہاں: اِس طرح کہ پہلے میں لیلےٰ کا نام لکھتا ہوں اور نیچے اپنی مُحبت و وفا۔ اُس کا حُسن اِس تحریر کا متن ہے اور مَیں اُس متن کی ادنےٰ شرح ہوں۔ لیلےٰ کے نام کے

سوا میں کچھ نہیں جانتا۔ اُس کے نام کے سوا دنیا میں کیا رکھا ہے ؎

ناچشیدہ جرعۂ از جام او ٭ عشق بازی میکنم با نام او

نہ تنہا عشق از دیدار خیزد
بسا کیں دولت از گفتار خیزد

توبہ کی تعریف میں ہے کہ انسان کا معصیت سے بچنا بہت مشکل ہے۔ یہ مشکل اگر حل ہو سکتی ہے تو توبہ سے۔ جس مذہب کے عقائد میں توبہ کا سہارا نہیں اُس میں زندگی کا لطف آدھے سے زیادہ ندارد سمجھئے ٭ جہاں تک ہو سکے آپ معصیت سے بچیں لیکن بچنے کا جو حق ہے وہ بہت کم میسر ہو سکتا ہے۔ اس لئے نفس کے لئے صلاح سب سے بہتر ہے کہ ؎ یکدم از اصلاح او غافل مخسپ ٭ گرچہ اُفتادی بہ گِل در گِل مخسپ

انسان اگر کیچڑ میں گر پڑے تو یہ ضرور نہیں کہ کیچڑ ہی میں پڑا ہے۔ توبہ گویا گرنے کے بعد اُٹھ کھڑا ہونا ہے ٭

سکندر سے ارسطو نے پوچھا کہ قیام سلطنت کے لئے کس چیز کی ضرورت ہے؟ ؎

نکتۂ خوش گفتہ است آں دوربیں ٭ عدل وار و مُلک را قایم نہ دیں

اس پر حضرت احمد جام فرماتے ہیں کہ:۔

کفر کیشے کو بعدل آمد فرہ ٭ مُلک را از ظالم دیندار بہ ٭ گفت بادا و دپیغمبر خدائے

کُلفتِ خود را بگو اے نیک رائے ؛ کز عجم چوں پادشاہاں آورند ؛ نامِ ایشاں جز بہ نیکی نشمرند
گرچہ بود آتش پرستی دینِ شاں ؛ بود عدل و راستی آئینِ شاں ؛ قرنہا زیشاں جہاں معمور بود
ظلمتِ ظلم از رعایا دور بود ؛ بندگاں فارغ ز غم فرسودگی ؛ داشتند از عدل شاں آسودگی

کسی بزم محبت میں مہ و خورشید - بہار گلشن - نسرین و نسترن - سرو و شمشاد - سنبل پیچاپ - نرگس و ریحاں کی تعریف میں مبالغہ ہورہا تھا - دیکھے اور بے دیکھے حُسن و عشق کے قصّے بیان ہو رہے تھے - سُننے والوں میں سے کوئی محبت زدہ پکار اُٹھا کہ یہ بیکار مبالغے کس لئے ؟ محبت کے مارے ہوؤں کو ان قصّوں کی تاب کہاں ؟

جواب ملا ؎

گُل کہ گفتم لطفِ رویش خواستم ؛ ذکرِ سنبل رفت مویش خواستم

سرو سے غرض قدِ یار - سنبل سے غرض موئے پریشان - خورشید سے غرض رخسارِ تاباں - اور یہ اس غرض سے کہ ؎

وصفِ خاصاں بہ زعام اندر نہفت ؛ باد صافی وقت آں عارف[1] کہ گفت

خوشتر آں باشد کہ سرِّ دلبراں
گفتہ آید در لباسِ دیگراں

ہماری زبان کی لٹریچر کی بڑی خوبی یہ ہے کہ عربی - فارسی اُردو میں جب کوئی کتاب

[1] حافظ رح

تصنیف یا تالیف کرنے کا ارادہ کیا جائے تو پہلے حمد و نعت اور بادشاہِ وقت کی تعریف میں سخن سرائی کا نہ صرف دستور ہے بلکہ لابد و ضرور ہے ؛ حمد و نعت کے اگر مضمون جمع کئے جائیں تو سَو پچاس جلدوں میں مشکل سے آئیں۔ دُنیا کی مشہور زبانوں میں شاید ہی کوئی زبان اس بات میں ہم سے بازی لے جاسکے ؛ ہماری لٹریچر کی یہ خوبی از روئے نیکی خدا پرستی کی دلیل ہے اور از روے فصاحت غایتِ کمال کا ثبوت ہے کہ ایک مضمون ہزار طرز پہ بیان کیا: اور اس میں بھی یہ شرط کہ جس وضع کی تصنیف ہے اُسی کی رعایت سے حمد و نعت لکھی جائے ؛ ساقی نامہ کی حمد میں میکدہ کی رعایت کہ ع ثنا ہا ہمہ ایزدِ پاک را ؛ ثریا دہِ طارمِ تاک را ؛ مُلاّ غنیمت کی مثنوی میں شاہد و عزیز کا قصہ ہے جسکی حمد کا آغاز اس طرح ہے ع

بنامِ شاہدِ نازک خیالاں ؛ عزیزِ خاطرِ آشفتہ حالاں

بہار و خزاں کی رعایت میں ہے کہ اُس خدا کی تعریف کیجاتی ہے جسنے ع

صور دمی دادہ بہ بادِ بہار ؛ نعش کشی کردہ خزاں را شعار

(آوازِ صور سے جس طرح مُردے قبروں سے اُٹھ کھڑے ہوں گے۔ بادِ بہار سے لالہ و گل پیدا ہو گئے اس سے پہلے خزاں نے پت جھڑ کے مردہ پتّوں کی لاشیں ٹھکانے لگا دی تھیں ؛ قیامت کا سماں بندھ گیا!)

وہ خدا جو ع دایہ گیِ حُسن دہد ناز را ؛ زمزمہ آرا کند آواز را

ناز کو دایہ گیِ حُسن دینا نہایت پاکیزہ خیال ہے۔ اسی طرح اور پاکیزہ خیالی ملاحظہ فرمائیے۔

کوششِ اندیشہ بہ افلاک داد ؛ ذوقِ تحمل بدلِ خاک داد

ہماں لو

(آسمان کو ہماری بربادی کی فکر رہتی ہے اور زمین کو برداشت کرنیکی طاقت)

خندہ برلب داد کہ بردار نوش ؛ گریہ بدل ریخت کہ برچیں خروش

(شکن رہ جائیگی یونہیں جبیں پر ؛ کوئی مُنہ چوم لیگا اس نہیں پر ؛ دہری رہ جائیگی یونہیں شبِ وصل
نہیں لب پر شکن تیری جبیں پر۔ از حضرت ریاضؔ)

عقل کہ در وادیٔ بُرہاں شتافت ؛ رو بحرم داشت و بے رہ نیافت

رہبرِ ما راہ ثوابش کم است
چہرہ نہ گویم کہ نقابش کم است

شاہد ایماں ز تو بس رو سفید ؛ کُفر سیہ رو ز تو مست اُمید

درحرم راز تو محرم تو بس
جلوہ بخود کن کہ ترا ہم تو بس

خدا سے دعا مانگنے کی ہدایت اس طرح کی جاتی ہے کہ ؎

تلخ دہانی گہ سازی مکن ؛ لب بکشا نغمہ طرازی مکن

شورشِ بیہودہ مکن کو گواہ
صبر گواہ است نہ فریاد و آہ

دُعا ہے :۔

خداوندا دلم بے نور تنگ است ؛ دلِ من سنگ و کوہِ طور سنگ است ؛ دلم را غوطہ دہ در چشمۂ نور
تجلی کن کہ موسےٰ مست در طور ؛ وگرنہ ناسزا دل عار داری ؛ کرم بسیار و دل بسیار داری

دلے وہ چوں محبت پاکدا ماں دلے پاکیزہ گوہر تر ز ایماں دلِ مرہم گداز ابرام بشناس
بشں مستِ مکن نہائے الماس برافروز آتشِ در سینۂ من کہ سوز و راحت دیرینۂ من
بپوشاں چہرہ ام را ظلمتِ زرد بنوشاں سینہ ام را شربتِ درد چہ شربت آبِ کوثر امتِ او
گلو سوزِ محبت لذتِ او مزاجِ کام دہ ناکامیم را بلند آوازہ کن خوشش نامیم را
ملامت را انیسِ داغِ من کن شہادت را نسیمِ باغِ من کن دماغم را بجامِ تازہ گرداں
لبم را دشمنِ خمیازہ گرداں جواہر سنجِ معنی کن دلم را بہ لیلےٰ آشنا کن محملم را

چو عقلم شمع بیداری برافروز
چو شمعم گرم رفتاری بیاموز

سوال و جواب

میری تپش نے یار کی شوخی نے بزم میں ؛ تصویر کھینچ دی ہے سوال و جواب کی

(۱) کسی نے کسی سے پوچھا کہ کسطرح رہتے ہو؟ جواب ملا جس طرح **میاں** رکھتے ہیں ؛
(۲) پوچھا کہ **میاں** کس طرح رکھتے ہیں؟ جواب۔ جسطرح چاہتے ہیں رکھتے ہیں ؛
(۳) پھر پوچھا کہ **میاں** کسطرح چاہتے ہیں؟ جواب جسطرح مناسب سمجھتے ہیں ؛

میاں کی تعریف میں ہے کہ

جاں کہ اورا بہا خداند کس
خاک را آدمی توانی کرد
سمن آری زخاکِ صحرائے
شب فرستی و شب فروزی ہم

رائیگاں ہیدہی بہ مور و مگس
آدمی نیز خاک دانی کرد
ہم بیاری و ہم بیارائی
روز سے آری فراخ روزی ہم
چوں کند رحمتش مدارا ے

تو نگاری زخاک صورت پاک
گُل برآری زگِل بہ جلوہ گری
گوہر اندر صدف بہ بندگنی
دہی از لطف ہر کجا خواہی
چیست حرفِ سیہ بہ دریائے

تُو توانیش باز کردن خاک
ہم برآری ہم فرو [illegible]
ہم بہ [illegible] و ارجمند کنی
چشمہ را آب و آب را [illegible]

صلائے عام

(از روئے اہتمام)

صلائے عام گو وقت پر نکلتا ہے مگر اکثر شکایتیں آتی ہیں کہ دیر میں پہونچا یا نہیں پہونچا - اس کا علاج آپ کے ہاتھ میں ہے کہ آپ ڈاکخانہ سے رسم راہ زیادہ رکھیں - اپنا پتہ مجھے اور ڈاکخانہ والوں کو بہت صحیح دیں اور تاریخ مقرّرہ پر مہینہ کے آخر اور دوسرے مہینے کے آغاز پر منتظر رہیں ؎

ساقی سے روز پوچھتے ہیں یہہ حساب ہم ٭ اب کتنے دن ہیں آمدِ فصلِ بہار کے

میں لکھتے لکھتے تھک گیا کہ صلائے عام کی قیمت آپ بذریعہ منی آرڈر بھیجیں مگر غفلت شعار وی پی کا بہانہ ڈھونڈھتے ہیں - اب پھر عرض ہے کہ جو صاحب صلائے عام کی خریداری پسند کریں اس کی قیمت بذریعہ منی آرڈر پہلے عنایت فرمائیں ؎

زندانِ محبت سے رہائی نہیں منظور ٭ ہم پوچھ چکے تیرے گرفتار سے پہلے

پہلو میں جگہ حضرتِ دل ہم تو نہ دیتے

واقف ہی نہ تھے آپ کے اطوار سے پہلے

آپ دیکھئے کہ صلائے عام کی لوح یعنی ٹائیل پیج خاص اہتمام سے چھاپا جاتا ہے۔ لوح کی چھپائی اور کاغذ میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں ہوتا: لوح کی خوبصورتی اور اندر مضامین کی خوبی یار کے چراغِ تہِ داماں کی تشبیہہ ہے ؛

صلائے عام کی یہ بڑی خوش نصیبی ہے کہ اس کے قدر شناس مضامین کی طرف سے کمی نہیں کرتے مضمون اچھے اچھے آتے ہیں : لیکن گنجایش نہ ہونے کی وجہہ سے شایع ہونے سے رہ جاتے ہیں۔ مضامین جو رہ گئے اُمید ہے کہ آہستہ آہستہ جسقدر گنجایش ہوتی جائیگی نکلتے جائیں گے ؛

Presentation of Mir Nasir Ali Khan Bahadur of Delhi to his Most Gracious Imperial Majesty King Emperor.

—— :o: ——

Extract from a letter from J. P. Thompson, Esquire I. C. S.
Dated 13th December, 1911

—— :-o-: ——

"Dear Mir Sahib"

I enclose your invitation card for the Garden Party this afternoon, which has just reached me from the private Secretary to His Honour."

o o o "Sir Louis Dane hopes to have an opportunity of presenting you to his Imperial Majesty." o o o o

—— :o: ——

Extract from a letter from Sir Richard Dane. K. C. I. E. (Brother of His Honour the Lieutenant Governor of Punjab)
Dated Lieut. Governor's Camp, 25th February 1912.

"Dear *Mir* Nasir Ali"

o o o o o o o

My Brother has told me that you had the great honour of being introduced to his Imperial Majesty the King Emperor"

I am, Yours Sincerely,

—— :o: ——

Extract from a letter from Major J. C. C. Angelo, Dy. Commissioner, Dated, 18th December 1911.

"My Dear Mir Sahib.

"I Am very glad you were Presented to His Imperial Majesty—it was a fitting ending to the Durbar." o o o o

Your Sincerely,

Babu Rebindra Nath Tagore of Gitanjali, writes:-

o o o o o

"I have no doubt that it (Sala-i-Am) is doing a good service in promoting the cultivation of Urdu literature."

o o o o o o

Extract from a Gentleman,s letter Dated. April 4, 1914.

o o o o o o

"I conclude from the last issue of the Sala-i-Am that you have been invested with a *Khilat* as Diwan of the Pataudi State, will you permit me as an old friend of yours and an admirer of your genius to offer you my sincere congratulation.

o o o o o o

"It like Addison you have acquired celebrity as an Essayist and a brilliant writer of Urdu prose; o o

o o o o o o

you, like him, deserve to be raised to the highest advancement in the state! Now, that is no flattery I speak as I think" o o o

"In conversation this morning with o o I brought to his notice the Sala-i-Am, and have at his request sent him your December Number, drawing his particular attention to your "Stray thoughts" مضمون پریشان o and especially to your simile of

یار کی زلف پریشان

o o o o o o

—— o ——

Farrash-khana Delhi. He has recently started an Urdu Magazine Sala-i-Am, in his own city. He is a writer of some forty years standing His writings are appreciated in Lucknow as well as in Delhi He has been congratulated for his work by the Lieutenant Governor of Punjab. He has received congratulations from all parts of India compliments from many literary men and favourable reviews from the Press, and now, that great boon the appreciation of Lord Minto. His style is very simple but emphatic. He wtries philosophical essays in Urdu and is thus doing much to bring to a high level Urdu literatare. It is hoped that the paper he has started will do much for the good of our languages. The paper itself is nicely got up, the annual subscriptions only Rs. 3. Those who are desirous of reading good Urdu should at once communicate with the editor, the point also I should add that the paper is much liked and purchased by Europeans both in India and Europe."

—:0:0:0—

Copy of a letter from the Private Secretary to His Honour the Lieutenant Governor of the United Provinces, dated 11th April 1913.

GOVERNMENT HOUSE

LUCKNOW.

Sir

I am desired to acknowledge your letter of the 19th forwarding a copy of your paper "Sala-i-Am." for His Honour the Lieutenant Governor's perusal; and to say that His Honour has put it a side to study an enjoy at leisure.

—oo—

The annexed Review of the SALA-I-AM Delhi, is re published from the Journal of the Moslem Institute, Calcutta, No. 2 Vol V. Page, 104.

—0:0:0—

"The Sala-i-Am, published at Delhi is a high class Urdu periodical and in get up printing and style it is without a parallel. it has been truly remarked by the *Pioneer* that it, "seeks to promote the cultivation of Urdu literature." It is edited by Khan Bahadur Mir Nasir Ali who is a writer of 40 years standing"

Extract from the GAZETTE OF INDIA JUNE 6, 1914. EXAMINATIONS.

XVI:— The following are the Text books prescribed for the PROFICIENCY EXAMINATION:—

o o o • • •

URDU:—

o o o • o •

In addition to the Grammer and Magazine recommended for the proficiency examination, the following are recommended :—

o o o o o •

Magazine

SALA-I-AM

o o o o •

Appendix B. List of authorised Text books. The following is a list of Text books prescribed for the various examination together with the places where they may be obtained.

o o o o o

URDU·

SALA-I-AM ____________ DELHI

o o o

school :—

"Sala-i-Am" edited by Mir Nasir Ali Khan and published at the Mustansir Press Delhi, annual subscription Rs. 5.

I have &c.

J. C. GODLEY

Director of Public Instruction, Punjab

Extract from a letter from R. P. DEWHURST *Esquire I C S Session Judge dated 11th January 1911.*

"I take this opportunity of saying that I entertain a very high opinion of your Magazine I will not say that I read every word of every number, but I can say with truth that I read eagerly all the articles proceeding from your own pen begining to end."

"I have always been an enthusiast with regard to Urdu literature since I come to India eighteen years ago and have read much classical verse and prose besides the mere ephemeral publications but I have never yet encountered such a model of a clear and attractive prose style as I find in your articles.

Extract from a letter from the Hon-ble W. Merk Esquire, L, L, D. C, S I, I C, S, Late Chief Commissioner, N W. Frontier provinces Written from England dated 16th August 1911

I thougt it (Sala-i-Am) a periodical that might be encouraged with for advantage. for instance to be placed in the waiting rooms for native gentleman calling on Deputy Commissionere.

Extract from à letter from A L GORDON WALKER Esquire I C S Punjab Commission dated 11th October 1911

"I quite agree with Mr. Merk that the (Sala-i-Am) ought to be in the waiting room of all Deputy Commissioners. Curiously enough I have used it for the purpose myself and always find that the Indian gentlemen who read it are delighted with it."

Extract from a D O letter from the Deputy commissioner of Gurgaon to the vice chancellor of the Punjab University dated 14th December 1910

"I wonder if you have any collection of receiving a letter from me last July when I sent you a copy of the Sala-i-Am, edited by Khan Bahadur Mir Nasir Ali, a most estimable old Government servant who spends his leisure hours, when not occupied in his Magisterial duties [he is an Honorary Magistrate in Delhi] in editing and publishing quite one of the best Magazines in Urdu.

"I am sending you another copy of the Magazine with a request that you will as Vice Chancellor of the University give it all your assistance and if possible, its Editor the Mir Sahib, who is a most loyal old man and a man of letters."

EXTRACT FROM THE INDIAN DAILY TELEGRAPH LUCKNOW DAILY 14th DECEMBER. 1901.

"But the chief point about which I have taken up my pen to write is the literature of Khan Bahadur S. Nasir Ali Sahib of

OPINIONS

Regarding "SALA-I-AM" Delhi.

The following Critique on the "SALA-I-AM," Delhi, was Published by the Pioneer, in its issue of the 3rd November 1909

"The Sala-i-Am published at Delhi keeps up high character as a periodical which seeks to promote the cultivation of Urdu literature. Khan Bahadur Mir Nasir Ali, with whom loyalty and learning go hand in hand is filling the leisure hours of his retirement by devoting himself to the editing and publishing of this Magazine. His style is marked by refinement and culture, and his readers should increase in number as the merits of his work become disclosed. The Sala-i-Am is particularly well printed and European students of Urdu should find it quite worth reading."

Extract from a letter from Colonel D. C. PHILLOT Secretary Board of Examiners, Calcutta, dated 20th January 1910.

"I have obtained the opinions of some of the board on the "Sala-i-Am". We think it is the best Urdu magazine we have yet seen both in appearance and contents I shall have great pleasure in recommending it to candidates for the high proficiency and Degree of Honour in fact, I have been doing so."

Extract from a letter from Sir Thomas GORDON WALKER L. L. K C I E., Late Lieutenant Governor of Punjab Dated 16th March 1909

"The Magazine (Sala-i-Am) appears to be a very superior work that ought to be appreciated."

SIR LUCAS WHITE KING
Kt. L. L. D. C. S. I. F. R. S.
Indian Civil Service retired
writes as follows:-

"I am delighted with the style of your Magazine and am looking forward to the next number."

Dated 15th October 1908

Extract from CIRCULAR No 26 SERIAL No 3059

From the Hon'ble Mr J. C. GODLEY M.A., Director of Public Instruction Punjab.

TO ALL DEPUTY COMMISSIONERS INSPECTORS OF SCHOOLS, HEADS OF TRAINING INSTITUTION & MANAGERS OF AIDED and RECOGNIZED UNAIDED SCHOOLS IN THE PUNJAB.

Dated Lahore The 31st August 1910.

Sir,

I have the honour to recommend the Journals noted below for the reading room of secondary

قواعد و مقاصد

صلائے عام

خواجہ قمر الدین راقم کا شعر ہے ؎

مقصد تمہارے ہاتھ ہے قسمت خدا کے ہاتھ ؛ جو کچھ خدا سے ہو وہ تمہاری زباں سے ہو

صلائے عام کا بھی یہی عقیدہ ہے کہ کسی ملک و قوم کی ترقی تو پروردگار کے اختیار میں ہے لیکن ترقی کے لئے پہلی شرط اپنی زبان میں کمال پیدا کرنے کی ہے ؛ ہندکی اور بات ہے مگر اسوقت ہندوستان کی زبانوں میں اُردو سے بہتر کوئی زبان میری سمجھ میں نہیں آتی جسپر جمہور اہلِ ہند (ہندو ہوں یا مسلمان) دونوں کی زبان کا اطلاق ہو سکے ؎

نغمۂ عشق سے ہیں سُبحہ و زُنار ملے ؛ ایک آواز پہ دو ساز کے ہیں تار ملے

خلاقِ دو عالم کی طرح اُردو زبان کی تعریف سب سے پاکیزہ یہ ہے کہ ؎

تجھسے کوئی آشنا ہو یا ہو ؛ پر تجھے سب سے آشنا دیکھا

یہ رسالہ اپنی زبان میں اظہارِ کمال کی غرض سے جاری ہے کہ اُردو لٹریچر کے لئے ہر طرز پر لکھنے کا مسالہ جمع ہو اور ادائے بیاں میں ہماری زبان اور زبانوں سے اگر بازی نہ لے جا سکے تو کسی زبان سے مرتبہ میں کم نہ رہے ؎

دیکھ کر تجکو مٹے جاتے ہیں دُنیا کے حسیں ؛ جمع ہوتا ہے مسالہ تری یکتائی کا

صلائے عام میں ہر طرح کے مضمون نظم و نثر شایع ہوتے ہیں۔ نہ یادہ تر نثر کہ اسوقت نثر کی ضرورت ہے : اور نثر بھی ایسی جسمیں زبان کی خوبی و فصاحت کے ساتھ خیال کی پاکیزگی اور نزاکت ضرور ہو ؎ دل باندھئے تو یار کے کاکُل سے باندھئے ؛ بلبل کو باندھئے تو رگِ گُل سے باندھئے

صلائے عام اعلےٰ حُکام سول و ملیٹری افسروں کے امتحان میں گورنمنٹ آف انڈیا

منظور

سے منظور ہو چکا ہے۔ ہندوستان کے سوا یورپ کے عالم و فاضل **صلائے عام** کی قدر کرتے ہیں اُردو میں **صلائے عام** کے مضامین کو خاص مرتبہ حاصل ہے ؎

دل پہ تمہارے نقش ہوا ہے بیانِ شوق ؛ کارِ قلم دکھاتی ہے میری زبانِ شوق

صوبہ آگرہ و اَوَدھ کے سررشتۂ تعلیم کے نصاب میں **صلائے عام** کے مضامین اُردو فائینل ریڈر میں انتخاب کرکے در ... رلیسیڈنٹ نصاب اُردو نے جو بمبئی میں منعقد ہوئی میرے مضامین کو اُردو ریڈروں میں شامل کرنیکے لئے مجھے لکھا ؛

اکثر اصحاب نمونہ کا پرچہ مانگتے رہتے ہیں۔ اوّل تو ایک پرچہ سے **صلائے عام** کا پورا حال معلوم ہونا مشکل ہے۔ دوسرے **صلائے عام** کو جاری ہوئے عرصہ ہو گیا نمونہ بھیجنے کی مجھے ضرورت نظر نہیں آتی ؎

پیری میں بھی بے ولولۂ شوق نہیں ہم ؛ رکھتے ہیں ابھی اِک دلِ ہنگامہ گزیں ہم
شہرت نہیں مجنوں کے برابر یہ مسلّم ؛ پر کوئی نہ جانے ہمیں ایسے بھی نہیں ہم

صلائے عام کی قیمت پیشگی چھ روپے سالانہ ہے۔ چھ مہینے سے کم کی خریداری منظور نہیں ہو سکتی قیمت بذریعہ منی آرڈر عنایت فرمائی جائے۔ مضمون نگار **صلائے عام** کی قیمت سے بری نہیں: نہ یہ ضروری کہ ہر مضمون خواہ مخواہ شایع کیا جائے ؎

کس قدر ہے فرق یوسف میں اور اپنے یار میں ؛ گھر خریدار اس کے آئیں وہ بِکے بازار میں

جو مضمون شایع نہ ہو سکیں اُن کے واپس کرنے کا ذمہ نہیں: جامعِ اوراق کو مضمون میں کمی بیشی کا اختیار ہے ؛

پچھلے پرچوں کی قیمت بشرط دستیابی ایک روپیہ فی پرچہ ؛

صلائے عام کا پتہ اسقدر کافی ہے کہ:

دہلی۔ فراشخانہ: مکان میر ناصر علیخاں بہادر ؛

حسب الارشاد میر ناصر علیخاں بہادر مطبع ناصری واقع فراشخانہ دہلی میں باہتمام میر احمد چھپا اور شایع ہوا ؛

PRINTED AND PUBLISHED BY MIR NÂSIR ALI KHÂN BAHÂDUR (EDITOR) AT THE NÂSRI PRESS, FARRÂSH KHÂNÂ, DELHI.

…GISTERED NO. L14… SALA-I-AM, DELHI.

SALA-I-AM, DELHI.

high class Monthly Magazine devoted to the cause of Urdu literature, the preservation of the old Indian, especially Mohammadan culture and refinement, and the assimilation of the best features of the new civilization.

[illegible]

فہرست مضامین

بابت ماہ اکتوبر ۱۹۲۳ء مطابق ربیع الاول ۱۳۴۲ ہجری

پیرایہ آغاز

اغازِ مضامین کا حق ہے کہ اللہ کے نام کی طرح پہلے پیرایہ آغاز لکھا جائے۔ ورنہ اور مضامیں کا لُطف آنا مشکل ہے اور جس طرح حضرتِ خضرؑ مُنہہ چھپائے پھر رہے ہیں صلائے عام کے جامعِ اوراق کو مضمون نگاروں کے سامنے مُنہہ دکھانا مُشکل ہوجائیگا ٥

تلفِ حق کی سزا ہے کہ پھرے ہے مارا ؛ تجھسے تھے اور بھی اے خضر بیا سے پہلے ٥

کہتے ہیں کہ حضرتِ خضرؑ بھولے بھٹکوں کو راہ بتاتے ہیں اور خود ایک عمر گزر گئی کہ آوارہ پھر رہے ہیں

تیرے مایوس کی تشویش مٹانے کے لئے ؛ تننتہ تنر اُٹھا دستِ دعا سے پہلے

اس پرچہ میں میرے مضمون کم۔ مضمون نگاروں کے مضامین زیادہ ہیں: مرزا عرفان علی بیگ صاحب نے پچھلے مہینہ کے صلائے عام کا ریویو ازراہ عنایت لکھا جسکی سُرخی ہے صلائے عام ماہ ستمبر ۱۹۲۳ء" ازراہ عنایت" میں نے مصلحتاً کہا کہ ریویو میں انصاف سے زیادہ طرفداری پائی جاتی ہے ؛ (صفحہ ۱۶) آواگون بھی آپ ہی کا مضمون ہے (صفحہ ۱۷) یہ مضمون ذرا مشکل ہے ؛ پُرانی دلی کی لوہے کی لاٹھ الامضمون (صفحہ ۲۴) پورا نہیں چھپ سکا جو مولوی بشیر الدین احمد صاحب نے لکھا ہے۔ اِس مضمون کی نسبت میں اپنی رائے اسکے پورا ہونے پر عرض کرونگا۔ مضمون مورخانہ

اور بطرز

اور بطرز ریویو ہے: یہ ریویو خیالاتِ خاص کے ساتھ ڈاکٹر ووگل صاحب بہادر کے لبیط مضمون سے علاقہ رکھتا ہے جو پنجاب ہسٹاریکل سوسائٹی کے رسالہ میں شایع ہوا ؛ اتالیق الامرا۔ مرزا محمد علیخان صاحب رئیس دہلی کا مضمون ہے (صفحہ ۲۳) یہ مضمون رؤسا کی تعلیم کے لئے بہت مفید ہے ؛ مضامین کے پورا نہ ہونے کی وجہ اس پرچہ میں عدم گنجایش ہے۔ اسیطرح اور مضامین بھی جن کے شایع ہونے میں دیر ہو رہی ہے: انکی تاخیر کی وجہ بھی یہی ہے کہ مضامین زیادہ ہیں اور گنجایش کم ہے ؛ اسکے علاج کی دو ہی صورتیں ممکن ہیں کہ میں اپنے مضامین میں کمی کروں یا صلائے عام کا حجم بڑھایا جائے۔ پہلی صورت آسان اور میرے آرام کا باعث ہو سکتی ہے۔ دوسری کے لئے صلائے عام کے خریدار فکر کریں کہ از روے خرچ اخراجات اتنا حجم بھی میری زیرباری کا سبب ہو رہا ہے ؛ صفحہ ۱۵ کے اخیر میں حضرت امیر خسروؒ کی نصیحت ہے جو حضرت نے اپنی کمسن بیٹی کی ہدایت کے لئے لکھی ؛

مضمون پریشان کا نام اب کی دفعہ دلقِ گدایاں رکھا گیا ہے۔ یہ شاعرانہ مضمون ہے ؛ قیاسِ صحیح اور اخیر کا مضمون جو صلائے عام کے نام سے لکھا گیا۔ فرضی مضامین ہیں: ایک اپنے ہاں کے طرز بیان دوسرا انگریزی وضعِ بیان کا تتبع ہے ؛ حضرتِ ریاض کی غزل تعریف سے مستغنی ہے۔ آپ کے ساتھ لسان الملک وغیرہ الفاظ لگانا بیکار ہے کہ بغیر ان الفاظ کے انکا جو مرتبہ شعر و سخن میں ہے وہ اہلِ سخن سے پوچھیے ؛ جناب ریاض کا مختصر خط جو غزل کے ساتھ آیا (صفحہ ۴) اور غزل (صفحہ ۲۶) میں ملاحظہ فرمایئے ؛ اب کی دفعہ صلائے عام کی ڈاک کے خطوط چھاپنے سے روک لئے گئے۔ مگر آخر کا مضمون (صفحہ ۴۳) کم و بیش صلائے عام کی ڈاک کا جواب سمجھ لیجئے ؛ دلقِ گدایاں والا مضمون اور صلائے عام کا اخیر مضمون یہ دونوں اس لایق ہیں جن کی نسبت از روے تعلی یا مبالغہ یا صلائے عام کی خاطر سے ...

مضمونِ پریشان
یا
دلقِ گدایان

مضمونِ پریشان کی تشبیہ میں ابتک زلفِ خوباں سے دیتا رہا کہ شاعرانہ زبان میں ازروے حُسنِ بیان یہہ تشبیہہ بہت موزوں ہے۔ لیکن چونکہ خلاقِ دوعالم کی تعریف میں ہے کہ ہژدہ ہزار عالم میں ایک کی شکل دوسرے سے نہیں ملتی۔ بقول جنابِ برق

ے نقش صنّاعِ حقیقی میں یہ نیرنگی ہے ÷ کسی تصویر سے ملتی کوی تصویر نہیں +

درخت کے پتّوں میں ایک پتّہ دوسرے پتّے سے نہیں ملتا۔ طبایع میں ایک کی طبیعت دوسرے سے نہیں ملتی۔ دواؤں میں کوئی دوا کسی کے مزاج کے موافق ہوتی ہے دوسرے کو راس نہیں آتی : مجنوں کو جنگل راس آیا اور فرہاد کو پہاڑ۔ لیلےٰ نجد میں اور دمن دکن میں پیدا ہوی ہیر پنجاب میں اور پدماوت راجپوتانہ میں مشہور ہوئی : اختلافِ طبائع میں کسیکو کوئی چیز پسند ہے کسی کو کوئی : جن لوگوں کو خط و خال کی تعریف سے مناسبت نہیں اُنکی خاطر سے مضمونِ پریشان

کو میں دلق گدایاں یعنی فقیروں کی گدڑی سے تشبیہ دیتا ہوں کہ گدڑی میں ایک وضع کے ٹکڑے نہیں ہوتے نہ ایک رنگ کے۔ مگر گدڑی کے لعل مشہور ہیں ؎

خوب آمدی اے شور نمکدانِ قیامت ؛ می جُست ترا داغِ پریشاں نظرِ ما

اس شعر میں "داغ پریشاں نظر" بلا کا کہا!

پریشاں نظری کی رعایت سے مجھے کہنا پڑا کہ دُنیا کو جسقدر آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھئے اپنی ہی نگاہ پر ظلم سمجھئے۔ یار کی تلوّن مزاجی کا رونا چھوڑ کر کہ ایک وضع پر نہیں رہتا آپ عالم اسباب کو دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ اس کا حال ہمیشہ دگرگوں ہی رہا ہے: اس کو بھی چھوڑیئے تو خلاقِ دو عالم کو ذات میں نہیں تو صفات میں مزاجِ یار سے بڑھ کر پائیگا؛ انسان کو مجبور بنایا اور دو جہاں کے کام اسے بتادیئے اور دونوں بالضد کہ زندگی کو سنبھال اور مرنے کی فکر رکھ۔ تیری زندگی تیرے بس کی نہیں مگر خود مرا تو حرام موت سمجھ: ہم اندھے لولے لنگڑے پیدا کئے دیتے ہیں تو انکی مدد کر۔ ہم محتاج پیدا کئے دیتے ہیں تو محتاجوں کو کھلا؛ ہمارا پچھلا حال پیدا ہونے سے پہلے کاجل کی کوٹھری سے زیادہ اندھیرے میں رکھا اور جو کچھ سُنا سُنایا معلوم ہوا اس قدر اختلاف ہے کہ رقیبوں میں اس قدر ایک دوسرے کے خلاف نہوگا۔ مرنے کے بعد کا حال ایسا خوفناک سنا جاتا ہے کہ مرنے کے نام سے رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں؛

تلوّن مزاجی کا یہ حال ہے کہ ہمکو مٹّی سے بنایا اور پھر مٹّی ہی میں ملادیا۔ زمین سے لالہ وگل نکالے پھر زمین ہی میں ملادیئے۔ نرگس ویاسمن خاک سے پیدا کئے اور ہمارے دیکھتے دیکھتے خاک ہی میں تلپٹ کردئے: بہارِ باغ کو پیدا کیا۔ بنایا سنوارا۔ پھر خزاں کے

ہاتھوں بگاڑ دیا: جان سی بے بہا چیز مفت دی پھر بے قصور چھین لی۔ بلکہ جنہوں نے میاں کی مرضی کا زیادہ خیال رکھا اور جنہوں نے خیال نہیں رکھا اُن کی نظر میں ظاہر ایکساں رہے: جان گو بے بہا تھی کہ خاصانِ خدا کو از روئے احسان الٰہی عطا ہوئی مگر ارزاں بھی ایسی کر دی کہ مور و مگس کو بھی مفت دے دی گئی: ہم سے بے پوچھے ہمیں یہاں بھیجا اور جب ہمارا جی یہاں لگا تو ہمیں اس طرح نکالا کہ مرنے والا تو در کنار دیکھنے والے روتے رہ گئے۔ ہیرے وجواہرات کو لاکھوں برس کانوں (معدن) کے سینہ میں عاشقوں کے راز کی طرح چھپائے رکھا پھر جو مزاج میں کچھ خیال آیا تو دن دھیاڑے سر بازار پھرایا کہ بکے یا نہ بکے: بے مانگے آنکھ ناک کان۔ آب میں موتی سے زیادہ نفیس دانت دیئے کہ ایک ایک کوہ نور سے زیادہ گراں بہا تھا پھر اس طرح چھینے کہ نوالہ چبانا مشکل ہو گیا۔ وہ آنکھیں جو پہروں ٹکٹکی باندھا کرتی تھیں اب پلک سے پلک نہیں اُٹھتی: یہ تلون نہیں تو کیا ہے کہ بچوں کے گھروندوں کی طرح اتنا بڑا کارخانہ بے ضرورت بنے اور بے وجہہ بگڑے؟ بنانے کی ضرورت تو خیر بنانیوالا جانے مگر بگاڑنے کی وجہ تو ہمیں بتائی جائے کہ ہم کیوں بگاڑے جاتے ہیں؟

بے گنتی مخلوق کا پیدا کرنا۔ صرف اتنے کیلئے کہ ایک دوسرے کی غذا کا کام دیں کہ ایک کی موت دوسرے کی زندگی کا باعث ہو: درخت خاک و آب چوس کر جئیں۔ درختوں کو کیڑے لگیں۔ کیڑے پرندوں کی غذا بنیں۔ اور حیوان کسی کو جیتا نہ چھوڑیں: عالم اسباب کیا ہوا گویا اچھا خاصہ مسلخ کا جواب ہوا*

اس پر آپ کہیں گے (اور میں کان دھر کے سنوں گا) کہ جو بات ہمیشہ سے چلی

آئے اُسکا رونا عقلمندی میں داخل نہیں۔ لیکن قدامت میں عقل کم عقلی و اوہامِ باطلہ سے زیادہ قدیم ہے: جو بات سمجھ میں نہ آئے اُس کے سمجھنے کی تدابیر اگر معاصی میں داخل ہے تو نیکی کا خدا حافظ ہے ؛ طالبعلمانہ بحث میں منقول کو معقول پر ترجیح دیجاتی ہے۔ لیکن مجھے آجتک معلوم نہ ہوا کہ نقل کو عقل پر ترجیح دینے کی دلیل کیا ہے ؟ نقل اگر اسی طرح عرصہ سے چلی آتی ہے تو عقل کا نقل سے قدامت میں مرتبہ بڑا ہے کہ اتنا بڑا کارخانہ عالمِ اسباب کا عقل کے بغیر کس طرح بن سکتا تھا ؟ یہ بات اور ہے کہ ہماری سمجھ میں نہ آئے۔ لیکن سمجھنے کی فکر سے ہمارا بنانے والا اس طرح روٹھ جائے کہ منائے سے نہ منے میری سمجھ سے باہر ہے ؛

آپ دیکھیں کہ دُنیا میں انسان کو سب سے زیادہ تلاش خوشی کی رہتی رہی۔ رہتی ہے اور رہے گی: لیکن رات دن کی خوشی اتنی اجیرن ہو جاتی ہے کہ خوشی خود ایک مصیبت بن جاتی ہے ؛ جب خوشی کی شکل رنج کی صورت ہو جائے تو خود رنج کا حال کیا کہا جائے ؟ بات یہہ ہے کہ دنیا میں رنج و راحت دونوں بیکار ہیں۔ عالمِ اسباب کا مدار تلون پر ہے کہ چہرۂ عشاق کی طرح ع ایک رنگ آتا ایک جاتا ہے ؛ دلقِ گدایاں کی طرح اس میں ایک ٹکڑا کسی رنگ کا ہے اور دوسرا کسی رنگ کا ؛ انسان اپنی زندگی دلقِ گدایاں کے پیچھے خراب نہ کرے ع ضایع مکن بہ دلقِ گدایاں گلاب را ؛ گھونس کو عطر میں نہلانا بھینس کے آگے بین بجانی۔ اندھے کے آگے رونا۔ بیوقوفی نہیں تو تضیع اوقات ضرور ہے ؛ یہ سمجھ لیجئے کہ نیرنگیٔ دہر عالمِ اسباب کی رونق کا سبب ہے اس کو ایک حال میں دیکھنے کی ہوس غلطی ہے: جہانتک ہوسکے آپ اسے دور سے دیکھکر چل دیجئے ع از دور نظارہ کردہ بگزر۔ کہ دُور کے ڈھول سُہاونے ؛

قیاسِ صحیح

کہتے ہیں کہ اگلے زمانہ میں سراندیپ کے بادشاہ نے اپنے بیٹوں کا امتحان لینے کے لئے اُن کو پاس بلاکر کہا کہ میری عمر زیادہ ہوگئی ہے سلطنت کا بار تم اپنے ذمہ لو۔ بڑے بیٹے نے جواب دیا کہ خدا حضور کو تا قیامت سلامت رکھے۔ میری مجال ہے کہ حضور کے سامنے میں بادشاہی کا نام لوں؟ اور حضور کے بعد سلطنت کیا زندگی ہی بیکار ہے ؏

مور با آنکہ بر سریر شود ٭ کے سلیمانِ تخت گیر شود

بادشاہ اپنے دل میں خوش ہوا کہ بیٹا سعادتمند ہے۔ دوسرے بیٹے سے یہی سوال کیا: اس نے جواب دیا کہ دو بزرگوں کے ہوتے۔ یعنی آپ کے اور بڑے بھائی کے سامنے مجھے سلطنت زیب نہیں دیتی۔ سر کا بوجھ کندھا ہی سنبھال سکتا ہے یہ بوجھ میری طاقت سے باہر ہے ؏

بر بزرگاں رواست ایں معراج ٭ لولوئے خورد نیست درخورِ تاج

چھوٹے بیٹے سے بھی یہی بات پوچھی۔ جواب ملا کہ بچوں سے بندگانِ خدا کی کہ ودیعت الٰہی ہیں چوکسی[1] مشکل ہے: جب بڑے بھائی اور منجھلے بھائی کی ہمت نہیں۔ میرے

[1] اس لفظ "چوکسی" کی صحت میں صاحبِ عالم جناب ہزبر کا شعر ہے سے آرزو ہی کہ رہوں تیرے در دولت پہ ؛ زندگی بیر میں کروں چوکسی دربان ہو کر۔ (ایڈیٹر)

سلئے یہہ ہوس چھوٹا مونہہ بڑی بات ہے سلہ

کیا کیا نہ خاک اُڑا کے دکھایا ہے اپنا اوج ؛ پر آسمان ہی کو زمیں پر رہا شرف

بڑھاپے میں جو چیز چھوٹنے والی ہوتی ہے اُسکی ہوس زیادہ ہوتی ہے۔ بادشاہ کو عالمگیر بادشاہ کی طرح بیٹوں کی طرف سے دل میں اندیشہ تھا: اس اندیشہ کے مٹانے کے لئے جیسا کہ اُس زمانہ کا دستور تھا تینوں بیٹوں کو راجہ دسرت کی طرح جلاوطن ہونے (یعنی بن اوباس) کا حکم دیا؛ اِس حکم کی تعمیل میں تینوں بھائی شہر بہ شہر جنگل بہ جنگل پھرتے پھرتے ایکدن اتفاق سے کیا دیکھتے ہیں کہ ایک حبشی کالی آندھی کی طرح کسی کی تلاش میں بھاگا چلا آرہا ہے۔ ان سے پوچھا کہ "تم نے میرا اُونٹ دیکھا ہے"؟ اونٹ تو دیکھا نہ تھا مگر ان میں سے ایک بول اُٹھا کہ "تمہارا اونٹ ایک آنکھ سے کانا ہے"؟ حبشی نے کہا "ہے"۔ دوسرے بھائی نے پوچھا کہ "اونٹ کا ایک دانت ٹوٹا ہوا ہے"؟ تیسرے نے کہا کہ "ایک پاؤں سے لنگڑا ہے"؟ حبشی نے جب یہ تینوں پتے ٹھیک سُنے تب اُسے یقین ہوا کہ اونٹ انہوں نے دیکھا ہے۔ ان سے پوچھا کہ اونٹ کدھر کو گیا ہے؟ لڑکوں نے کہا کہ سیدھا چلا جا؛ یہ کہہ کر تینوں ایک درخت کے سایہ کے تلے بیٹھ گئے کہ گرمی زیادہ تھی اور دھوپ تیز۔ پاس پانی کا چشمہ تھا مُنہہ ہاتھ دھو کر ذرا کمر سیدھی کی کہ اتنے میں وہی حبشی پھر دوڑا آیا کہ میں بھاگتے بھاگتے تھک گیا مگر اونٹ کہیں نہ ملا؛ ان لڑکوں میں سے ایک نے کہا کہ تیرے اونٹ پر ایک طرف تیل اور ایک طرف شہد لدا ہوا ہے۔ دوسرے نے کہا کہ اونٹ پر عورت سوار ہے۔ تیسرا بولا کہ عورت حاملہ ہے۔ یہ حال واقعی تھا۔ حبشی کو کامل یقین ہوا کہ میرا اونٹ انہیں تینوں نے غائب کر دیا ہے۔

سلہ دراصل بادشاہ کے لڑکوں یعنی شاہزادوں سے مراد ہے ؛

شور مچایا کہ یہ تینوں اُٹھائی گیرے چور رہزن ہیں۔ جہاں کہیں مال اسباب اونٹ گھوڑا جو ملجائے اُڑا لیتے ہیں ؛ یہ شور سنکر لوگ بہت جمع ہوگئے اور بادشاہ کے پاس پکڑلے گئے۔ بادشاہ نے دریافت کیا کہ تم کون ہو؟ لڑکوں نے کہاکہ ہم غریب مسافر ہیں۔ گردشِ روزگار سے مارے مارے پھرتے ہیں ؎

مانعِ دشت نوردی کوئی تدبیر نہیں ؛ ایک چکر ہے مرے پاؤں میں زنجیر نہیں

پھرتے پھرتے حضور کے شہر میں آ گئے۔ دیکھاکہ یہ حبشی ابر سیاہ کی طرح بھاگا جارہا تھا۔ ہم سے پوچھا کہ تم نے میرا اونٹ دیکھا ہے؟ اس کا اونٹ ہم نے کبھی دیکھا نہ تھا حبشی سے کہدیا کہ ہاں دیکھا ہے ؛ بادشاہ کو یہ عذر پسند نہ آیا۔ ملزم سمجھ کر قید کا حکم دے دیا ؛ یہ رات ان بیچاروں کو بڑی مصیبت میں کٹی کہ ایک تو مسافرت اُسپر سخت جُرم کا الزام کوئی سعی و سفارش کرنے والا نہیں ؛ دوسرے روز صبح کو معلوم ہوا کہ وہ اونٹ لدالدایا معہ اُس زنِ حاملہ کے مل گیا؛ ایک لکڑہارا جنگل میں لکڑی کاٹنے گیا۔ دیکھاکہ اونٹ کی نکیل ببول کے درخت میں اُلجھ رہی ہے۔ لکڑہارے نے نکیل درخت سے نکال کر اونٹ کو عورت سمیت عورت کے پتہ بتانے پر حبشی کے گھر پہونچا دیا ؛ حبشی نے خدا کا خوف کرکے بادشاہ کے حضور میں عرض کیاکہ وہ بیچارے جو قید میں ہیں بے گناہ ہیں۔ رہا فرمائے جائیں ؛

بادشاہ نے تینوں کو اپنے پاس بلاکر خلعت و انعام دیا اور افسوس کیاکہ تم کو بے قصور اذیت پہونچی۔ لیکن حقیقتِ حال تو بتاؤ کہ یہ معاملہ کیا ہے؟ بڑے لڑکے نے عرض کیاکہ میں نے بے دیکھے اونٹ کو ایک آنکھ سے کانا جو بتایا اس کی وجہہ یہ ہے کہ سڑک کے درختوں

کے پتے صرف ایک طرف کے اونٹ کھائے نظر آئے ۔ قیاس میں آگیا کہ اونٹ ایک آنکھ سے کانا ہے۔تب تو ایک ہی سمت کے درخت چرتا گیا ؛ دوسرے لڑکے نے کہا کہ اونٹ کا کھوج ایک پیر کا گھسٹا جاتا تھا اس سے میں نے جانا کہ لنگڑا ہے ؛ تیسرا بولا کہ اونٹ نے جو پتیاں چری تھیں وہ پوری نہیں چریں۔ ایک دو پتی سوچی بے چری رہ گئی۔ میرے ذہن میں آیا کہ اونٹ کا دانت ٹوٹا ہے کہ پورے پتے چرے نہیں جاتے ؛ تیل و شہد کی حقیقت یوں ہے کہ زمین پر کچھ آلائش سی نظر آئی جس پر ایک طرف چیونٹیاں اور دوسری طرف مکھیاں جمع دیکھیں۔ چیونٹیوں سے تیل اور مکھیوں سے شہد کا پتہ لگا ؛ عورت کا پتہ اس طرح چلا کہ جہاں اونٹ بیٹھا وہاں زنانی جوتیوں کا کھوج تھا۔ اور حاملہ اس سبب سے کہا کہ پاؤں کے کھوج کے ساتھ ہاتھوں کے بھی نشان دیکھے۔ میں سمجھ گیا کہ عورت سے حمل کی وجہ سے اونٹ پر چڑھا نہ گیا۔ ہاتھوں کے سہارے سے اُٹھی ؛ شاہزادوں کی ذکاوت سے بادشاہ بہت خوش ہوا اور اپنے ساتھ محل میں رہنے کی اجازت دی ؛ تینوں شاہزادے ایک نہایت آراستہ کمرے میں رہنے لگے۔ بادشاہ اکثر شریک صحبت رہتا ؛

ایک دن بادشاہ کے ہاں سے دعوت میں شراب اور کباب خاصہ میں آئے بڑے لڑکے نے شراب جو چکھی تو کہا کہ اس میں انسان کے خون کی بُو آتی ہے۔ مجھلا بولا کہ کباب کتّے یا بھیڑیے کے گوشت کے ہیں ۔تیسرے نے آہستہ کہا کہ بھائی یہ بادشاہ باورچی کے نطفہ سے ہے ؛ بادشاہ یہ گفتگو چھپا ہوا آڑ میں سُن رہا تھا۔ اُنہیں خبر نہ تھی کہ بادشاہ چھپا ہوا ان کی باتیں سُن رہا ہے ؛

بادشاہ

بادشاہ نے کوتوال کو حکم دیا کہ شراب کھینچنے والے کو حاضر کیا جائے۔ دریافت کیا کہ وہ شراب کیسی تھی؟ شراب والے نے بیان کیا کہ یہ شراب فلاں باغ کے انگوروں سے کھینچی گئی تھی۔ وہ باغ سُنا ہے کہ کبھی پہلے گورستان تھا۔ گورستان خراب جانے کے بعد وہاں باغ لگا۔ اُس باغ کے انگوروں سے یہ شراب کھینچی گئی ؛ قصاب نے بیان کیا کہ جس گڈریئے سے میں کبابوں کے گوشت کے لئے بکری کا بچہ لایا۔ اُس بچہ کو بھیڑیا لے گیا تھا۔ میری کتیہ بڑی شکاری تھی وہ بھیڑیے کے بھٹے میں سے نکال لائی اور کتیہ کے بچوں کے ساتھ کتیہ کا دودھ پی کر بکری کا بچہ پلا ؛

بادشاہ کو جب ان دونوں باتوں کی صحت ہوگئی تو اُس شاہزادوں کے پاس گیا اور اُن کی عقل و فراست کی تعریف کی۔ شاہزادے نہایت ڈر گئے کہ بادشاہ نے کل کی ہماری گفتگو سُن لی اور اب تیسری بات پوچھیگا ؛ شاہزادوں نے ہر چند حیلہ حوالہ کیا مگر بادشاہ نہ مانا اور اقرار کیا کہ تم کچھ خوف نہ کرو تم کو کسی طرح کا آزار نہ پہونچے گا ؛ تمہاری دو باتیں سچی نکلیں۔ تیسری بھی کہہ ڈالو ؛ جب شاہزادوں کو بادشاہ کی طرف سے جان بخشی کا یقین ہوگیا تو جواب دیا کہ :-

"جب سے ہم حضور کے در دولت پر آئے ہیں حضور کا حال ہم غور سے دیکھا کرتے ہیں اور حضور کی باتیں سُنا کرتے ہیں۔ حضور کی زبان پر زیادہ تر کھانے پینے کا ذکر رہتا ہے کہ قورما ایسا ہو اور پلاؤ ایسا۔ خمیری روٹی بہتر ہے یا ڈبل روٹی۔ بریانی کی ترکیب یہ ہے اور بورانی کی یہہ۔ ہمیں شبہہ ہوا کہ حضور کا خمیر سریر سلطنت سے نہیں ہے"

ازنشاں ہائے تاج وتخت وراں ٭ کآدمی راتواں شناخت ازاں
بازجستم یکے ازانت نہ بود ٭ جز دمِ شورِ باونانت نہ بود
نامدت ہیچ ازیں سخن بمیاں ٭ کہ نبودت دراں حکایتِ ناں
گرد روشن فراستم بہ ضمیر
کہ خمیر است نسبتت نہ سریر

یہ سنکر بادشاہ کو رنج تو بہت ہوا مگر دوڑا ہوا اپنی ماں کے پاس گیا کہ اماں سچ بتاؤ میں کس کے نطفہ سے ہوں؟ ماں نے اوّل تو جھوٹھ سچ بہت بہانے بتائے مگر بیٹا ایک نہ مانا۔ بادشاہ کو غصہ بہت بڑھتا گیا آخر کو بیٹے کو نہایت ہی غصہ میں دیکھکر سچ کہہ دیا کہ "بیٹا۔ تیرا باپ تو شکار کو گیا تھا۔ میں محل میں اکیلی تھی کہ داروغہ مطبخ کا جوان سبزہ آغاز لڑکا خاصہ لیکر آیا۔ میری عمر اُن دنوں جوانی کی تھی۔ آگ و پھوس کا ساتھ بُرا" × × × × × × اتنا سُننا تھا کہ بادشاہ کو شرم کے مارے غش آگیا ٭ جب ہوش آیا تو سوچا کہ اب کیا کرنا چاہیئے؟ یہ آفت کے پرکالے اگر یہاں رہ گئے تو خدا جانے کیا کیا بھید کُھلیں گے؟ شاہزادوں کے پاس جاکر کہا کہ پانی بہتا اچھا اور سیّاح چلتا بھلا۔ میں تمہیں اپنے ملک میں زیادہ روکنا پسند نہیں کرتا ٭ بہت انعام اکرام دیکر رخصت کردیا ٭

صلائے عام۔ یہ قصہ حضرت امیر خسرو کی مثنوی ہشت بہشت سے لکھا گیا ہے۔ امیر خسرو نے یہ مثنوی ہفت پیکر کے جواب میں لکھی تھی۔ میں نے

لے یہاں والٹیر کے Zadig نامی قصہ کے متعلق نقل کیا ؛ والٹیر نے اپنے قصہ میں عقل سے قیاس لگانے پر زیادہ زور دیا ہے اور ثابت کیا ہے کہ انسان کتنا ہی راستی و عقل سے کام لے تقدیر کے آگے کچھ نہیں چلتی۔ والٹیر کے قصہ کا ریویو میں علیحدہ لکھوں گا۔ اس وقت مجھے یہ عرض کرنا ہے کہ ولایت میں جو زیادہ نازک خیالی اور پاکیزہ بیانی کے افسانے اور حکایتیں ہیں اکثر ہمارے ہاں کے طرز بیان اور پاکیزہ خیالی کی تقلید کے نمونے ہیں۔ ایڈیسن نے اسپکٹیٹر میں کئی حکایتیں ہمارے زبان کی لٹریچر سے اپنی زبان میں نقل کیں۔ فرنچ زبان کے مصنفوں نے مثلاً مانٹسکیو نے یہی وضع اختیار کی ؛ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہماری لٹریچر میں وسعتِ خیال کی بہت بڑی گنجایش ہے اور افسانہ کے لیے وسعتِ خیال عجیب نعمت ہے ؛

نصیحت

حضرت امیر خسروؒ نے اپنی بیٹی کو اُس کی صغرسنی میں اس طرح نصیحت کی۔

دانہ بے کشت کے بیار آید ؛ آسماں بے زمیں چہ کار آید ؛ ہے چہ ننگ است شد معلوم ؛ چوں مسیحا ز مریمِ معصوم

(عموماً لڑکوں کے پیدا ہونے کی خوشی زیادہ ہوتی ہے مگر لڑکیاں بھی بہت ضروری ہیں ؛)

گرچہ خوردی کنوں و بے تمیز ؛ روزے آخر بزرگ گردی نیز ؛ ماہت از ہفتہ بر نرفتہ ہنوز ؛ روشنی چوں مہ چہار دہ روز

اسیطرح حضرت جامیؒ اپنے لڑکے کو نصیحت فرماتے ہیں ؎ مرا ہفتاد شد سال و ترا ہفت ؛ ترا اقبال می آید مرا رفت

گیرمت سلک گوہرت نبود ؛ بہ ز تسبیح زیورے نبود ؛ پا بہ دامانِ عافیت درکُن ؛ رُو بہ دیوار و پشت بر در کُن

(زیور رہو یا نہ ہو۔ تسبیح سے بہتر کوئی زیور نہیں ؛ پردہ کی تاکید یہ کہ گھر میں بھی دروازہ کی طرف مُنہ نہ کرنا)

راہِ در گم کن اندرون سرائے ؛ گر شل خضر در زند مگشائے ؛ تا سرت از شرف باہ شود ؛ مقنعے بر سرت کلاہ شود

کم دو دشمیر بادہ خوں آشام ؛ گر بہ باشد جہندہ کام بکام ؛ کیک پنہاں خرام را بہ وطن ؛ حجرہ باید بہ بیضہ بے روزن

ریویو

صلائے عام ماہ ستمبر ۱۹۲۳ء

آج تو صلائے عام چھینا جھپٹی سے بال بال ہی بچ گیا۔ اتفاق یہ پیش آیا کہ جب چٹھی رساں ٹرک چھوڑ کر میری کوٹھی پر آ رہا تھا تو اُس نے پہلے ہی سے میری ڈاک کے لفافے اور صلائے عام کا پمفلٹ علیحدہ ہاتھ میں بغرض تقسیم لے لیا تھا ایک سفید پوش جن کا نہ نام معلوم ہے نہ نشان لوح صلائے عام کو تیک پر دیکھ کر کچھ ایسے خود رفتہ ہو گئے کہ بے تکلف چٹھی رساں سے فرمانے لگے کہ کیا یہ پرچہ ہمارے نام ہے؟ اُس نے جواب دیا کہ نہیں مگر ان کو اطمینان نہیں ہوا دوڑ کر چٹھی رساں کے ہاتھ سے لے لیا اور حیرت زدہ نگاہ سے دیکھکر فرمانے لگے کہ میں نے دھوکا کھایا یہ فی الحقیقت ڈپٹی صاحب کے نام ہے ۔ چٹھی رساں نے خدا خدا کر کے اُنسے بچایا چھٹایا ورنہ شہد کی مکھی کی طرح لپٹے چلے آتے تھے۔ حق امر یہ ہے کہ ایک بار لوح کو دیکھکر تو میری روح بھی تازہ ہو گئی ستمبر کا صلائے عام عجب دلکش نظارہ رکھتا ہے۔ جسکا ظاہر ایسا خوشنما ہے اُس کا باطن کیا کچھ خوبیوں سے نہ بھرا ہوا ہوگا۔

میں دیکھتا ہوں کہ لوگوں کو صلائے عام کی دیر رسی یا عدم رسی کی شکایت ہوتی ہے حالانکہ مجھے تو اپنے وقت ملتا ہے کہیں ع "زرمے طلبی سخن دریں است" کا تو مضمون نہیں ہے؟

اس دفعہ مضمون پریشان اپنی خوبیوں میں واقعی لاثانی ہے اور میں نے تو اسکو اس نظر سے دو دفعہ کر کے دیکھا کہ اس کی خوبی کو کسی خاص مضمون کے انتخاب کے ساتھ بیان کروں مگر باور فرمائیے کہ مجھے تو وہ سارا کا سارا ہی مضمون منتخب نظر آیا بس اس کا انتخاب ناممکن ہوا۔ ہر جملہ اسکا وہ قیمت رکھتا ہے جسکا ملنا مشکل ہے ۔ میں تو اسکے سوا اور کیا کہوں کہ جواہرات کا ڈبہ ہے کھولتا ہوں تو بکھرے جاتے ہیں کبھی اسکو اٹھاتا ہوں کبھی اسکو اٹھاتا ہوں اور جسکو نہیں اُٹھاتا وہ رہا جاتا ہے اب یہ کیسے گوارا ہو کہ چھوڑ دوں بہر حال میں تو بھرے میں پڑ گیا ہوں۔ ہر بات اُسکی گرہ میں باندھنے کے لایق ہے ادہر تو مضمون پریشان کہیں دل کو جمنے نہیں دیتا اُدہر محشر خیال نے حشر برپا کر رکھا ہے۔ اس خواب پریشان کی تعبیر بھی آپ ہی کے ہاتھ میں ہے۔ جبتک خیالات ایسے وسیع نہ ہوں ان پریشان خیالیوں کو قلمبند کر دینا آسان نہیں ہے

....جانفشانی اور یہ بیدار مغزی اور یہ صرف آپکیواسطے خاص عطیہ خدا ہے اور بس ۔ آپکا نیازمند عرفان علی (آئی ایس او) آنریری مجسٹریٹ آگرہ

آواگون

آواگون سے اپنا مقصد اُس مسئلہ سے نہیں ہے جسکو عرب تناسخ کہتے اور جسکو روحی تعلقات کے ساتھ منطقی ناممکن ثابت کرتے ہیں بلکہ مقصود صرف لغوی معنوں سے ہے جسکا ترجمہ سیدھا سادا آنا جانا ہے۔ ہاں یہ انتہائی منازل تو اس آنے جانے میں بھی طے کرنا پڑے گی کہ کس کا آنا جانا کہاں سے آنا اور کہاں کو جانا۔ تو اب تین باتیں اس سے پیدا ہوتی ہیں اوّل کس کا آنا جانا دوم کہاں سے آنا سوم کہاں کو جانا۔

اول بات کی نسبت تو جواب میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ انسان کا آنا جانا ملحوظ خاطر ہے مگر انسان معہ اپنے تمام لوازم روحانی وجسمانی اور روحی اور جسمی کے ہے اور اس کے واسطے کسی دلیل کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ ہر انسان جو پیدا ہوتا ہے وہ یہ چاروں چیزیں ساتھ ساتھ لیکر آتا ہے اور اگر ان میں کوئی بھی غائب ہے تو وہ انسانی حالت سے خارج بالیقین ہے۔ اس موقع پر اگرچہ شیخ سعدی علیہ الرحمتہ کو تو محض چار عنصر سے بحث تھی جیساکہ فرما گئے کہ چار طبع مخالف وسرکش ؛ چند روزے بوند باہم خوش گر یکے زین چہار شد غالب ؛ جان شیریں برآید از قالب ۔ اور اس دلیل کے ساتھ نتیجہ بھی اُنھوں نے نکال کر دکھا دیا کہ ۔ لاجرم مرد عارف کامل ؛ نہ نہد بر حیات دنیا دل ؛ نیک و بد چوں ہمیں بباید مرد ؛ خنک آنکس کہ گوئے نیکی برد۔ ہرچند کہ شیخ رح نے جسد انسانی سے تعلق ظاہر کیا ہے مگر نتیجہ میں روح کو لے لیا ہے لیکن ہمکو اس جگہ اون لوازم سے واسطہ ہے جن سے انسان لپٹا ہوا آتا ہے اور وہ روح و روحانی اور جسم وجسمانی ہیں۔ بحث کو عام فہم اور مختصر کرنے کی غرض سے ہم ہر ایک تفصیل کو چھوڑتے ہیں اور صرف اُن مسلمہ امور کو لیتے ہیں جن کو ساری دنیا مانتی ہے مثلاً روح نہ جسم ہے نہ جسمانی مگر جسم میں آباد رہتی ہے نہ کاٹے کٹتی ہے نہ مارے مرتی ہے جیسی کی تیسی بنی رہتی ہے لیکن جب اسکا مسکن ٹوٹ پھوٹ جاتا ہے تو وہ پرواز کر جاتی ہے اور اُجڑے گھر کو پھر لوٹ کر بھی نہیں دیکھتی۔ لیکن ڈہیٹ

بھی اتنی ہے کہ جب تک اسکا سارا گھر نہ ڈھے جاوے تب تک نکالے سے بھی نہیں نکلتی۔ اگر کوئی اس کے مکان کا کونہ ٹوٹ پھوٹ بھی جاوے تب بھی ایسے مرمت طلب مکان میں بھی رہتی ہے اور عجب تماشا ہے کہ مکان کی ساخت جب سے ہوتی ہے تب ہی سے وہ اپنا دخل بھی کر لیتی ہے یعنی اگر انسان کا بچہ دو سیر کا وزن میں ہے تو بھی روح اس میں دخیل ہوتی ہے اور اگر وہ بڑھتے بڑھتے دو من یا چار من کا ہو جاتا ہے جب بھی اسی میں رہتی ہے خود تو جسیم نہیں مگر چھوٹے جسم میں بھی پوری آجاتی ہے اور بڑے جسم میں بھی پوری آجاتی ہے اور گھٹتے بڑھتے جسم میں بھی پوری آجاتی ہے۔ ان سب حالتوں پر نظر کرنے سے وہ کچھ عجیب چیز نظر آتی ہے جو بیان سے باہر ہے۔ خلاصہ تقریر کا یہ ہے کہ انسان جب آتا ہے تو مع روح کے آتا ہے اور بلا روح کے دُنیا میں پاؤں تک نہیں دھرتا اور جب روح لیکر آتا ہے تو یہ بھی ظاہر ہے کہ تمام روحی تعلقات بھی ساتھ ساتھ ہوتے ہیں اور اُن کو ہم روحانی کہتے ہیں یہ تعلقات روح کے ساتھ وابستہ ہوتے ہیں مگر بعض لوگوں کی سمجھ میں باوجود عمدہ علم کے نہیں آتے روحی تعلقات تو پورے طور پر جب ہی سمجھ میں آتے ہیں جب جسمی اور جسمانی تعلقات اور روحانی تعلقات کے درمیان میں کوئی حدِّ فاصل قایم کر دی جاوے اور ایسی حد کے قایم کرنے کے واسطے ہر انسان ہرگز تیار نہیں ہو سکتا کیوں کہ جسمی او جسمانی تعلقات اس کو ایک لحہ قرار نہیں لینے دیتے اور ساری عمر اسی میں ختم ہو جاتی ہے کہ ؎ ایٔ عیش آدمی شکم است ؛ گر بتدریج میرود چہ غم است ۔ اس کے معنی یہ نکلتے ہیں کہ شکم پروری کا ٹھیکہ لینا ہر انسان کے ہاتھ میں ہے اور ایسا فرض ہے کہ اس سے نجات ہی نہیں ملتی پس روحانی تعلقات کا سمجھنا دور از کار ہے روح کو نہ کبھی کسی نے دیکھا نہ وہ کسی کے ہاتھ آئی کچھ عجیب شے ہے نہ اُس کے ہاتھ ہیں پاؤں ہیں نہ بال و پر ہیں مگر عمل دخل ہر جگہ کرتی ہے اور اس کا ثبوت تو ہر شخص کے پاس موجود ہے کہ خود تو رہے جھونپڑوں میں خواب دیکھے محلوں کا۔ آخر شش یہ روح ہی تو ہے کہ جھونپڑوں سے باہر نکل کر محلوں میں جا پہونچتی ہے۔ مگر اپنے تھان کی اتنی پکی ہے کہ جب جاگو تو اُسے ضرور حاضر پاؤ۔

اب ہم کہاں تک بیان کریں کہ روح تو خدائے تعالےٰ کے حکم میں ہے مگر اس کے تعلقات انسان کے ساتھ ہیں پس روح تو سمجھ میں نہیں آتی مگر اس کے تعلقات سے چونکہ انسان کو ہر وقت واسطہ پڑتا رہتا ہے لہذا وہ سمجھ میں ضرور آتے ہیں۔ جب کبھی ہم چوٹ کھا جاتے ہیں تو جسم تو زخم کو دکھلاتا ہے اور درد کرتا ہے مگر روح بتاتی ہے کہ ہائے ہائے چوٹ کھائے۔ اب ہم روح اور روحانی تعلقات کو اس سے زیادہ عرض نہ کریں گے۔ جسمی اور جسمانی حالت تو زیادہ صراحت کی محتاج نہیں ہر شخص سمجھتا ہے کہ ہم جسم رکھتے ہیں اور اس کو برقرار رکھنے اور پرورش کرنے کے تعلقات ہر انسان اپنی اپنی حالت کی مناسبت سے رکھتا ہے اور ارضی و سماوی حوادث اس سے لگے لپٹے ہوئے ہیں کیونکہ جسم کے نشو و نما کی بنیاد اُن ہی سے قایم ہے۔ ہم اگر اپنے جسم کو محفوظ نہیں رکھ سکتے تو روح کی ایذا کا باعث ہو جاتے ہیں۔ چھوٹے موٹے صدمات جسمی بھی صدماتِ روحی کا باعث ہو جاتے ہیں کیونکہ جس طرح ہر انسان مکمل جب اپنا گھر آسایش کا پاتا ہے تو آسایش کے ساتھ زندگی بسر کرتا ہے اسی طرح جب روح اپنے گھر کو جو جسم انسان ہے اچھی حالت میں پاتی ہے تو با خرخشہ خوش رہتی ہے اور اگر ٹوٹتا پھوٹتا رہتا ہے تو روح بھی تکلیف محسوس کرتی رہتی ہے مگر انسان تو ایک ناقص گھر کو تکلیف پا کر چھوڑ بھاگتا ہے اور کوئی دوسرا مکان خواہ ذاتی خواہ مستعار خواہ کرایہ پر محض آسایش پانے کی نظر سے بدل لیتا ہے مگر روح کو کچھ ایسی محبت اپنے گھر سے پڑ جاتی ہے کہ وہ ہرگز نہیں بدلتی اچھا ہو تو اور برا ہو تو وہ اُسی مکان میں اُس وقت تک بنی رہتی ہے جب تک کہ وہ بالکل ناقابل بود و باش ثابت ہو۔ ایسے ہی موقع پر کسی بزرگ کا کلام ہے کہ ع شاد باید زیستن ناشاد باید زیستن۔ اتنی تقریر کرنے سے یہ امر ثابت ہے کہ جسم و جسمانی تعلقات روح و روحانی تعلقات سے پورا واسطہ رکھتے ہیں اور جسم و جسمانی تعلق اگر پیدا نہیں تو روح و روحانی بھی نہ وارد ہیں؛

اس میں ایک چھوٹی سی بحث یہ بھی باقی رہتی ہے کہ تقدّم کس کو ہے آیا جسم و جسمانی تعلقات

کو انسان ہونے کے واسطے تقدّم ہے یا روح و روحانی تعلقات کو اب عقل ظاہر بیں تو یہی کہتی ہے کہ مکیں سے مکان کو تقدم ہے جیسے ایک گلزار کے واسطے زار کا ہونا مقدم ہے اور گل کو تقدّم نہیں ہے مگر جب اس میں گل کھل جاتا ہے تو وہ گلزار کہلاتا ہے۔ اور جو گلزار کی سیر کرتے ہیں وہ دل سے کہتے ہیں ؎ گل عزیز است غنیمت شمرندش صحبت ؛ کہ بباغ آمد شد من راہ ماازاں خواہد شد۔ اس مختصر دلیل سے جسد کو روح پر تقدم ہوتا ہے اور اس کے معنی صریح یہی ہیں کہ خالق مطلق نے جب جسد انسان کو بخشا تو اس میں روح پھونک دی فلہٰذا تعلقات جسمی و جسمانی کو روح و روحانی تعلقات سے بالیقین تقدّم ہے۔

دوسری بات کی نسبت کہ کہاں سے آنا ہوا۔ اس مسئلہ کے حل کرنے میں عقل چکّر کھاتی ہے اور کہنے کو تو سب یہی کہتے ہیں کہ عدم سے آئے لیکن جہاں سے آئے اُس کے واسطے بھی ایسے ہی مقام کی ضرورت ہے جیسے کہ منزل مقصود پر پہونچنے کے لئے مقام درکار ہے جب تک کسی چٹھی رساں کو یہ نہ معلوم ہو کہ مکتوب الیہ کہاں رہتا ہے وہ چٹھی کو لئے لئے پھریگا اور بھٹکتا پھریگا نہ تو مکتوب الیہ کا پتہ ملیگا نہ چٹھی ہاتھ سے دھریگا اور اگر پتہ مکان کا مل جائیگا تو بیشک جسکی چٹھی ہے اس کے ہاتھ دھریگا پر واضح ہو کہ مکتوب الیہ کے دل میں سب سے پہلے یہ سوال پیدا ہوگا کہ چٹھی کہاں سے آئی اور وہ اس مقام کو دریافت کرکے چھوڑے گا جہاں سے چٹھی روانہ ہوئی تھی پس اسی طرح انسان جب دنیا میں آتا ہے تو پہلا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کہاں سے آیا۔ چونکہ آنے والے کو بھیجنے والے یہ پتہ نہیں بتا دیتے کہ تم کہاں سے روانہ کئے جاتے ہو لہذا وہ خود نہیں جانتا کہ کہاں سے آیا اور کوئی خط بھی اس کے ہاتھ میں نہیں ہوتا کہ کوئی کھول کر پڑھ لے کہ فلاں جگہ سے آیا۔ اور جب کسی طرح سے پتہ نہیں چلتا تو خواہ غصّہ کے مارے خفا ہو کر خواہ عدم واقفیت سے زچ ہو کر یہ کہدینا پڑتا ہے کہ کہیں سے نہیں جس کو مہذّب الفاظ میں یوں کہتے ہیں کہ عدم سے آیا ہے اور حالانکہ عدم کوئی مقام نہیں ہے مگر دل کو ڈھارس بندھ جاتی ہے کہ غیب کا حال خدا جانے پس عدم سے آنا سب تسلیم کرلیتے ہیں۔ بعض جو زیادہ نازکخیالی کو دخل دیتے ہیں وہ یہ کہکر دل بہلا لیتے ہیں کہ

عالمِ ارواح سے آیا۔ حالاں کہ پورا جسدِ خاکی لیکر آتا ہے مگر عالمِ ارواح کو اپنی شرافت ظاہر کرنے کو کہہ دیتے ہیں کیوں کہ عدم کے لفظ سے کچھ سُبکی خیالات کی پیدا ہوتی ہے اور عالمِ ارواح کہنے سے روح تازہ ہو جاتی ہے اور شرافتِ انسانی ظاہر ہو جاتی ہے۔ اور شرافتِ انسان میں کسی کو کلام ہی نہیں ہو سکتا کیونکہ یہ بالکل سچ ہے کہ انسان اشرف المخلوقات ضرور ہے۔
اس تمام تقریر کے بعد اگر کوئی ہم سے پوچھے کہ تم کہاں سے آئے تو ہمارا جواب اس کے سوا اور کچھ نہ ہوگا کہ خدا جانے ع فرق است ز آبِ خضر کہ ظلمات جائے اوست ۔ تا آبِ ما کہ منبعِ اش اللہ اکبر است
شاعرانہ مضمون ڈھالنے کے لئے کوئی کہہ دے کہ ع عدم سے جانبِ ہستی تلاشِ یار میں آئے
مگر ہم کب مانتے ہیں یہ تو محض لفاظی ہے اس میں ایک بات بھی ٹھکانے کی نہیں ہے۔

اب تیسری بات سمجھنے اور سمجھانے کو یہ باقی ہے کہ جانا کہاں کو ہے۔ اس کے جاننے میں بھی ہم ویسے ہی کورے دھرے ہیں جس طرح سے کہ دوسری بات کے سمجھنے میں ناقابل تھے اور بالآخر یہ کہنا پڑا کہ خدا جانے۔ مگر اس کے ہم تنہا نہیں بلکہ ساری دنیا قائل ہے کہ جانے کا کوئی مقام بالضرور ہے ورنہ مرنے پر ساری دنیا دم نہ دیتی ایک چھوٹا مثل مشہور ہے کہ بنیہ کوڑی دیکھ کر گرتا ہے (خدا کرے یہ مضمون وہ بنئے نہ پڑھیں جو کوڑی دیکھ کر گرتے ہوں ورنہ مجھے ندامت ہوگی) آخر کچھ نہ کچھ لالچ ضرور ہے جب تو دنیا کو خیرباد کہتے چلے جاتے ہیں اور لطف یہ ہے کہ وہاں پہونچکر جہاں اُنکی منزل ہو نہ اپنوں کو خبر کرتے ہیں نہ پرایوں کو کچھ عجیب بے خبری کے عالم میں جا پڑتے ہیں ہم تو اُن کو کبھی کبھی یاد بھی کر لیتے ہیں سال بھر میں ایک آدھ بار اُن کی نذر و نیاز بھی کر دیتے ہیں مگر وہ کبھی جھوٹے ہاتھوں بھی نہیں پوچھتے۔ اب ہم اگر قیاسات کو دخل دیں تو آمد کے لحاظ سے ہم نے ہمیشہ دیکھا کہ حضرت انسان جب اس دنیا میں آئے تو مُنہ بسورتے اور روتے ہی آئے۔ دو امر سے ہمارا قیاس دور جا چلتا ہے اول تو یہ کہ اپنے اصلی وطن۔ اصلی مکان۔ اپنے ہم جنسوں اور محبوبوں کو چھوڑنے سے دل دُکھتا ہے اور رونا آتا ہے عام اس سے کہ خود چھوڑا ہو یا کسی نے بجبر و تعدی چھڑایا ہو پس جب روتے آتے ہیں تو ترکِ وطن ترکِ مکان ترکِ ہم جنس و ترکِ احبا کا خیال

ایسا دامن گیر حال ہوتا ہے کہ وہ رُلائے بغیر نہیں رہتا۔ دوسرا رُخ ہمارے خیال کا یہ بھی ہے کہ دنیا کی مکروہ صورت دیکھتے ہی مفارقت وطن و مکان و احباب بے ساختہ رُلا دیتی ہے اور یہ افسوس ہوتا ہے کہ ہائے کہاں وبال میں آپھنسے۔ اب اگر سوچ سمجھ کر دیکھئے تو دونوں رُخ ہمارے خیال کے بے بنیاد ہیں کیوں کہ ان کی تائید کہیں سے نہیں ہوتی جتنے کہ انسان جو دنیا میں آچکا ہے اس کو خود نہیں معلوم کہ وہ کیوں آیا تھا۔ اسی طرح انسان کی روانگی کے لحاظ سے ہم مطلق لا علم ہیں خدا جانے کہاں کو جاتے ہیں تو اب یہ مضمون بھیڑ مادیان سے کم نہیں ہے کہ اگر ایک بھیڑ کوئیں میں جا گرتی ہے تو سب بھیریں اس کے پیچھے اس کوئیں میں جا گرتی ہیں اسی طرح سے جب ایک انسان نے اپنی ہستی سے باہر قدم دھرا تو سب اُسی کی پیروی کرتے چلے جاتے ہیں اس کی انکو مطلق خبر نہیں کہ کہاں جاتے ہیں۔ باوجود ان خیالی باتوں کے عقل مندوں کی پیروی کرتے کرتے یہ ماننا پڑا ہے کہ دوسرا عالم کوئی نہ کوئی ضرور ہے اور جب جسد انسانی کو ہم خود آنکھوں سے منتشر ہوتے ہوئے دیکھ لیتے ہیں اور سمجھ لیتے ہیں کہ عناصر نے جن سے وہ جسد ترکیب پائے ہوئے تھا اپنے اپنے عنصر سے میل کھا لیا تو باور کرنا پڑتا ہے کہ روح ضرور کسی دوسرے عالم میں جا پہونچی اب سوائے فرضی باتوں کے یقین کرنے کے واسطے کون سی دلیل ہے کہ روح نے کہاں جا کر اُس عالم میں قیام کیا۔ بعضے تو یہ کہا کرتے ہیں کہ روح نکل جانے پر ڈانواں ڈول پھرا کرتی ہے اور روح چاہے نیکوں کی ہو چاہے بدوں کی دنیا میں بھی دورہ کرتی رہتی ہے مگر پھر ہم یہ کہیں گے کہ سوائے وہم و خیال کے اور کوئی وجہ ایسا باور کر لینے کی سمجھ میں نہیں آتی اور ہم کو یہ کہہ کر باز آنا پڑتا ہے کہ اس کا علم خدا کو ہے اور ہم جو کہیں سو سب گپ شپ ہے

حاصل کلام یہ ہے کہ آنا جانا انسان سے لگا ہوا ہے اور آواگون صحیح ہے۔

اب یہ بیان کرنا ہنوز باقی ہے کہ جب انسان آتا ہے تو روتا ہوا آتا ہے تو جاتے وقت اس کی حالت کیا ہوتی ہے۔ آتے ہوئے تو ہنستے ہوئے کسی انسان کے بچّہ کو آج تک نہیں دیکھا مگر جاتے وقت روتے ہوئے بھی دیکھا ہے اور ہنستے ہوئے بھی دیکھا ہے۔ اس سے

یہ پتہ ضرور چلتا ہے کہ مرنے سے پہلے رنج یا خوشی کا اظہار ہو جاتا ہے اور اس کا تعلق خاص روح سے ہے پس جاتے وقت یا تو روح بیزار ہوتی ہے یا خوش ہوتی ہے اور ایسی صورت میں یہ امر دیکھنے قابل ہے کہ اگر بیزاری ہے تو کیوں اور خوش ہے تو کیوں۔ ان دونوں صورتوں میں اخلاق انسانی کو دخل پورا پورا ہے۔ بیزار تو وہی جاتے ہیں جو سمجھتے ہیں کہ مرتے وقت کچھ اپنے حقوق ایسے چھوڑے جاتا ہے جو عاقبت میں بھی سلئے ہوئے چلا جاتا مگر موت کے قبضہ میں آکر کوئی قابو ایسا ہی چلتا کہ اُن ہی باندھ کر ساتھ لیجاوے یا اس وجہ سے رونا آتا ہے کہ ہنوز کھیلنے کھانے کے دن اور بھی دُنیا میں درکار تھے جن کو قضا کے ہاتھ نے کاٹ دیا اور مُہلت نہیں دی یا اس وجہ سے روتا ہے کہ دوسرے عالم میں جاکر تکلیف کے سوا راحت مُیسّر نہیں ہونا یہ حال کوئی نہ کوئی سبب ایسا ہی دلگیر مرتے وقت درپیش ہوتا ہے کہ وہ رنج کا باعث ہوکر روح کو بیزار کر دیتا ہے اور اس قسم کی تمام صورتیں اُن اشخاص میں پیش آیا کرتی ہیں جن کو دنیا سے بہرہ مندی ہے اور عاقبت کی جنکو خبر نہیں ہے مثلاً بادشاہوں میں محمود غزنوی کی تمثیل ساری دنیا کے پیش نظر ہے کہ باوجود عمر طبعی سے متجاوز ہو جانے کے اور باوجود بے انتہا فتوحات مالی کے اُسکو حرص دُنیا مرتے وقت ازبس بے چین کئے ہوئے تھی اور روح کو مفارقت سے بیزاری پیدا تھی۔

مگر ہنستے اور خوش ہوتے ہوئے اُن لوگوں کی روح دوسرے عالم کو پرواز کرتی ہے جو اخلاقِ حمیدہ سے متصف ہیں اور اپنی موجودہ حالت پر قانع اور شاکر ہیں یعنی جن کو نفس مطمئنہ نصیب ہے وہ جب جاتے ہیں ہنستے اور خوش ہوتے جاتے ہیں۔ اب ہم اس مضمون کو زیادہ طول نہیں دینا چاہتے اور اس رباعی پر خاتمہ کرتے ہیں کہ

یاد داری کہ وقت زادن تو ؛ ہمہ خنداں بودند و تو گریاں ؛ آنچناں زی کہ وقتِ مُردنِ تو ؛ ہمہ گریاں شوند و تو خنداں

اسی وقت کے لئے کہ روح کو ابتدا ہی سے دُنیا کے سود و زیاں بالکل بے وقعت شمار کئے جاتے ہیں ؎

سود و زیانِ مایہ چو خواہد شد ز دست ؛ از بہرِ این معاملہ غمگیں مباش و شاد

راقم مرزا عرفان علی بیگ آئی۔ ایس۔ او۔ آگرہ

ریویو

پرانی دہلی کی لوہے کی لاٹھ کی نسبت واقعات اور تخیلات

نوشتہ ڈاکٹر جے۔ پی ایچ۔ ووگل صاحب بہادر۔ پی ایچ ڈی

(از رشحاتِ قلم جناب مولوی بشیر الدین احمد صاحب دہلوی۔ تعلقہ دار۔ ایم۔ آر۔ اے۔ ایس (لندن))

۱۲ر دسمبر سنہ ۱۹۱۱ء کے دربارِ شاہی کے رو سے دہلی شہر کے دار السلطنت کے قرار داد کے اعلان نے ہندو اور مسلمان دونوں کے قومی خیالات میں ایک قسم کی تحریک پیدا کر دی ہے کیوں کہ مسلمانوں کے دورِ حکومت اور عروج کی مدتِ مدید میں دہلی ہی اُن کی عظمت و جبروت اور سطوت کا مرکز رہا ہے۔ دہلی کے سات شہروں کے وسیع رقبے میں اب بھی مسلمانوں کے تمامی دورِ حکومت کی تاریخی یادگاریں مساجد اور مقابر جابجا بکھرے پڑے ہیں جن میں سب سے پرانی یادگار قطب مینار اور اسی کے ملحقہ مسجد ہے جو مسلمانوں نے سنہ ۱۱۹۳ء میں فتح ہندوستان کے بعد ہی بنائی تھی۔

ہندوؤں کی روایات کو دیکھو تو وہ اس سے بھی پرانے زمانے کے واقعات پر روشنی ڈالتی ہیں۔ وہ اسی سرزمین کو پانڈوؤں کے اُس قدیم شہر اندرپرستھ کا مقر بتلاتے ہیں جس کی داستان سنسکرت کے بڑے رزم نامے مہابھارت میں مذکور ہے۔ چنانچہ زمانۂ حال کا وہ گاؤں جس کا نام اندرپت ہے اور جو دہلی کے سات شہروں میں سے شیر شاہ اور ہمایوں کے قلعۂ کہنہ کی زمین پر بسا ہوا ہے ان روایات قدیمہ کی تصدیق کرتا ہے بریں ہم کوئی قدیم عمارت اُس زمانے کی ایسی اب تک دریافت نہیں ہوئی جس سے کسی شک کی گنجائش باقی نہ رہے۔

قدیم کتبوں کے مواد سے یہ امر تو بے شک یقینی ہے کہ مسلمانوں کے عہد سے پہلے

دہلی کی

دہلی کی کوئی ممتاز حیثیت نہ تھی بلکہ دہلی نے مسلمانوں ہی کے حملوں کے دوران میں قعرِ گمنامی سے سر اُبھارا ہے۔ دہلی کے آخری ہندو حکمراں راجہ پرتھی راج کو جب **شہاب الدین** نے قتل کرکے دہلی کو فتح کیا اُس وقت البتہ دہلی کو کچھ کچھ وقعت حاصل ہو چکی تھی جس کا ثبوت اب بھی مندروں کے موجودہ ستونوں اور عربی کے ایک کتبے سے ہوتا ہے جس میں ستائیس مندروں کا ذکر ہے اور یہ وہی ستون ہیں جن کو **اورنگ زیب** نے اپنی بناکردہ مسجد میں لگایا ہے۔ ان ہندوانی دالانوں کے علاوہ دہلی میں مسلمانوں کے زمانے کے پیشتر کی صرف اور تین یادگار ہیں۔ دو تو **اسوکا** کے ستون ہیں جن پر کتبے ہیں اور جن کو کسی دوسرے مقام سے لائے ہیں۔ یہ ستون **فیروز شاہ تغلق** کے حکم سے دارالسلطنت میں لائے گئے تھے جن کی مفصّل کیفیت بہ صراحت سخت مشکلات حمل ونقل خود بادشاہ موصوف چھوڑ گیا ہے۔

تیسری یادگار یہی آہنی ستون ہے جو "لوہے کی لاٹھ" کے نام سے مشہور ہے اور قصبۂ مہرولی سے بالکل قریب **قطب الدین ایبک** کی مسجد **قوت الاسلام** کے صحن میں کھڑا ہے۔

یہ بات ظاہر ہے کہ اوّل تو یادگار خود غیر معمولی اور پھر اُس پہ کا کتبہ وہ بھی ایسے خط میں جو بجائے خود مُغلق ہو یہ اسباب ہیں جو خود طرح طرح کے تخیلات کو اور بھی اُبھارتے ہیں۔

سب سے پہلے عرب سیاح **ابنِ بطوطہ** نے جو **محمد تغلق** کے زمانے میں دہلی میں تھا اُس نے اپنے سفرنامے میں قطب الدین ایبک کی عظیم الشان مسجد کے تذکرے کے ضمن میں اس آہنی ستون کا بھی ذکر کیا ہے کہ "ہفت جوش" یعنی سات دھاتوں سے مرکب ہے لیکن اُس نے کہیں اس کتبے کا ذکر نہیں کیا جو زمانۂ حال میں اس ستون کی بڑی عجائبات میں شمار کیا جاتا ہے۔ رہا اُس کا دھاتوں سے مرکب ہونا۔ ممکن ہے کہ یہی ایک بات اُس کی نوٹس میں لائی گئی ہو سو وہ بھی صحیح نہیں۔

طامس کاریاٹ یہ وہ سیاح ہے جو سب سے پہلے پہل مُلکِ ہندوستان میں آیا تھا اس نے اپنے ایک خط میں جو مسٹر **اِل وِھیٹکر** کو تحریر کیا تھا یہ لکھا ہے:-

''از دربارِ قوی شوکت شہنشاہ المخاطب بہ مغلِ اعظم مقیم شہر اسمیر واقع ہندِ مشرقی ۱۶۱۲ء - میں اس ملک میں ہوں جو ڈلی (غالباً دہلی) کہلاتا ہے جہاں سکندرِ اعظم نے پورس بادشاہِ ہند سے جنگ کی اور اس پر فتح حاصل کی اور اس نے اپنی فتح کی یادگار میں ایک براس کا (پیتل) ستون استادہ کیا تھا جو آج تک وہاں برقرار ہے''

کار سٹیفن صاحب نے اس فقرے کو نقل کرتے ہوئے فرض کر لیا ہے کہ اس سے مراد اسوکا کے دو ستونوں میں کا ایک ہے لیکن مجھے جناب سر ایڈورڈ میکلیگن کی رائے سے اتفاق ہے کہ زیادہ اغلب یہ ہے کہ اس سے مقصود قطب والا آہنی ستون ہے لیکن ٹری، کوریاٹ (سیاح) کے حوالے سے کہتا ہے کہ وہ ستون سنگ مرمر کا تھا۱؎

بالکل اسی قسم کا بیان ''لسٹ آف کنٹریز آف انڈیا'' میں بھی پایا جاتا ہے جو سر طامس رو کے جرنل کے آخر میں ہے کہ ''بڑا شہر جو ڈلی کہلاتا ہے دریائے جمن کے شمالی مغربی جانب واقع ہے جو گنگا میں جا کر ملتا ہے آگرے پر سے ہو کر گزرتا ہے - یہ ایک قدیم شہر ہے جو شاہان مغلیہ کے آباو اجداد کا دارالسلطنت ہے - اب ویران ہے - بعض لوگ کہتے ہیں کہ یہ پورس کا دارالسلطنت تھا جس پر سکندر نے فتح حاصل کی تھی اور یہیں ایک ستون کھڑا ہے جس پر یونانی زبان کا کتبہ ہے''۲؎

اسی روایت کو کہ دہلی کسی زمانے میں پورس نامی بادشاہ کا دارالسلطنت تھا جو سکندرِ اعظم کا نامور مدِمقابل جین ڈی تھیونات فرانسیسی سیاح نے بھی بیان کیا ہے لیکن یہ جو یادگار فاتح میسیڈونیا (یونان) نے اپنی فتح کی بنائی تھی وہ جیسا کہ اس کے خبر دہندوں نے ظاہر کیا - آہنی ستون نہ تھا بلکہ اسوکا کا فیروز آباد والا ستون تھا - لیکن سیاح مذکور کو پھر بھی اس روایت پر وثوق نہیں اور شک باقی تھا جیسا کہ بصراحت اس کے سفرنامے میں مذکور ہے۳؎

۱؎ از کار سٹیفن ''آرکیالوجی اینڈ مانیومنٹل ریمینز آف دہلی'' لدھیانہ وکلکتہ ۱۸۷۶ء صفحہ (۱۳۰) - ای - ڈی میکلیگن ''ارلی انگلش وزیٹرز ٹو دی پنجاب'' مندرجہ جرنل پنجاب ہسٹاریکل سوسائٹی جلد اول ۱۹۱۰ء صفحہ (۱۱۵) - ۱۲ - ۲؎ ہکلوائی ٹش پاسٹمس یا پرچاس ہز پلگرمز - لندن ۱۶۲۵ء - جلد اول اوّل صفحہ ۵۷ - الف - ۱۲ - ۳؎ سفرنامہ جین ڈی تھیونات پیرس ۱۶۸۴ء صفحہ (۱۲۰) - الف - ۱۲ -

فرین کائیس برنیر اورنگ زیب کے دربارِ شاہی کے طبیب نے بھی اپنے سفرنامے میں اس آہنی ستون کا تذکرہ کیا ہے۔ اگرچہ اس میں خاص کر ستون کا ذکر نہیں ہے لیکن جس کتبے کا ذکر ہے وہ بادی النظر میں اسی آہنی ستون کا کتبہ ہے کیوں کہ مقام کا تعین کیا ہے کہ کوتیا قطب الدین (یعنی خواجہ قطب الدین) اور دلیورا کے مندر کا ذکر ہے جو کسی زمانے میں اسی جگہ تھا جہاں کہ اب مسجد قوت الاسلام ہے[1]

ایک اور ہم عصر ونیشین سیاح نکولاؤ منکی نے بھی آہنی ستون کا تذکرہ کیا ہے اور اس نے مذکورہ بالا فرانسیسی سیاح کی بہ نسبت قدرے وضاحت سے لکھا ہے۔ چینیوں کے ہندوستان میں آنے کی بحث میں منکی نے اپنے دعوے کے ثبوت کے استدلال میں حسبِ ذیل دلائل پیش کرکے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ "چینی کسی زمانے میں ہندوستان میں برسرِ حکومت رہ چکے ہیں جن کو پٹھانوں نے بے دخل کیا:" میں جب ہندوستان میں تھا (۱۶۵۳ء۔۱۶۵۳ء) میں نے بہت سی قدیم عمارتیں دیکھی تھیں جن کے پتھروں پر بہت سی چینی مورتیں اور حروف اور اسی قسم کے اور چیزیں کھدی ہوئی تھیں جن سے مجموعی طور پر یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ چینی لوگ یہاں رہ چکے ہیں۔ دہلی کے شہر سے دو لیگ کے فاصلے پر ایک قدیم شہر ہے جو "خواجہ قطب الدین" کہلاتا ہے۔ یہ نام ایک قدیم درگاہ سے پڑا ہے۔ جو اب بھی موجود ہے مگر اس کے بانی فنا ہوگئے۔ اس جگہ میں نے بارہا ایک بہت پرانا دالان بڑے بڑے پتھروں کا بنا ہوا دیکھا ہے۔ اسی دالان کے سامنے ایک برنجی ستون پتھروں کی چٹان میں گڑا ہوا ہے۔ یہ ستون اونچان میں دو بام اور دور میں نو بالشت ہے۔ اس ستون پر کچھ حروف کندہ ہیں جنہیں آج تک کوئی نہ جان سکا کہ کیا ہیں۔ اگرچہ بہت سے لوگوں نے جہاں تک ممکن تھا اس امر کے معلوم کرنے میں کوشش بھی کی کہ اس کتبے سے کیا مقصود ہے۔ یہاں کے باشندے کہتے ہیں کہ حروف

[1] سفرنامہ برنیر انگلش ایڈیشن مرتبہ دی۔ اے۔ سمتھ۔ لندن ۱۹۱۴ء صفحہ ۲۸۳ - ۱۲

چینی زبان کے ہیں[۵۰]"۔

زمانِ مابعد کے سیّاحوں میں سے ہم صرف لارڈ بشپ ریجنالڈ ہیبر کے ایک خط مورخہ مارچ سنہ ۱۸۲۵ء سے اقتباس کرتے ہیں جو اکبر شاہِ ثانی کے زمانہ میں دہلی آئے تھے۔ وہ یہ ہے:-

"سب سے قدیم چیزوں میں سے جو میں نے دیکھی ہیں جن کا زمانہ متحقق نہیں ہو سکتا چند منتشر ٹکڑے سنگِ مرمر کے ہیں جن پر کچھ کندہ ہے مگر کچھ بہت پُرانے نہیں ہیں اور دو عجیب و غریب ستون سیاہ مخلوط دھات کے ہیں۔ جن میں کا ایک دہلی کے قریب پٹھانوں کے قلعہ میں ہے اور دوسرا اُسی کے قریب قطب مینار میں دونوں ایسے کتبوں سے لپے ہوئے ہیں جو کسی سے پڑھے نہیں[۵۲] جاتے لیکن دونو کا ذکر مسلمانوں کی تاریخ میں موجود ہے کہ یہ اسی جگہ اُس زمانے میں بھی تھے جب کہ مسلمانوں نے دہلی کو سنہ ۱۱۹۳ء میں فتح کیا تھا"۔

بشپ صاحب نے بھی سترھویں صدی کے بعض دوسرے سیّاحوں کی طرح فیروز آباد کے ستون کو غلطی سے دھات کا سمجھ کر اُنہوں نے اپنے سفرنامے میں یوں لکھا ہے:-

"یہ (فیروز آباد) خاص کر ایک بلند سیاہ ستون کے لئے مشہور ہے جو دھات کا ڈھلا ہوا ہے جو "فیروز کی لاٹھ[۵۳]" کہلاتا ہے۔ یہ اصل میں ہندوؤں کی صنعت ہے۔ میں اس نشان کو سیوا کا نشان سمجھتا ہوں جو اسی جگہ ایک مندر میں کھڑا تھا۔ جس کی نسبت اُسی قسم کی روایت چلی آتی ہے جیسی کہ "سکالش کے سنگِ تاجپوشی"

---

۵۱ "سٹوریا ڈی موگر آر مغل انڈیا" (سنہ ۱۶۵۳ء - سنہ ۱۷۰۸ء) مصنفہ نکولاؤ منّکی وینشیئن۔ مترجمہ ولیم آر وین۔ لندن سنہ ۱۹۰۷ء۔ جلد اول صفحہ ۱۵۱۔ الف الف ۱۲۔

۵۲ اب پڑھ لئے گئے۔ جب اسوکا کی لاٹھوں کی نسبت کوئی جداگانہ مضمون لکھا جائیگا تو اس کا مفصل تذکرہ کیا جائے گا۔ من المترجم ۱۲

۵۳ لاٹھ کو بشپ صاحب نے لٹھ سمجھ کر *Firoze's walking stick* لکھا ہے۔ یعنی فیروز شاہ کا عصا۔ اور دوسری سہو اُن سے یہ ہوئی کہ فیروز شاہ کی لاٹھ کو دھات کا لکھا ہے حالاں کہ وہ گرنڈ کے بھربھرے سفید پتھر کی ہے۔ ۱۲۔

کی ہے کہ جب تک یہ برقرار رہے گا برہما کے بال بچوں کی حکومت اندرپت میں قایم رہے گی"۔
اور آگے چل کر بشپ نے پھر اسی آہنی ستون کا یوں ذکر کیا ہے:۔

" ان بڑی محرابوں میں سے سب سے بڑی محراب کے سامنے ایک دھات کا ستون فیروز شاہ کے قلعہ والی لاٹھ کی طرح کا ہے اور ہندوؤں کے محل اور مندر کے گرے پڑے کھنڈروں کا بہت کچھ باقی ماندہ حصہ ہے یہ قطب کی بنا سے بھی بہت پہلے کا ہے اور یہ چیزیں اگر اسی قسم کے قرب و جوار میں نہ ہوتیں تو میں ان کو نادر چیزیں سمجھتا"[1]

انیسویں صدی کے سیاح آہنی ستون کی نسبت ایسے بادہوائی خیالات کا اظہار نہیں کرتے کہ یہ سکندر اعظم کی یادگار ہے۔ اب یہ بات متحقق ہو چکی ہے کہ فاتح میدونیا کی افواج بجانب مشرقی کبھی بھی دریائے بیاس سے آگے بڑھی ہی نہیں۔ البتہ واقعات تاریخی کے اظہار میں اس آہنی ستون کی اس پرانی عجیب وغریب روایت کا ذکر جو ہندوؤں کی سلطنت کے زوال اور مسلمانوں کے فتح دہلی کے متعلق ہے ادبدا کر کیا جاتا ہے۔

جو روایت چاند بھاٹ نے اپنی کتاب " پرتھی راج راسا" میں بیان کی ہے اُسی کا اعادہ سر سید احمد خان نے اپنی مشہور کتاب آثار الصنادید[2] میں اس طرح کیا ہے:۔

" رائے پتھورا سے (پرتھی راج) کے زمانے میں نجومیوں نے عرض کیا کہ ہم ایک ایسا ستون آپ کے شہر میں بنادیں گے کہ جب تک وہ قایم رہے گا آپ کی سلطنت منقطع نہ ہوگی رائے پتھورا نے اس کا سبب دریافت کیا۔ پنڈتوں نے جواب میں ستاروں کی گردش اور اُن کے اثرات بیان کئے جو رائے پتھورا کی سمجھ میں نہ آئے اور چوں کہ اس کی تعمیر میں صرفہ زیادہ

[1] آر ہیبرہ جرنی تھرو دی اپر پراونسز آف انڈیا (۱۸۲۴ء-۱۸۲۵ء) دوسرا ایڈیشن ۱۸۲۸ء جلد دوم صفحہ (۲۹۱) و (۳۰۷) و جلد سوم صفحہ (۳۹۴)۔۱۲

[2] یہ عبارت اصل کتاب آثار الصنادید کی نہیں ہے بلکہ ایم گارسن ڈی ٹاسی کے فرنچ ترجمے کا ترجمہ ہے جو حصہ اول صفحہ (۹۵) الیف الیف جرنل ایشیاٹک سلسلہ پنجم میں درج ہے۔۱۲

تھا اُس نے ہمت نہ کی۔ آخرِ کار ایک پنڈت نے جو بہت سن رسیدہ اور نہایت دانشمند تھا خیال کیا کہ بدون راجہ کی تفہیم کے مقصد برآری نہ ہوگی اور یہ بھی سوچا کہ کَلِّمُوا النَّاسَ عَلٰی قَدرِ عُقُولِھِم[1] اُس نے ایک ایسی داستان گھڑی جو راجہ کی سمجھ میں آجائے"

"اس ارادے سے پنڈت نے ایک دن پھر اس معاملے کو چھیڑا۔ رائے پتھورا نے حسبِ معمول پھر سبب پوچھا۔ پنڈت نے دست بستہ عرض کی کہ یہ بات ایسی نہیں جو عرض کی جا سکے لیکن چونکہ آپ کو اصرار ہے تو ذرا آپ تخلیئے میں تشریف لے چلیں اور سب کچھ سُن لیں۔ مگر کسی اور سے اس بات کا ذکر نہ فرمائیں"۔

"راجہ فوراً پنڈت کو اپنے ساتھ لے تخلئے میں چلا گیا۔ جہاں پنڈت نے یوں عرض کیا۔ اے مہاراج پرتھی راج! سُنئے۔ تمام روئے زمین کا مالک اور خدا راجہ باسک[2] ہے۔ یعنی سانپوں کا خدا جو تمام روئے زمیں پر پھرتا رہتا ہے۔ چند دنوں میں وہ یہاں آنے والا ہے تب ہم اس ستون کو اُس کے پھن پر گاڑ دیں گے نہ یہ ستون اپنی جائے سے ہٹے گا نہ راجہ باسک اور کہیں جا سکے گا نہ اس سلطنت کو زوال ہوگا۔ یہ بات راجہ کی سمجھ میں آگئی اور اُس نے ستون کے گاڑے جانے کا حکم دے دیا۔ سارے پنڈت جمع ہوئے اور ستاروں کی صورت دیکھ کر نیک ساعت میں ستون کو گاڑ دیا۔ راجہ نے پنڈتوں سے پوچھا کہ آیا۔ ستون راجہ باسک کے پھن پر گڑ بھی گیا؟۔ جس کا جواب اُنہوں نے اثبات میں دیا۔ کچھ عرصے بعد رائے پتھورا کو شبہ ہوا اور یہ گھبراہٹ ہوئی کہ پوچھوں تو کہ آیا واقعی ستون راجہ باسک کے پھن پر برابر گڑا ابھی ہے یا

---

[1] لوگوں سے اُن کی عقل اور سمجھ کے موافق بات کرنی چاہئے۔ ۱۲

[2] سنسکرت کا ناگا راجہ واسُکی جس کی اب بھی بنام نہاد باسک یا باشگی حصص مغربی کوہِ ہمالیہ میں کثرت سے اور خصوصاً وادیِ بھادروا ریاستِ جموں کشمیر میں پرستش کی جاتی ہے۔ اور ہمارے ہاں بھی عورتوں میں ایک کہاوت چلی آتی ہے کہ "راجہ باسک مرے کوئی روتا نہیں۔ جیسی پیا لہ ٹوٹا کوئی جوڑتا نہیں۔ یعنی سانپ کے مرنے پہ کوئی روتا نہیں اور انڈا ٹوٹ جائے تو کوئی جوڑتا نہیں۔ ۱۲

ہیئتِ ملیّہ

نہیں بنا بُر علیہ راجہ نے پھر پنڈتوں کو طلب کیا اور کہا کہ راجہ باسک کا پھن دکھلاؤ یا ستون کو اکھاڑو کہ میں دیکھوں کہ ستون کی جڑ خون آلود ہے یا نہیں۔

پنڈتوں نے راجہ کو اس ارادے سے باز رکھنے کی جتنی کوشش کی اس نے ایک نہ سنی اور ستون کو اکھڑوا کر چھوڑا۔ وہاں کیا دھرا تھا؟ راجہ باسک کے خون کا پتہ بھی نہ تھا! لیکن پنڈتوں نے اپنی بات کے سچ کرنے کے واسطے کسی چالاکی سے ستون کی جڑ میں تھوڑا سا خون لگا دیا اور کہا کہ دیکھئے دیکھئے ستون عین راجہ باسک کے پھن پر گڑا ہوا ہے یا نہیں۔ رائے پتھورا کو بڑا رنج ہوا کہ میں نے ناحق اکھڑوایا اور فوراً اسی وقت پھر جوں کا توں گڑوا دیا۔ لیکن اب گڑوانے سے کیا ہوتا تھا؟ وقت تو نکل گیا تھا۔ اس واقعہ پر کچھ زیادہ دن نہ گزرے تھے کہ مسلمان آدھمکے۔ رائے پتھورا دو حال سے خالی نہیں یا تو مارا گیا یا قید کرکے غزنی بھیج دیا گیا۔ اور ملک پر مسلمانوں کا تسلط ہو گیا۔"

سر الگز نیڈر کننگھم واقعہ مذکورۂ بالا کو تمارا خاندان کے راجہ اننگ پال سے منسوب کرتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ:-

"عام طور پر یہ روایت مشہور ہے کہ یہ آہنی ستون بیلان دیو المعروف بہ اننگ پال بانیِ تمارا خاندان کا بنایا ہوا ہے جس کو ایک ذی علم برہمن نے یقین دلایا تھا کہ ستون کا حصۂ زیرین اتنا عمیق گاڑا گیا ہے کہ وہ دُنیا کے سانپوں کے بادشاہ پر جو زمین کو اپنے سر پر اُٹھائے ہوئے ہے۔ جا کر ٹکا ہے۔ اب یہ ستون کسی طرح جنبش نہیں کھا سکتا اور جب تک یہ ستون اپنی جگہ پر قایم ہے۔ یہ سلطنت بھی اسی خاندان میں قایم و برقرار رہے گی۔ لیکن راجہ کو برہمن کی بات میں شک ہوا اور ستون کے قلع قمع کا حکم دے دیا تب معلوم ہوا کہ واقعی ستون کا حصۂ زیریں سانپوں کے بادشاہ کے سر میں گڑ گیا ہے اور اسی کے خون سے بھرا ہے۔ راجہ اپنی اس بد عقیدتی پر متاسف ہوا اور ستون کو پھر اپنی جگہ پر گڑوا دیا۔ لیکن راجہ کی پہلی سوءظنی کا نتیجہ یہ ہوا کہ کسی تدبیر سے وہ ٹھیک نہ بیٹھا اور باوجود تمام

کوششوں

کوششوں کے زمین میں ڈھیلا ہی رہا اور یہی اصلی وجہ تسمیہ دہلی کے قدیم شہر کی کہی جاتی ہے۔[1] کننگھم صاحب کہتے ہیں کہ اس روایت کو بہت سے لوگوں نے مختلف طریقوں سے بیان کیا ہے۔ لیکن اصل مطلب سب میں یکساں ہے۔ بدعقیدت راجہ اور سانپوں کے راجہ کی داستان۔ جس کے پھن پر ستون ٹھونکا گیا تھا یہی لفظ دہلی کا ماخذ قرار دیا گیا ہے جو مشتق ہے ایک ہندی کے اسم صفت "ڈھیلے" سے جس کے معنی ہیں جو مضبوط اور جما ہوا نہ ہو یا ہلتا جلتا ہو روایت جو بیان کی جاتی ہے اگر اُس سے قطعِ نظر بھی کیا جائے تو بھی لفظِ دہلی کا ماخذ اور اشتقاق قابل تعریف ہے۔ جہاں کہیں سنسکرت کے پُرانے کتبوں میں دہلی کا ذکر آیا ہے ڈھلی۔ ڈھلیکا اور ڈھیلی۔ لکھا گیا ہے۔ لفظ ڈھلی۔ اسمِ صفت ڈھیلے کا مؤنث ہے۔ کیونکہ سرزمین دہلی کی ابتدائی حالت یہی تھی کہ زمیں بہت بودی اور پلپلی تھی۔

اگلے زمانے کے لوگوں کے خیالات جن کا اقتباس اوپر درج کیا جا چکا ہے ان میں کچھ نہ کچھ دل آویزی ضرور ہے اور آثارِ قدیمہ کے مغربی اور مشرقی محققین آثار قدیم کے لئے جنھوں نے بالاشتراک جس قدر مواد فراہم کیا ہے اُس پر اُن کا فخر حق بجانب ہے۔ جیمس پرنسپ کی بیدار مغزی کے ہم ممنون ہیں کہ اُنھوں ہی نے سب سے پہلے اس رازِ سربستہ کو حل کیا۔ یہ امر واقعی ہے کہ یہ عالم متبحر بھی وہلۂ اول میں اس کتبے کو بالکل صحیح صحیح اور پوری طرح تشفی بخش طور پر ان مشکلات کو حل کرنے میں پوری کامیابی حاصل نہیں کر سکا۔ لیکن بات یہ ہے کہ ایسے مشکل امور میں مرۃً بعد اُخریٰ۔ بہ تدریج اور بہت سے دوسرے ماہرین کی امداد استعانت سے ہی اصل اور صحیح مطلب متحقق ہوتا ہے۔ ۱۸۳۸ء میں پرنسپ صاحب نے کپتان ٹی۔ ایس۔ برٹ صاحب رائل انجینیر کی امداد سے اس کتبے کا فی الجملہ صحیح اور ٹھیک ٹھیک چربہ اور ترجمہ ساتھوں ساتھ شایع کیا لیکن بعد کی جانچ پرتال کتبے کے پڑھنے اور اسی سبب سے اُس کے ترجمے میں بھی بہت کچھ گنجایش

---

[1] رپورٹ آرکیالوجیکل سروے آف انڈیا۔ جلد اول صفحہ (۱۶۱) الیف الیف۔ جس میں اس روایت کی مختلف شکلیں بیان کی گئی ہیں۔ اور جلد ہستم صفحہ (۱۹۲) الیف الیف میں بھی اسی کا ذکر ہے۔ ۱۲

(گذشتہ سے پیوستہ)

داستانِ عہدِ گل را از نظیری می شنو
اتالیق الامراء
عندلیب آشفتہ تر گفت است این افسانہ را

صادق علیخاں کا خط ایک دوست کے نام جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ تعلیم تربیت کے کیا نتائج ہیں

مکرم بندہ سلامت سلام کے بعد عرض مدعا۔ میں بطور سیر سیاحت اس ملک میں آنکلا ہوں آجکل ریاست خیر آباد کی سیر کر رہا ہوں اور اسکے مختصر حالات سے آپ کو مطلع بھی کرنا چاہتا ہوں۔ ریاست خیر آباد ایک اوسط درجہ کی خود مختار ہندوستانی وضع کی ریاست ہے اسکی دس لاکھ کی آبادی ہے اور پچاس لاکھ سالانہ کی آمدنی ہے۔ موجودہ رئیس کا نام شوکت علیخاں ہے۔ انکو مسند نشین ہوئے گیارہ برس کا عرصہ ہوا پانچ برس ہوئے کہ انکو گورنمنٹ ہند سے کامل اختیارات ملے ہیں۔ اتفاق سے آجکل اس ہر دلعزیز نواب کی پیدایش کا جشن ہے۔ شہر میں اور محلات میں سالگرہ کی تقریب میں بہت چہل پہل ہو رہی ہے۔ اور دور نزدیک کے اکثر مہمان جمع ہیں ان میں گرد نواح کے انگریزی علاقہ کے سول ملٹری انگریزی یورپین افسر بھی شریک ہیں۔ یہاں میری گو کسی سے سابقہ شناسائی نہ تھی مگر بفرط اخلاق و مہمان نوازی مجھے بھی اس خوشی میں شریک کیا گیا ہے۔ شوکت علیخاں کی عمر گرامی کا یہ چوبیسواں سال ہے جو شروع ہے۔

انکو ان کے والد ماجد نے جب یہ سات برس کے تھے ایک بزرگ پاکیزہ نفس لیاقت علیخاں المخاطب لیاقت یار جنگ کے سپرد کیا تھا ان کی کل تعلیم اور تربیت لیاقت یار جنگ کی نگرانی میں ہوئی ہے یہ ہی ان کے معلم اور اتالیق رہے ہیں اب بھی مجلس شوریٰ کی ایک سربرآوردہ ممبر ہیں۔ میں ان سے ملا ہوں آدمی کیا ہے بلا مبالغہ حکمت اور علم و دانش کی زندہ تصویر ہے۔ ان کی عمر ستر برس سے کم نہیں ہے۔ اس سے پہلے چند رئیسوں کے مصاحب رہ چکے ہیں۔ نہایت مہذب اور متین صائب الرائے آدمی ہیں۔ نواب ان کو اپنے باپ مرحوم کا ہم مرتبہ خیال کرتا ہے اور ان کی تعظیم و تکریم کو سرمایہ سعادت دارین جانتا ہے۔ مجھے آئندہ جو کچھ اس رئیس اور ریاست کے متعلق لکھنا ہے اس کی اول تصدیق اس اینول رپورٹ سے آپ کو ہوگی جو پچھلے دنوں صاحب پولیٹیکل ایجنٹ بہادر ریاست نے رئیس اور ریاست کے متعلق گورنمنٹ آف انڈیا میں بھیجی تھی اس رپورٹ کے ملخص جملے یہ ہیں۔

"نواب شوکت علیخاں نو عمر رئیس ہے مگر اپنی لیاقت اور قابلیت کی وجہ سے بڑا تجربہ کار دور اندیش معلوم ہوتا ہے اس کو کامل اختیارات ملے ابھی پورے پانچ سال نہیں ہوئے مگر اس تھوڑے عرصہ میں اس نے ریاست کے ہر صیغہ کو ترقی دی ہے۔ صیغہ مال گذاری میں جو دشواریاں اور زمینداروں کے لئے تکلیف دہ امور

اُن کی ایک دم اصلاح ہوگئی۔ پچھلے بندوبست سے جو عذرداریاں اور مشکلات پیدا ہوگئی تھیں اُن کو رفع کردیا گیا ہے اَب پانی کے ذرایعہ میں بہت ترقی ہوئی ہے۔ نو توڑ اراضی میں بہت رعایت دی گئی ہے دوسرے گرد و نواح علاقۂ غیر کے زمیندار آ کر آباد ہوئے ہیں۔ زر بقایا سنین ماضیہ کو معاف کر دیا گیا ہے عملہ مال میں جو کچھ کمی بیشی ہوئی ہے وہ بے نقص ہے۔ انصاف کو بہت ارزاں اور اُسکے حاصل کرنے کو بہت سہل اور آسان کردیا ہے۔ ہر دیوانی فوجداری محکمہ جات کی اپیل پنچایتی مجلس میں ہوتی ہے جس میں مختلف المذاہب اشخاص کو رعایا کی پسند پر بھرتی کیا گیا ہے۔ اونٹے سے اونٹے طبقہ کے فریادی کو نواب تک پہونچنے میں نہ ڈر ہے نہ روک ہے۔ پرچہ نویسی اور خبر کا بڑی خوبی کے ساتھ بندوبست کیا ہے۔ ریاست کے دور نزدیک ہر حصہ کی خبریں جلدی سے جلدی نواب تک پہونچ جاتی ہیں۔ سماعت ضروری اخبار کا کوئی خاص وقت مقرر نہیں ہے۔

فوج کے بڑے حصہ کو پولیس کی صورت میں بدل دیا ہے اور پولس کی تعداد میں اس سے پورا اضافہ ہوگیا ہے اُس کا یہ نتیجہ ہے کہ تین برس کے عرصہ میں تمام رقبۂ ریاست میں صرف دو ڈکیتیاں ہوئیں جنکے مال و مجرم کی تلاش میں نواب نے اسقدر سرگرمی ظاہر کی کہ بجنس مال و مجرم گرفتار ہوگئے۔ چوری کا پورا انسداد ہے۔ بڑی قوت کے کئی موٹر کار اس لئے خریدے گئے ہیں کہ اُن کے ذریعہ دور سے دور علاقہ میں بذات خاص نواب دورہ کرسکے اور دفعتاً پہونچ جانے سے نگرانی علاقہ کی بھی اچھی طرح ہو رہی ہے۔ گزرگاہوں کی حفاظت کا مُشتبہ اور واردات پیشہ اشخاص کو جواب دہ اور ذمہ دار بنا دیا ہے اور اکثر واردات پیشہ اشخاص کی رات دن میں کئی بار حاضری ہوتی ہے۔ مسافروں کے واسطے بہت سہولت بہم پہونچائی گئی ہے۔ گزرگاہوں اور عام راستوں کی درستی کرائی گئی ہے پل اور کھرنجے بنوائے گئے ہیں۔ تجارتی مال پر محصولات کی کمی نے درآمد مال میں افراط پیدا کردی ہے۔ تعلیم کا شہر اور دیہات میں اچھا انتظام ہے اور رعایا کے بچوں کی تربیت کا خاص اہتمام ہے۔ پیشہ وروں کو حوصلہ مند بنایا جا رہا ہے۔ نواب کے مصاحبوں کا یہ خیال ہے کہ نواب کو خوشامد سے نفرت ہے اور سچی بات کہنے سے خوش ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ پچھلے سال کی تقریب سالگرہ میں شاعروں نے بجائے قصائد کے دعائیہ قطعات پیش کئے عام طور سے دواخانے اور طبیب دور نزدیک علاقوں میں رعایا کے علاج کو مقرر کئے گئے ہیں موذی جانوروں کے ہلاک کرنے کا خاص انتظام ہے

نواب بہت

نواب بہت سادہ مزاج ہے بظاہر اس کی صداقت اور راست بازی اس کی آیندہ کی بہتری کی ضامن ہے۔
ریاست کا حکومت اعلےٰ گورنمنٹ ہند سے جو نازک رشتہ ہے اُسکی بزرگداشت میں نواب ہمہ تن مصروف ہے
اس امر میں نواب کے مصاحب اور کل مشیر نواب کے ہم خیال ہیں کہ گورنمنٹ برطانیہ کی وفاداری اور ارادت
مندی پر ریاست کی حال و استقبال کی بہبودی و ترقی منحصر ہے۔ نواب کا اعتقاد ہے کہ بغیر اعلیٰ حکومت کی مہربانی
کے ریاست کی مشکلات میں آسانی نہیں پیدا ہو سکتی۔ اہم معاملات میں برٹش اعلےٰ حکام کے مشورہ کو پیش نظر
رکھا جاتا ہے۔ نواب کی ارادت اور وفاداری گورنمنٹ ہند کے ساتھ مداہنت اور ظاہرداری کی نہیں ہے
بلکہ اُس کے اتالیق نے مذہبی روایات اور احکام سے اُس کے ذہن نشین کر دیا ہے کہ وفاداری بہترین صفت ہے
میرا خیال ہے کہ نواب کی دس لاکھ رعایا میں سے شاید ایک متنفس بھی تلاش سے ایسا نہ ملیگا کہ جو نواب کا شاکی
ہو کیونکہ نواب اکثر اوقات رعا کی بہتری کے خیالوں میں مصروف رہتا ہے۔

نواب نے مجھ سے درخواست کی ہے کہ دو سو رائفل بندوقیں پولس کے مسلح کرنے کو دلوادی جائیں
میری رائے میں اگر دو سو ہنری مارٹینی رفل گن کی شکل میں بہوتہ پور ریاست کو دیجاویں گی تو گورنمنٹ کا
احسان ہے میں سفارش کرتا ہوں کہ ایسا ہونا چاہئے۔

آخر میں اس امر کے ظاہر کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ نواب کو اس خوبی کے ساتھ جس نے حکومت کے قابل بنا دیا
ہے وہ لیاقت یار جنگ کی تعلیم و تربیت کا اثر ہے اُس نے اپنے کمال تجربہ اور دانشمندی سے نواب کو تمام
اوصاف حمیدہ کا عادی بنا دیا ہے یہ کل اوصاف حمیدہ عارضی نہیں رہے بلکہ نواب کی طبیعت ثانی بنگئے ہیں فقط

راقم۔ آر۔ ایچ سمیٹھ پولیٹکل افسر

اکثر جزوی حالات اس رپورٹ کے چھوڑ دئے گئے ہیں مثلاً حفظان صحت اور آسائش عامہ کے قواعد و ضوابط
کا اجرا میوہ دار سایہ دار درختوں کا راستوں پر نصب ہونا۔ روشنی واٹر ورکس وغیرہ کا تذکرہ وغیرہ۔

میں اس عرصہ میں دو یورپین سیاحوں سے بھی ملا ہوں جو چند ہفتے سے اس ریاست کے علاقہ میں گشت لگا رہے ہیں اُنکے
پاس کچھ فوٹو بھی ہیں اور نقشے بھی ہیں اُن سے خوش منظر مقامات اور مفید تعمیرات کا حال معلوم ہوتا ہے۔ میں نے یہ بھی سنا ہے کہ نواب
صاحب ہر نماز جمعہ کے بعد جامع مسجد میں لکچر بھی دیتے ہیں۔ نواب کے حکیمانہ اقوال کی جا بجا تعریف ہو رہی ہے۔ ایک جمعہ تک اسی

لسان الملک ریاض

تا عمر مرے دورِ مے و جام کے اُٹھے ؛ ہم قبر سے پیاسے مے گلفام کے اُٹھے

ٹوٹے ہوئے ٹکڑے جو خم و جام کے اُٹھے ؛ میخانہ سے کچھ ڈھیر مرے نام کے اُٹھے

ہم جا کے تہِ دام دبے پاؤں نکل آئے ؛ قسمت سے کنارے تھی کچھ اس دام کے اُٹھے

یہ کہہ کے شبِ وصل ہمیں چھیڑ رہے ہیں ؛ پہلو سے ہمارے کوئی دل تھام کے اُٹھے

کل اُسکی گلی میں کوئی سو بار گئے آئے ؛ تا صبح نہ بیٹھے کہیں ہم شام کے اُٹھے

اس قدر سے موسیٰ کو غش آیا بے اٹھالائیں ؛ کچھ سایہ نشیں آج ترے بام کے اُٹھے

میخانے میں جا کر عوض دُرد لگا آئے ؛ جب دام نہ کچھ جامۂ احرام کے اُٹھے

بیتاب کیا لذتِ دشنام نے ایسا ؛ منہ چومنے عاشق ترے دشنام کے اُٹھے

فرہاد سے کوئی نہ بڑھا تیشہ زنی میں ؛ اُٹھنے کو کئی آدمی اس کام کے اُٹھے

جنبش بھی نہ ہو۔ کیتنے ستم پیشہ ہیں صیاد ؛ پر کاٹتے مرغانِ تہِ دام کے اُٹھے

ہم سائلِ میخانہ کے وجم سے نہیں کم ؛ چلو سے اگر پی تو مرے جام کے اُٹھے

جب کہہ کے ریاض اُسنے پکارا سرِ محفل ؛ بن بن کے کئی آدمی اس نام کے اُٹھے

صلائے عام۔ شعر میں میں آپ کو شروع سے اُستاد مانے ہوا ہوں ؛ مجھے آپکا پتہ معلوم نہ تھا اسوجہ سے صلائے عام بھیج نہ سکا۔ آئندہ ایسی تقصیر نہ ہوگی: آپ اپنا کلام صلائے عام کے لئے ضرور بھیجا کریں۔ اندنوں شعر و سخن کے متعلق آپکا ذکر آتا رہتا ہے۔ آپنے پچھلے پرچے اگر دیکھے ہوں تو مجھے قسم کھانے کی ضرورت نہیں ؛ آپ بڑھاپے کی شکایت چھوڑ دیں۔ اس کی شکایت سے جوانی انے سے ہی

ے کھینچنے سے انہیں رہی اے حضرتِ واعظ ؛ میں لیکے تبرک کے یہہ انگور کروں کیا ؛

انسان کی عمر اتنی ہی سمجھنی چاہیئے جتنی وہ خود سمجھ لے۔ آپ اس جھگڑے میں نہ پڑیں اپنا کلام جمع کرکے جلدی چھپوا دیں ~ عنادل ہوکے بیخود آشیاں سے آ رہے نیچے ؛ مگر خاکِ چمن پر گل گرا گلچیں کے دامن سے ؛

صلائے عام

اگلے لوگوں کی زبانی ہے کہ انسان جانوروں کی بولیاں سمجھتے تھے۔ کلیلہ دمنہ لقمان کی حکایتیں[1]۔ طوطا مینا۔ چڑیا چڑے کی کہانیاں مشہور ہیں: اس زمانہ میں بھی آپ دیکھتے ہیں کہ اسٹیشن کے پہرہ پر جو ملازم ہے وہ رات کو جب تار بابو نیند میں اونگھ جائیں تو یہہ کہہ کر جگاتا ہے کہ "بابو جی تار بولتا ہے"۔ ٹیلیفون کی گھنٹی آواز دیتی ہے کہ دوسری طرف والا کچھ کہہ رہا ہے: آذان کی آواز نماز کی خبر دیتی ہے اور گھڑی کا کام ہی یہی ہے کہ وقت بتائے: بلبل کی نغمہ سنجی آمدِ بہار کی آواز ہے[2] اور کاگلے کا دیوارِ صحن پر بولنا کسی عزیز کے سفر سے پھرنے کا شگون ہے: فاختہ کی آواز کو حق سرہ سمجھتے ہیں اور پپیہے کی بولی کو کہتے ہیں کہ "پی تو کہاں ہے"؟ یہاں تک کہ خط نصف الملاقات مشہور ہے کہ کاتب و مکتوب الیہ کی باتیں ہو جاتی ہیں:

اس نصف الملاقات کی ایکدن کی کیفیت سُننے کے قابل ہے:

موقع یہ ہے کہ کسی شہر (فرض کیا کہ دلی سہی) کے ڈاکخانہ کی ڈاک کا بڑا تھیلہ ہے

---

[1] Aesop's Fables [2] آمدِ بہار کی ہے جو بلبل ہے نغمہ سنج: اُڑتی سی ایک خبر ہے زبانی طیور کی۔

جن میں ہر طرح کے خطوط و اخبار وغیرہ اپنے اپنے منزلِ مقصود کو جا رہے ہیں سفر میں اگر ساتھی ہوں تو باتوں میں راستہ جلدی کٹتا ہے اور جب ملاقات کا مسئلہ پہلے ہی طے ہو چکا ہے (گو نصف ملاقات سہی) تو ڈاک میں خطوں اخباروں اور رسالوں کو آپس میں باتیں کرنے سے کون روک سکتا ہے؟ خاص کر جب کہ نئے اور پرانے چھوٹے اور بڑے لفافے۔ چٹھیاں۔ شادی کے رقعے۔ مبارکبادیاں تعزیت نامے۔ عرضیاں۔ شکایتیں۔ شکریئے۔ بڑوں کے خط چھوٹوں کے نام۔ چھوٹوں کے بڑوں کے نام۔ دوکانداروں کے تقاضے کی تحریریں۔ نوٹس۔ اطلاعیں۔ پوسٹ کارڈ سب سے زیادہ: ایک عجیب مجمع ہو رہا ہے ؛

صلائے عام کی وجہ سے پہلے مجھے رسالوں سے کام پڑا۔ چند نئے رسالوں نے سلام علیک کے عوض دیکھتے ہی یہ شکایت شروع کی کہ تم نے ابتک ہمارا ریویو نہیں لکھا اور رسالہ بغرض تبادلہ اور ریویو بھیجا گیا تھا۔ ہمعصری کے حق کی رعایت کیوں نہیں کی؟ میں نے عرض کیا کہ ہمعصری اتفاقیہ بات ہے۔ یہ ایسی بڑی نعمت نہیں: دوسرے ریویو اور تبادلہ یہ مارے باندھے کی باتیں نہیں۔ کچھ دنوں بعد رنگ دیکھ کر لکھا جائیگا ۔

چاک مت کر جیب بے ایام گل ؛ کچھ اُدھر کا بھی اشارہ چاہئے

یعنی میری طرف سے بھی تو تبادلہ یا ریویو کا اِشارہ ہو ؛

ایک طرف سے آواز آئی کہ صلائے عام میں نہ خلافت کا ذکر ہوتا ہے نہ کانگریس کا اس کو لیکر کوئی کیا کرے؟ میں نے پوچھا آپ کون ہیں؟ جواب ملا کہ ہم قوم و ملک کے

خیرخواہ ہیں۔ میں نے عرض کیا کہ آپ اپنی زبان سے اس قدر غافل ہیں کہ مجھے قومی و ملکی خیرخواہی میں شُبہ ہے۔ اس پہ بحث بڑھنے لگی اور میں چپ ہو گیا ؛

کسی نے پوچھا کہ صلائے عام کی اشاعت کس قدر ہے ؟ میں نے جواب دیا کہ اشاعت کا یہ حال ہے کہ ایک پرچہ بھی نہیں بچتا۔ پُرانے پرچے کمریار کی طرح نظر نہیں آتے ؛

ایک بڑا لفافہ ڈاک کے تھیلے میں سے بولا کہ میں فلاں رئیس کی طرف سے صلائے عام کی منظوری کی درخواست لئے جاتا ہوں۔ درخواست ہے کہ پرچہ دی پی بھیجدو : میاں وی پی بھیجنے کا نہیں اور قیمت براتِ عاشقاں بر شاخِ آہو کا معاملہ سمجھ لیجئے ؛

دس بارہ پوسٹ کارڈ چیخ اُٹھے[۱] کہ ہماری درخواست نمونہ کے پرچہ کی ہے ؛

دو ایک خطوں نے بیان کیا کہ صلائے عام کی زبان کا کیا کہنا ! اس کی زبان نے آگے فصاحت سحبان کچھ چیز نہیں۔ اِس کے مضامین سب کے سب لاجواب ہوتے ہیں ؛ رہا قیمت کا سوال۔ کئی سال سے اسکا ذکر نہیں ؛ قیمت کا جواب آگے آئی[۲] آیت ؛

یہ طرزِ بیان جناب ای وی لوکس صاحب کے دائی ورشنس *The Listeners* سے اپنی وضع پہ اخذ کیا گیا ؛

---

[۱] پوسٹ کارڈ کی زبان بند خطوط کی طرح خفیہ تو ہوتی ہی نہیں ان کی آواز طشت از بام میں داخل ہے ؛

[۲] جنکی قیمت پہونچ گئی اُنکا شکریہ ایک دفعہ نہیں سَو دفعہ ؛

خط

× × × × × × × × × × × ×

صلائے عام گورکھپور میں نظر سے گزرا۔ بار بار آپ کا ذکر آیا۔ آپکی لٹریچر یہ کہتی ہے کہ آپ جوان طبع ہیں۔ میں لحد کو سئے جنت کے خواب دیکھ رہا ہوں۔ مجھے مردہ سمجھ کر غالباً آپ نے صلائے عام سے محروم رکھا ۔ خط لکھا تو ضرور ہوا کوئی غزل بھی نذر کروں ۔ × × ×

ریاض

قواعد و مقاصد

صلائے عام

خواجہ قمرالدین راقم کا شعر ہے ؎

مقصد تمہارے ہاتھ ہے قسمت خدا کے ہاتھ ؛ جو کچھ خدا سے ہو وہ تمہاری زباں سے ہو

صلائے عام کا بھی یہی عقیدہ ہے کہ کسی ملک و قوم کی ترقی تو پروردگار کے اختیار میں ہے لیکن ترقی کے لئے پہلی شرط اپنی زبان میں کمال پیدا کرنے کی ہے ؛ ضد کی اور بات ہے مگر اس وقت ہندوستان کی زبانوں میں اردو سے بہتر کوئی زبان میری سمجھ میں نہیں آتی جس پر جمہور اہل ہند (ہندو ہوں یا مسلمان) دونوں کی زبان کا اطلاق ہو سکے ؎

نغمۂ عشق سے ہیں سبحہ و زنار ملے ؛ ایک آواز پہ دو ساز کے ہیں تار ملے۔

خلاق دو عالم کی طرح اردو زبان کی تعریف سب سے پاکیزہ یہ ہے کہ ؎

تجھ سے کوئی آشنا نہ ہوا یا ہو ؛ پر تجھے سب سے آشنا دیکھا

یہ رسالہ اپنی زبان میں اظہار کمال کی غرض سے جاری ہے کہ اردو لٹریچر کے لئے ہر طرز پر لکھنے کا مسالہ جمع ہو اور ادائے بیان میں ہماری زبان اور زبانوں سے اگر بازی نہ لے جا سکے تو کسی زبان سے مرتبہ میں کم نہ رہے ؎

بیچ کر تجکو مٹے جاتے ہیں دنیا کے حسین ؛ جمع ہوتا ہے مسالہ تری یکتائی کا

صلائے عام میں ہر طرح کے مضمون نظم و نثر شایع ہوتے ہیں۔ زیادہ تر نثر کا ؛ کیونکہ اسوقت نثر کی ضرورت ہے : اور نثر بھی ایسی جسمیں زبان کی خوبی و فصاحت کے ساتھ خیال کی پاکیزگی اور نزاکت ضرور ہو ؎

دل باندھئے تو یار کے کاکل سے باندھئے ؛ بلبل کو باندھئے تو رگ گل سے باندھئے

صلائے عام اعلیٰ حکام سول و ملیٹری افسروں کے امتحان میں گورنمنٹ آف انڈیا

سی منظور

سے منظور ہوچکا ہے۔ ہندوستان کے سوا یورپ کے عالم و فاضل صلائے عام کی قدر کرتے ہیں
اُردو میں صلائے عام کے مضامین کو خاص مرتبہ حاصل ہے ؎

دل پہ تمہارے نقش ہوا ہے بیانِ شوق ؛ کار قلم دکھاتی ہے میری زبانِ شوق

صوبۂ آگرہ و اودھ کے سررشتۂ تعلیم کے نصاب میں صلائے عام کے مضامین اُردو فائینل ریڈر میں انتخاب کرکے درج کئے گئے اور صاحب پریسیڈنٹ نصاب اُردو نے جب امار گورنمنٹ بمبئی منعقد ہوئی میرے مضامین کو اُردو ریڈروں میں شامل کرنیکے لئے مجھے لکھا۔

اکثر اصحاب نمونہ کا پرچہ مانگتے رہتے ہیں۔ اوّل تو ایک پرچہ سے صلائے عام کا پورا حال معلوم ہونا مشکل ہے۔ دوسرے صلائے عام کو جاری ہوئے عرصہ ہوگیا نمونہ بھیجنے کی مجھے ضرورت نظر نہیں آتی ؎

پیری میں بھی بے ولولۂ شوق نہیں ہم ؛ رکھتے ہیں ابھی اک دلِ ہنگامہ گزیں ہم
شہرت نہیں مجنوں کے برابر یہ مسلّم ؛ پر کوئی نہ جانے ہمیں ایسے بھی نہیں ہم

صلائے عام کی قیمت پیشگی چھ روپے سالانہ ہے۔ چھ مہینے سے کم کی خریداری منظور نہیں ہوسکتی قیمت بذریعہ منی آرڈر عنایت فرمائی جائے۔ مضمون نگار صلائے عام کی قیمت سے بری نہیں: نہ یہ ضرور ہے کہ ہر مضمون خواہ مخواہ شایع کیا جائے ؎

کس قدر ہے فرق یوسف میں اور اپنے یار میں ؛ گھر خریدار اس کے آئیں وہ بکے بازار میں

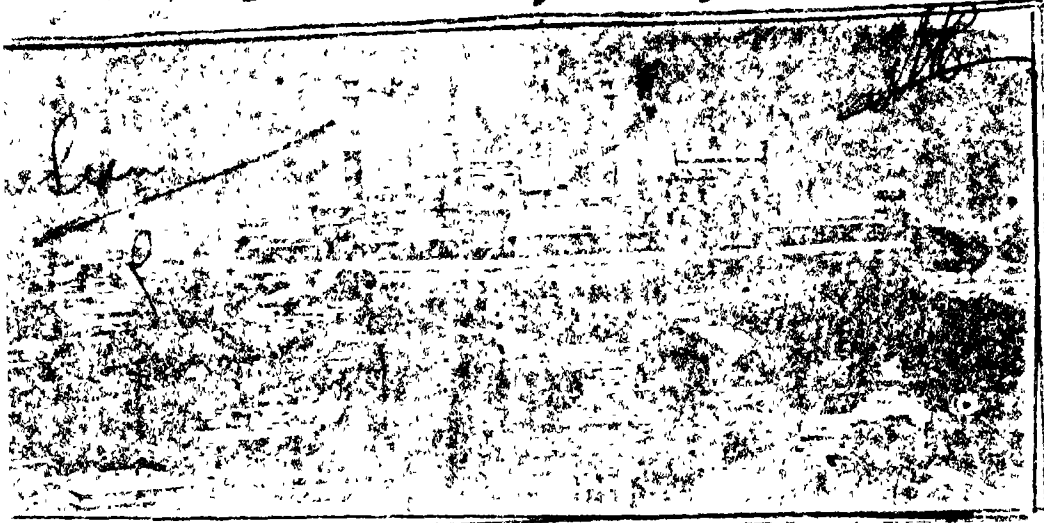
جو مضمون شایع نہ ہوسکیں اُن کے واپس کرنے کا ذمہ نہیں: جامعِ اوراق کو مضمون میں کمی بیشی کا اختیار ہے۔
پچھلے پرچوں کی قیمت بشرط دستیابی ایک روپیہ فی پرچہ۔

صلائے عام کا پتہ اسقدر کافی ہے کہ:

دہلی۔ فراشخانہ: مکان میر ناصر علیخاں بہادر۔

حسب الارشاد میر ناصر علیخاں بہادر مطبع ناصری واقع فراشخانہ دہلی میں باہتمام میر احمد چھپا اور شایع ہوا۔

PRINTED AND PUBLISHED BY MIR NÂSIR ALI KHÂN BAHÂDUR (EDITOR) AT THE NÂSRI PRESS,
FARRÂSH KHÂNÂ, DELHI.



صلائے عام

SALA-I-AM, DELHI.

A high class Monthly Magazine devoted to the cause of Urdu literature, the preservation of the old Indian, especially Mohammadan culture and refinement, and the assimilation of the best features of the new civilization.

حسب الارشاد میر ناصر علی خاں بہادر ... مطبع ... ناظری ... اور چھاپا

جلد ۱۱ نمبر ۱۱

فہرستِ مضامین

بابت ماہِ نومبر سنہ ۱۹۲۳ء مطابق ربیع الثانی سنہ ۱۳۴۲ ہجری

پیرایۂ آغاز

ہوئے جاتے ہیں بسمل مجھ سے پہلے دیکھنے والے ؛ خدا جانے وہ تلواریں مجھے کیوں کر لگاتے ہیں

اِس شعر میں تسیمؔ کے کام کا صرف ایک لفظ ہے یعنی "پہلے"۔ آغازِ مضامین کے لئے "پہلے" کا لفظ ضروری ہے کہ پیرایہ میں سب سے پہلے یہہ لفظ چاہیئے ؎

اُڑے ہوش و خرد یاں جنبشِ پرواز سے پہلے ؛ یہہ کیا پر لگ گئے خط باندھ کر بالِ کبوتر میں

اِس پرچہ میں پہلا مضمون لسان الملک حضرت ریاضؔ کا ہے جو انہوں نے صلائے عام کی آمد کے متعلق لکھا۔ اس کے اخیر میں جو شکایت ہے اُس کی معذرت میں اقرار کے سوا اور کوئی تدبیر مجھے نہیں سوجھتی: جناب قلقؔ کا شعر ہے ؎

چل اے قلقؔ منا کے اُسے ہم ہی لائیں گے ؛ وہ کام آ پڑا ہے جو تقدیر سے نہ ہو ؛

اس کے بعد محشر خیال صلائے عام کا معمولی مضمون ہوگیا ہے۔ مضمون پریشان کی طرح یہ مضمون بھی پڑھنے والوں کو پسند آنے لگا ہے ؎

لی نہ کروٹ تک پکارا فتنۂ محشر ہزار ؛ دیکھئے کب نیند بھرتی ہے دلِ ناشاد کی

تقدیر بھلی ہو یا بُری (صفحہ ۱۴ پر) نیا مضمون ہے۔ تقدیر کا مسئلہ نہایت مشکل مسئلوں میں سے

مگر اس مضمون میں نئے رنگ میں دکھایا گیا ہے ؎

تقدیر کا معارضہ تدبیر سے نہ ہو ٭ جو خاک سے ہو وہ کبھی اکسیر سے نہ ہو

اُردو رسالوں کی نسبت رائے - زیادہ تر صاحب رسالہ ترقی (حیدرآباد - دکن) کی رائے کا اقتباس بہ اختصار ہے: اس کے متعلق بہت لکھنے کی گنجایش ہے ٭

رباعیات جناب گرامی جو مولوی بشیرالدین احمد صاحب رئیس دہلی کی توجہ سے مجھے پہونچیں بڑے پایہ کی فارسی شاعری کا نمونہ ہیں۔ حضرت گرامی کی شاعری کا میں نہایت معتقد ہوں ٭ ماہ گزشتہ کے **صلائے عام** میں **قیاسِ صحیح** کے نام سے ایک مضمون چھپا تھا۔ اس کے جواب میں جناب مولوی صاحب نے لکھا ہے کہ "ایک کہانی مجھے بھی یاد آئی" (صفحہ ۲۷ پر) ٭ **پُرانی دِلّی کی لوہے کی لاٹھ** والا مضمون (صفحہ ۳۶ پر) اس لاٹھ کے متعلق والے مضمون کا بقیہ ہے جو پہلے چھپا تھا۔ یہ مضمون مورخانہ اور محققانہ ہے ٭

اخیر میں صلائے عام کی سُرخی سے جو مضمون ہے وہ زیادہ تر حسب حال خیالات و واقعات پر مبنی ہے ٭ اس کے ساتھ ولایت کے ایک بڑے عالم و فاضل کی رائے انگریزی میں صلائے عام کے بارہ میں پڑھنے کے لایق ہے ٭ یہ تحریر ولایت کی پچھلی ڈاک میں وصول ہوئی ٭ اکتوبر سنہ رواں کے صلائے عام کی تنقید میں جناب مرزا عرفان علی بیگ صاحب آئی۔ ایس۔ او نے جو تحریر فرمایا اس کا میں نہایت شُکر گزار ہوں ٭

کثرتِ مضامین کی وجہ سے بعض مضمون بوجہ عدم گنجایش وقت پر شایع ہونے سے رہ جاتے ہیں۔ اس کیلئے آئندہ صلائے عام کا حجم بڑہانے کا ارادہ ہے: یہ اطلاع مضمون نگاروں کی خاطر سے دیجاتی ہے کہ اب تک جن اصحاب کے مضامین کے شایع ہونے میں دیر ہوئی وہ خفا نہ ہو جائیں ؎

اُفتادہ رہنے دی ہے زمیں دل کی اس لئے ٭ اُمید ہے کہ آپ یہاں گھر بنائیں گے ٭

آمد بہت بُری سی ہے تمہارے شباب کی ∴ یہ دن تمہیں ضرور ستمگر بنائیں گے

صلائے عام کی آمد

یہ چھلکتا ہوا کیا جام شراب آتا ہے ∴ اے میں قربان مرا عہدِ شباب آتا ہے

نامہ رساں کو آتے دیکھ کر۔ مجھے اتنی ہی مسرت ہوتی ہے۔ جتنی۔ ساقی کو دیکھ کر کبھی ہوتی تھی۔ اُس کے ہاتھ میں گلرنگ جام ہوتا تھا اس کے ہاتھ میں رنگین صحائف خطوط کاغذِ زر ہر چیز نشہ آور۔ وی پی۔ جس سے نشہ کرکرا ہو مجھ سے اُس کا لگاؤ نہیں ∴

دست بہ دست جو چیز مجھے پہنچی وہ جام شراب و عہدِ شباب دونوں سے اچھی تھی یعنی صلائے عام یہ جام شراب قیدک کے ساتھ ابھی سر بمہر تھا مگر دیکھتے ہی مجھے ایک بوتل کا نشہ ہو گیا۔ قیدک کیا کھلی مُہرِ ساغر توکیا مُہرِ خُم ٹوٹی ؎

چٹ سے مُہر جو ٹوٹی خُم کی ∴ لوگ یہ سمجھے ٹوٹی توبہ

فوراً ڈھلنے لگی جام پر جام قدح پہ قدح اب دَور کی عوض مَیں خود اُس میں نظر پڑا بہ اعتبارِ خط بھی بہ اعتبارِ غزل بھی۔ حافظ کا اِتنا ٹکڑا میرے کام کا نکلا "غرق مے ناب اولٰے"

مطبوعہ غزل کے چھٹے شعر میں قصد کا قدر اور مقطع کے دوسرے مصرع میں نام

کا کام چھپ گیا ہے۔ اسی طرح خط کی دوسری سطر میں لحد کے بعد کے "کو" چھپ گیا ہے۔

لغزش رنداں کی طرح لغزش کاتب درگزر کے قابل ہے۔

میں غرور مردہ تھا صلائے عام کے آنے سے جان پڑ گئی لیکن اگر یہ مبالغہ ہے تو بڑھاپے

میں شباب کے آنے کی کیفیت ضرور پیدا ہو گئی۔

آپ کہتے ہیں بڑھاپے کی شکایت فضول مگر یہ تو آپ سے جوان طبع کے لئے ہے۔

میں تو مرتے مرتے اس کا رونا روؤں گا کیا آپ دن رات پیتے ہیں کہ پیر فلک کی طرح غم پیری

آپ سے دور رہے اگر ایسا ہے تو آپ مزے میں ہیں مگر آپ کی صورت مجھے یاد ہے ؎

جگہ کیوں نہ دیتے شیخ کو شیشے سر پر ؛ بڑھاپے میں روئی کا گالا ہوئے ہیں

اب تو آپ بدرجۂ اولےٰ پنبۂ مینا ہوں گے۔

میں نے چند روز ہوئے اپنے دوست شرر کو روئی بنے ہوئے دیکھا تھا۔ شرر یعنی

مولوی عبدالحلیم صاحب اڈیٹر دلگداز مگر میں نے غلط کہا وہ پنبۂ مینا سے تجاوز کر کے فرشتہ بن گئے

تھے اتنا غیر معمولی نور کہ نوشی سے بھی ممکن نہیں مجھے بھی نمبر ۲ کا فرشتہ سمجھئے۔ اپنے فرشتہ

ہونے کے ثبوت میں ایک مطلع یاد آگیا ؎

ہم نہیں وہ کہ جو تربت میں اکیلے ہوں گے ؛ ایک ہم ساتھ کے دو تین فرشتے ہوں گے

مطلع میں ذکر موت کے بعد کا ہے۔ گفتگو بڑھاپے کی زندگی اور بڑھاپے کی صورت کے بابت ہے ع

ہائے یہ نور کی شکل اور گنہگاروں میں۔

میں جیتے جی اقرار گناہ کرنے کا نہیں فرشتے مرنے پر جو چاہیں کہیں۔ بڑھاپے میں بڑی مصیبت یہ ہے کہ تائب ہو کر بھی بعض اوقات توبہ شکنی کو جی چاہتا ہے۔ لیکن شاعرانہ خیالات کی نزاکت کا یہ تقاضا ہوتا ہے کہ لطف آئے توبہ توڑنے سے زیادہ اور توبہ ٹوٹے نہیں خدا جانے آپ بڑھاپے میں ارتکاب معاصی کے متعلق نزاکت خیال سے کام لیتے ہیں یا نہیں ضرور کام لیتے ہوں گے ع
چوں بخلوت می روند ایں کار دیگر میکنند۔ آپ اپنا عیب مجھ پر ظاہر کیوں کرنے لگے حالاں کہ احتیاط سے جو عیب کیا جائے وہ ہنر میں داخل ہے۔ میں چاہتا ہوں بہ ڈھب آپکو سمجھاؤں کہ توبہ کرکے پارسا بن جانے پر بھی کچھ کام چلے۔ آپ بے حد مشاق ہو گئے ہوں گے۔ ایک صورت تو یہ ہے ؎

ریاض توبہ نہ ٹوٹے نہ میکدہ چھوٹے ٭ زباں کا پاس رہے وضع کا نباہ رہے

دوسری صورت میں اس سے زیادہ اچھا اور مزے کا ثبوت اپنے دعوے کے لئے دینا چاہتا ہوں جب ارتکاب معاصی کا جی چاہے تو اس حد کی نازک خیالی سے کام لیجئے ؎

پس توبہ تیرے لب ترسے ساقی ٭ لب خشک ہم بھی میں ترکرنے والے

توبہ کے بعد پی سکتے نہیں اور چاہتے ہیں لطف پینے سے زیادہ آئے لب بھی خشک ہو رہے ہیں ہم نے یہ فائدہ کا فرساقی کے لب ترسے اٹھایا نیت صرف یہ تھی کہ خشک لب تر ہو جائیں نہ پینا مقصود تھا نہ لب تر کا چوسنا۔ کام دونوں بنے اور نیت اچھی رہے جس پر اعمال کا مدار ہے ؎

مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو ٭ اک گونہ بیخودی مجھے دن رات چاہئے

بقایا صفحہ ۱۷

یہاں بے خودی بھی مقصود نہ تھی ؎

بڑھاپے کے سلسلے میں ابھی بہت کچھ کہنا باقی ہے۔ پھر کسی وقت سہی

آخر میں گلہ مندانہ صرف اس قدر عرض کرنا ہے کہ میری غزل کو آپ نے صلائے عام کے پاکیزہ دامن یعنی نورانی صفحے کا بدنما داغ بنادیا۔ صفحات کی ترتیب ہوچکی تھی تو دوسرے نمبر کے لئے اشعار رکھتے۔ اس طرح چھاپنے سے نہ چھاپنا اچھا تھا۔ کسی کی نظم و نثر کے ساتھ یہ سلوک نہیں ہونا چاہئے۔ والسّلام۔

راقم

جب کہہ کے ریاضؔ اُس نے پکارا سرِ محفل
بن بن کے کئی آدمی اس نام کے اُٹھے

صلائے عام۔ گلہ اسے نہیں کہنا چاہئے جس کا علاج ہو سکے۔ واقعی رسالہ کی ترتیب کے بعد آپ کی غزل پہونچی تھی: آپ مطبع کر چکے ہیں۔ مطبع کی وجہ سے جو دردِ سر ہوتا ہے اُسے آپ جانتے ہیں۔ مطبع کا چلانا جوئے شیر لانے سے زیادہ مشکل ہے ؎ اس دفعہ کی غلطی آپ معاف فرمائیں۔ آئندہ ایسا نہ ہوگا ؎

لو شب کو ہائے چرخ سے وہ بدگماں ہوئے
آئی بلا ستم زدۂ روزگار پر ؎

محشرِ خیال

لئے تھے نامۂ اعمال اپنے اور دیوانے ؎ ہمارے ہاتھ میں تھیں دھجیاں دامانِ محشر کی

دیوانگی کی علامت ہی یہی ہے کہ کپڑوں کی دھجیاں اُڑ رہی ہوں - اور جب محشر سا وسیع دامن ہاتھ آئے تو اس کو ثابت چھوڑنا دیوانگی کی ذلّت ہے: محشر کے خوف سے اور دیوانے ہوش میں آئیں تو آئیں مگر خوف سے جو دیوانگی جاتی رہے وہ ننگِ جنوں ہے ؎ مجھے اس تشبیہ سے یہہ فائدہ ہے کہ جس طرح لباس کی دھجیاں پریشانی کی نشانی ہیں **محشرِ خیال** کو پریشاں خیالیوں کا مجموعہ سمجھنا چاہیئے ؎

خلوت سے انجمن میں وہ تشریف لائے ہیں ؎ دُنیا و دیں کے ساتھ بکھیڑے لئے ہوئے

حضرت **غالب** کے **محشرِ خیال** سے دراصل غرض یہی ہے کہ خلوت میں انجمن کا لطف آئے **ع** ہے آدمی بجائے خود اک محشرِ خیال ؎

معتزلہ محشر میں دیدار الٰہی کے قابل نہیں۔ لیکن جسطرح دُنیا میں ہمیں اللہ میاں کا دیکھنا نصیب نہ ہوا قیامت میں بھی یہی مصیبت رہی تو قیامت کی مصیبت کس کے سہارے سے کٹے گی؟ قیامت کے دن بھی جب ہمیں میاں دکھائی نہ دیئے یا میاں عمداً مُنہہ چھپائے رہے تو قیامت کو ہم روزِ محشر نہ کہیں گے۔ جب دن کو بھی میاں نظر نہ آئے تو دن کہاں ہا! حشر کا دن گویا شبِ دیجور ہو گیا ؛ گو کہتے ہیں کہ قیامت کے دن آفتاب سوا نیزہ پر آجائے گا: میاں کے دیدار بغیر وہ دن اندھیری رات سے زیادہ تاریک دکھائی دے گا ؎

کیئے دن کیونکہ اُسے جس میں نہ سوجھے کچھ خاک ؛ چاہیئے روزِ سیہ کو شبِ یلدا کہنا

کاجل نہ آنکھ میں ہے نہ مسّی ہے ہونٹھ پر
دو راتیں اور کھوئیں جہاں رات بھر رہے

قیامت میں ہمیں اگر بہشت نصیب ہوئی۔ (دوزخ سے تو خدا اپنی پناہ میں رکھے) تو کیا ہمیں دُنیا سے چھوٹنے کا قلق مٹ جائیگا؟ انسان کو خدا کے گھر میں بھی اپنا گھر یاد آتا ہے۔ حج میں زیارتِ بیت اللہ نصیب ہوتے ہی حاجیوں کو اپنے اپنے گھر کو لوٹنے کی سوجھتی ہے۔ یہاں تک کہ جب انسان کسی مہلک بیماری میں مرتے مرتے بچے تو کہتے ہیں کہ خدا کے گھر سے پھرے۔ خدا کے گھر سے انسان کو اپنا گھر زیادہ پیارا ہوتا ہے ("زیادہ" میں نے مصلحتاً کہا کہ خدا کے گھر کی محبت میں کسی کو شک نہ ہو ؛) جب خدا کے گھر کا یہ حال ہے جہاں اللہ میاں رہیں تو غیروں کے رہنے کے مکان یعنی بہشت پر قیاس کر لیا جائے ؎

تم جس کے دل میں ٹھیرے وہ بے خانماں ہوا ؛ اپنا گھر اُس کو پھر نہ ملا جس کے گھر رہے

آپ ہم کو بہشت دیں یا نہ دیں لیکن ہم کو دُنیا سے نہ نکالیں۔ دُنیا سے نکلنے کا قلق قیامت کا سامنا ہے ؎

جسم گلی پڑے رہے صندوقِ قبر میں ؛ مٹی ہوئے حضور کے خلعت دیئے ہوئے

وہ جان جو دوبارہ ملی ہے فدا کروں
محشر میں تجھکو میرے اگر روبرو کریں

محشر میں ہمیں خوفِ محشر اِتنا نہیں جتنا کہ دُنیا سے چھوٹنے کا صدمہ ہوگا۔ ملی ہوئی چیز جو بہ جبر چھوڑنی پڑی اُس کا صدمہ اُس خیالی اُمید کی خوشی سے زیادہ سمجھئے: اسی لئے مشہور ہے کہ "نو نقد نہ تیرہ اُدھار" ؎

ہونٹوں کو چاٹ چاٹ کے لیتے ہیں ہم مزہ ؛ رکھے ہوئے ہیں رات کے بوسے لئے ہوئے

پھر اُدھار بھی بلا ضرورت: یہی بات جو ہمیں قیامت کے وعدہ پر میسر ہوگی۔ اِس سے کم میں یہاں کام نکل سکتا ہے ؛ یہی سامان جو اس وقت ہمیں دُنیا میں میسر ہے گو متاعِ قلیل سہی یہی ہمارے لئے ذرا دیر پا کر دیا جائے ؛ رہا ہم سے حساب کتاب۔ اس کا علم میاں کو ہم سے زیادہ ہے: ہم بھول گئے تو اُنہیں یاد ہے۔ اُنہیں ہمارا اعتبار نہ ہو نہ سہی ہمیں اُن کا اعتبار ہے ؛ حساب تو تب لیا جائے جب کوئی اُلجھن ہو۔ ہمارا اُنکا معاملہ صاف ہے ؎

زخمِ دل و جگر کو میں کچھ کھا نہیں گیا ؛ رکھے ہوئے ہیں آپ کے تحفے دیئے ہوئے

جو کچھ ہم پر گذری آپ جانتے ہیں اور ہمارا دل کہ جان پر بن گئی !

محشر میں پہلے تو حساب کتاب کا جھگڑا۔ اس سے چھوٹے تو بہشت (دوزخ میں جان بوجھ کر چھوڑتا ہوں کہ لا تقنطو من رحمتہ اللہ سے لگّا نہیں کھاتی) : بہشت میں ایک ہی حالت میں تمام عمر۔ اور عمر بھی جو خضر کو مات کرے۔ بسر کرنی کیسی مصیبت ہوگی ؛ تمام عمر ایک ہی طرح بسر کرنا قیامت سے کم نہیں ؎

ہمیشہ کیوں خمارے میں گزرے عمر ہاں ساقی ؛ کبھی کچھ گردشِ سر ہو کبھی کچھ دورِ ساغر ہو

دُنیا جو از روے عقائد مذہبی دارالمحن ہے۔ اس میں تمام عمر رونے میں کٹتی ہے : ہماری آنکھوں کو رونے کا کچھ شیوہ ہی ہوگیا ہے۔ اس کا نعم البدل سُنا ہے کہ مرنے کے بعد بہشت میں ملیگا ؛ لیکن جب روتے روتے آنکھیں پھوٹ جائیں تو نظارۂ لالہ و گل کسکام کا ؟ بہرے ہونے پر تان سین کے دُھرپت سنکر ہم کیا کریں گے ؟ ٹانگیں ٹوٹ جانے کے بعد ناچنا سیکھنا اور گونگا ہو کر الاپنے کا شوق کس قدر حماقت ہے ؎

اِک دن نہ تم نے حشر کیا اپنی چال سے ؛ جتنے زمانہ والے تھے سب دبرئے ہوئے

نفسِ امّارہ کے لغزشیں انسان کے لئے کتنے مضر ہیں۔ لیکن آدھی سے زیادہ

دُنیا کا مدار اِنہیں لغزشوں پر ہے : جس طرح کشتی کے بادبان کے لئے ہوا ضرور ہے مگر ہوا ہی طوفان کا سبب ہو جاتی ہے ۔ لعابِ دہن ہضمِ طعام کے لئے از روئے طب ضرور ہے لیکن دہن سے باہر نفرت کا باعث ❊ انسان کی عقل محدود ہے مگر غیر محدود عالم کے سمجھنے کا دعویٰ رکھتا ہے ۔ ایک تار سے سارے تھان کا قیاس کر لیتا ہے اور ایک اینٹ سے سارے قلعہ کا نقشہ کھینچا چاہتا ہے ص

نہو منکر نہو منکر خُدا وہ ہے خُدا وہ ہے ❊ رجوعِ قلب ہو جاتی ہے جسکی سمت مشکل میں

دنیا میں کوئی چیز بیکار نہیں ۔ یہ ہماری سمجھ کا قصور ہے کہ رسّی کو سانپ اور سانپ کو رسّی سمجھ لیتے ہیں : کوئی مصیبت نہیں جس کا نتیجہ بے کار جائے ۔ کوئی رنج نہیں جو مرنے سے پہلے مٹ نہ سکے ص

چوں نسخہ جز وکُل نوشتند ❊ یک درد بہ صد دوا سرشتند

یہہ بھی جانے دیجئے ۔ یہ کتنی بڑی تسلّی کی بات ہے کہ جس طرح زندگی کا خاتمہ موت ہے موت کا خاتمہ حشر ہے کہ حشر کے بعد موت بھی نہیں : حشر تمام عُمر کے مصائب و آلام یہانتک کہ موت کا بھی اختتام سمجھئے ❊ حشر کے بعد نہ آپ میرا کچھ کر سکتے ہیں نہ میں آپ کا ۔ مُلّا کی دوڑ مسجد تک ص

حشر اسے کہتے ہیں آئے کہنے میری قبر پہ ❊ اب یہاں سے بڑھ نہیں سکتی سواری آپکی

تیرا چُپ چپ یہ بیٹھنا سالک
اِک طرح کا بیان ہے گویا

تقدیر بھلی ہو یا بُری: مدارِ تقدیر پر ہے

تقدیر بھلی ہو یا بُری۔ انسان کو تقدیر سے مفر نہیں

مناسب تو یہ تھا کہ میں تقدیر کا موازنہ تدبیر سے کرتا کیونکہ لیلےٰ و مجنوں۔ شیریں و فرہاد۔ ہیر و رانجھا۔ یوسف و زلیخا کی طرح دونوں نام اگر کھے کے گھنڈی تکمے یا چولی دامن کی طرح ہمیشہ ایک دوسرے کے ساتھ زبان زدِ خاص و عام چلے آتے ہیں۔ مگر میں نے تدبیر کو اگر بن پڑے تو بھلی تقدیر اور بگڑ جائے تو بُری تقدیر سمجھ رکھا ہے کہ یکتائیٔ خلّاقِ دو عالم کیطرح جب ایک کو مان لیا تو دوسرے کا خیال خلاف عقل ہے۔ میرے عقیدہ میں تقدیر کے سامنے تدبیر بیکار ہے۔

کہیں ملتی نہیں بیماریٔ قسمت کی دوا ❊ زندگی نسخۂ تدبیر لئے پھرتی ہے

تقدیر اسے کہتے ہیں کہ جو بات ایک کے لئے اچھی ہو وہی دوسرے کے لئے بُری کیوں ہو جائے؟ درخت ہرے ہوں تو اچھے اور زخم ہرے ہوں تو بُرے۔ ہرا ہونا وہی ہے پھر ایک کا ہرا ہونا اچھا اور دوسرے کے لئے ہرا ہونا بُرا کیوں ہے؟ لڑائی فساد کا گھر سمجھی جاتی ہے مگر آنکھیں لڑ جائیں تو محبت میں داخل ہے۔ لڑائی وہی مگر ایک جگہ فساد دوسری جگہ محبت کی جڑ ہو گئی:

دوڑ کر مجھسے گلے مل گئے ملتے ہی نظر ❊ دل کی تقدیر لڑی یا کہ لڑی تیری آنکھ

قدِ یار بارہ پر ہو تو سرو شمشاد کا جواب سمجھا جائے۔ تیغ نگاہ پر بارہ ہو تو قتل کا سامان سمجھئے ؛ چلنے میں میرے پاؤں لڑکھڑائیں تو بُڑھاپے کا قصور ہے۔ نشہ میں میخوار لڑکھڑائیں تو بادہ کشوں کے سرور کیفیت کا اثر سمجھا جائے؛ ہمارا مُنہہ بنانا مُنہہ بگاڑنے میں داخل ہے اور یار کا مُنہہ چڑانا شوخی و ناز کہلائے ؛ ہم ہزار تدبیریں کریں تقدیر بُری ہو تو سب رائیگاں جائیں۔ تقدیر بھلی ہو تو بگڑے ہوئے کام خود بخود سنور جائیں ؛ آپ نے خیال کیا ہوگا اور میں نے تجربہ کیا ہے کہ ایک وقت ایسا ہوتا ہے کہ تدبیر تو تدبیر تقدیر بگڑ جاتی ہے۔ پھر جو دیکھا تو بگڑے ہوئے کام آپ سے آپ بن گئے ؎

حُسن ہو یا عشق ہو تقدیر اچھی چاہیئے ؛ قیس دیوانہ ہوا لیلےٰ کی شُہرت ہوگئی

کبھی ترچھی نگاہ سیدھی نظر سے زیادہ کام کر جاتی ہے۔ گردشِ ایام سے گردشِ نگاہ یار زیادہ غضب ڈھاتی ہے۔ اور گردشِ دورِ ساغر سب سے زیادہ جھک لاتی ہے ؎

نہیں ہے جذبۂ اُلفت سے اُنکا ہاتھ قابو میں ؛ کہ دل پر تیغ پڑتی ہے وہ جب سر پر لگاتے ہیں

زندگی میں لباس سے انسان کی زینت سمجھی جاتی ہے مگر مرتے وقت کفن سے وحشت برسنے لگتی ہے۔ یہ کیوں ؟ حالانکہ دونوں صورتیں لباس ہی میں سمجھنا چاہئے ؎

پیدا لباس سے ہے کہ وحشت سرا ہے قبر ؛ دامن نہیں ہے جیب نہیں آستیں نہیں

دُنیا کو جہاں اور تشبیہوں سے مشابہت ہے کم و بیش قمار خانہ سے بھی ہے۔ اسپر اُستاد **ذوق** کا شعر آپ نے سنا ہوگا کہ ؎

جو دل قمار خانہ میں بُت سے لگا چُکے ؛ وہ کعبتین چھوڑ کے کعبہ کو جا چُکے

دُنیا کو قمار خانہ سے اس وجہ سے مشابہت ہے کہ ہار جیت کے معاملہ میں سارا مدار تقدیر

بر مخفی

پر منحصر ہے۔ کسی کو پہلے سے معلوم نہیں ہوتا کہ بازی میرے ہاتھ رہے گی یا دوسرے کے: گو دونوں اپنی اپنی طرف سے ایک دوسرے سے چالوں میں کسر نہیں کرتے ۔ کھیل وہی اور کھیلنے والے بھی مشاق پھر وہ چیز کیا ہے جس سے ایک ہار جاتا ہے اور دوسرا جیت جاتا ہے؟ مجھے تو تقدیر کے سوا کوئی چیز نظر نہیں آتی ۔ جب تقدیر بری تھی راجہ نل جوئے میں سلطنت ہار گیا اور جب تقدیر بھلی آئی اسی حریف سے اپنی سلطنت جیت لی ۔ لاٹری میں آپ کے نام کی چٹھی کیوں نکل آئی اور میرے نام کی خالی گئی۔ اور یہی نہیں: بعض ہمیشہ بازی ہارتے رہے اور بعض ہمیشہ بازی لے گئے ۔ اچھے کھلاڑیوں کو دیکھا ہے کہ انہیں زندگی بھر یہی اُمید رہتی ہے کہ اگلی بازی ہماری ہوگی ۔

یہہ مسلمہ فلاسفی ہے کہ قسامِ ازل نے دُنیا میں راحت وخوشی سب کو برابر تقسیم کی۔ لیکن یہ جو آپ سنگ مرمر کے محلوں میں رہتے ہیں اور دوسرے کو پھوس کی جھونپڑی بھی میسّر نہیں آخر اس کا بھی کوئی سبب ہوگا؟ میں نے اس قدر لذیذ کھانے کھائے کہ ہضم ہونا مشکل ہو گیا اور ہمسایہ میں بال بچے والوں کو تیسرا فاقہ ہے۔ تیسرے فاقہ میں حرام حلال ہو جاتا ہے مگر یہاں حرام کا بھی پتہ نہیں ۔ آپ موٹر اُڑائے جا رہے ہیں اور لنگڑا اپاہج جو گدائی کو نکلا موٹر کی زو میں آگیا۔ آپ کے صاحبزادے دو گھوڑے کی گاڑی میں اسکول جاتے ہیں اور محلہ کے لڑکے فیس کے لئے چندہ مانگ رہے ہیں۔ امیر کے جنازہ پر سیاہ دوشالہ ڈالا گیا اور محتاج کے لئے کفن کا کپڑا بھی مشکل سے ملا ۔

یہ تقدیر کی خوبی نہ تھی تو کیا تھی کہ جوئے شیر تیار ہوتے ہی فرہاد کو مرگِ شیریں کی

خبر پہونچے اور فرہاد اپنے تیشہ سے اپنا کام تمام کرلے ؟ دارا اور اورنگ زیب کی لڑائی میں دارا ہاتھی پر سے اُتر پڑے اور دارا کا لشکر یہہ سمجھ لے کہ دارا کا پتہ نہیں : میدانِ جنگ اورنگ زیب کے ہاتھ رہے ٭ لڑائیوں میں اکثر بہت ہی چھوٹی چھوٹی باتوں پر فتح و شکست کا مدار رہا ہے ٭

روز مرہ میں جس شخص کے آنے کا میں نے نہایت اشتیاق سے انتظار کیا اُس کی خبر آئی کہ اُن کو ریل نہیں ملی۔ وہ نہ آسکے ٭ جس خط کا مجھے زیادہ انتظار ہوا وہ اکثر مس سینٹ Missent ہوگیا۔ یعنی کہیں کا کہیں چلا گیا ٭ ٹریموے میں جس رُخ کو مجھے جلدی جانا ہو وہ دیر میں آتی ہے : آتی تو شاید وقت ہی پر ہے مگر الانتظار اشد من الموت کی وجہہ سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بہت دیر لگی ٭

کہتے ہیں کہ ہلاکو ہزاروں اسیرانِ جنگ کو اکثر آپ کھڑے ہوکر قتل کرواتا تھا۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ آٹھ دس صفیں ایسے مظلوموں کی قتل ہونے کے لئے جمائی گئیں اور ہلاکو گھوڑے پر سوار ہوکر اُن کے مارے جانیکا تماشہ دیکھ رہا تھا ٭ صفیں چار سو پانسو قیدیوں کی تھیں ٭ ہلاکو نے دیکھا کہ پہلی صف کے سرے پر ایک شخص بزرگ صورت تھے یہہ وہاں سے بھاگ کر صف کے اخیر میں آکھڑے ہوئے۔ جلاد گردنیں مارتا ہوا جب اس صف کے اخیر میں پہونچا تو یہ بزرگ اپنی جان بچانے کے خیال سے دوسری صف میں جا کھڑے ہوئے ٭ ہلاکو ان کو دیکھتا رہا کہ دیکھوں یہ کہاں تک اپنی جان بچاتے ہیں ؟ یہ بیچارے اسیطرح ہر صف سے نکل کر دوسری صف میں جا چھپتے تھے۔ یہاں تک کہ اخیر صف آگئی : اس پر ہلاکو کو ہنسی آئی کہ

قاضی جی (معلوم ہوا کہ یہ بزرگ شہر کے قاضی ہیں جن پر عتاب ہوا اور ان کے مارے جانے کا حکم دیا گیا تھا) یہ تماشا کب تک رہیگا۔ اپنی جان کب تک بچاؤ گے ؟ ؎

پھوٹیں اگر نصیب تو دل کس جگہ چھپائیں ؎ پتھر پڑیں تو جا کے کہاں شیشہ گر رہے

اس وقت ہلاکو گھوڑے پر سوار لیموں ہاتھ سے اُچھالتا اور اُچھال کر ہاتھ میں لے لیتا تھا جس طرح سرکس کے طور پر اکثر کیا کرتے ہیں۔ قاضی جی نے ہلاکو کو جواب دیا کہ جب تک لیموں اوپر سے نیچے کو آئے خدا جانے کیا ہو جائے ؟

قاضی جی صف کے اخیر میں تھے کہ اِتنے میں ہلاکو کے ہاتھ سے خطا کی لیموں کے لینے کو ہلاکو نے زین پر جنبش کی ران سے زین نکل گیا۔ ہلاکو زمین پر آرہا مگر پاؤں رکاب میں اٹک گیا۔ گھوڑا بے تحاشہ بھاگا سوار کا پاؤں لٹکا چلا گیا اور گھوڑے کی ٹاپوں سے سر کُچل گیا ؏

ہلاکو کا گھوڑے سے گرنا تھا کہ قتل گاہ میں ہل چل پڑ گئی۔ کوئی کسی طرف بھاگا کوئی کسی طرف: آخری صف میں جو لوگ بچ رہے اُن میں ہمارے قاضی جی تھے جو اب تک ایک صف سے دوسری صف میں بھاگ کر اپنی جان بچا لے گئے ؏

مُجھے نام کی صحت نہیں کہ ہلاکو تھا یا کوئی اور ظالم بادشاہ تھا مگر یہ قصّہ از روئے عبرت بے کار نہیں ؏

لیکن تقدیر بھلی ہو یا بُری یہ جھگڑا اس لایق نہیں کہ انسان رات دن اس فکر میں غلطاں پیچاں رہے۔ تقدیر اگر بھلی ہو تو اس کی ناپائداری کا خیال جان لیوا سمجھنا چاہئے اگر بُری ہے تو جسقدر جلد اس سے رہائی ہو اچھا ہے: موت ایسی لاجواب نعمت ہے کہ بقول جناب عنا اکبر آبادی

دو بجلیاں

دو ہچکیوں میں ختم ہیں ستم رت کی گردشیں
اے موت اب گراں ستم انقلاب ہے

یہ مضمون میں اتنا لکھ چکا تھا کہ رسالہ نگار ماہ اکتوبر سنہ رواں میری نظر سے گزرا جس میں **تقدیر** اور **گردشِ کواکب** کے عنوان سے جناب **قمر** نے مصر کے ایک فاضل جناب اسعد فہمی کی کتاب **علم التنجیم** کے مقدمہ کی نسبت لکھا ہے کہ "مصری فاضل نے تقدیر و اسباب کے مسئلہ پر ایک نہایت دلچسپ بحث کے بعد یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ عالم کائنات کا ادنےٰ سے لیکر اعلےٰ تک ہر واقعہ اسباب کے غیر قابل تغییر سلسلہ سے وابستہ ہے اور سارا نظام عالم اسباب کے ماتحت واقع ہے ٭ مصری مصنف نے اس مسئلہ کو بہت خوبصورتی سے ثابت کیا ہے کہ دنیا میں کوئی واقعہ ایسا نہیں ہے جو محض اتفاق سے بلا تاثیر اسباب پیدا ہو گیا ہو بلکہ کائنات کا ہر ذرہ ایک زبردست اور باقاعدہ نظام کے ماتحت واقع ہے جو تمام موجودات پر حاوی ہے اور انسان کی سعادت و بدبختی کا ضامن ہے" ٭ (منقول از مضمون مطبوعہ نگار متذکرہ بالا)

صاحبِ مضمون نے تقدیر کا نام علمِ نجوم کی رعایت سے "جاذبیت عامہ" رکھا ہے۔ یہ بحث زیادہ تر علم تنجیم کے متعلق ہے اور علمِ نجوم ایک زمانہ گزرا کہ تقویم پارینہ سے زیادہ بیکار ہو گیا۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ دنیا کے بڑے بڑے معاملوں میں بہت ہی چھوٹی چھوٹی باتوں کا اثر دیکھا جاتا ہے۔ چند تمثیلیں جو صاحبِ مضمون نے لکھیں ان میں سے یہ تمثیل اس بات کے ثبوت میں ہے کہ کتنی خفیف بات کتنے بڑے معرکہ کا سبب ہوئی ٭

راستہ پر ایک گاڑی جا رہی ہے جس میں ایک نوجوان ایک عورت کے ساتھ بیٹھا ہوا ہے۔ باہم محبت آمیز باتیں ہو رہی ہیں۔ یہ دونوں اپنی باتوں میں اسقدر منہمک ہیں کہ انہیں کسی کا خیال نہیں ہے۔ اتفاق سے اسی وقت سامنے سے اس عورت کا شوہر آ رہا ہے جو اس قدر بدمزاج ہے کہ اگر ان دونوں کو دیکھ لے تو فوراً ہلاک کر دے۔ ایک دوسرا شخص سڑک کے کنارے نارنگی چھیلتا ہوا آ رہا ہے اور اس عورت کے شوہر سے متصادم ہو جاتا ہے۔ یہ دونوں لڑنے لگتے ہیں اور گاڑی گزر جاتی ہے نہ وہ عورت اپنے شوہر کو دیکھتی ہے۔ نہ اس کا شوہر اپنی بیوی کو غیر کی معیت میں دیکھتا ہے۔ اور اس طرح یہ مجرم عورت نجات پا جاتی ہے۔ لیکن واقعہ اسی حد تک محدود نہیں رہتا۔ جہاں اس شخص نے نارنگی چھیلی تھی۔ اس کے سامنے سلطنت کے وزیر اعظم کا مکان تھا۔ وہ ایوان پارلیمنٹ میں جانے والا ہے۔ سواری اس کے لینے کے لئے آتی ہے۔ وزیر اعظم کا دماغ ایک نہایت ہی اہم سیاسی مسئلہ کے سوچنے میں مصروف ہے اور رات بھر کے غور و فکر کے بعد وہ اس نتیجہ پر پہونچا ہے کہ بغیر جنگ کئے ہوئے مقصد حاصل نہیں ہو سکتا اور چونکہ اس مسئلہ کا انحصار صرف اس کی رائے پر تھا۔ اس لئے آج اعلان جنگ بالکل یقینی تھا۔ وہ اپنے خیال میں منہمک گھر سے باہر نکلتا ہے اور جب وہ اپنے موٹر کے قریب پہنچتا ہے تو اسکا پاؤں اُسی نارنگی کے چھلکے پر پڑتا ہے۔ چونکہ سڑک پختہ ہے اس لئے اسکا پاؤں پھسل جاتا ہے اور وہ زمین پر گر کر بیہوش ہو جاتا ہے۔ اب بجائے ایوان حکومت کی طرف جانے کے۔ اُسے لوگ گھر لے جاتے ہیں۔ چونکہ سر میں سخت چوٹ آئی ہے اس لئے وہ عرصہ تک بیمار رہتا ہے اور آخر میں وہ مر جاتا ہے۔ بظاہر نارنگی کا چھلکا نہایت بے حقیقت چیز ہے لیکن محض اسی کی وجہ سے دُنیا جنگ کے مصائب سے محفوظ رہی × × × ×

(منقول از رسالہ نگار ماہ اکتوبر ۱۹۲۳ء)

مضمون پریشان

کہہ کے کچھ کان میں پڑہ جائے گی آگے شاید ٭ جا لگی کان سے گر زلفِ پریشاں جُھک کر

مُجھے زہد و پارسائی سے اتنی مُحبّت ہے اور اس قدر مشق تقوے و پرہیزگاری میں بہم پہونچائی ہے کہ زہدانِ خشک اور واعظانِ بے عمل میں سے بہت کم مجھ سے بازی لے جا سکتے ہیں مگر قباحت یہ ہے کہ ضرورت سے زیادہ پارسائی کا دعوائے انسان کو اوروں کے عیوب دیکھنے میں دلیر کر دیتا ہے۔ لیکن دوسروں کے عیوب پر نظر رکھنا اپنی پاکیزہ مزاجی کا خون کرنا ہے: جس طرح ہمیشہ ہر مُہم میں فتح یاب ہونے سے نادر کے دل سے بندگانِ خدا کے جان لینے کا خوف جاتا رہا تھا۔ یہی حال ہلاکو و چنگیز خاں کا تھا کہ خلقِ خدا کی ہلاکت سے انہیں خوشی ہوتی تھی: اسی طرح زاہدانِ خشک اور مُتقیانِ ریاکار اپنے زہد کے گھمنڈ پر رندان بے ریا کی جانوں کے دشمن ہو جاتے ہیں ٭ ہم نے مانا کہ زہد و تقوے بہت اچھا ہے مگر دوسروں کو بُرا جاننا پاکیزہ خیالی کے لئے اچھا نہیں

رندِ خراب حال کو زاہد نہ چھیڑ تو ٭ تجکو پرائی کیا پڑی اپنی نبیڑ تو

پاکیزہ خیالی کے خیال میں مجھے یاد آیا کہ دہلی میں ایک دفعہ مشاعرہ کی طرح کا یہہ مصرع قرار پایا تھا ع اجل کیا ہے خمارِ بادۂ ہستی اُتر جانا۔ بادۂ ہستی کے خمار کے اُتر جانے کا نام اجل رکھنا بہت ہی پاکیزہ نازک خیالی ہے: اسی طرح نواب مصطفٰے خاں شیفتہ نے اجل کو یار کی حیا سے تشبیہہ دی ہے ؎

زندگی خاک ہو جب فہم میں اتنا ہو خلاف ✤ ہم اجل کہتے ہیں تم جس کو حیا کہتے ہو

پاکیزہ خیالی کے یہ معنی ہیں کہ بُری بات بھی اچھی طرح بیان کی جائے اور ناگوار خیال بھی دل کش صورت پیدا کرے۔ چشم پُرخوں کی جس کا دیکھنا بھی نگاہ کو ناگوار ہو ساغرِ صہبا سے تشبیہہ دیجائے اور چرخِ نیلوفری کو جس نے ایک گردش میں ہزار نادر اور نادر شاہیاں خاک میں ملادیں[1] گنبدِ مینا کہا جائے تو پاکیزہ بیانی میں داخل ہے: دیدۂ بے خواب کو بختِ بیدار کیوں نہ کہئے اور گردشِ روزگار کو دورِ ساغر سے مشابہت میں کیا قباحت ہے؟ ؎

گلہ ہے کجروشی کا وگرنہ کیا غم تھا ✤ فلک کی ہوتی اگر راہ راہ کی گردش

ہر گردش بُری نہیں۔ خاص کر جو "راہ راہ" کی گردش: ؎

بسانِ چرخ رہے دور جام دن رات ✤ ہمیں پسند نہیں گاہ گاہ کی گردش

بادۂ ہستی کی رعایت سے یہہ مضمون بہت پاکیزہ ہے کہ:-

زمیں پہ گر کے بھی ہوتی نہیں شراب تلف ✤ کہ زیرِ خاک ہیں رندانِ بادہ خوار بہت

یہاں کی شراب اور بادۂ حوضِ کوثر میں فرق یہ ہے کہ وہاں مفت ملے گی

[1] بہ یک گردش چرخ نیلوفری

اور یہاں داموں کی بھی مشکل سے ملتی ہے۔ مفت کی چیز کی اتنی قدر نہیں ہوتی جتنی داموں
والی چیز کی قدر ہوتی ہے ؛ شراب سے غرض نشہ و مستی و خمار ہے کہ خمار کے بعد صبوحی
کا خیال پیدا ہوتا ہے۔ وہاں مستی کا خیال نہیں اور خمار کا پتہ نہیں۔ وہاں خمار میں ہاتھ
پاؤں کا ٹوٹنا نصیب نہیں پھر صبوحی کا ذکر کہاں ؟ یہہ خمار بادہ ہستی ہے جس میں صبوحی کا
سہارا سمجھئے کہ خمار بادہ ہستی اترنے کے بعد اعضا شکنی کا علاج ضرور تھا۔ اس کا علاج
صبح محشر سے ہو جائے گا : صبح محشر گویا اچھی خاصی صبوحی ہو جائے گی کہ قیامت سے شرط
باندھ کر سونے والے جب انگڑائیاں لیتے اٹھیں گے تو سوا نیزہ پہ آفتاب دیکھ کر
آنکھیں کھل جائیں گی ؛ یا بقول حضرت سرمد رح ع دیدیم کہ باقی ست شب فتنہ غنودیم ؛
جب دیکھیں گے کہ ابھی رات باقی ہے پھر اونگھ جائیں گے ؛ خدا جانے کتنی قیامتیں آئیں گی
دو کا نام تو میں نے سنا ہے کہ قیامت صغرٰے و قیامت کبرٰے : اوروں کے نام مجھے
معلوم نہیں۔ کہتے ہیں کہ فتنۂ رفتار یار کی طرح ہزاروں دفعہ محشر بپا ہوا اور جب تک خرام
ناز سلامت ہے محشر بپا ہوئے بغیر نہ رہیں گے ؎
نقشہ بگڑے گا بھی دُنیا کا تو جب وقت آئے گا ؛ پھر اُٹھیں گی یہ بنائیں سب اسی آثار پر
زندگی کو موت سے کچھ تعلق نہیں۔ یہ دونوں ایک جگہہ جمع نہیں ہو سکتے
جس طرح تیز ہوا میں مچھر نہیں ٹھہر سکتے ؛ یہ جو مشہور ہے کہ "دُنیا بہ اُمید باقی است"۔ یہ
اُمید صرف زندگی سے محبت سمجھئے : نہ ہماری زندگی کا اعتبار ہے نہ ہماری اُمیدوں کا
جس طرح زندگی سے مایوس ہونا انسان کی طبیعت میں نہیں اسی طرح امیدوں سے مایوس

ہونا ہماری طبیعت کے خلاف ہے۔ جب تک ہمارے جسم میں سانس ہے
آس بھی ساتھ ہے ؛ لیکن زندہ رہنے کی فکر ایک بڑی مصیبت ہے۔ اور مصیبت
پر مصیبت یہ ہے کہ آخر میں ساری محنت بے کار جاتی ہے : انسان رات دن اسی میں
غلطاں پیچاں رہتا ہے اور آخر کو ڈھاک کے وہی تین پات۔ چند روز دشتم پشتم کیٹے
اور پھر کچھ نہیں ؛ مرنے کے بعد پھر زندہ ہونے کی اُمید اگر کچھ نہیں تو بھی اس کے خوش کن
ہونے میں شک نہیں۔ اور یہی بندگانِ خدا کے لئے تسلّی کا بڑا سہارا ہے ٥

انسان کی زندگی کو سفر سے تشبیہہ دیتے ہیں۔ ہم اپنی زندگی کو دریا کی روانی سے
تمثیل کیوں نہ دیں ؟ سارے چشمے جو پہاڑوں سے نکلتے ہیں ان میں گو اکثر آخر کو سمندر
میں جا کر مل جاتے ہیں۔ لیکن بعض تھوڑی دیر چل کر ریت میں اور زمین کے گڑھوں میں بھر
جاتے ہیں ؛ وہ جو سمندر میں مل گئے اُن کا تو کچھ حشر ہوا کہ گو خود گم ہو گئے مگر ٹھکانے سے تو
پہونچ گئے لیکن جو راہ میں ریت میں خشک ہو کر رہ گئے اُن کا کیا نتیجہ سمجھا جائے ؟ پھر ایک
کے ساتھ نیچر کا یہ سلوک اور دوسرے کے ساتھ وہ : یہہ آپ کی سمجھ میں آجائے
تو آجائے میری سمجھ سے باہر ہے ٥

ہر ایک غنچہ چٹک چٹک کر صبا و شبنم سے کہہ رہا ہے
کہ تم کو کیا مل گیا جو ہم کو کیا پریشاں جگا جگا کر ؛

اردو رسالوں کی نسبت رائے

صلائے عام کی نسبت رائے لکھنے کے بعد (جو صفحہ ۳۵ میں ملاحظہ فرمائی جائے) صاحب رسالۂ ترقی (حیدرآباد۔ دکن) عموماً اردو رسالوں کی نسبت یہہ رائے قائم کرتے ہیں:۔

× × × × × شاید ہی کبھی ایسی کثیر اور شدید کوششیں محروم نتائج رہی ہوں۔ جیسی کہ اردو کی ترقیٔ علم ادب اور علوم جدیدہ وغیرہ کی دیکھنے میں آئی ہیں۔ خدا اس بدمذاقی اور طوفانِ بے تیزی سے بچائے کہ ہم تو یہ سمجھتے رہیں کہ چلتے چلتے نہ معلوم کہاں نکل آئے ہوں گے اور آنکھ کھول کر جو دیکھیں تو وہیں ہیں جہاں سے چلے تھے۔ بلکہ اور پیچھے ہٹ گئے ہیں۔ اس کی سب سے بڑی اصولی دو وجہیں سمجھ میں آتی ہیں۔ جن کی طرف وفور جوش میں حامیان اردو کا خیال نہیں جاتا۔ پہلا سب سے بڑا اور بنیادی سبب یہ ہے کہ ہماری کوشش جو اس سمت میں ہوتی ہے کوئی غایت نہیں رکھتی۔ یا یوں کہئے کہ اس قدر غائتیں رکھتی ہے کہ جن میں سے کوئی بھی پوری نہیں ہوتی۔ اور اس طرح پر "مجسمہ ادب" کا "خواب پریشان" کے مانند خاتمہ ہو جاتا ہے۔ بجائے اس ابتری مطامح اگر کوئی مختصر اور مفید غایت مثلاً اصطلاحات علمیہ کی ترویج یا فنون جدیدہ کی اشاعت۔ یا مسلمانوں کے قدیم علوم کا احیار۔ یا علم المادیات یا اردو کے اصول قواعد وغیرہ مقرر کر کے پرچہ نکالا جائے تو یقیناً وہ اپنی غایت اپنی مختصر زندگی میں پوری کرنے کے علاوہ اپنے "پیکر کاغذی" کو اردو کی خدمت کا اہل بنا سکتا ہے۔ دوسری وجہ اس کثرت تعبیر کی یہ ہے کہ باوصف اس قدر غوغائے نظم و نثر کے ہنوز اردو کے ادب کا کوئی معیار مقرر نہیں ہوا۔ یا یوں کہئے کہ اس قدر کثرت سے معیار مقرر کر لئے گئے ہیں کہ ہر رسالہ اور ہر تصنیف بجائے خود ایک مخصوص معیار کا مدعی اور علم بردار ہے اور جا بجا ٹکسالیں بنی ہوئی ہیں جن سے الفاظ محاورے اصطلاحات۔ تخیلات۔ طرز ہائے ادا وغیرہ ڈھل ڈھل کر نکلتے ہیں۔ اور کسی کی مجال نہیں کہ ان ٹکسالوں کی شان میں ایک ذرا سی بھی گستاخی تعریض و ایرا کی صورت میں پیش کر سکے اور تنقید تو وہ چیز ہے

کہ اُردو کے بہت سے لغات و محاورے کی طرح اس نے بھی اپنے مفہوم کو اپنا ضد بنا کر بالکل معکوس و مسخ کر دیا ہے۔"

× × × × × × × × × × × × × × ×

اسی رائے کے متعلق رسالوں کے بارہ میں ایک جگہ پوست کندہ ارقام فرماتے ہیں کہ:-

× × × × × × × × × × × × × × ×

" رسالہ بازی کی طرف توجہ کی تو رطب و یابس۔ الم غلم۔ موضوع و مُہمل جو کچھ ملا بھر بھر کر شایع کرتے رہے۔ مشاعروں اور گلدستوں پر آئے تو بقول ایک تازہ وارد ایرانی کے بجز "لیلۃ الواہ واہ" کے اور کوئی نتیجہ نہ پیدا کیا اور جہاں سے چلے تھے وہیں رہے۔ جس رسالے یا دیوان یا تصنیف کو دیکھئے گلستاں بہ دامن اور دریا بہ کنار ہونے کا مدعی۔ اور ایک لحاظ سے یہ دعوےٰ صحیح بھی ہے۔ یعنی اگر ہم زمانہ کا ٹائیٹل **مخزن** کو اور **ہمایوں** کا **ہزار داستان** کو **ترقی** کا **معارف** کو اور **آئینہ** کا **نگار** کو دے دیں تو پڑھنے والا کبھی اس دعوے کی تردید کا پہلو نہیں پا سکتا۔ اس لئے کہ ان مُربیان اُردو میں سے ہر ایک علمی۔ ادبی۔ تاریخی۔ اقتصادی۔ معاشی۔ سیاسی۔ تمدنی۔ معاشرتی۔ روحانی۔ تعلیمی۔ ورزشی۔ قومی۔ اخباری وغیرہ وغیرہ خدا جھوٹ نہ بلائے تو ایک درجن سے زائد ہی مقاصد کا حامل ہے اور مساوات کا مدعی پھر کیوں کر ان میں فرق کیا جا سکتا ہے اور طرفہ یہ کہ ہر نیا اُردو کا خادم عبرت پذیری سے اس قدر بے نیاز ہے کہ اپنے عارضی اُبھرنے والے معاصرین یا جا بجا جمشید کو آئے دن "فنا فی الادب" ہوتے دیکھتا ہے۔ مگر بمصداق ع

"مقصد و مفتاد قالب دیدہ ایم" خود بھی ان کا جنم لینے کے اندھا دھن شوق میں شہید بے اصولی ہو جاتا ہے"

× × × × × × × × × × × × × × ×

منقول و مقتبس از رسالۂ ترقی حیدر آباد۔ دکن

"ایک کہانی مجھے بھی یاد آئی"

انگریزی اخبار اور رسالوں کی ریس تو بھلا ہم کیا کریں گے یہ مُنہ اور مسالہ حلوا خوردن را روئے باید۔ یہاں زبانی جمع خرچ بہت۔ وہاں کہنا کم اور کرنا زیادہ۔ وہاں ہر بات میں وقت کی پابندی یہاں سرے سے وقت کی قدر ہی نہیں۔ آج کا کام کل جا کر ہوا تو کیا غضب ہوا۔ صبح کا بھولا شام کو گھر آیا تو کچھ بات نہیں یہی غنیمت جانو کہ آ تو گیا۔ ہمارے روزانہ اخباروں کا حال یہ ہے کہ آج کا کل اور کل کا پرسوں آیا۔ ہفتہ وار اس ہفتے کا اُس ہفتے میں۔ تاریخ دیکھو ایک ڈاکخانے کی مُہر دیکھو چار دن بعد کی معلوم ہوا کہ خیر سے چال کا یہ حال ہے کہ مطبع سے ڈاک خانے تک چلنا محال ؎ آہستہ خرام بلکہ مخرام ٭ زیر قدمت ہزار جان ست۔ اب رسالوں کو دیکھئے نام رسالہ اور رفتار پیدل کی سی بھی نہیں۔ خرام ناز اور رفتارِ معشوقانہ اسی کا نام ہے مہینے کے کئی کئی دن چڑھا کر تشریف لاتے ہیں۔ ہم یہ کہہ کر ٹال دیتے ہیں کہ خیر آ تو گئے دیر آید درست آید۔ بعض دفعہ پورے مہینے بھر کا غوط لگا جاتے ہیں دوسرے مہینے خوابِ غفلت سے بیدار ہو کر نکلے تو ڈبل نمبر کے نام سے جلوہ نما ہوئے۔ پوچھا سبب؟ کہا "دیر سویر ہو ہی جاتی ہے"۔ غرض ہم کو جب تک وقت کی قدر نہ ہوگی اور کام پابندی سے نہ کریں گے دُنیا میں ذلیل و خوار ہیں اور رہیں گے۔ ؎

وہ اپنی خو نہ چھوڑیں گے ہم اپنی وضع کیوں چھوڑیں ٭ سبک سر بن کے کیا پوچھیں کہ ہم سے سرگراں کیوں ہو

غرض جو کام کریں گے ریں ریں کر کے ؎ آنچہ دانا کند کند ناداں ٭ لیک بعد از خرابیِ بسیار بجز انگریزوں کی تقلید ہے تو کوٹ پتلون۔ بوٹ ہیٹ۔ کالر نکٹائی میں۔ نہ کہ اُن کی مستعدی۔ جفاکشی۔ پابندیِ وقت میں ؎ عیسائیوں میں ساری مسلماں کی خصلتیں۔ اسلامیوں میں اُن کی سی کوئی ادا نہیں اب لیجئے جناب میر صاحب خان بہادر کو۔ عمر کے لحاظ سے بوڑھے۔ ہمت کے لحاظ سے جوان (رباعی) ہے جان کے ساتھ کام انساں کے لئے ٭ بنتی نہیں زندگی میں بے کام کئے۔

جیتے ہو تو کچھ کیجئے زندوں کی طرح ✤ مُردوں کی طرح جیئے تو کیا خاک جئے (حالی)

جب دیکھو پڑھنے لکھنے میں منہمک۔ صلائے عام نکالتے ہیں نہ کمانے کے لئے بلکہ کچھ سکھانے کے لئے۔ مہینا ختم ہوا یا نہیں کہ وقت مقررہ سے پہلے موجود۔ ناظرین کو زحمتِ انتظار نہیں۔ نقد ہے اُدھار نہیں۔ اکتوبر کے ختم میں ابھی پورا ایک ہفتہ باقی ہے کہ رسالہ موجود۔ ریل لیٹ ہو جائے تو ہو جائے صلائے عام کی پالیسی کا امروز را بہ فردا مگزار ہے۔ وہاں جو کچھ ہے آج ہے کل کا بے کل لفظ اُن کے کانوں میں نہیں پڑا۔ میر صاحب خان بہادر ایک زندہ نمونہ ہیں مستعدی۔ جفاکشی۔ پابندی کا۔ تازیانہ ہیں کاہلوں۔ غافلوں اور وقت کے خزانے کو بے دریغ لٹانے والوں کے لئے۔ اے کاش ہم ان سے سبق لیں۔ کاہلی چھوڑ کر مستعدی اپنا معیار بنائیں خلاصہ یہ کہ حیوان سے انسان بنیں ؎

غور سے دیکھا نظامِ دہر تو ثابت ہوا ✤ آدمی پیدا ہوا ہے کام کرنے کے لئے

اکتوبر کے صلائے عام میں "قیاسِ صحیح" کا دلچسپ مضمون دیکھ کر مجھے بھی ایک اسی قسم کی کہانی یاد آئی جس میں ذہانت ذکاوت اور دانش مندی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے اور کیا خوب کہا ہے کہ "یک من علم را دہ من عقل باید"۔ ورنہ اُسی شاہزادے کی کہاوت ہو جائے گی جو عقل کا کُتھل تھا بادشاہ نے اُسے علم نجوم پڑھوایا کہ صاحب زادے بلند اقبال کی عقل درست ہو۔ وہاں ڈھاک کے تین پات ویسے کے ویسے ہی ٹھوس رہے۔ جب وہ علمِ نجوم پڑھ چکے اور اُن کے اُستاد نے بادشاہ کے گوش گزار کیا تو بادشاہ نے ٹٹولا۔ ایک انگوٹھی اپنی مٹھی میں چھپا لی اور کہا کہ ہاں بتاؤ میری مُٹھی میں کیا ہے۔ صاحب زادے نے حساب لگا کر کہا کہ "کوئی گول گول چیز ہے جو بیچ میں سے خالی ہے"۔ بادشاہ "ہاں درست۔ ٹھیک۔ آگے چلو کہو کہ وہ کیا چیز ہے"۔ صاحب زادے کیا کہتے ہیں کہ "ہے کیا؟ چکّی کا پاٹ ہے"۔ ہاں تو وہ اصل کہانی یوں ہے :-

۱۲۶ ایک شخص آنکھوں کا اندھا تھا مگر عقل کا اندھا نہ تھا سڑک کے کنارے بیٹھا

بھیک مانگا کرتا تھا۔ اُس نے وہیں کھیت میں ایک جھونپڑی ڈال لی تھی اُسی میں رہتا تھا۔ بھیک مانگنے کو سڑک پر آن بیٹھتا تھا۔ ایک دن کیا ہوا کہ اُس کے کان میں گھوڑے کی ٹاپ کی آہٹ آئی۔ معلوم ہوا کہ کوئی سوار گھوڑا ڈپٹائے چلا جا رہا ہے۔ سوار نے دور سے للکارا کہ "آبے اندھے رستے میں سے ہٹ۔ تیری موت تو نہیں آئی" اور دو چار گالیاں بھی رسید کیں۔ اندھا کنارے ہو گیا۔ اس کے بعد پھر ایک سوار گزرا اُس نے ڈانٹ کے تو کہا مگر سخت سست نہیں کہا۔ پھر تیسرا سوار آیا۔ اُس کے ساتھ اور بھی سوار تھے اُس نے کہا۔ "میاں اندھے! رستے میں کیوں بیٹھے ہو ایسا نہ ہو کہ جھپیٹ میں آجاؤ۔ کنارے ہو کر بیٹھو نا"۔ اندھا فوراً کھسک گیا۔ یہ بادشاہ سلامت کی سواری تھی جو ہرن کے شکار کو برآمد ہوئی تھی۔ بادشاہ ذرا کی ذرا ٹھٹکا اور اندھے سے پوچھا۔ "تم کب سے یہاں بیٹھے ہو؟" اندھا۔ "صبح سے"۔ بادشاہ "اِدھر سے کوئی اور گیا ہے"؟ اندھا۔ "جی ہاں حضور پہلے ہرنی گئی۔ بعد کو قوال۔ پھر وزیر اور آپ بادشاہ سلامت اب تشریف لے جا رہے ہیں"۔ بادشاہ اندھے کی اِن باتوں سے بہت متعجب ہوا اور تعجب کے لہجے میں کہا کہ "بھئی تم تو اندھے ہو۔ تم نے کیسے جانا؟" اندھا۔ جنابِ عالی آنکھوں کا اندھا بے شک ہوں مگر عقل کا اندھا نہیں خدا کو دیکھا نہیں تو عقل سے پہچانا۔ بادشاہ۔ "ہاں یہ تو سچ ہے۔ مگر یہ بتاؤ کہ یہ تفصیل تم کو کیسے معلوم ہوئی؟" اندھا۔ حضورِ والا! یہ کوئی ایسی پیچیدہ بات نہ تھی کہ جسے ہاتھی گھوڑے لگتے۔ یہ تو کھلی بات ہے۔ "یہ شکار کا موسم ہے جنگل بھی اسی رُخ پہ ہے۔ بادشاہ اکثر اسی طرف شکار کو جاتے ہیں۔ اس جنگل میں ہرن کا شکار خوب ہوتا ہے اور یہ موسم اسی شکار کا ہے یہ بات بھی ہے کہ یہ دن ہرنوں کی مستی کے ہیں۔ نادہ کی طرف رغبت کرتے ہیں اور ہمیشہ نادہ آگے چھلانگیں بھرتی جاتی ہے اور نر اُس کے پیچھے لگا رہتا ہے۔ اس کے بعد جو سوار آیا اُس نے ناحق ناروا مجھے دو چار صلواتیں سنا دیں۔ میں سمجھ گیا کہ ہو نہ ہو یہ وریدہ دہن کوتوال ہوگا کیونکہ پولیس والوں کا مزاج کرخت اور زبان سخت ہوتی ہے۔ اُس کے بعد جو آئے انہوں نے تحکم کے

ایسے میں کہا تو ضرور مگر کالی والی نہیں چھٹنائی۔ میں سمجھا کہ ہو نہ ہو یہ وزیر صاحب ہوں گے کہ ان کے مزاج میں ایک گونہ صلاحیت ہے۔ پھر آپ تشریف لائے۔ سالے کہ نکوست از بہارش پیداست۔ آپ نے کس نرمی سے مجھے مخاطب فرمایا ہے میں سمجھ گیا کہ یہ حسنِ خُلق اور شیریں سخنی بادشاہوں ہی کے سزاوار ہے جب تو خدا نے یہ رتبہ دیا ہے"۔ بادشاہ اس اندھے کی باتوں پر ریجھ گئے اور ارشاد فرمایا کہ بھئی یہاں تم کیوں پڑے ہو۔ ہمارے ساتھ چلو۔ اندھا کیا چاہے دو آنکھیں۔ غرض اندھے صاحب کی ساڑے ساتی گئی اور بادشاہی محل میں داخل ہو گئے۔ سوا سیر آٹا اور پانچ پیسے روز پیشگاہِ خسروی سے ان کو ملنے لگا۔ کھانے لگے اور اینڈنے لگے۔ اسی طرح کئی مہینے گزر گئے۔ بادشاہ نے ایک نئی بیگم کی۔ جیسا کہ بادشاہوں کا دستور ہے۔ بیگم صاحب کی پالکی درِ دولت پر آن لگی۔ اندھے کی یاد ہوئی۔ حکم ہوا کہ "میاں اندھے ذرا ہماری بیگم کو تو جاکر دیکھو کیسی ہیں"؟۔ اندھا۔ "جہاں پناہ کیسی کیا معنی۔ راجہ کے گھر آئی رانی کہلائی۔ اس سے بڑھ کر کیا خوش قسمتی ہوگی کہ محلِ شاہی میں آن براجیں"۔ بادشاہ کے اصرار پر اندھا پالکی کے پاس ڈرتا ڈرتا گیا اور دیکھ بھال کر آگیا۔ بادشاہ "کہو کیا دیکھا"۔ اندھا۔ حضورِ عالی کیا عرض کروں بیگم تو بیگم ہی ہیں۔ اللہ مبارک کرے"۔ بادشاہ کو اندھے کی گفتگو سے کچھ شبہ ہوا مُصر ہوا کہ سچ کہو۔ بادشاہی حکم اندھا مجبور۔ کہوں تو ماں ماری نہ جائے نہ کہوں تو باپ کتا کھائے۔ عجب ضغطے میں پڑا۔ نہ پائے رفتن نہ روئے ماندن۔ آخر بولا تو یہ بولا کہ جان بخشی کا حکم ہو تو عرض کروں۔ "یہ تو کسی کنجنی کی جنی ہے"۔ بادشاہ۔ "ہیں! کنجنی! غلط۔ فلاں امیر کی تو بیٹی ہے تو کہتا ہے کنجنی ہے۔ اچھا ہم تحقیقات کریں گے اگر ذرا بھی غلط ثابت ہوا تو تیری جان کی خیر نہیں"۔ بادشاہ نے تحقیق کرایا تو بات سچی نکلی۔ اندھے کی طلبی ہوئی حکم ہوا بتا کہ تجھے کیسے شناخت ہوئی۔ اندھا۔ حضور اس میں شناخت کی کیا بات ہے۔ اگر کوئی شریف زادی ہوتی تو بھلا میری مجال تھی کہ پالکی میں اس طرح بے محابا ہاتھ ڈال کر سب کچھ ٹٹول لیتا۔ وہ میرے ہاتھ نہ توڑ ڈالتی"۔ بادشاہ بہت خوش ہوئے اور اس دن سے ڈھائی سیر آٹا مقرر ہوا اور کچھ پیسے اور بڑھ گئے

بادشاہ کو جب اندھے کی دانائی اور دور بینی کا کئی دفعہ امتحان ہو چکا تو اس کو ڈیوڑھی پر بطور معتمد خاص نگہبان اور دربان مقرر کیا کہ محل کے اندر کوئی ایرے غیرے جانے آنے نہ پائے۔ اندھا ایک کھٹیا پر پڑا ڈیوڑھی میں حقہ گڑگڑاتا رہتا تھا۔ جہاں کسی کے پاؤں کی چاپ معلوم دی اور وہ چونکا۔ کہا ٹھیر جاؤ اور خود دروازے کی چوکھٹ میں لیٹ گیا اور کہا بسم اللہ آؤ میری چھاتی پر پاؤں رکھ کر جاؤ۔ یہی طریقہ تھا۔ ایک دن کیا ہوا کہ کوئی عورت آئی اُس کے ساتھ کوئی دوسری بھی تھی۔ عورت جھپا کے سے پاؤں چھاتی پر دھر کے نکل گئی اُس کے ساتھ والی جب آئی اور چھاتی پر پاؤں دھر کے جانے لگی تو جھٹ اندھے نے کَولی بھر لی اور پکڑ لیا۔ کہا۔ "بیٹا! تو جاتا کدھر ہے"۔ دیکھا تو وہ مرد تھا۔ یہ بات بادشاہ کے کانوں تک پہونچی اندھے کی طلبی ہوئی۔ پوچھا گیا تو نے کیسے پہچان لیا کہ مرد ہے؟" مالک میرے۔ آقا میرے۔ ان داتا۔ یہ کون سی مشکل تھی اور حضور نے مجھے ڈیوڑھی پر رکھا ہی اسی غرض سے تھا۔ بات یہ ہے کہ محل شاہی میں رات دن آنے جانے والوں کا تانتا لگا رہتا ہے۔ غلام کسی کو نہیں چھوڑتا جب تک وہ خانہ زاد کی چھاتی پر پاؤں دھر کے نہ لانگھے۔ عورت کا پاؤں ہلکا پھلکا پڑتا ہے اس کا پاؤں ایسا زبردست پڑا کہ فدوی کی پسلی تک ٹوٹ گئی میں نے پکڑ لیا"۔ بادشاہ بہت خوش ہوا۔ پھر کچھ آنا بڑھا کچھ پیسے۔ غرض اسی طرح اندھا رہنے لگا۔ خدا جانے بادشاہ کے جی میں کیا آیا ایک دن اندھے سے یہ سوال کیا کہ "ارے میاں اندھے! یہ تو بتاؤ کہ ہم کیسے ہیں؟"۔ اب اندھا سٹی بھول گیا۔ گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل۔ کہا۔ حضور! جہاں پناہ سلامت۔ آپ کیسے ہیں! یہ تو بڑی ٹیڑھی کھیر ہے۔ سبحان اللہ۔ بڑوں کے بڑے ہی ہوتے ہیں۔ آپ سلطان ابن سلطان۔ بادشاہ ذی جاہ۔ سایۂ خدا۔ غریبوں کے پرورش کرنے والے اور بہت کچھ تعریف کی۔ بادشاہ نے کہا "نہیں۔ یہ کچھ بات نہیں۔ بلا خوف وخطر سچ سچ کہو سر مو جھوٹ نہ ہو ورنہ ابھی تیری گردن بھٹا سی اڑا دوں گا"۔ اندھا لرز گیا۔ ناچار کہا کہ "امر واقعی یہ ہے کہ آپ کسی بنئے کی اولاد ہیں" بادشاہ سُن کر سناٹے میں آگیا۔ چلو کہ اندھے کی کوئی بات آج تک غلط ثابت نہیں ہوئی دل میں کہنے لگا کہ ہو نہ ہو دال میں کچھ کالا ہے۔ فوراً شمشیر برہنہ لئے محل میں گھسا اور ماں کے سر پر جا چڑھا۔ ماں سے تیور بدل کر پوچھنے

دگا۔ ماں سہم گئی۔ کہنے لگی "کچھ تو دیوانہ ہوا ہے اُس موئے اندھے کی بات پر میری گردن اُڑانے آیا ہے۔ کچھ سڑی تو نہیں ہو گیا" مگر بادشاہ نے کہا "نہیں سچ سچ بتاؤ ورنہ جان کی خیر نہیں"۔ عورت ذات تھی اور بادشاہ کا غصہ گو وہ بیٹا ہی کیوں نہ ہو۔ پاؤں تلے کی زمین نکل گئی۔ لرز کر بولی "ہاں خطا بے شک ہوئی۔ تمہارے باپ کے زمانے میں مودی خانے پر ایک بنئے کا لونڈا شکیل و جمیل تھا میرا دل اُس کے دام محبت میں گرفتار ہو گیا۔ اب جو چاہے تم کرو"۔ بادشاہ نے تلوار کو نیام کیا اور اندھے سے کہا کہ "میاں وہ بات سچ ہو یا نہ ہو تم آخر کہو تو سہی کہ تم نے کس بنا پر اتنا بڑا اتہام رکھا"۔ اندھا۔ حضور اتہام نہیں ہے۔ اِس میں اگر ذرا بھی فرق ہو تو فدوی کی گردن حاضر ہے صاف اُڑا دیجئے۔ میں بھلا ایسی لیسی بات زبان سے نکال سکتا تھا اور پھر حضور والا کی نسبت۔ توبہ توبہ کرکے عرض کرتا ہوں اور کان پکڑ کر کہتا ہوں کہ غلام نے عرض کیا اصل بات وہی ہے۔ اور یہ جو آپ فرماتے ہیں کہ تجھے کیسے علم ہوا تو خانہ زاد عرض کرتا ہے کہ حضور اگر بادشاہ کے جنے ہوتے تو جاگیر دیتے منصب سے سرفراز کرتے خلعت مرحمت فرماتے۔ یہ کیا بات کہ جب نظر بخشش ہوئی سیر بھر آٹا اور کچھ پیسے۔ یہ کوئی دینے میں دینا ہے آپ کا عمل خود بتلاتا ہے اور ہانکے پکارے کہتا ہے کہ ہو نہ ہو آپ بنئے کی اولاد ہیں ؎

اگر مادرِ شاہ بانو بدے ۔ مرا سیم و زر تا بزانو بدے

بادشاہ کے پاس سوائے سکوت اور سر جھکا لینے کے جواب ہی کیا تھا فقط

حرّرہٗ خاکسار بشیر الدین احمد تعلقہ دار۔ از۔ دہلی

مخدوم و مکرم میرے۔ تسلیم۔ صلائے عام ماہ اکتوبر میرے ہاتھ ضرور پڑا مگر ہاتھوں ہاتھ چھن گیا اور خدا جانے کہاں کا کہاں جا پہونچا۔ مہربانی فرما کر مجھے دوسرا پرچہ اکتوبر کا مرحمت فرمائیے۔ کیوں کہ اُس پرچہ کو نہ میں نے دیکھ پایا ہے نہ اُس کے واپسی کی امید ہے۔ × × ×

× × × × × × × × × × × × × × × × × × ×

آپکا نیازمند عرفان علی (آئی ایس او) آنریری مجسٹریٹ آگرہ

رباعیات گرامی

صاحب صلائے عام کی نظر ایسی نکتہ رس اور اوق ہے کہ معمولی مضمون اُن کی نظر میں جچتا نہیں اور تازہ ڈال کے ٹوٹے مضمون کا ملنا بدون دماغ پر زور ڈالنے اور کاوش کے ہو نہیں سکتا۔ اس کے لئے فرصت اور اطمینان خاطر دو اہم امور کی ضرورت ہے اور یہ دونوں کے دونوں عنقا۔ ہم دُنیا کے گورکھ دھندے میں ایسے پھنسے ہیں کہ سر کُھجانے کی فرصت نہیں مضمون لکھے تو کون لیکن صلائے عام کی ہر دل عزیزی اُس کے مضامین کی پاکیزگی اور ندرت مجبور کرتی ہے کہ کچھ نہ کچھ حق خدمت ادا کروں۔ حُسنِ اتفاق سے جناب نواب سراج الدین احمد خاں صاحب سائل کی صاحب زادی کی شادی میں جناب مولوی شیخ غلام قادر صاحب گرامی دہلی آن نکلے تھے مجھے قیامِ حیدر آباد دکن کے زمانے سے صاحبِ معزز کی خدمت میں درجۂ رسوخ حاصل تھا۔ بچھڑے ہوئے یہاں بھی ملے اور خوب دل کھول کر ملے۔ گرامی نے زبانِ فارسی میں وہ درجہ حاصل کیا ہے کہ ہندی نژادوں کا تو ذکر نہیں اہل زبان بھی عش عش کرتے ہیں۔ جس کا ثبوت اُن کے کلام سے ہوگا ع آفتاب آمد دلیلِ آفتاب۔ شاعری کے اعتبار سے آپ کا مرتبہ بہت بلند ہے۔ آپ کی رباعیاں عمرِ خیام کی مشہور انام رباعیوں سے لگا کھاتی ہیں۔ ذاتی وقار یہ ہے کہ آپ کو پیشگاہ اعلیٰ حضرت سرکار عالی متعالی حضورِ نظام خلد اللہ ملکہ و سلطنتہ کے دربار دُر بار کے "شاعرِ خاص" ہونے کا فخر حاصل ہے جناب گرامی اول تو عمر رسیدہ اوپر سے بیمار اُس پر شادی کے مہمانوں کی بھرمار۔ بھلا یہ کون سا موقعہ شعر و سخن کا تھا مگر میں نے لگ لپٹ کر بہ اصرار تمام کچھ رباعیاں صلائے عام کے لئے لے ہی لیں پر مشکل یہ کہ آپ کا کلام مطبوعہ نہیں۔ مدوّن نہیں۔ آپ کے حافظہ میں مخزون ہے۔ یہ درِ نایاب ملیں تو کیوں کر۔ یہ میرا ہی پاسِ خاطر تھا کہ صاحب موصوف نے اپنی قلمِ خاص سے چند رباعیاں مجھے لکھ کر دیں جن کو میں صلائے عام اور اُس کے ذریعے سے ناظرینِ صلائے عام

کے سامنے پیش کرتا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ ناظرین ایسے نادر کلام کو پڑھ کر بہت محظوظ ہوں گے۔

والسلام

خاکسار بشیر الدین احمد۔ از دہلی (تعلقہ دار ریاست دکن نیایرڈ)

---

(۱) فریاد کہ عمرم ہمہ بر باد آمد ؛ ناکردنی و کردنیم یاد آمد
کارے کہ نہ کردنیست کردم چہ کنم ؛ فریاد کہ فریاد بہ لبقر یاد آمد

(۲) خاور چکد از شبنم بایں تیرہ شبی ؛ کوثر چکد از لبم بایں تشنہ لبی
اے دوست ادب کہ در حریم دل ماست ؛ شاہنشہ انبیا رسولِ عربی

(۳) اے ساقیِ ما بادہ بدہ عصمت خیز ؛ کامد یاد آرد گیر باطل ستیز
در ساغرم اے ساقیِ خمخانۂ راز ؛ آں بادہ ز رمز اسمہٗ احمد ریز

(۴) بر چرخ ستارہ جستجوئے دارد ؛ ہر ذرہ بخاک آرزوے دارد
دارد ہر رہ نوردے شعرے در سر ؛ پیداست کہ ہر دماغ بوئے دارد

(۵) از غصہ ہیچ دوری اینست ؛ حسرت معزوش ناصبوری اینست
با خود در بیخودی رسیدن سہل است ؛ بیخود در خودرسی حضوری اینست

(۶) شینیم مقدس سیم غازی مائیم ؛ از راہ نشینانِ حجازی مائیم
بے پردہ بلعبہ سبحہ گراں بودیم ؛ در پردہ امامِ مہرۂ بازی مائیم

(۷) ما زمزمہ سنجِ گلشنِ لاہوتیم ؛ افتادہ بدامِ فتنۂ ناسوتیم
نے عقل نہ عشق نے تصرف نہ اثر ؛ پیچیدہ بخویش مُردہ در تابوتیم

(۸) اے روح بجسم زار نالی تا چند ؛ در بندِ قفس شکستہ بالی تا چند
پر برزن و بر فراز سدرہ بنشیں ؛ در مرکزِ فتنہ خاک مالی تا چند

(۹) در حکمت و عقل بیدپا دانندم ؛ در شعر سنائی دگر خوانندم
ایں بوالعجبی ہا کہ بسانِ خورشید ؛ خوانند و لیکن از نظر رانندم

(۱۰) خودرا یکچند پاسبانی کردیم ٭ یکچند بخویشتن سرگرانی کردیم
از بیم و امید پائے در زنجیریم ٭ در پہلوئے مرگ زندگانی کردیم

(۱۱) ما رخت زشہر بند ہستی بستیم ٭ از خویش گسستیم و باو پیوستیم
در میکدۂ بے خبری باخبریم ٭ در مکتب عین ہوشیاری مستیم

(۱۲) دیباچۂ اسرار نہانی مائیم ٭ در خورد جواب لن ترانی مائیم
جولاں گہ ما خط وجود و عدم ست ٭ بازیچۂ مرگ و زندگانی مائیم

(۱۳) دل بستگی فنوں طرازی دگرست ٭ دل گرمی ذوق دل نوازی دگرست
ایں بازی عشق ست بازیچہ مسنج ٭ بازی دگرست عشق بازی دگرست

صلائے عام - یہ رسالہ بھی منجملہ اُردو کے اُن قدیم اور مشہور رسالوں کے ہے جن سے ہر ادبی کان پیشتر ہی سے آشنا ہیں۔ البتہ یہ امر ضرور قابل آفریں ہے۔ کہ اس کے لائق مدیر جناب ناصر علی خان بہادر نے نہایت وضعداری اور استقلال کے ساتھ اس یکسانیت اور تسلسل سے اُردو کی خدمت کی ہے کہ اردو رسائل میں شاید ہی کوئی اس کی ہمسری کرے ایسے کہنہ مشق پرچے اور ایسے مشہور و وضعدار مدیر کے متعلق کچھ بھی کہنا آفتاب کو چراغ دکھانا ہے۔ البتہ یہ شعر بے اختیار زبان پر آجاتا ہے ؎

دل ہزاروں کے تیری بھولی ادائیں لیں گی ٭ حسرتیں چاہنے والوں کی بلائیں لیں گی

یہ عبارت رسالۂ ترقیؔ (حیدر آباد۔ دکن) سے نقل کی گئی ہے جو "خدمتِ ادب" کی داد میں صاحبِ مضمون نے ماہ صفر المظفر سنہ ۱۳۴۲ ہجری کے رسالہ میں شایع فرمائی ٭ اس کا شکریہ عرض ہے۔ مگر شعر میں ضرورت سے زیادہ مبالغہ کا گلہ ہے ؎

مکرلتے ہیں سچ بات کو وہ ضد سے مگر ہم ٭ چُپ رہتے ہیں سُنکر اُنہیں جھوٹا نہیں کرتے

پرانی دلی کا

پرانی دہلی کی لوہے کی لاٹھ کی نسبت واقعات اور تخیلات

گزشتہ سے پیوستہ

اپنے نوٹس کے سلسلہ میں پرنسپ صاحب نے یہ بھی لکھا ہے کہ یہ ستون گھڑے ہوئے لوہے کا ہے۔ بہرحال راجہ دھاوا اپنے بعد گھڑے ہوئے لوہے کی صناعی کی ایک یادگار چھوڑ گیا ہے۔ یہ ستون اچھی طور سے مخلوط لوہے کا مدوّر تم ہے اور قریب قریب بیرنیس Berenice جہاز کے مستول کے برابر بڑا ہے۔ صرف ذرا لمبان میں زیادہ ہے[۵۱]۔

اوپر ذکر آچکا ہے کہ ابن بطوطہ سے لیکر مابعد کے تمام لوگوں نے دہلی کے ستون کو بالالتزام پیتل یا کسی مخلوط دھات کا بتلایا ہے لیکن اس بات کے غیر صحیح ہونے کو جنرل کننگھم اپنی پہلی رپورٹ بابت ۱۸۶۲ء میں بتلا چکے ہیں[۵۲]۔

اس ستون کو بعد میں سر کننگھم کے اسسٹنٹ مسٹر بیگلر نے نظر تحقیق سے دیکھ کر لکھا ہے کہ اس ستون کی چوٹی سے نیچے تک لمبان ۲۳ فٹ ۸ انچ ہے۔ اس کی برجی گھنٹے نما ہے۔ ستون کا حصہ زیرین شکل میں ایک بے قاعدہ لٹو کا سا ہے۔ جو متعدد چھوٹی چھوٹی لوہے کی سلاخوں پر ٹکا ہوا ہے اور پتھر کے نیچے اُتار کر سیسہ پلا کر محفوظ کر دیا گیا ہے[۵۳]۔

مزید براں ستون کے نمونے کے ٹکڑوں کی کیمیائی امتحان اور تجزی کرنے سے ظاہر ہوا کہ اس میں ۹۹٫۷۲ فی صدی لوہا شامل ہے[۵۴]۔

---

[۵۱] از جرنل ایشیاٹک سوسائٹی بنگال جلد ہفتم ۱۸۳۶ء صفحہ (۶۲۹) ایف ایف وجلد سوم صفحہ (۴۹۴) جرنل مذکور میں پرنسپ صاحب نے ایک چربہ اس کتبہ کا چھاپا ہے لیکن وہ بالکل غیر صحیح ہے۔ ۱۲۰۔ [۵۲] آرکیالوجی کل سروے رپورٹ مرتبہ اے کننگھم جلد اول صفحہ ۱۶۹ ایف ایف ۱۲۰۔ [۵۳] آرکیالوجیکل سروے رپورٹ مرتبہ اے کننگھم جلد چہارم صفحہ ۲۸۔ [۵۴] سر رابرٹ ہیڈفیلڈ سنہالیز آئرن سپیشل آف اینشنٹ اوریجن۔ جرنل آف دی آئرن اینڈ سٹیل انسٹیٹیوٹ۔ لندن ۱۹۱۲ء صفحہ ۱۵۳ ایف ایف نقشہ چودھواں۔

مسٹر ونسنٹ سمتھ لکھتے ہیں کہ یہ ستون گھڑے ہوئے لوہے کا ہے جو تقریباً ۲۴ فیٹ لمبا اور وزن میں کچھ ہی چھ ٹن سے زیادہ ہے۔ دھات کو اچھی طرح مخلوط کیا گیا ہے۔ اس کا گھڑا جانا اور ایسی سخت نہ گلنے والی دھات کا قابو میں لانا صنعت و حرفت کی کامیابی ہے۔ لوہے کو دوسری دھاتوں کے ساتھ مخلوط کرنے کے مشکل طریقے میں اگلے زمانے کے ہندوستانیوں کو جو غیر معمولی قدرت حاصل تھی اُس کی صرف یہی ایک مثال نہیں ہے[۵۱] (بلکہ اور بھی ہیں)۔

اسی اثنار میں پرنسپ صاحب کے ترجمہ سے کہیں بہتر ترجمہ بمبئی کے ایک نامور فاضل بھاؤ جی واجی نے ۱۸۷۵ء میں شایع کیا ہے۔ اگرچہ اس میں بھی کچھ سقم رہ گئے ہیں لیکن پھر بھی بھاؤ صاحب کی نقل اور ترجمہ دونوں میں بہت بڑی ترقی اُس گتھی کے سلجھانے میں کی ہے جس نے کئی پشتوں سے لوگوں کو حیران اور پریشان کر رکھا تھا اور یہ ظاہر ہے کہ ع نقاش نقش ثانی بہتر کشد ز اوّل۔ کتبے میں جس راجہ کا نام درج ہے اُس کا حل بھاؤ صاحب ہی نے کیا کہ وہ نام "چندرا" ہے۔ لیکن انہوں نے جو اس نام کے راجہ کو گپتا خاندان کے راجاؤں کے زمرے میں سے سمجھا ہے یہ البتہ ٹھیک نہیں ہے۔ اس کتبے میں جو حروف ہیں اُن کی طرز تحریر کو بھاؤ صاحب آخری پانچویں یا اوائل چھٹی عیسوی صدی کا بتلاتے ہیں[۵۲]۔

ڈاکٹر ووگل صاحب کے اصل مضمون میں اس مضمون کی جان نہ پرنسپ صاحب کا ترجمہ دیا ہے نہ بھاؤ صاحب کا۔ اور بدون ان دونوں کے یہ مضمون نامکمل رہتا ہے لہذا ہم تاریخ دہلی سے دونوں انگریزی ترجموں کو بجنسہ نقل کرتے ہیں۔ ترجمے کی مشکلات ارباب بصیرت پر مخفی نہیں ہیں۔ ترجمے میں اصلی زبان کا لطف قائم رکھنا بڑا مشکل کام ہے اور یہ تو ترجمہ در ترجمہ ہوا۔ پرنسپ صاحب اور بھاؤ صاحب نے اصلی زبان سنسکرت سے انگریزی میں ترجمہ کیا اور پھر دونوں اپنی اپنی جگہ صحت کے دعوے دار اور پھر ایک دوسرے پر معترض اور مطلب میں آسمان زمین کا فرق رہا میں بیچارہ کسی شمار قطار میں۔ میں انگریزی سے اردو میں ترجمہ کر رہا ہوں میری شرم

[۵۱] ونسنٹ اے سمتھ کی آکسفرڈ ہسٹری آف انڈیا صفحہ ۱۹۶ - [۵۲] از جرنل بمبئی برینچ رایل ایشیاٹک سوسائٹی - جلد دہم (۱۸۷۱-۱۸۷۴ء) بمبئی ۱۸۷۵ء - صفحہ ۲ - ایف ایف - بھاؤ واجی صاحب کا مضمون ۱۳ اپریل ۱۸۷۱ء کو پڑھا گیا - ۱۲

خدا کے ہاتھ ہے۔ اصل زبان سنسکرت سے میں نابلد خدا جانے کیا کا کیا ہو جائے بہرحال میں نے تو یہی کوشش کی ہے کہ انگریزی سے اُردو ترجمے میں کوئی نقص نہ رہ جائے۔

ڈاکٹر پرنسپ کے انگریزی ترجمے کی اردو

پہلا سلوک اُس نے جس نے اپنے دشمنوں کی، اُن کی خندقوں میں جنگی طیاریاں سُن کر اپنی بہترین سپاہ اور معاونین کے ساتھ ایک شہرت کی یادگار (یا بازو) اپنی تلوار سے اُن کے بازوؤں پر منقوش کر دیا وہ جو سات استقادول کا مالک تھا (اسی طرح جیسے کہ گورمنٹ کے سات بازو ہوتے ہیں) [دریائے سندھ؟] کو عبور کر کے سندھ کے واہلیکوں کو ایسا مطیع کر لیا تھا کہ الی یومنا ہذا بھی اُس کی آراستہ افواج اور حفاظت کا اُس جانب جنوب (دریا) کی بھی وہ مقدسانہ تعظیم کرتے ہیں۔

دوسرا سلوک۔ وہ جس نے جس طرح کہ شیر ایک جانور کو دبوچتا ہے اور دوسرے کو چھوڑتا ہے اس دنیا کو چھوڑنے کے بعد اُس دنیا میں اپنی جگہ پیدا کر لی۔ جس کا ذاتی وجود اب تک بردۂ دنیا پر بوجہ اُس کے کارہائے (سابقہ) کے اب تک باقی ہے۔ جس کی قوتِ بازو اب بھی اگرچہ (کہ وہ) اب آرام میں ہے۔ (متوفی) اور اُس کی جبروت کا کچھ حصہ جو دشمنوں کا بیخ کن تھا اب بھی زمیں سے ملصق ہے۔

تیسرا سلوک۔ اُس نے جس نے اپنی قوتِ بازو سے غیر منقسم سلطنتِ اراضی پر مدتوں حکمرانی کی ہے وہ (جس میں اوصاف مجتمع تھے) چاند اور سورج کے جو چودھویں رات کی طرح حسین تھا اور اپنی لو اُس سے لگا دی تھی۔ یہ بہت بلند بازو (ستون) واجب التعظیم وشنو کا بنوایا۔

ڈاکٹر بھاؤ داجی کے انگریزی ترجمے کی اُردو

وہ جس کے دستِ قدرت پر شان و عظمت تلوار (کی نوک) سے منقوش ہے جب اُس نے علی التواتر اپنے مجتمع دشمنوں کے میدانِ جنگ میں (بمقام) ونگاس (بنگال؟) مُنہ پھیر دیے جس نے سندھ کے سات دہانوں کو عبور کر کے

بالھیکوں[1] کو جنگ میں مفتوح کیا۔ جس کی .... شجاعت کی خوشبو سے نسیم اب تک جنوبی سمندر میں اُڑتی رہتی ہے۔ جس نے دُنیائے (دنی) کو من وجہ رنج (دائم) میں چھوڑ کر دوسرے عالم میں (عرشِ بریں) پر چلا گیا جو دارالجزا کو جسمانی شکل میں چلا گیا لیکن اُس کی شہرت اس زمین پر (بدستور) باقی ہے۔ جس نے اپنے بچے کھچے دشمنوں کو فنا کر دیا جس کی بہادری مثل جنگل کی ایک بڑی بھڑکتی ہوئی آگ کے تھی۔ (اُس کی بہادری زمین سے نہیں چلی (مٹ) گئی) اور وہ جس نے اپنی قوتِ بازو سے اس دُنیا کی ایک لاثانی سلطنت مدتہائے دراز تک کی۔ جس کا چہرہ چودھویں رات کے چاند کی طرح چمکتا تھا۔ اس خداوند دُنیا کا نام "چندرا" تھا۔ جس نے وشنو سے عقیدت رکھنے کی وجہ سے اپنے دل کو مطمئن کر لیا تھا (یعنی صاحب دل تھا) یہ جھنڈے کا کھمبا بھگوان وشنو کا وشنو پداگری (وشنو کے نقشِ قدم کا پہار) تعمیر (واستاد) کیا۔

ڈاکٹر پرنسپ صاحب کے ترجمے پر ڈاکٹر بھاؤجی داجی کے واجبی اعتراض

میں نے جو کتبے کی نقل کی ہے اُس کی ہر سطر پرنسپ صاحب کی اُس نقل سے مختلف ہے جو انہوں نے جرنل میں چھاپی تھی جس کو دھاؤنا پڑھا ہے وہ دراصل بھاؤنا ہے۔ اسی طرح دھواج غلط۔ بھواج صحیح اور اسی طرح سے جسے چندرا رکنا پڑھا ہے وہ چندرا وہنا ہے۔ یہ غلطی اس وجہ سے ہوئی ہے کہ حرف دھا پر ایک پھانا درمیان سے بائیں طرف لگا دینے سے بھا ہو جاتا ہے۔ دھاوا سے کسی راجہ کا نام ہی نہیں ہے۔ جس کو اس ستون کا بانی سمجھا گیا ہے بلکہ اس کا بانی چندرا راجہ ہونے میں کسی قسم کا شک نہیں ہے۔ جو نرورا راجاؤں کے خاندان میں سے تھا جس کے سکّے کا ذکر جنرل صاحب نے بنگال ایشائک سوسائٹی کے جرنل نمبر ۳ ۱۸۶۵ء میں کیا ہے۔ سکوں میں جن کی تحقیقات کی گئی ہے اُن میں سے ایک سکّے پر چندرا کا نام موجود ہے۔ لیکن جنرل صاحب اُس چندرا کو کوئی اور راجہ چندر گپت خیال کرتے ہیں جو زمانِ مابعد میں ہوا ہے۔ مگر چندر گپتا خاندان کے کسی راجہ کا سکّہ اُس سکّے سے جس پر ہم بحث کر رہے ہیں ملتا جلتا نہیں ہے۔ علاوہ ازیں سکّہ پر لفظ چندرا ہے۔ تو کوئی وجہ نہیں کہ اُس میں گپتا کے لفظ کا بھی انظام کیا جائے۔

[1] کیا یہ بالھیک سورا استر کے "ساہ" خاندان کے راجہ تھے؟ جو یقیناً ۹۰ء میں دریائے سندھ کے کنارے رہتے تھے اور ۲۶۰ء یا ۲۶۱ء میں نکالے گئے (دیکھو رائل ایشیاٹک سوسائٹی جرنل جلد ہشتم صفحہ ۲۰)۔ ابھی یہ بات تحقیق نہیں ہے۔ لیکن اگر پایۂ تصدیق کو پہونچ جائے تو یہ گتھی بھی سلجھ جائے۔ ۱۲۰

سرسید اس ستون کو تیسری عیسوی صدی سے بھی پہلے کا بتاتے ہیں۔ کتبے کی نسبت اُن کا خیال ہے کہ اس میں سمت نہیں ہے اس وجہ سے وہ ۵۶ء قبل مسیح سے بھی زیادہ پُرانا ہے کیوں کہ بکرماجیتی سمت کا رواج اُس وقت قرار پا چکا تھا۔ سرسید کی رائے میں ستون کا بانی راجہ "مدھاوا" تھا جو یدھشٹر کی اولاد میں تھا اور جس نے ۹۵ء قبل مسیح میں حکمرانی کی تھی۔ کار اسٹیفن صاحب کی رائے میں ڈاکٹر بھاؤ داجی جو ایک بڑے ماہر السنہ ہیں اُن کی رائے زیادہ بھروسے کے قابل ہے کہ کتبے کی روش تحریر گپتا راجاؤں کے مابعد کے زمانے کی ہے اور دہلی کے تمام ذی علم ہنود اور مسٹر ایڈورڈ طامس کا بھی اس طرف رجحان ہے[۱]

سب سے آخر مرتبہ اس ستونِ آہنی کے کتبے پر ڈاکٹر جے۔ ای۔ فلیٹ نے اپنی قابل یادگار کتاب "گپتا خاندان کے کتبوں" میں تنقید کی ہے۔ اُن کا رجحان اسی طرف ہے کہ کتبے میں جس چندرا کا ذکر ہے وہ گپتا خاندان کا چندرا گپتا اول تھا جو ضرور چوتھی صدی میں زندہ رہا ہوگا۔ لفظ دھاوِ نا جس نے غلجان ڈال دیا ہے اس لفظ کی تصحیح فلیٹ صاحب نے بھاوتا کی ہے اور وہی ترجمہ کیا ہے جو بھاؤ داجی نے کیا ہے یعنی "عقیدت"۔ فلیٹ صاحب کہتے ہیں کہ ممکن ہے کہ چندرا (گپتا) کا دوسرا نام دھاوا بھی ہو جس طرح کہ سمدر گپتا کے بعض کتبوں میں اُس کا نام کاچا بھی پایا جاتا ہے[۲]۔

اچھا اب ہم سب سے پہلے فلیٹ صاحب کے انگریزی ترجمے کو اردو کا لباس پہناتے ہیں۔ اس ترجمے میں یہ خوبی ہے کہ وہ زیادہ تر لفظی ہے:۔ باقی آئندہ

---

[۱] ڈاکٹر پرنسپ صاحب سنسکرت کے کتنے ہی عالم ہوں مگر پھر بھی انگریز ہیں۔ رہے بھاؤ داجی اُن کو جو مہارت علم سنسکرت میں ہو سکتی ہے دوسرے کو کب ہو سکتی ہے اور یہی حال سرسید کا ہے۔ بھاؤ داجی کا ترجمہ اس لئے زیادہ مستند ہے کہ اہل البیت ادریٰ بما فی البیت مثل مشہور ہے کہ "گھر کا بھیدی لنکا ڈھائے" جن خواص اور نکات علمی کو وہ پہونچ سکتے ہیں دوسروں کے لئے سخت مشکل ہے۔ [۲] کارپس انسکرپشیونم انڈیکیرم جلد سوم۔ انسکرپشنز آف دی آرمی گپتا کنگز اینڈ دیر سکسیسرز۔ کلکتہ۔ ۱۸۸۸ء صفحہ (۱۳۹) ایف ایف - ۱۲

صلائے عام - (از روئے واقعات و خیالات)

یہہ عجیب بات ہے کہ بہ مقابلہ اور شاغلِ عالم اسباب کے علمی مشغلوں میں جس قدر کمال پیدا کیا جائے معاش کے لئے بہت بکار آمد نہیں ہوتا۔ اکثر اہلِ کمال روٹیوں کے محتاج رہے: خاص کر اُردو لٹریچر میں کمال پیدا کرنے والے زمانہ کے ہاتھ سے شاکی دیکھے گئے ؛ اساتذہ کے لاجواب کلام کی اتنی قدر نہ ہوئی جس قدر کہ معمولی بارہ ماسے اور آسلے دال ناملے اور مثل ان کے زباں زدِ عوام ہو گئے ؛ اُردو رسالوں کی نسبت بھی یہی دیکھنے میں آیا کہ جن میں جس قدر علم و فضل کا سرمایہ نظر آیا اُسی قدر اُن کی بے قدری ہوئی۔ سر سید احمد خاں بہادر کا **تہذیب الاخلاق** اُن کی زیر باری کا باعث رہا۔ اسی طرح اور بہت رسالے (پہلے کے اور آج کل کے) آمدنی کیطرف سے نالاں دیکھے ؎

جسم بگلی پڑے رہے صندوقِ قبر میں ؛ مٹی ہوئے حضور کے خلعت دئے ہوئے

حالاں کہ تمام قومی و ملکی دعوؤں میں رسالے نکالنے والوں کے برابر اپنے ملک و قوم کا خیر خواہ دوسرا نہیں۔ خاص کر زبان کے معاملہ میں انکا احسان سب سے زیادہ ہے ؛

اُردو کی زندگی کا مدار اب تک تو میں اپنے مُلک کے شاعروں پر سمجھتا رہا لیکن اب دیکھتا ہوں کہ ہماری زبان کی زندگی آگے کو اُردو رسالوں پر منحصر ہے ؎

مشتاق

مُشتاقِ اہلِ میکدہ میں یاں کرم کرے ؛ ابرِ سیہ کا لُطف نہیں خانقاہ پر

زبان کی ترقی کے لیئے میں شاعری کا بہت مُعتقد ہوں - میرے ذہن میں سمایا ہوا ہے کہ انسان کی زندگی کا حاصل سخن سنجی نہیں تو سخن فہمی ضرور ہے - لیکن انگریزی تہذیب کا مقولہ ہے کہ جس قدر جس ملک میں تہذیب و تمدّن کو عروج ہوتا ہے اُسی قدر شاعری میں کمی ہوجاتی ہے - یعنی نثر کی قدر بڑھ جاتی ہے ؛ اِس وقت نثر کی ترقی کا مدار صرف اُردو رسالوں پر ہو رہا ہے ؛ ہماری زبان میں طبیعت کی موزونیت کا یہ حال ہے کہ روزمرّہ میں بھی بے قافیہ بات زبان سے نکالنی ناپسند ہے - ہر لفظ کے ساتھ اُس کے ہم قافیہ ایک لفظ اور ضرور بولتے ہیں: مثلاً یار غار - شراب کباب - روٹی ووٹی - اچار وچار - لڑکا وڑکا - میلہ ٹھیلہ - ہزاروں لفظ توابع مُہمل کے زبان سے نکلتے ہیں - یہ ثبوت ہماری فطرتی موزونیت طبع کا ہے: مگر نثر عاری میں ہم عاری ہیں ؛

میں دیکھتا ہوں کہ باوجود بیقدری کے اُردو رسالوں کی تعداد میں زیادتی ہے - روز بروز نئے نئے رسالے نکل رہے ہیں: ان کی تعداد کا میرے پاس کوئی رجسٹر نہیں جس سے ان کی تعداد کا سنینِ ماضیہ و حال سے مقابلہ کیا جائے - مجھے تو ان کی ترقی کی اطلاع اس طرح ہوئی ہے کہ ہر مہینہ دو چار تازہ اخبار اور رسالے ڈاک میں اس حکم کے ساتھ پہونچتے ہیں کہ "بغرض تبادلہ وریویو" ؛ میری صلاح یہ ہے کہ نئے نئے پرچے نکالنے سے پُرانے رسالوں کی جو موجود ہیں زیادہ قدر دترقی کی کوشش کیجائے تو مُلک و زبان کو زیادہ فائدہ پہونچ سکتا ہے ؛

جس طرح انسان کی نبض سے بیماری و صحت کا پتہ لگتا ہے ؎

کر گزشت است ازیں بادیہ وحشی اینک ؛ نفسِ رہ مے طپد و سینۂ صحرا گرم است

اس وقت ہندوستان کے رسالوں میں بہت زور کے مضمون نکل رہے ہیں جو پہلے دیکھنے میں نہیں آئے۔ صلائے عام کے مضمون نگاروں کے مضامین اکثر چھپنے سے رہ جاتے ہیں اور نہیں تو دیر میں چھپنے کی نوبت آتی ہے۔ اسکا مجھے افسوس ہے: بزا افسوس کرنے سے میں یہہ بہتر سمجھتا ہوں کہ صلائے عام کا حجم بڑھا دیا جائے۔ گو خرچ زیادہ ہو کہ ع

ایں ہم اندر عاشقی بالائے غمہائے دگر ؛

اُردو رسالوں کی ترقی میں مجھے خیال آیا کہ اس وقت اُردو رسالوں کی قدردانی کی اُمید دو تین ریاستوں سے ہے۔ حیدرآباد (دکن)۔ ریاست رامپور۔ ریاست بھوپال ؛

فرمانفرمائے ریاست حیدرآباد نے اُردو یونیورسٹی قائم کرکے تمام مُلک پر بڑا احسان کیا۔ یونیورسٹی سے **سلطان العلوم** کا خطاب واقعی بہت بجا و دُرست ہے۔ یہ نہ صرف شکریہ کے طور پر بلکہ از روئے استحقاقِ علمی حق بجانب ہے ؛

اُردو رسالوں کے متعلق مجھے ایک بات اور عرض کرنی ہے کہ مَردوں کے مضامین کے سوا عورتوں کے مضمون بھی اکثر شایع ہوتے ہیں۔ بلکہ بعض رسالے محض عورتوں ہی کے لئے جاری ہوئے ہیں اور عورتیں ہی رسالے نکالتی ہیں ؛ مگر ان کی زبان میں مستورات کے لب و لہجہ کی کوئی خاص طرز دیکھنے میں نہیں آئی ؛ میری غرض اس ذکر سے یہ ہے کہ اُردو زبان کو اور زبانوں سے یہ امتیاز خاص حاصل ہے کہ عورتوں کی زبان مردوں سے نہیں ملتی ؛ عورتوں کی زبان کی یہ تعریف ہے کہ اشاروں اشاروں میں بڑے بڑے مطلب ادا کرجانا کہ سُننے والا جیونکا

ہیتوں سمجھ جائے اور کبھی تھوڑی سی بات اس اُلجھاؤ سے بیان کرنی کہ تمام عمر سمجھ میں نہ آئے ٭

صاحب عالم حضرت صابر عورتوں کی زبان کی تعریف میں فرماتے ہیں کہ :-

× × × × × × "عورتوں کی زبان سے مراد یہہ ہے کہ وہ باتیں جو عورتوں کو اثنائے خانہ داری میں پیش آتی ہیں۔ مثلاً کسی بہن بھیلی کے گھر مہمان جانا یا کسی بھائی بند کا اپنے گھر بلانا۔ میاں سے لوم چھلے کے گھڑوانے کی تمنا اور کرتے دو پٹہ رنگوانے کا تقاضہ وغیرہ۔ ان معاملات کو اس لطافت سے ادا کیا جائے کہ سامع کا جی نکل جاوے اور سننے والا کلیجہ پکڑ کر بیٹھ جاوے الخ (ماخوذ از گلستانِ سخن مصنفہ صاحب عالم شہزادہ مرزا قادر بخش بہادر المتخلص صابر)

ولایت میں مردوں سے زیادہ عورتیں ناول لکھتی ہیں۔ لیکن وہاں کیا کسی زبان میں ہماری زبان کی طرح مردوں اور عورتوں کی زبان میں امتیاز نہیں : مگر وہاں بھی پڑھنے والے مردوں کو شکایت ہے کہ عورت نے اپنے دل کا حال تو لکھا نہیں۔ ہمارے (مرد کے) دلکا حال تو ہم آپ جانتے ہیں ٭ ہم اپنے دل کا حال تم سے سنکر کیا کریں ؟ تم اپنے دل کا حال اپنی زبان سے آپ کہو تو لطف ہے ؎

میں اگر جاؤں تو نکلے مطلبِ دل کچھ نہ کچھ ٭ میرا جانا اور ہے قاصد کا جانا اور ہے

میری رائے میں عورتوں کو اپنے دل کا حال چھپانے میں جو یدطولے حاصل ہے مردوں کو نصیب نہیں ؎

سکھایا دخترِ رز کو منہہ چھپانا
کوئی کیا روئے جانِ شیشہ گر کو

صلائے عام - (ازروئے تعلّی وتنقید)

بھری ہے کان میں ہر گل کے واستاں میری ؛ فصیح تر کہیں بلبل سے ہے زباں میری

ہوئی ہے میری فصاحت زبانِ زدِ عالم ؛ سخن سخن ہے مرا اور زباں زباں میری

عروج فکر کو ہوتا ہے کہنہ مشقی سے

ہوا جو پیر طبیعت ہوئی جواں میری

صلائے عام کی یہ شاعرانہ تعلّی گو دُون کی باتوں میں داخل ہے۔ مگر اس کی وجہہ بھی آپ سُن لیں کہ ولایت کی پچھلی ڈاک میں کیمبرج سے ایک بڑے عالم متبحّر کی تحریر صلائے عام کی نسبت شرف صدور لائی جو ذیل میں درج کیجاتی ہے۔ صاحبِ تحریر علوم مشرقی کے بڑے عالم و فاضل ہیں :-

From Lieutenant-Colonel D.C. Phillott, M.A., Ph.D., F.A.S.B., late Secretary Board of Examiners, CALCUTTA.

The printing, paper, and contents of the "SALÂ-i-ÂM" make it the best Urdu Magazine for European Students of Urdu.

D.C. PHILLOTT, Lieut. Colonel.

CAMBRIDGE
1923

ذیل میں جناب مرزا عرفان علی بیگ صاحب آی ایس او آنریری مجسٹریٹ آگرہ کی تحریر کا اقتباس از روے تنقید رسالۂ صلائے عام بابت ماہ اکتوبر ۱۹۲۳ء درج کیا جاتا ہے۔

× × × × × × × × × × × × × × ×

"اکتوبر کا صلائے عام دلقِ گدایاں کا وہ مضمون رکھتا ہے جس کی نظیر نہیں ہو سکتی فی الحقیقت یہ مضمون لاثانی ہے۔ آپکی قلم کی قوت نے وہ شان دکھلائی ہے کہ باید و شاید ؛ میں بلا کسی مبالغہ اور بلا تصنع کے عرض کرتا ہوں کہ آپنے اس کو "دلقِ گدایاں" لکھا ہے مگر میں تو اس کو صلائے عام کے سر پہ تاجِ مکلل پاتا ہوں۔ اس میں تلونِ یزدانی بے ثباتیِ عالم کو ظاہر کرتی چلی جاتی ہے اور ہر پیدا کو ناپید اور ہر اثبات کو نفی کر دکھلاتی ہے اور چونکہ عالم کے فانی ہونے کا پورا پورا ثبوت دیتی ہے فلہٰذا عبرت خیز اور اعلیٰ ترین نصیحت ہے ؛ میں مشتے نمونہ از خروارے کے طور پر صرف دو جملے اس سے مختصراً نقل کرتا ہوں کیوں کہ جی نہیں مانتا۔ آپ خفا نہ ہوجئے گا اور یہ نہ سمجھئے گا کہ تحسین ناشناس ہے یا حد سے متجاوز ہے ؛

"جان خاصانِ خدا کو از روے احسانِ الٰہی عطا ہوئی مگر (باوجود بے بہا ہونے کے) ارزاں بھی ایسی کردی کہ مور و مگس کو بھی مفت دیدی گئی۔ ہم سے بے پوچھے ہمیں یہاں بھیجا اور جب ہمارا جی یہاں لگا تو ہمیں اس طرح سے نکالا کہ مرنے والا تو درکنار دیکھنے والے روتے رہ گئے۔" × × × ×

× × × × "بے مانگے آنکھ۔ کان۔ ناک۔ دانت۔ . . . . دیئے پھر اس طرح چھینے کہ آنکھوں کی پلک سے پلک نہیں اُٹھتی . . . . دانتو نسے

نوالہ چبانا مشکل ہو گیا۔ یہ تلوّن نہیں تو کیا ہے کہ بچوں کے گھروندوں کی طرح اتنا بڑا کارخانہ بے ضرورت بنے اور بے وجہ بگڑے؟" × × × × × × × × ×

بالآخر کس قدر عمدہ نتیجہ نکالا ہے کہ سبحان اللہ اور وہ یہہ ہے:۔

"نیرنگی دہر عالم اسباب کی رونق کا سبب ہے اس کو ایک حال میں دیکھنے کی ہوس غلطی ہے" × × × × × × × × ×

وہ کون سا اہلِ علم ہے جو اس مضمون کو پڑھکر اور سمجھ کر صد آفریں نہ کرے گا؛ صلائے عام کے دیگر مضمون اپنی اپنی خوبیوں سے بھرے ہوئے ہیں یہاں بیان کی حاجت نہیں لیکن مجھے یہ فقرہ جو ذیل میں درج کرتا ہوں انشاء پردازی کے لحاظ سے ازبس پسندیدہ نظر آیا۔

از مضمون اتالیق الامراء ریوٹ پولیٹکل افسر متعلق ریاست خیرآباد

"یہ کل اوصاف حمیدہ عارضی نہیں رہے بلکہ نواب کی طبیعتِ ثانی بن گئے ہیں"

آپ کا نیاز مند عرفان علی (آئی ایس او۔ آنریری مجسٹریٹ گڑگن)

از اعزاز منزل۔ مورخہ ۱۰ نومبر ۱۹۲۳ء

لسان الملک حضرت ریاض

× × × × × × × "ہمیں بھی خان بہادر میر ناصر علی (اڈیٹر صلائے عام دہلی) کی اس رائے سے اتفاق ہے کہ اس دور میں ان سے اچھا لکھنے والا کوئی نہیں۔ شوخی۔ رنگینی۔ نزاکتِ خیال۔ بندش کی چستی۔ زبان کی صفائی یہ ساری خوبیاں آپ کے کلام فصاحت التیام میں موجود ہیں" ؎

ہیں تو ریاضؔ اور بھی دُنیا میں سخنور ⁂ مشکل ہے تمہاری سی طبیعت ہو کسی کی

(از مسٹر کٹ گرٹ گونڈہ)

صلائے عام

(دوسرے پرچہ کا انتظار)

کہتے ہیں کہ الانتظار اشدّ من الموت۔ انتظار موت سے بھی زیادہ ناگوار سمجھا جاتا ہے۔ لیکن صلائے عام کے دوسرے پرچے یعنی ماہ دسمبر ۱۹۲۳ء کے صلائے عام کا انتظار اس مقولہ سے نہ صرف مستثنٰی بلکہ نوید آمدِ یار کی طرح اشتیاق بڑھانے کا باعث سمجھئے ؎

کتنا ہی کروں خشک یہ یہہ دامن تر ہائے ❊ خجلت سے ہوا جاتا ہے نم اور زیادہ

ایفاء وعدہ یار کے انتظار میں تو ہمیشہ شُبہہ ہی رہتا ہے۔ کیونکہ وہاں تو وعدہ وفا نہ کرنا ہنر میں داخل ہے: صلائے عام کے انتظار میں یہہ شکایت ممکن نہیں ؎

مُہلت بقدرِ گردشِ ساغر جو دے فلک ❊ ساقی کو ڈھب پہ لائیں گے سو التجا سے ہم

صلائے عام کا وعدہ فردائے قیامت کا وعدہ نہ سمجھئے کہ فردائے قیامت کی میعاد آجتک مقرر نہ ہوئی اور ظاہرا ہوتی نظر نہیں آتی۔ صلائے عام کے دوسرے پرچہ کا انتظار رمہِ نو کی طرح ایک مہینہ سے زیادہ نہیں۔ اگلا پرچہ اس سال کا اخیر پرچہ ہوگا جسمیں امید ہے کہ سال بھر کی کوتاہیوں کی کسر نکل جائیگی ؎

لوگ جب سُنتے ہیں قصے ترے دیوانوں کے ❊ قیس و فرہاد کے افسانے اُٹھا رکھتے ہیں +

دسمبر ۲۳ء کا صلائے عام از روے خوبیٔ مضامین اور ایزادیٔ حجم معمولی پرچوں سے زیادہ ہوگا جس کو دیکھ کر آپکا انتظار بے کار نہیں جاسکتا۔ صاحبِ عالم حضرتِ صبا بمبئی کا شعر ہے ؎

اے موت ابھی نہ آکہ ہوس ہو نکال لے ❊ قاتل کی آرزوئے ستم رائیگاں نہ ہو

قواعد و مقاصد

صلائے عام

خواجہ قمرالدین راقمؔ کا شعر ہے ؎

مقصد تمہارے ہاتھ ہے قسمت خدا کے ہاتھ ؛ جو کچھ خدا سے ہو وہ تمہاری زبان سے ہو

صلائے عام کا بھی یہی عقیدہ ہے کہ کسی ملک و قوم کی ترقی تو پروردگار کے اختیار میں ہے لیکن ترقی کے لئے پہلی شرط اپنی زبان میں کمال پیدا کرنے کی ہے ؛ ضد کی اور بات ہے مگر اس وقت ہندوستان کی زبانوں میں اُردو سے بہتر کوئی زبان میری سمجھ میں نہیں آتی جس پہ جمہور اہل ہند (ہندو ہوں یا مسلمان) دونوں کی زبان کا اطلاق ہو سکے ؎

نعرۂ عشق سے ہیں سبحہ و زنار ملے ؛ ایک آواز پہ دو ساز کے ہیں تار ملے

خلاقِ دو عالم کی طرح اُردو زبان کی تعریف سب سے پاکیزہ یہ ہے کہ ؎

تجھسے کوئی آشنا نہوا ؛ پر تجھے سب سے آشنا دیکھا

یہ رسالہ اپنی زبان میں اظہارِ کمال کی غرض سے جاری ہے کہ اُردو لٹریچر کے لئے ہر طرز پر لکھنے کا مسالہ جمع ہو اور ادائے بیاں میں ہماری زبان اور زباں والے اگر بازی نہ لیجا سکے تو کسی زبان سے مرتبہ میں کم نہ رہے ؎

دیکھ کر تجکو مٹے جاتے ہیں دُنیا کے حسیں ؛ جمع ہوتا ہے مسالہ تری یکتائی کا

صلائے عام میں ہر طرح کے مضمون نظم و نثر شایع ہوتے ہیں۔ زیادہ تر نثر کہ اس وقت نثر کی ضرورت ہے : اور نثر بھی ایسی جس میں زبان کی خوبی و فصاحت کے ساتھ خیال کی پاکیزگی اور نزاکت ضرور ہو ؎

دِل باندھئے تو یار کے کاکُل سے باندھئے ؛ بُلبُل کو باندھئے تو رگِ گل سے باندھئے

صلائے عام اعلےٰ حکام سول و ملیٹری افسروں کے امتحان میں گورنمنٹ آف انڈیا

سے منظور ہو چکا ہے - ہندوستان کے سوا یورپ کے عالم و فاضل **صلائے عام** کی قدر کرتے ہیں
اُردو میں **صلائے عام** کے مضامین کو خاص مرتبہ حاصل ہے ؎

دل پہ تمہارے نقش ہوا ہے بیانِ شوق ؛ کارِ قلم دکھاتی ہے میری زبانِ شوق

صوبہ آگرہ و اودھ کے سررشتہ تعلیم کے نصاب میں **صلائے عام** کے مضامین اُردو فائینل ریڈرز میں انتخاب کرکے درج کئے گئے اور صاحب پریسیڈنٹ نصاب اُردو نے جو بابمارہ **گورنمنٹ بمبئی** منعقد ہوئی میرے مضامین کو اُردو ریڈروں میں **شامل** کرنیکے لئے مجھے لکھا ؛

اکثر اصحاب نمونہ کا پرچہ مانگتے رہتے ہیں - اوّل تو ایک پرچہ سے **صلائے عام** کا پورا حال معلوم ہونا مشکل ہے - دوسرے **صلائے عام** کو جاری ہوئے عرصہ ہو گیا نمونہ بھیجنے کی مجھے ضرورت نظر نہیں آتی ؎

پیری میں بھی بے ولولۂ شوق نہیں ہم ؛ رکھتے ہیں ابھی اِک دلِ ہنگامہ گزیں ہم
شہرت نہیں مجنوں کے برابر یہ مسلّم ؛ پر کوئی نہ جانے ہمیں ایسے بھی نہیں ہم

صلائے عام کی قیمت پیشگی چھ روپئے سالانہ ہے - چھ مہینے سے کم کی خریداری منظور نہیں ہو سکتی ؛ قیمت بذریعہ منی آرڈر عنایت فرمائی جائے - مضمون نگار **صلائے عام** کی قیمت سے بری نہیں : نہ یہ ضرور ہے کہ ہر مضمون خواہ مخواہ شایع کیا جائے ؎

کس قدر ہے فرق یوسف میں اور اپنے یار میں ؛ گھر خریدار اس کے آئیں وہ بکے بازار میں

جو مضمون شایع نہ ہو سکیں اُن کے واپس کرنے کا ذمہ نہیں : جامعِ اوراق کو مضمون میں کمی بیشی کا اختیار ہے ؛
پچھلے پرچوں کی قیمت بشرط دستیابی ایک روپیہ فی پرچہ ؛

صلائے عام کا پتہ اسقدر کافی ہے کہ :

دہلی - فراشخانہ : مکان میر ناصر علیخاں بہادر ؛

حسب الارشاد میر ناصر علیخاں بہادر مطبع ناصری واقع فراشخانہ دہلی میں باہتمام میر احمد چھپا اور شایع ہوا ؛ ؛ کر

PRINTED AND PUBLISHED BY MIR NASIR ALI KHAN BAHADUR (EDITOR) AT THE NASRI PRESS, FARRASH KHANA, DELHI.

Dec 23

SALA-I-AM, DELHI.

A [illegible]
[illegible]
[illegible]
and [illegible]
the best [illegible] of the new [illegible].

فہرست مضامین

جلد ۱۱

بابت ماہ دسمبر سنہ ۱۹۲۳ء
مطابق جمادی الاول سنہ ۱۳۴۲ ہجری

نمبر ۱۲

پیرایۂ آغاز

بھلا بدلتے ہیں کب ہم وفاشعار زباں ٭ کہ تم سے ہار چکے ہیں ہزار بار زباں

پچھلے پرچہ کے وعدہ کے موافق اس مہینہ کے صلائے عام میں آپ معمول سے زیادہ مضامین دیکھ لیجئے۔ مضمون پریشان باوجود پیش پا خیالات کے حسن یار کی طرح خط وخال کی خوبیوں سے خالی نہیں ؎

لخت دل صد پارہ ہے ہر نوک مژہ پہ ٭ ہے آج تو کچھ رنگ ہی لے دیدۂ تر اور

نوید آمد سال نو۔ اخبار نویسوں کی سنت سمجھئے ٭

گل وبلبل (صفحہ ۱۸) شاعرانہ ہے۔ ہماری شاعری پر اغیار جو طعنہ دیتے ہیں کہ ہماری زبان کی شاعری کا مدار صرف انہیں دو لفظوں (گل وبلبل) پر ختم ہے۔ طعنہ دینے والوں کی خدمت میں از روئے شعر وسخن منصفی کی التجا ہے ؎

خزاں ہوتی نہ دامن گیر گل کی ٭ نہ دن برگشتہ گر بلبل کے ہوتے

نیا سال سگ زرد برادر شغال۔ (صفحہ ۴۴) جناب مولوی بشیر الدین احمد صاحب تعلقہ دار رئیس دہلی کا مضمون آمد سال کی تقریب میں ہے۔ ایسے مضمون زیادہ تر خیالی اور سخن گسترانہ ہوتے ہیں۔

صلائے عام کی ڈاک (صفحہ ۴۹) اور تنقید (صفحہ ۴۸) میں۔ اب کی دفعہ اہل الرائے میں توارد ہوگیا ہے۔ توارد اس لئے کہا گیا کہ اصحاب تحریر میں کسی کو کسی کی تحریر کا علم نہیں ورنہ آپ سرقہ نہیں تو طرفداری سمجھتے ؎

تنگ گو ہاتھ سے وحشت کے ہوں پر یوں گھر میں ٭ جیب و داماں تو نہیں ہوں کہ نکل جاؤں گا۔

موت سے کیا ڈرنا؟ (صفحہ ۲۶) جناب مرزا عرفان علی بیگ صاحب آئی۔ ایس۔ او کا مضمون ہے۔ مضمون بہت مشکل ہے اور مشکل پر مشکل یہ ہے کہ ایک مذہب کے عقائد کو دوسرے مذہب کے عقاید سے ملایا ہے جو ظاہرا متفق نہیں ٭ یہ بحث بہت زیادہ تحقیق کی محتاج ہے مگر ہے دلچسپ

محمود غزنوی والا مضمون (صفحہ ۳۲) پر سوز خانہ ہے اور گو محمود غزنوی کے حال سے تاریخیں بھری پڑی ہیں مگر اس مضمون کا طرز نیا اور بہت اچھا ہے ٭ پورا مضمون ایک دفعہ لکھنے کی گنجایش نہ تھی اس لئے "باقی آئندہ" ٭

جہاں آپ اتنے مضمون پڑھیں آخر میں جو صلائے عام کی سرخی سے لکھا گیا ہے (صفحہ ۵۶) پر میری خاطر سے دیکھ لیں۔ حضرت میر ممنون کا شعر ہے ؎

کھل چلے ہیں کیا نقاب پیرہن کے بند کیا
ایک پردہ شرم کا تھوڑا سا حایل رہ گیا

مضمون پریشان

ہے جو سودائے سرِ کاکلِ پیچاں ہم کو ٭ خواب کیا کیا نظر آتے ہیں پریشاں ہم کو

دُنیا میں جو کچھ ہم دیکھ رہے ہیں اس کی تشبیہ زیادہ تر خواب سے دیجاتی ہے۔ فرق اتنا ہے کہ شب پرہ کی طرح جو دن کو سوتا رہتا ہے یہہ خواب ہم دن کو دیکھ رہے ہیں۔ دوسرا فرق یہہ ہے کہ خواب آنکھیں کھولے ہوئے دکھائی دیتا ہے: پریشان اس لئے کہ خواب کو آرام کا باعث سمجھا جاتا ہے کہ جو شخص سوتا ہو اُس کو از روے ادب کہتے ہیں کہ آرام میں ہے مگر بار بار چونک پڑنے سے آرام میں خلل آجاتا ہے۔ یہہ پریشانی کا سبب ہے کہ ع سوتوں کی موت جاگنا ہے بار بار کا ٭ اگر قیامت تک سوتے پڑے رہیں تو چنداں اُلجھن نہ ہو ٭ پہلی اُلجھن جو ہوئی وہ خوابِ عدم سے جاگنے میں ہوئی۔ پھر اکثر ہر آواز پر چونک پڑنے کا شیوہ ہوگیا: یہاں تک کہ قیامت کو آوازِ صور سے میں کیا تمام عالم چونک پڑے گا ٭ اخبار والے اگر سال بھر خبر نہ ہوں تو اخیر سال پر ضرور چونکتے ہیں کہ یہ آخ آہ! آج

سنہ ۱۹۲۲ء کو ۳۶۵ دن اور بارہ مہینے گذر گئے : ۳۶۵ دفعہ آفتاب مشرق سے نکلا ع مرا سینہ ہے مشرق آفتاب داغِ ہجراں کا۔ اور ۳۶۵ دفعہ مغرب میں دلِ عشاق کی طرح بیٹھ گیا ۞ الف لیلہ کی طرح جو اصغر علیخاں نسیم نے نظم کی کہ ہر حکایت کے ساتھ ہزار بار صبح وشام کا سماں دکھانا پڑا سنہ ۱۹۲۲ء میں ۳۶۵ صبح اور ۳۶۵ شام آپ نے اور میں نے دیکھ لیں ؛ دنیا میں کم وبیش چار پہر روشنی رہی اور چار پہر اندھیرا رہا۔ بہار کے بعد خزاں آئی اور پت جھڑ کے بعد پھر درختوں میں نئی کونپلیں نکلیں : بہار میں جو پھول کھلے تھے خزاں میں مرجھالئے اور خزاں میں جو مرجھائے وہ بہار میں پھر رنگ لائے ۞ کہیں خوشی ہوئی کہیں رنج ہوا۔ کہیں نغمہ شادی کہیں نوحۂ غم رہا ؛ خلاق دو عالم نے بے حساب نقش ہستی مشاق صناع کی طرح گھڑے اور بچوں کے گھروندوں کیطرح دیکھتے دیکھتے مٹا دئے۔ ہم سے دو چار بھلائیاں بھولے سے شاید ہوئیں اور ہزاروں برائیاں عمداً : اسے آپ اپنا نہیں میرا اور زمانہ کا کچا چٹھا سمجھئے ؛

لیکن یہ کارخانہ آپ آج سے نہیں (خدا جھوٹھ نہ بلوائے) سنہ عیسوی کے حساب سے ۱۹۲۳ سال اور ہجری سنہ ۱۳۴۲ اور بکرمی ۱۹۸۰ سال سے بہت پہلے کا سمجھیں کہ اسی طرح خدا جانے کتنے پدم قرنوں۔ صدیوں۔ جگوں سے چلا آتا ہے : اس کا حساب لیلاوتی اور محمد شاہی زیچ سے باہر ہے۔ اس کے آغاز و انجام کی صحت تو درکنار تک ملانے سے بھی سمجھ میں آنا مشکل ہے ؛ اگر تک ہی ملانی منظور ہے تو بقول بار بلیین جس نے ایک جنیرو یٹ پادری صاحب کے وعظ سے نقل کیا اس طرح قیاس کر لیجئے :۔

صحرائے عرب کے ریگ بیابان آپ نے دیکھی نہیں تو سنی ہوگی کہ سیکڑوں کوس

ریت ہی ریت کے لق و دق میدان نظر آتے ہیں۔ ریت کے ذرّوں کو آپ مٹھی میں لیں اور گننے کا ارادہ کریں تو ان کا گننا ذرا مشکل ہوگا: لیکن ابھی ٹھہریئے۔ اس مشکل کا آسان ہونا آسان نہ سمجھئے :: اس ریت کے ذرّوں کا ایک پہاڑ یا چبوترہ دس لاکھ میل لمبا۔ اور اتنا ہی چوڑا اور دبیز تصوّر کریں اور اُس پہاڑ کے ذرّوں کی تعداد کو دُنیا کے تمام درختوں کی پتّیوں کی تعداد سے ضرب دیں اور حاصل ضرب کو سمندر کے پانی کے قطروں۔ تمام حیوانات کے بالوں اور شروع سے اب تک یعنی طوفانِ نوحؑ کے وقت کی بارش سے قیامت تک کی بارشِ باراں کی بوندوں سے ضرب دیں اور اس حاصل ضرب کے ذرّوں کے حجم یعنی کوہِ بے ستوں کے تراشنے کے لیئے فرہاد سے کہیں کہ جوئے شیریں پیچھے لگانا پہلے اس پہاڑ سے ہر تیشہ میں ایک انچ کا گڑھا پیدا کر۔ اور پہاڑ کا ایک انچ کھدتے کھدتے اور ایسے ہی پہاڑ پیدا ہو جائیں۔ جتنے آسمان پر تارے ہیں تو آپ ازل سے ابد تک کے ایک لمحہ کا بھی اندازہ شاید ہی کر سکیں۔ مجھے حساب میں بہت دخل نہیں اس لئے آپ کو تکلیف دیجاتی ہے کہ حساب لگاتے لگاتے مرا سر پھرنے لگا ::

لیکن جہاں اس قدر بے تحاشہ عالمِ اسباب کی کثرت ہے یہ مٹنا بھی اسی طرح ہے۔ بڑے میاں (پیرفلک) جو بُڑھاپے کی وجہ سے کبھی کبھی اونگھ جاتے ہیں یہ سارا زمانہ جو حساب سے باہر ہے ان کی ایک جھپکی کی برابر ہے۔ ازل سے ابد تک جس کا حساب نہ آپ سے ہو سکا نہ مجھ سے افیونی کی ایک پینک سے زیادہ نہیں: اور پینک بھی ایسی جس کا کوئی یادگار زمانہ میں دکھائی نہیں دیتا :: کہتے ہیں کہ طوفانِ نوحؑ کا یادگار اگلے لوگوں نے علاج کے طور پر بابل کا مینار

بنانا چاہا مگر زمانہ نے اس کا نشان بھی نہ چھوڑا۔ زمانے کے سیلاب کے آگے کوئی چیز نہیں ٹھہرتی۔ نہ سنگ مرمر کی پچی کاری۔ نہ مانی و بہزاد کی دست کاری۔ اکثر قبریں جو سنگین ہوں ان کے مُردے پہلی ہی شب برات میں لاخانماں ہو جاتے ہیں۔ شب برات میں نے اس لئے کہا کہ مُردوں کی فاتحہ کی یہی یادگار ہے۔ قبر اگر سنگین ہے تو شاید ایک پشت اور مرمت ہوتی رہے تو شاید دو چار پشت۔ یہ حد درجہ ہے: پھر آخر کو مرمت کرانے والے بھی نہیں رہتے۔ ہمایوں کے مقبرہ کو دیکھکر عمارت کی خوبصورتی کا خیال ضرور آتا ہے مگر ہمایوں کی روح کو فاتحہ کا ثواب پہونچانے کے لئے دیکھنے والوں کے ہاتھ اُٹھتے نہیں دیکھے۔

نیرنگ روزگار کا مزاج عجیب ڈھنگ کا ہے کہ داد دہش میں حاتم طائی سے بڑھ کر اور مُمسک ہونے میں قارون سے بدتر۔ درخت کے ہزار بیجوں میں سے دو چار ہی کے جمنے کی نوبت آتی ہے۔ باقی کا نام و نشاں بھی نہیں رہتا۔ دنیا میں بے حساب سال ہوئے ان میں سے چند ہی یاد رہ گئے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ سنہ ۱۹۲۳ کسی کو یاد رہے گا یا نہ رہے گا۔ یہ سنہ ابھی گزرا ہے۔ اکثر چیزیں فاصلہ سے اچھی طرح نظر آتی ہیں: اس کو بھی ذرا فاصلہ سے دیکھنا چاہئے: یعنی کچھ عرصہ کے بعد۔

دُنیا میں کوئی چیز باسی نہیں ہوتی۔ کروڑوں پدموں صدیوں کے بعد بھی زمانہ جیسا تھا ویسا ہی چلا آتا ہے: نہ یہ سڑتا ہے نہ گلتا ہے۔ سرو کی طرح جب دیکھئے بہار و خزاں میں ویسا ہی نظر آئے گا۔ لیکن ہماری زندگی محدود اور اسباب زندگی مزاج یار کی طرح ایک وضع پر نہیں۔ میری زندگی کا ایک پل بھی مجھے عمر نوح سے زیادہ عزیز ہے۔ زندگی

کالطف

کا لطف گھنٹے۔ گھڑیوں اور گرانا میٹر سے بیان نہیں ہو سکتا: یار کی ملاقات کا مدار چار پہر کی رات پر ہی منحصر نہیں۔ چلتے پھرتے نظر سے دو چار ہو جانا بس ہے۔ یار دن کو ملے یا رات کو۔ کسی طرح ملنا چاہئے ؛ حضرت ہنر کا شعر ہے ؎

ہنر کچھ اب کی لگا ہیں وہ کر گئیں جادو ؛ وگرنہ یوں تو ملی آنکھ بارہا اُس سے

میں اپنے دل سے یہ کبھی پوچھا نہیں چاہتا کہ تو کہاں سے آیا۔ کیوں کر آیا۔ کہاں جائے گا؟ پوچھنے کے لایق یہ بات ہے کہ تیرا جی یہاں لگا یا نہ لگا؟ اگر جی نہ لگا تو اس میں تیرا قصور ہے کہ زمانہ کا ؛ ؎

راحت طلب کروں تو ملے آسماں سے رنج ؛ حاضر ہے موت ابھی جو خیال آئے خواب کا

میرا قصور تو تب ہوتا جب کہ میں دُنیا سے بیزار رہتا۔ میں تو دنیا پر مرتا رہا۔ گو یہ مجھ پر نہ مری ؛ میرے مرنے پر نہ زمین کو خبر ہوئی نہ آسمان کو۔ دُنیا کی نگاہ میں اس کے چاہنے والے اور نہ چاہنے والے دونوں برابر ہیں۔ اس کے چاہنے والے نفرت میں برباد ہوئے ؎

اپنی نادانی تو دیکھو سب نے دنیا سے چھوڑ کر ؛ اس طرح سر پر لیا گویا نہیں درکار تھا

جب انسان مرتا ہے تو لوگو مرنے کا صدمہ ہوتا ہے لیکن یہ سوچ کر تسلی ہوتی ہے کہ یہاں کوئی نہیں ہوئی۔ آسانی سے دم نکلا۔ دن اچھا تھا۔ مرتے وقت عزیز و اقارب سب موجود تھے ؛ سنہ ۱۹۲۳ء کا انتقال بھی آسانی سے ہوا۔ مادرِ گیتی موجود تھیں۔ پیرِ فلک سرہانے (سرپر) اور بارہ بیٹیاں پائنتیں بیٹھی تھیں۔ ابنائے زماں یعنی نجومیوں اور اخبار والوں کی زبان پر تھا کہ اِنّا لِلّٰہِ واِنا الیہ راجعون۔ یہ دن سب کو دیکھنا ہے (مگر خدا ہمیں بچائے رہے!)

دن کی تو کہہ نہیں سکتے مگر تاریخ وہی تھی جس تاریخ آپ کے آباؤ اجداد کا واقع ہوا: یہ تاریخ

اس خاندان کو راس نہیں آتی ؎

آہ ہاں مژگاں سے نہ کاوش کروائے طفلِ سرشک ؛ جس کے سایہ میں رہو اُس کا بُرا چاہتے ہو

سال کا انجام و آغاز کچھ چیز نہیں۔ اکثر آغاز سے انجام اچھا نکلتا ہے ناسخ کا شعر ہے ؎

طفلی میں تھی اک دایہ ہیں اب چار کے کاندھے ؛ آغاز سے کیا خوب ہے انجام ہمارا ؛ اسیطرح

جس کے ساتھ زمانہ ہو اُس کے آخیر وقت کا کیا کہنا ؎

صد شکر کہ ہے ساتھ جنازے کے وہ بے مہر ؛ آغاز سے بہتر ہے یہ انجام ہمارا

قیدِ ہستی سے رہائی غیر ممکن تھی ہمیں

آج دم دے کر اجل کو ہو گئے آزاد ہم

دُنیا میں موت و زندگی کے عجیب جھگڑے ہیں۔ اس میں رنج و راحت عیش و

مصیبت کے قصے اتنی مدت سے چلے آتے ہیں کہ تقویم پارینہ کی طرح انکا ذکر کرنا بے کار ہے ع

کہ تقویم پارینہ ناید بکار ؎

خانہ خراب! نالہ و زاری سے باز آ ؛ ہر دم کی ہائے ہائے میں اے دل اثر نہیں

ایسے بے جوڑ تماشے تماشائے روزگار کے سوا کسی ڈراما میں نظر نہیں آتے کہیں جنازہ و

کفن و گور کی تلاش ہے۔ اور کسی گھر میں بچہ کے لئے کرتہ ٹوپی کی تیاریاں ہو رہی ہیں (سنہ ۱۹۲۳

کے واقعہ اور سنہ ۱۹۲۴ء کی پیدائش میں صرف ایک رات درمیان ہے) کہیں اولاد کی تمنا میں

خواجہ رحمۃ اللہ علیہ کی درگاہ پر دیگیں چڑھ رہی ہیں کہیں غریب ضعیفہ کے بچے کو کفن کے لالے پڑ رہے ہیں ❊ ادھر مادر گیتی کو پلے پلائے بچے ۱۹۲۳ء کی جدائی کا رنج ہے۔ اُدھر زمانہ کو ۱۹۲۴ء کی پیدائش کی خوشی ہے ❊

جس طرح کبھی آنکھیں پتھرا جاتی ہیں کہ آنکھیں موجود مگر سوجھائی نہیں دیتا اسی طرح انسان کے دل پتھر سے زیادہ سخت ہو جاتے ہیں کہ کوئی بات اثر نہیں کرتی ع

کون آتا ہے کون جاتا ہے ؟ عبور زمانہ سے انسان کا دل بتانِ سنگ دل کی طرح سخت ہو جاتا ہے ❊ شاد باید زیستن ناشاد باید زیستن۔ غرض "زیستن" سے ہے ؛ بالزبک کے قول کے موافق ناشاد زیستن بھی غنیمت ہے کہ کسی طرح زندہ تو ہیں ❊ زندگی بھلی بُری جیسی ہو بہت غنیمت ہے ❊

جو وقت کہ گزر گیا بے کار گیا۔ جو آئے گا معلوم نہیں کیسا نکلے : یہ وقت جو آنکھوں کے سامنے ہے اسی کی قدر چاہیئے ❊ اس وقت جو ہماری حالت ہے خدا جانے کتنی بے حساب گردشوں کا نتیجہ ہے جس طرح ایک سبو چاک کی ایک گردش سے نہیں بنا اسی طرح ہم اس حالت پر جو اس وقت ہے بہت گردشوں کے بعد پہونچے۔ ہم کو معلوم نہیں کہ ماں کے پیٹ میں ہم کس طرح رہے ؟ یاد نہیں کہ ہم نے دودھ کس طرح چھوڑا ؟ دانت نکلنے میں ہم پر کیا گزری ؟ مرنے کے بعد ہم سے کوئی کہنے نہیں جاتا کہ ہمارے سیوم وچہلم وبرسی میں کیا خرچ ہوا کفن کس قیمت کا تھا۔ قبر کتنے میں بنی ؟

جن کی تارک الدنیا ہونے کی شہرت ہے۔ اُن کو میں تارک الدنیا نہیں

جاتا بلکہ آرام طلب سمجھتا ہوں کہ دُنیا کے انکار سے بھاگ نکلے اُن کو اپنے آرام کا اتنا خیال تھا کہ انکارِ عالم سے بچنے کی فکر میں زندگی بسر کی جس طرح دریا کے کنارے کوئی پیاسا بیٹھا رہے کہ کوئی ادھر سے نکلے تو وہ پلا جائے ؎

خاکساری ہے فقیری میں بھی مشکل ورنہ ؛ پیرہن مٹی میں کس کو نہیں رنگ آتا ہے

دنیا میں آرزوؤں کا نہ پورا ہونا اس سے بہتر ہے کہ آرزو پیدا ہی نہ ہو - مرتبہ میں نباتات جمادات سے بہتر ہیں کہ بے حس ہے اور درخت میں خشکی و تری کا حس ہے نباتات سے حیوان افضل ہیں کہ جانوروں میں نباتات سے زیادہ حس ہے اور جانداروں میں سب سے زیادہ انسان میں - یہی حس آرزوؤں کی جڑ سمجھئے - آرزوئیں نہ ہوں، تو انسان کی زندگی بے کار ہے ؎

جب اپنے شغل سے دلِ خونیں نہ باز آئے ؛ پھر کیا گناہ دیدۂ خونابہ بار کا

ہماری آرزوئیں بر آئیں، تو کیا کہنا - نہ بر آئیں تو بھی اک مشغلہ تو ہے : کوئے یار نہ سہی - رنگا پوئے سحر سہی، چشم تو بتاں نہ سہی دیدۂ آہو سہی - نشہ نہ سہی سرور سہی ؎

جو آرزو ہی تھا عوض ... میں حرص ہیں کب ہیا ؛ نشہ جو کم ہوا سی کو سرور کہتے ہیں -

... میں سب سے اچھا مضمون یہ ہے ؎

کیا میں بھی کوئی نقشِ کفِ پا تھا کہ ظالم ؛ رفتار میں موجود تھا ٹھوکر میں نہیں تھا

یہ سال ۵۶۳ دن برابر زمانہ کی رفتار کے ساتھ رہا اور زوالِ دنیا کی ایک ٹھوکر میں اس طرح گیا کہ گویا تھا ہی نہیں ؎

حسرتِ دل نہیں دُنیا میں نکلتی ناسخ ؛ ہاتھ شل ہوتے میسر جو گریباں ہوتا

دسمبر ۱۹۲۳ء کے صلائے عام کا مضمون پریشان اس سال کی رخصت کا مضمون ہو گیا ع گویا کہ قفس کردہ و بالِ پریشانی را ۔ اگر پریشانی پسند نہیں تو بقول جناب رضا علی وحشت ؎

کدامی گیسوے برہم سرِ آراستن دارد ۔ کہ یا رب در کفِ مشاطہ امشب شانہ می رقصد

آپ اسے رخصت سالِ حال نہ سمجھیں تو معمولی مضمونِ پریشان سہی ؎

تنگ گو ہاتھ سے وحشت کے ہوں پر ہوں گھر میں
جیب و داماں تو نہیں ہوں کہ نکل جاؤں گا

غزل ۔ جناب نواب حبیب عنایت بہادر فرمانروائے ریاست لوہارو

کرتا ہے قاتل بھی ماتم مجھکو دفنانے کے بعد ۔ قدر اچھوں کی ہوا کرتی ہے مرجانے کے بعد
ساقیا مدہوش رکھ اور مجھ سے سُن عالم کے راز ۔ مست ہو جاتا ہے غافل ہوش میں آنے کے بعد
کچھ عجب ہی حال ہوتا ہے دلِ ناشاد کا ۔ یار کے جانے سے پہلے اور یاں آنے کے بعد
دیکھنے میں تو بھلی معلوم ہوتی ہے مگر ۔ سانپ بن جاتی ہے اس کی زُلف بل کھانے کے بعد
فصلِ گُل ہے بلبل ارمان ہو سکے جتنے نکال ۔ شاخِ گُل سُولی نظر آئے گی مرجھانے کے بعد
تیرِ مژگاں نے کیا جس پر یہ کے شہید ۔ وہ ہی کر سکتا ہے زندہ مجھکو مرجانے کے بعد
زندگی بھاتی نہیں اعظم کسی کو دیکھکر ۔ وہ ادائیں بھولی جاتی ہیں کہیں بھانے کے بعد

۲۰ دسمبر ۱۹۲۳ء ۔ دہلی   اعز الدین احمد۔

نویدِ آمدِ سالِ نو

ڈاک میں صلائے عام کی روانگی کی تاریخ ایسی واقع ہوئی ہے کہ یہ پرچہ جنوری سنہ ۱۹۲۴ء کے آغاز میں پڑھنے والوں کی نظر سے گزرے گا۔ اس لئے اخبار نویسوں کے دستور کے موافق سالِ نو کی نسبت بھی کچھ نہ کچھ لکھنا چاہئے کہ بقول حضرت امیر خسروؒ سنہ ۱۹۲۳ء کا پیغام سنہ ۱۹۲۴ء کے نام کم وبیش یہ تھا ؎

دمے آبے زشمشیرِ نگاہت آرزو دارم ٭ کہ رنگِ رفتہ بر روئے من از روئے تو می آید

جس طرح ماں باپ کے خط وخال کا چربا اولاد میں نظر آجاتا ہے یا دو بھائیوں میں جو ایک ماں باپ سے ہوں ایک دوسرے کا نقشہ کم وبیش ملتا ہے۔ یا ماں کا حسن بیٹی میں پیدا ہو جاتا ہے ایک سال کو دوسرے سے کچھ نہ کچھ تعلق ضرور ہوتا ہے ٭ رنگِ روئے یار سے چاہنے والے کے چہرہ پر رنگِ رفتہ کا آجانا خوب کہا۔ اور دو بھائیوں میں ایک دوسرے سے مشابہت کی تشبیہ از روئے شاعری اس سے اچھی کہنی مشکل ہے کہ ؎

بہم صدمے اٹھائے دل جگر باہم ہوئے آخر ٭ برابر آئے تھے عمریں بھی لائے تھے برابر کی

ایک سال سے دوسرے سال کی آغاز وانجام میں ایک ہی صورت ہوتی ہے کہ

دونوں یکسا

دونوں کیا زمانہ کا تمام خاندان کا خاندان رنگ خزاں و بہار سے پیدا ہوا۔ نہ اس کے آغاز کا اعتبار ہے نہ انجام کا ؂

سال نو کی آمد ایسی کوئی بڑی خبر نہیں جس کے واسطے اخبار نویسوں کو خبر رسانی کی ضرورت ہو۔ معمولی جنتریوں سے اس کا پتہ لگ جاتا ہے: مگر عالم اسباب میں ہر نئی بات پر چہ میگوئیاں کرنے کو جی چاہتا ہے ؂ بچہ کے پیدا ہوتے ہی زائچہ جنم پترے کی سوجھتی ہے پنڈت جی مہاراج۔ نجومی و رمال گھر کی بڑی بوڑھیاں اپنی اپنی رائے کے موافق پیشین گوئیاں کرتی ہیں کہ بچہ بڑا طالع ور ہوگا۔ ماں باپ کے لئے بڑا بھاگوان ہے: ایک آدھ کھٹکے کی بات بھی بتا دیتے ہیں کہ نظر گزر سے بچا رہے ؂ عورتوں میں ذکر رہتا ہے کہ بچہ بالکل باپ کی شکل پر ہے۔ دوسری کہتی ہے ماں پر گیا ہے۔ گھر کے بڑے بوڑھوں سے نام کی فرمائش ہوتی ہے کہ برکت کے لئے اچھا سا نام رکھا جائے۔ مگر خیال رہے کہ نام خاندان پر ہو۔ باپ دادا کے نام سے ملتا ہوا نام تجویز کرنا چاہئے ؂ پیر چرخ نے کہا کہ ۱۹۲۳ء کے بعد ۱۹۲۴ء کا نمبر ہے نام کے لئے بھی بہت مناسب ہے کہ یہ خاندانی نام ہے۔ مادر گیتی بولیں کہ یہ نام کاہے کو ہوا؟ نام کیا تسبیح کا شمار دانہ ہے ؂ زمانہ نے کہ بچہ کے چچا ہوتے ہیں (اس رشتہ سے کہ پیر چرخ باوا اور پیر چرخ کے بھائی میاں زمانہ) بھایا کہ برکت کے لئے حضرت حافظ رح کے دیوان میں فال دیکھی اس میں شراب کے مضمون زیادہ نکلے کہ حضرت عمر خیام رح کی طرح حافظ جی کی نگاہ میں نشۂ بادۂ ہستی کا نام زندگی ہے۔ بچہ کی گھٹی میں ابھی سے شراب کا ذکر

اچھی برکت ہوئی اس سے تو یہی بہتر ہے کہ قید خانوں میں قیدیوں کو نمبر سے پکارتے ہیں یہ بچہ عدم سے قیدِ ہستی میں آیا ہے۔ ملکِ عدم کے گناہ گاروں کو قیدِ حیات کی سزا دیجاتی ہے یہ قید ہو کر یہاں آیا ہے۔ جب تک یہاں ہے نمبر سے پکارا جائے گا یعنی قیدی نمبر ۱۹۲۴۔ یہاں کے قواعد کے موافق اگر اس کا چال چلن اچھا رہا تو نیک نام ہو جائے گا نہیں تو بدنام ہو کر نکلے گا۔ اس کی نیک نامی اور بدنامی کا مدار اس کے اعمال نامہ پر ہے اور اعمالنامہ اس کے ہم جنس قیدیوں کے ہاتھ میں ہے جو یہاں کے قواعد میں کہنہ مشق ہیں۔ یہہ خوش رہے تو انشاء اللہ یہہ بچہ نیک نام ہو کر نکلیگا کہ اس کے چہرے سے سعادت مندی کے آثار ٹپکتے ہیں: اس پر گھر والے بہت خوش ہوئے ؛ قاعدہ ہے کہ انسان خوشی کی باتوں سے خوش ہوتا ہے۔ سچی نکلیں تو کیا کہنا۔ غلط نکلیں تو بھی ذکر عیش نیم عیش کی طرح دل لگا کر سُننے کو جی چاہتا ہے: یہی وجہ ہے کہ نجومیوں رمالوں۔ ہاتھ دیکھنے والوں زائچہ بتانے والوں کی روٹیاں چل جاتی ہیں ؛

آمدِ یار کی طرح نئے بچے کی پیدائش خوشی کے موقعوں میں داخل ہے۔ اس سے مجھے خیال آیا کہ عالمِ اسباب میں خوشی کا وجود ہے ضرور: زاہدانِ خشک جو دُنیا کو دارِ محن کہتے آئے ان کو کسی کا خوش دیکھنا ناگوار معلوم ہو تو ہو ورنہ دُنیا میں خوشی کے اسباب زیادہ ہیں ؛ میں خوشی کو جوہر اور رنج کو عرض سمجھتا ہوں کہ خوشی کے ہونے کا نام رنج ہے جس طرح کپڑے کا وجود جوہر ہے اور کپڑے کا رنگ عرض ہے کہ کپڑے کے بغیر رنگ نہیں ٹھہر سکتا اسی طرح پیدا ہونا جوہر ہے اور مرنا عرض ہے کہ انسان پیدا نہ ہو تو مرنا

ممکن نہیں۔ تمام دُنیا میں پیدا ہونا خوشی میں سمجھا جاتا ہے اس خوشی کا ہٹنا یعنی موت رنج میں داخل ہے ؛

دُنیا میں ہر شخص کو خوش رہنے کی نہ صرف آرزو کرنی چاہئے بلکہ ہر شخص کو اس کا دعوےٰ کرنا مناسب ہے۔ میں نے از روئے اخلاق آپ کا مزاج پُوچھا کہ مزاج پوچھنے کی عادت آدمیت میں داخل ہے۔ عادت کا پورا کرنا خوشی ہوئی کہ لوگ مجھے بے تمیز نہ کہیں۔ اب میرا حق ہے کہ آپ کہیں "شکر۔ الحمدللہ! آپ کا مزاج" ؛ یہہ حق میں از روے دعوےٰ طلب کرتا ہوں کہ میں نے آپ کا مزاج آپ کے خوش کرنے کو پُوچھا۔ اب میرا حق ہے کہ آپ مجھے خوش کریں ؛ میں نے آپ کو خوش کیا اب مجھے دعوےٰ ہوگیا کہ آپ مجھے خوش کریں۔ عوض معاوضہ ہوگیا اور گلہ نہ رہا ورنہ مجھے گلہ کی گنجایش تھی۔ اور گلہ حق تلفی کی جڑ ہے ؛ آپ کسی کو خوش کرنے سے باز نہ رہیں اور دوسرے سے بھی اس کی امید ہمارا حق ہے ؛ بچّوں سے ماں باپ کو یہ اُمّید رکھنی کہ جس طرح ہم نے انہیں خوش کیا ماں باپ کا حق ہے کہ بچّے ماں باپ کو خوش رکھیں ؛

زمانہ کی یہ امید کہ نمبر ۱۹۲۴ والا بچّہ نیکنام ہوکر زمانہ کو خوش رکھیگا زمانہ کے حق بجانب ہے ؛ ہم کو قطعی اسباب کا حق حاصل ہے کہ ہم اس بچّہ سے اُمّید رکھیں کہ یہ ہمیں خوش رکھیگا ؛

ہم نے اس سال (۱۹۲۴ء) کی نوید آمد لکھ کر اپنی طرف سے رسمِ محبت ادا کردی اب دیکھیں اس کے صلہ میں ہمیں کیا ملتا ہے ؟ اور کچھ نہیں تو اسے ہماری طرفداری کا پاس ہوگا کہ اخبار والوں نے اسکی آؤ بھگت میں کسر نہیں کی اور نہیں تو آزاد فقیروں کی طرح صدا لگا چلے ؎

کعبہ کو چھوڑ کر تجھے سب نے کیا طواف ؛ خیرات آج راہِ خدا کچھ تو چاہئے ؛

گُل و بُلبل

(ازروئے شاعری)

جہاں اور زبانوں کی شاعری کا ذکر آتا ہے۔ یہہ دیکھ کر کہ مجھے فارسی کی شاعری سے اُنس ہے۔ میری طرفداری کا خون کرنے کے لئے لوگ مجھ سے ازروئے طعن کہہ اُٹھتے ہیں کہ فارسی میں گُل و بُلبل کے سوا کیا رکھا ہے؟ فارسی شاعری کی ساری کائنات دو لفظوں پر ختم ہے۔ یعنی گُل و بُلبل پر۔ اس طعنہ میں فارسی و اُردو کا مضمون واحد ہے۔ کیوں کہ اُردو کی شاعری کے خط و خال فارسی کی نقل ہیں۔

یہہ طعنہ سخن گسترانہ تو ہو نہیں سکتا۔ عامیانہ اور غلط ہے: بلکہ عامیانہ اور غلط ہونے کے سوا فارسی شعر و سخن کی جان پر ظلم ہے۔ اوّل تو اس زمانہ میں بہت کم ایسے لوگ ہیں جن کو فارسی زبان پر پورا عبور ہو۔ دوسرے عرصہ کی بیگانگی سے کہ اگلی وضع کی طبیعت و معاشرت مدّت ہوئی کہ مٹ گئی۔ وہ لب و لہجہ و ضبطِ ادب و آدابِ دہنِ یار کی طرح نظر نہیں آتا: شعر کہنا در کنار شعر و شاعری سے مس نہیں رہا۔ سب کی نسبت تو میں ازروئے اخلاق کہہ نہیں سکتا مگر آج کل کے معمولی انگریزی خوانوں میں بہت کم ایسے اصحاب نکلیں گے جو شعر کے وزن و بحر و تقطیع سے واقف ہوں۔ اور شعر کی باریکیاں

سمجھ سکیں: فارسی کیا اُردو شعر کے سمجھنے کے بھی لالے ہیں ؛

اس وقت مجھے ان سے غرض نہیں۔ مگر آپ ہی ملاحظہ فرمائیں کہ از روئے نازک خیالی و پاکیزہ بیانی تمام عالمِ اسباب میں گُل و بُلبل سے زیادہ نازک و پاکیزہ مضمون ذہن میں آنا مشکل ہے: پھولوں کی خوبصورتی کو دُنیا میں کوئی چیز نہیں پہونچتی - ان کے رنگ و بُو کا جواب آج تک انسان سے تو کیا نیچر کے دستِ قدرت سے باہر ہے: دستِ قدرت سے باہر اگر نہیں تو ممکنات میں نظر نہیں آتا - اگر ہے تو آپ مجھے دکھادیں ؛ یہہ گُلوں کا صدقہ ہے کہ گل و گلزار و باغ و بہار سے دُنیا کی رونق ہو رہی ہے ؎

نہ جانے کیوں دلِ مرغِ چمن کو سیکھ گئی ؛ بہار وضع تری مُسکرا کے آنے کی

اسی طرح مُرغانِ چمن کے پر و بال کی خوشنمائی کو حسینانِ جہاں میں کوئی پہونچ نہیں سکتا مشاطہ نے ایک رات کی دُلہن کو زیور و لباس سے کتنا ہی آراستہ کیا مگر مُرغانِ گلشن کی رعنائیِ پر و بال کی برابری نہ ہوسکی: ان کے پر و بال ہوائے شوق کے گویا جواب ہیں رخسارِ حسیناں کی تعریف میں اگر ہم نے گلاب کے پھول سے تشبیہہ دی یا دلربا کی مستِ خمار آنکھوں کو نرگسِ بیمار سے تمثیل دی۔ زلفِ پیچاں کو سنبل سے اور ہونٹھوں کو برگِ گُل سے مِلایا تو کیا ہوا؟ یہہ نسبتیں ناقص رہیں کہ رنگ و وضع میں اگر تھوڑی سی مناسبت پیدا ہوئی تو پھولوں کی سی خوشبو کہاں سے آئے گی؟ مے پرتگال کو بادۂ گُلرنگ کہا تو شراب کی تعریف ہوگئی۔ اور تعریف سے عزت سمجھئے: اسی طرح دہنِ یار کو غُنچہ سے مشابہت میں یار کی تعریف ہوی ؎

دیکھ چشمِ دل سے حسن و عشق کی نیرنگیاں ؛ مصحفِ گل میں لکھی ہے داستانِ عندلیب
یعنی نکہتِ گل روحِ روانِ بلبل ہے ؛

پھر مرغانِ چمن کی نغمہ طرازی کو لیجیئے تو ان کی خوش الحانی کے آگے تان سین کی آواز گونگے کا چیخنا ہے۔ مرغانِ خوش الحان کے سامنے تمام دُنیا کے باجے بھرّائی ہوئی آواز سے زیادہ نہیں۔ جس طرح روتے روتے انسان کی آواز بھاری ہو جاتی ہے۔ یا حرفِ فراموشِ لب گو رہیں جو دہنِ گور سے باہر نہیں نکلتے ؛

مرغانِ چمن میں بلبل سے زیادہ بھولاپن دیکھنے میں نہیں آتا کہ لفس کے لئے نہیں بلکہ پھولوں کے حُسن پر فدا ہونا مآلِ زندگی سمجھتی ہے۔ یہ بھولاپن نہیں تو کیا ہے کہ پھول کی چار پتیوں کے پیچھے صیاد کے دام میں گرفتار ہوتی ہے۔ قفس میں قید رہتی ہے۔ آشیانہ چھوٹتا ہے۔ بہار کا لُطف نصیب نہیں ہوتا ؎

بہار آئی ہے ظالم خدا خدا کر کے ؛ مٹا نشان نہ بلبل کے آشیانے کا

محبت میں اس سے زیادہ مصیبتیں کس نے اُٹھائیں اور کون اُٹھا سکتا ہے؟ لاکھوں جانبازوں میں ایک قیس ہوا۔ وہ دیوانہ قرار پایا: اور فرہاد کو سر پھوڑنے پر مُنڈ چرا سمجھنا پڑا ؛ یہاں خالق نے ہر بلبل کا خمیر گلوں کی محبت سے پیدا کیا ؛

مخلوقِ خدا میں آپ کو گل و بلبل سے زیادہ معصوم اور حسین دوسری چیز مشکل سے نظر آئے گی۔ دُنیا کے جھگڑوں سے بیفکر ہو کر شاخِ گل پر بلبل کا چہچہانا فردوسِ بریں کا لُطف سمجھیے اور پھولوں کا چند ساعت کے لئے کھِلنا مُسکرانا۔ اور پھر مرجھانا بے ثباتیِ عالم کی پاکیزہ مثال ہے ؎

سمجھتے ہیں کہ ہے صیاد درپئے آزار ٭ اور اسے پہ دھیان ہے گلشن میں آشیانے کا

یہ دونوں یعنی گل و بلبل دنیا کے رنج و راحت عیش و مصیبت کے عجیب مثالیں ہیں موسم بہار میں دونوں کو اپنی اپنی وضع پر جو زندگی کا لطف حاصل ہے کسی کو میسر نہیں اور خزاں میں جو مصیبت و بربادی ان کے سر پر آتی ہے خدا دشمن کو نصیب نہ کرے ؏

وائے قسمت کہ خزاں میں رہے گلزار کے پاس ٭ اور بہار آئی تو صیاد جفا کار کے پاس

خزاں میں نہ پھولوں کا پتہ ہوتا ہے نہ بلبل کا۔ بہار میں بلبل کے چہچہوں سے باغ میں جو شور رہتا ہے خزاں میں اسی قدر باغ سنسان نظر آتا ہے۔ پھول جن کو حسین بیتاب ہو کر گلے کا ہار بنا لیتے تھے زمین پر مرجھائے پڑے ہوتے ہیں اور کوئی اٹھاتا نہیں ٭ اس کو بھی جانے دیجئے۔ گلوں کی جان کو تمام عمر کانٹوں کا ساتھ ان کی زندگی تلخ کرنے کو کیا کم تھا کہ خار سے پہلے گلوں کو اپنی بربادی اپنی آنکھوں سے دیکھنی پڑتی ہے ؏

موسم گل ہو گیا آمادہ جانے کے لئے ٭ اور جگہ ڈھونڈھا کئے ہم آشیانے کے لئے

بلبل کی مصیبتیں ایک ہوں تو کہی جائیں۔ گلوں کی بے مہری۔ صیاد کا کھٹکا۔ برق و باراں کا دھڑکا کہ آشیانہ جو کس محنت سے تنکے چن چن کر بنایا بجلی کی نذر ہو جاتا ہے: جس طرح یار کے خرام ناز سے آفتیں برپا ہوتی ہیں بجلی کا گرنا بلبل کے لئے قیامت کا سامنا ہے ؏

برا ہو باد خزاں کا کہ دم کے دم میں یہاں ٭ کیا ہے فیصلہ بلبل کے آشیانے کا

دنیا میں رنج و راحت کا طور اور عیش و مصیبت کا ڈھنگ جو گل و بلبل میں دیکھا وہ نیرنگی روزگار کا مرقع سمجھنا چاہئے کہ رہروان فنا کا پتہ بوئے گل کی طرح کہیں نہیں ملتا۔ نہ بوئے

گُل کا نقشِ پا ہے نہ مسافرانِ عدم کا ؛ برنگِ نکہتِ گُل ہم سب اس جہان میں خانہ بدوش ہیں کہ بادِ بہاری تک بھی ٹھہرنا مشکل ہے جہاں فغانِ بلبل "نقارخانہ میں طوطی کی آواز" کی طرح کون سُنتا ہے ؎

رہا نہ کرنے میں صیاد ہے بہانہ طلب ؛ کہو نہ منہہ سے اسیرو کہ پر نہیں رکھتے

رہا ہوئے پہ بھی ہم تو رہے قفس ہی کے گرد
کہاں وہ جائیں کہ جو بال و پر نہیں رکھتے

اس مضمون میں ابھی لکھنے کی بہت گنجایش ہے۔ خاص کر شعرائے فارسی کو کہ گل و بلبل کے مضامین فارسی میں نہایت پاکیزہ باندھے گئے ہیں: اہل سخن میں جو اصحابِ کمال اس طرف متوجہ ہوں اس مضمون کو پورا کرنے میں دریغ نہ فرمائیں؛ ایسے مضمون ہماری لٹریچر کی ترقی کے لئے ضروری ہیں ؎

صیاد ترے ڈر سے ہوں خاموش ورنہ یاں ؛ میں اور دیوے چین گھڑی بھر فغاں مجھے ؛

زبانِ دہلی

نمونے کے طور پر

زبانِ دہلی کی تعریف صاحب عالم حضرت صآبر کی زبانی اس طرح ہے کہ

× × × × × × × × × × × × × × × ×

”حق یہہ ہے کہ فصاحت اس خطّہ لطافت بنیاد میں آسمان سے برستی ہے اور زمین سے اُگتی ہے۔ ایوان یہاں کے ابیات بلند ہیں اور خشت و سنگ الفاظ متیں۔ طاق و دوائر خوش ترکیب ہیں اور نقش و نگار مضامین رنگین۔ اس گلشنِ جنت آئین میں درختِ فصاحت کی یہہ تازگی اور ریاض بلاغت کی یہ سیرابی مقامِ تعجّب اور محلِ شگفت نہیں کہ یہ نہال ان ہیں نخلبندانِ گلشن کمال کی سعی سے شگفتہ ہیں“ × × × × × × × × × × × × × ×

”یہاں ارباب دانش پر مخفی نہیں ہے کہ زبان اُردو کا رواج فصاحت پیشگانِ پایہ تخت شاہی سے آغاز ہوا تھا اور انہیں نونہالانِ چمن زارِ کمال کا جہد اس حدیقہ سیراب کا چمن طراز ہمیشہ اس گلزمین میں تصرف مالکانہ کو کام کرتے رہے اور اس ایوانِ رفیع کی مرمّت و آرائش

میں اہتمام رفتہ رفتہ اُس حُسن وبہا نے کمال پایا اور اُس کی زیب و زینت نے ایک جمال بہم پہونچایا روز بروز ترقی جلوہ گر رہی اور ہر بار اس دولت روز افزوں میں زیادتی متصور" × × × × × × × ×

× × × × × × "جب زبان اُردو کی اصل یہی خاک پاک مقرر ہوئی اور اسی گلزمین میں اہلِ کمال کی پیروی جادۂ مقصود میں راہبر تو اب لازم ہے کہ

دلّی والوں کی زبان کا تتبع کیا جائے

صاحب عالم کو دعوے ہے کہ دلّی والوں نے اُردو کا پایہ کس بلندی پر پہونچایا اور ہندی کا فرق کس اوج پر مرتفع ہوا کہ لہجہ دری اُس کے اوصاف میں الکن ہے اور زبان پہلوی اُس کی مدح میں بے سخن۔ اُردو کو کسوت دری اور ہندی کو لباس فارسی میں جلوہ دینا اگر اعجاز نہیں تو سحر سے کم نہیں" × × × × × × × × × × × ×

× × × × × کسی بزرگ کی تعریف میں جن سے حضرت صابر کو ملنے کا موقع نہیں ملا۔ اس طرح لکھتے ہیں :۔

× × × × × × × × "راقم ہر چند اُس مظہرِ محاسن کی ملاقات سے کامیاب نہیں ہوا لیکن گوشش محامد نیوش نے اوصاف حمیدہ اور اطوار پسندیدہ کا ذخیرہ اس قدر حاصل کیا ہے کہ حصولِ آشنائی کے واسطے چشم دیدار طلب کی وساطت کو کچھ دخل نہیں رہا" × ×

× × × × × × × (بات اتنی ہے کہ گو آپ سے ملنا نہیں ہوا مگر آپ کی تعریف بہت سُنی ہے)

(ماخوذ از گلستانِ سخن)

غلام حیدر الحسنی

کلام جناب گرامی

برہم نہ زنم مژہ نگاہم ایں است ٭ بر چرخ زنم بآہ راہم ایں است
از خویش بروں شدن نیرزد بہ جوی ٭ در خود نہ رسیدہ ام گناہم ایں است

دیوانۂ اندازِ تکلّم مائیم ٭ پیمانہ کشِ ذوقِ تبسّم مائیم
از معنیٔ امتیازِ ہجران و وصال ٭ مارا چہ خبر بخویشتن گم مائیم

صلائے عام۔ حضرت گرامی کے کلام فارسی کا کیا کہنا! زیادہ خوشی اس بات کی ہے کہ حضرت نے جب غریب خانہ پر تشریف لائے تو اپنا کلام صلائے عام کے لئے ازراہ کرم ہمیشہ بھیجنے کا وعدہ کیا٭

× × × × × × × × × × × ×

× × × × "صلائے عام کے اندازِ دلربانے راحلِ زار کے دل کو خراب و مبتلا کر رکھا ہے۔ اس صحیفۂ گرامی کے لئے سراپا انتظار رہتا ہوں:
تیغِ ہندی اور خنجرِ رومی ع نہ کند آنچہ انتظار کند ٭ سالکِ مروارید سے ایک دُرِ بے بہا گم ہوگیا یعنی نومبر کا پرچہ ملکہ شیمیں ذقن لیلائے ادب کے دُرجِ دہان سے درِ دندان نکل گیا۔" × × × × × × × × × × × × ×

خاکسار۔ ابوالسان راحلؔ۔ نعمانی السہروردی کا کاذیٔ ہوشیارپوری۔

موت سے کیا ڈرنا

جینی مت۔ اور۔ تصوف

میں ایک کتاب دیکھ رہا تھا جس میں ایک اشلوک جو جینی بزرگ کا کلام ہے میں نے پڑھا اور اسکو بالکل تصوف سے بھرا پایا اس کا لب لباب تو یہی ہے جو اس مضمون کی سرخی ہے کہ "موت سے کیا ڈرنا" مگر وہ بہت کچھ تشریح طلب ہے لہذا جین مت کے متعلق بھی جہاں ذکر کیا جاوے گا۔ تمہید کے طور پر میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ اس قول سے ملتی جلتی کہ "موت کو کیا ڈرنا" ایک ہندی مثل ہے کہ اوکھلی میں سر دیا تو موسلوں سے کیا ڈر۔ لیکن ہر دو اقوال مذکورہ کے درمیان فرق یہ پیدا ہے کہ اوکھلی میں سر دینا خود سر والے کے اختیاری فعل میں ہے اور موت سے مرنا اختیاری فعل نہیں ہے اور وہ لازمی و شدنی ہے۔ ان دونوں قولوں کو موازنہ کرنے سے یہ صورت نکل کھڑی ہوتی ہے کہ ڈر لگا ہونا مشترک فیہ ہے یعنی دونوں میں ڈر لگا ہوا ہے چاہے وہ اوکھلی ہو چاہے موت ہو اور ڈر وہ چیز ہے کہ جس سے انسان بھاگتا پھرتا ہے اور چھپتا پھرتا ہے۔ اور اس بات کی ساری دنیا قائل ہے کہ موت وہ بلائے بے درماں ہے کہ ڈرنے والے کو اور نڈر کو دونوں کو ایک ہی ترازو میں تولتی ہے اور جب یہ باور ہو جاوے کہ موت سے کسی پہلو بھاگ کر یا چھپ کر بچ نہیں سکتے تو بالآخر یہی قول صادق آتا ہے کہ موت سے کیا ڈرنا یعنی اول مرنا آخر مرنا پھر مرنے سے کیا ڈرنا۔

جو اہل تصوف ہیں وہ بجائے ڈر کے موت کے آجانے پر بے حد مسرت کرتے ہیں۔ حافظ شیراز کا کلام ہے ؎

چو کار عمر نہ پیداست بارے آں اولے ؛ کہ روز واقعہ پیش نگار خود باشم۔

مصرعہ ثانی میں نگار سے مقصود خدائے تعالےٰ ہے۔ یہ کلام حافظ کا حدیث شریف مُوتُوا قَبْلَ اَنْ تَمُوتُوا کی پوری تفسیر ہے اور مقصود اس سے یہ ہے کہ ماسوائے اللہ سے گریز اور بارگاہ صمدیت میں

حاضری ہو۔ حافظ شیراز تو دنیا سے کچھ ایسے ناخوش تھے کہ وہ یہاں کا رہنا ہی پسند نہ فرماتے تھے چنانچہ فرماتے ہیں ؎

چنیں قفس نہ سزائے من خوش الحان است ٭ روم بہ گلشن رضواں کہ مرغ آں چمنم
عیاں نشد کہ چرا آمدم کجا بودم ٭ دریغ و درد کہ غافل زکار خویشتنم
چگونہ طوف کنم از فضائے عالم قدس
چو در سرا چہ ترکیب تختہ بند تنم

تختہ بندی تن کی وجہ سے بڑی معقول وجہ عالم قدس سے غیر حاضری کی یہاں فرمائی ہے یہ بہت کچھ قابل غور ہے۔ اہل ہنود کے اکابر نے اس تختہ بندی تن پہ بہت بڑی نازکخیالیاں کی ہیں اور تصوف نے اس تختہ بندی کے پرخچے خوب اڑائے ہیں چنانچہ مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے کہ ؎

تو مباش اصلا کمال ایں است و بس ٭ رو در و گم شو وصال ایں است و بس

جس اشلوک کا میں نے ابتدا میں ذکر کیا ہے وہ میں نے مہاتما بجے دہرم سوری کے ذکر حیات میں پڑھا تھا یہ بزرگ جین مذہب کے بہت بڑے اہل تصوف تھے ان کی حیات کا ذکر بہت خوبیوں اور نیکیوں سے بھرا ہوا ہے اور اُن کا حیات نامہ اکثر زبانوں میں لکھا گیا ہے اور یورپ و ایشیا کے تمام ممالک میں اس کی اشاعت ہو چکی ہے۔ پس یہاں ذکر کرنا صرف اسی قدر کافی ہے کہ انہوں نے کثرت سے سفر کئے اور ہر جگہ لوگوں میں خدا شناسی کے وعظ دئے جس سے خلق کو اپنے معبود حقیقی کے پہچاننے کا سیدھا راستہ ہاتھ آیا۔ اُن کا گزر خاص آگرہ میں بھی سنہ ۱۹۱۲ء میں ہوا تھا اور مثل بنارس و دیگر مقامات کے آگرہ خاص میں بھی اُنہوں نے ایک شفاخانہ۔ اسکول اور لائبریری کھولدی جس سے آگرہ کے لوگوں کو از بس نفع پہونچا اس لائبریری کو میں نے خود دیکھا ہے اور اس کی کتابوں سے بہت کچھ فائدہ علمی حاصل کیا ہے اس میں بیس ہزار سے زیادہ کتابیں جمع ہیں۔ ہم اس موقعہ پر فیض رسانی جناب سیٹھ لکھمی چند کو بھی دل سے

فراموش نہیں کر سکتے کہ انہوں نے لکھوکھا روپے کے صرف سے ایک عظیم الشان مندر۔ دہرم شالہ لائبریری اور چھاپہ خانہ موسومہ سرسوتی پریس تعمیر فرمادیا اور ان کے افتتاح میں ہزارہا روپے صرف کرکے آٹھ روز تک بلاتخصیص قومی سب کی دعوت دی اور عمدہ ترین کھانے تقسیم فرمائے یہ سیٹھ جی بڑے منکسر المزاج ہیں۔

مہاتما بجے دھرما سوری کے گرو مہاتما بدھی چند بہت بڑے خدا پرست تھے انہوں نے مہاتما بجے دھرما کو جب اپنا فیض باطن بخشا ہے تو مہاتما بجے دھرما شباب کے عالم میں تھے اور مولچند نام تھا جو والدین نے رکھا تھا۔ یہ ذکر سنہ ۱۸۶۶ء کا ہے جب مولچند بمقام مہوا ملک کاٹھیاواڑ میں پیدا ہوئے تھے اور مہاتما بدھی چند کی فیض رسانی کے بعد مہاتما بجے دھرما کے نام سے شہرت پائی۔

ہمیں اس ذکر کی ضرورت یوں پڑی کہ ان مہاتما گرو کی زبان سے وہ اشلوک مہاتما بجے دھرما کے گوش زد ہوا تھا وہ اشلوک یہ ہے۔

मृत्यो बिभेषि किं मूठ भीतं मुञ्चति नो यमः
अजातं नैव गृह्णाति कुरु यत्नमजन्मनि॥

ترجمہ۔ اے نادان موت سے کیوں ڈرتا ہے۔ عزرائیل خوف زدہ کو نہیں چھوڑتا۔ جو پیدا نہیں ان کو کبھی پا نہیں سکتا۔ یہ کوشش کر پیدا نہ ہو۔

بہت کچھ تفصیل اور بڑی تفسیر درکار ہے جب یہ سمجھ میں آویگا کہ وہ کون سی کوشش ہے کہ جس سے انسان پھر پیدا نہ ہو۔ ہم اس موقع پر قبل ازیں کہ تصوف کے پرتو پر چلیں یہ مناسب سمجھتے ہیں کہ ہندو عقائد کا اور جین عقائد کا خفیف سا ذکر کردیں اس سے سمجھنے میں آسانی ہوگی۔ دراصل اہل ہنود سے جین علیحدہ نہیں ہیں صرف اتنا ہی فرق ہے کہ جین مت نے اپنا اصول منجملہ دیگر اصولات کے ایک یہ رکھا ہے کہ اہنسا پرمو دھرما अहिमसा पर्मो धर्मा جس کے معنی یہ ہیں کہ اہم تر دہرم یہ ہے کہ کسی کی جان مت لو اور یہ بید کی شرتی ہے جس کے سناتن دھرم والے اور جین دونوں پابند ہیں مگر تھوڑا اختلاف سمجھ بوجھ نے ڈال دیا ہے۔ سناتن دھرم والوں کا یہ قول ہے کہ

ع

بناجیوجیو سے نہیں جیوجیوا دھا یعنی بغیر جان کے جان دار نہیں اور جاندار جاندار کی غذا ہے۔ اس مسئلہ میں صرف اسی قدر پھیر ہے کہ "اہمسا" متعدی و لازمی دونوں معنوں میں مستعمل کیا جاتا ہے یعنی کسی جاندار کو جان کر مارنا اور کسی جاندار کا بلا ارادہ مارنا۔ جین مذہب نے شدت کے ساتھ اس کو اختیار کیا ہے اور سناتن دھرم والے یہ اعتراض کرتے ہیں کہ "اہمسا" اُن کے اختیار سے باہر ہے مثلاً ہزارہا جانوں کا بلا جانے بوجھے روزمرہ پاؤں تلے کچل کچل کر مرنا۔ لیکن ایک فارسی کا قول محض آگاہ کُن ہے اور جین مذہب کے موافق ہے کہ ؎ آہستہ خرام بلکہ مخرام ؛؛ زیر قدمت ہزار جانند۔ قیامت کو تین قسموں پر عقلائے ہند نے تقسیم کیا ہے اول نت پرلے یعنی جو ہر وقت واقع ہوتی رہتی ہے اور وہ یہ ہے جیسے کہ حشرات الارض ادہر پیدا ہوئے اُدھر مر گئے جس کا کسی کو غم نہیں ہوتا۔ اگر مچھر کاٹتا ہے تو زور سے ہاتھ مار کر اُسے مار ڈالتے ہیں پس وہ مچھر ہست سے نیست ہو جاتا ہے۔ دوم پرلے یہ وہ قیامت ہے جو جسم انسان پر واقع ہوتی ہے کہ وہ ایک میعاد معینہ کو ختم کر کے جسم کو چھوڑ جاتا ہے۔ سوم مہا پرلے اور یہ قیامت عظمےٰ ہے کہ سارا جہان یکبارگی نیست و نابود ہو جاویگا۔

مگر ہم اس تمام مباحثہ کے بعد اس قدر کہنے کی جرأت کرتے ہیں کہ "اہمسا" سے یہی مقصد ہے کہ تم کسی کی جان مت لو اور یہ بالکل سیدھی بات ہے جس میں کسی دلیل کی حاجت نہیں ہے۔

اس قدر درمیانی بحث کے بعد ہم پھر شلوک کے مطلب پر آتے ہیں اس میں سمجھنے کے لایق یہ جملہ ہے کہ "یہ کوشش کر کہ پھر پیدا نہ ہو۔" یہ تو ظاہر ہے کہ پیدایش کوئی امر اختیاری نہیں ہے پس بادی النظر میں یہ ناممکن نظر آتا ہے کہ پیدا نہ ہو۔ خلاف اسکے مولانا روم نے تو یہ بھی فرما دیا ہے کہ ؎

هفت صد هفتاد قالب دیده ام ؛؛ همچو سبزه بارها روئیده ام

اس مسئلہ کو تھوڑا بہت تناسخ سے میل جول ہے مگر ہم کو تناسخ سے بحث نہیں ہے لیکن ضرور جانتے ہیں کہ اعمال کا پھل ضرور ملتا ہے اور ملیگا۔ ایک جملہ معترضہ یہ بھی اس موقعہ پر لکھ دینے کے لائق ہے کہ جب ہم کسی کو بُرا کہتے ہیں اور اس کو کسی ایسی شئے یا جاندار سے مشابہ کہتے ہیں جو اس میں فی الواقع نہیں ہو سکتے تو مقصود اُس سے صرف یہ ہوتا ہے کہ وہ شخص ایسا بُرا کام کرتا ہے جس کی صفت اُس شئے

یا اُس جانور میں پائی جاتی ہے۔ مثلاً ہمارا کسی سے یہ کہنا کہ تو گدھا ہے۔ یہ معنی رکھتا ہے کہ جس طرح سے گدھا بے تمیز جانور ہے ایسی ہی بے تمیزی اس شخص میں موجود ہے ورنہ یہ ظاہر ہے کہ وہ گدھا فی الحقیقت نہیں ہے۔ اس تمثیل کے بعد اس قدر ذکر اور بھی کردوں کہ از روے عقائد سناتن دھرم ایک انسان اچھے اعمالوں کی بدولت نو درجے جب خوبی کے ساتھ طے کرلیتا ہے تو وہ دسویں درجہ پر ایسے مقام پر پہونچ جاتا ہے جہاں سے پھر اس دنیا کو واپس نہیں کرتا اور وہ مقام مُکت کا ہے۔ وہ مدارج حسب ذیل ہیں اول بچار۔ دوم بیراگ۔ سوم سہم۔ چہارم دمن۔ پنجم اوپرتی۔ ششم ترنکشا۔ ہفتم سردھا۔ ہشتم سمادھان نہم موکمشو۔ دہم مکش۔

پس اس اشلوک کے فرمانے سے اس خدا پرست گرو کا یہ مطلب تھا کہ ان سب مدارج کو اعمال حسنہ کے ساتھ طے کرو تاکہ لوٹ کر آنا نہو۔

ان دس مدارج کا تفصیلی ذکر تو ایک پوری کتاب چاہتا ہے لہذا متروک کیا جاتا ہے لیکن رفع حجت کے واسطے اس قدر کہہ دینا کافی ہے کہ عقلائے اہل ہنود نے تناسخ کو ان مدارج پر بلحاظ اعمال تقسیم کیا ہے اور یہ ظاہر ہے کہ ان نو مدارج کے طے کرنے کے بعد تناسخ کی ہوا بھی نہیں لگ سکتی یہ حسن اعمال ہے جس کی بدولت ایک روح خدا سے جا ملے گی۔ حافظ شیراز فرماتے ہیں ع وصال اُو ز عمر جاوداں بہ۔ اور جو اہل دل ایسے خدا رسیدہ ہوں تو فی الحقیقت یہ مقولہ اُن کے حسب حال ہے کہ موت سے کیا ڈرنا۔ اس اشلوک میں ڈر کے مٹانے کے واسطے یہ دلیل بڑی معقول دی ہوئی ہے کہ (یم) حضرت عزرائیل تو ڈرنے والوں کو بھی موت کے ہاتھ سے نجات نہ دیں گے پھر ڈر کر کوئی کیا کریگا۔ اگر موت سے ایسے ہی ڈرنے لگیں تو وقت ضرورت میدانِ کارزار میں کاہیکو کوئی قدم رکھے گا اور اگر موت ہی کی چڑھ بنے گی تو وہ کاہیکو کسی کو زندہ چھوڑے گی۔ حضرت عزرائیل کے ہاتھ میں کسی کی موت نہیں ہے۔ وہ محتاج آفریدگار کے حکم کے بالیقین ہیں ہاں یہ وہ ضرور جانتے ہیں کہ جان کیوں کر نکالی جاتی ہے اور یہ وہ اس وجہ سے جانتے ہیں کہ یہ خدمت اُن کے سپرد ہے۔

یہ خدا پرست گرو (بدھی چندجی) بھاؤ نگر میں رہتے تھے اور بجے دھرم از مول چند م

جن کی عمر اُس وقت صرف اُنیس ۱۹ سال کی تھی ساری دُنیا سے مُونہہ موڑ کر ان کی خدمت میں فیض یابی کی غرض سے حاضر ہوئے تھے۔ گرو صاحب نے اشلوک مذکورہ کے ساتھ یہ نصائح بھی اُن کو دئے تھے۔

"اُن تعلّقات کو ترک کرنا لازم ہے جس سے انسان پھر کر پیدا ہو"۔

"خواہشِ دُنیا وہ بری بلا ہے کہ انسان کو دُنیا میں لوٹ آنے کی ترغیب دیتی ہے اور وہ خواہش اُن چیزوں کی ہے جو دُنیا میں عیش و عشرت کے واسطے میسّر آتی ہیں"۔

"جو شخص دُنیائے ناپائدار کی آرزو رکھتا ہے اور جس نے اپنی تمام عمر اس حصول میں صرف کی ہے وہ اُسی آرزو کو لیکر آویگا۔ اور جو چیزیں کہ اس شخص کو اپنا فریفتہ اور مبتلا رکھتی ہیں وہ اس کو پھر اسی دُنیا میں کھینچ لاویں گی۔ اور یہ صرف خواہش ہے جو آدمی کو بار دگر دنیا میں آنے کو مجبور کرتی ہے اور جب دل سے یہ خواہش مٹ جاویگی تو بارِ دگر آنے سے روح کو چھٹکارا مل جاویگا"

اہل تصوف اس کے قائل ضرور ہیں کہ انسان محو خدا ہو سکتا ہے اور اسی اصول پر اس اشلوک میں یہ امر موجود ہے کہ یہ کوشش کر کے پھر پیدا نہ ہو۔

رست و خیز کے لحاظ سے مولانا روم فرماتے ہیں ؏ چو میرد مبتلا میرد چو خیزد مبتلا خیزد۔

اس تمام مضمون کا ماحصل یہ ہے کہ جب انسان اپنے اعمال حسنہ کے بدولت وہ رُتبہ حاصل کر سکتا ہے جو محو بالذات ہے "تو موت سے کیا ڈرنا"۔

مضمون کے خاتمہ پر اس قدر اور بھی ذکر کردوں کہ مہاتما بجے دہرماجی کا پرلوک پارسال بھادوں سمت ۱۹۷۹ میں بمقام شیوپوری ریاست گوالیار میں ہوا اور انکا مندر بھی وہیں بنایا گیا اور اُن کی مورت یکم فردری سنہ ۱۹۲۳ء بڑے بھاری جلسہ کے ساتھ اس میں قائم کی گئی۔ اب اُن بزرگ کے جانشین مہاتما بجے اندرا سوری ہیں اور آج کل آگرہ میں بمقام بیلن گنج لائبریری میں تشریف فرما ہیں۔ میں خود ان سے ملا ہوں عجب بے نفس مہاتما ہیں انہیں علم کے پھیلانے کا بیحد شوق ہے۔ فقط۔

راقم مرزا عرفان علی بیگ آئی۔ ایس۔ او (از آگرہ)

سلطان محمود

سلطان محمود غزنوی

تمہید یہ بادشاہ ہندوستان کا نہ تھا گو غزنیں اس کے زمانہ میں ہند کا ایک صوبہ شمار ہو گیا تھا۔ ہم اس کے صرف اُن حملوں میں سے بعض کا ذکر کردینا منظور ہے جن میں معرکہ آرائی کے بازار گرم تھے اور تخت و تاراج سے مُلک ہند کی حالت اولٹ پلٹ ہوتی تھی۔ اِس بادشا کے حملے ملک گیری کی نظر سے مخصوص نہ تھے پس کوئی ملکی حدود تغیر پذیر نہیں ہوئے اور ہندوستان اور اُس کے ممالک جیسے تھے ویسے ہی بنے رہے۔ تمام تاریخ کی ورق گردانی سے یہ پایا جاتا ہے کہ سلطان محمود کی خاصکر نیت تبلیغ اسلام کی بزورِ شمشیر تھی اور لوٹ مار اور قتل و غارت گری و آتش زنی اسکے مغلوب الغضبی ہونے کے پھل تھے۔ یہ بادشاہ تعصب سے بھرا تھا اور اُس نے خود اپنے آپ کو بت شکن مشہور کرنا افضل ترین نمود کا باعث سمجھ لیا تھا۔

پیدایش اس کی پیدایش سنہ ہجری کے ۳۵۷ سال میں زابلستان کی ایک خاتون سے ہوئی تھی اور وہ شبِ عاشورہ تھی یہ اتفاق کی بات ہے کہ اس کے باپ امیر ناصرالدین سبکتگین نے اُسی شب کو یہ خواب دیکھا تھا کہ اس کے گھر کے آتشدان سے ایک درخت نکلا اور اِتنا بڑا ہو گیا کہ لوگ اُس کے سایہ تلے آرام کرتے ہیں۔ امیر ناصرالدین سبکتگین اس اپنے خواب پر غور کر رہا تھا اور معبّروں سے تعبیر پوچھ رہا تھا کہ علے الصباح یہ خبر گھر سے پہونچی کہ محلِ شاہی میں لڑکا تولد ہوا۔ چونکہ وہ ساعت اور تولد کا وقت مبارک و مسعود تھا بادشاہ نے نیک فالی کی بنا پر اسکا نام محمود رکھا۔ یہ امر قابلِ لحاظ ہے کہ آتشدان سے درخت کی پیدایش حیرت افزا ضرور ہے۔ لیکن محمود کا مزاج جو اس کی تمام سوانح عمری سے پایا جاتا ہے ضروری آتشی ہی پایا جاتا ہے کیونکہ وہ غضب سے بھرا ہوا جابجا ثابت ہوا ہے پس ایسے پرغضب کو پوری مناسبت آتشدان سے ہوئی ہے جہاں اُس نے

شل درخت کے نمو کیا تھا۔ یہ بادشاہ بڑا جفاکش تھا اور ایک دن بھی قرار سے نہیں بیٹھتا تھا۔

مزاج وطبیعت خواب کی تعبیری حالت خود ہی اس کی شاہد ہے کہ محمود سیماب طبع تھا اُس کو قرار نہ تھا اور حرارت سے جبکہ بھرا ہوا تھا تو سکون وقرار کیوں کر ہو سکتا تھا۔ اور زمانہ حکومت کے واقعات یہ کہے دیتے ہیں کہ یہ بادشاہ بڑا حریص الطبع تھا اور گو ممسک اور بخیل کہنا اُس کے حق میں ناروا ہوگا کیوں کہ اُس نے جہاں مال و دولت بے قیاس جمع کیا تھا وہاں وہ علما۔ فضلا۔ شعرا۔ اور وظائف اور انعامات میں صرف بھی کرتا تھا لیکن یہ اخراجات کوئی بھاری پیمانہ پر نہ تھے چنانچہ وظائف میں چار لاکھ دینار کا سالانہ صرف بمقابلہ اُس کی فتوحات کے ضرور حقیر سمجھا جاتا ہے۔ ہاں لشکر اور فوج کی فراہمی میں صرف کثیر کرتا تھا۔ پھر بھی یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ غارت گری کا مال تھا جو بیدردی کے ساتھ فوج میں اور لشکر میں تقسیم ہوا کرتا تھا۔ مولف تاریخ فرشتہ اس کی حمایت میں لکھتا ہے کہ وہ بخیل نہ تھا مگر یہ شعر تو حسب حال اس کے تھے ہ نہ بود ش بہ فضلِ سخاوت شرف نگہ داشتے دُر بسان صدف ؛ خزائن بسے داشت پر از گہر ؛ ولے زاں نشد مفلسے بہرہ ور

چونکہ سخاوت کا اظہار اُس وقت بالیقین ہوتا ہے جب کہ مفلسوں کی دستگیری ہو اور ایسی مثالیں سلطان محمود کے زمانہ میں پائی نہیں جاتیں لہذا اسے سخاوت کی صفت سے بے بہرہ کہنا بے جا نہیں ہے۔ فردوسی نے بھی ایک قطعہ میں اس دادودہش پر قدرے اعتراض کیا ہے وہ قطعہ یہ ہے۔ خجستہ درگہِ محمود زابلی دریاست ؛ کدام دریا کہ آنرا کنارہ پیدا نیست

شدم بہ دریا و غوطہ زدم ندیدم دُر ؛ گناہ بخت من است و گناہ دریا نیست

شکل وصورت سلطان محمود کی نہ صورت اچھی تھی نہ شکل اچھی تھی یعنی نہ حُسن تھا نہ جمال۔ چنانچہ ایک دن ایسا اتفاق پڑا کہ یہ اپنی صورت آئینہ میں دیکھ دیکھ کر افسوس کر رہا تھا اور کہتا تھا کہ میں بدصورت ہوں اور جب خود بینی سے فرصت پائی تو اپنے مصاحبوں میں جاکر ذکر کیا کہ جب رعایا بادشاہ کی صورت دیکھتی ہے تو اُس سے مبارک فال لیتی ہے اور مسرت کا اظہار کرتی ہے اور لوگ دُور دُور سے بادشاہ کے دیکھنے کو آتے ہیں مگر ہماری صورت دیکھ کر لوگ بیزار ہوتے ہیں اور دُور دُور نفرت

کرکے بھاگتے ہیں۔ عُلما، حاضرین جلسہ نے تسکین خاطر اس طرح جواب دیکر فرمائی کہ اگر اچھی سیرت اختیار فرمائیے گا۔ تو ساری دُنیا کے عزیز بنجائیے گا۔ سنا جاتا ہے کہ محمود نے اُس دن سے اُس نصیحت پر بہت بڑا عمل کیا اور نیک سیرت اور خوش خصلت ہونے کی ہمیشہ کوشش کی۔ محمود میانہ قد اور خوش اندام تھا اگرچہ چیچک رو تھا اور خوبرو نہ تھا۔

تربیت وتعلیم امیر ناصرالدین سبکتگین نے کوئی دقیقہ محمود کو اعلےٰ درجہ کی تعلیم دینے میں باقی نہیں رکھا تھا اور علاوہ دینیات کے وہ تعلیم جو بادشاہوں کو رعایا پروری۔ عدل گستری اور ملک گیری کی تدابیر وصلح وجنگ کے متعلق لازم ہے اعلےٰ پیمانہ پر دی تھی۔ شجاعت ودلیری اور خوش نصیبی کو تو یہ ماں کے پیٹ سے لیکر آیا تھا اس کی شان میں قبل از تخت نشینی یہ خیال موزوں ہو چکا تھا کہ ؎ ہمش ہوش دل بود وہم زور دست ٭ بدیں ہر دو بر تخت باید نشست۔ ایام جوانی میں بطفیل حمایت پدر اُس نے غزنین میں ایک باغ وسیع اور ایک مکان پر تکلف بنایا تھا اور ایک دن اس میں بڑا جشن کیا تھا لوگوں کو دعوت دی تھی اس وقت امیر ناصرالدین سبکتگین نے یہ نصیحت کی تھی کہ "اے فرزند ایں باغ وعمارت بسے مطبوع ومقبول آمد اما ہر یکے از ملازمان ایں سلسلہ بریں نوع باغے مے توانند ساخت لائق بحال سلاطین آنست کہ بعمارت منزلے ونزہت گاہے پردازند کہ دیگراں از تعمیر مثل آں عاجز آیند...... آں تعمیر دلہائے اہل فضل وعلم است پس نہال احسان در زمین دل ایشاں نشاں وثمر سعادت جاوید بچیں"

اب تو غزنیں میں نہ وہ باغ ہے نہ وہ مکان ہے۔ **نظم**۔ بسا کاخے کہ محمودش بنا کرد ٭ کہ از رفعت تفاخر بر سما کرد ٭ نہ بینی زاں ہمہ یک خشت برجا ٭ بنائے عنصری ماندست بر پا ٭

سنہ جلوس ۹۹۷ء یہ ۳۸۷ھ ہجری تھا جب کہ چھپن برس کی عمر پاکر امیر ناصرالدین سبکتگین نے علاقہ بلخ میں رحلت کی مگر غزنیں میں اسکی نعش دفن ہوئی۔ اُس وقت محمود نیشاپور میں تھا اور سیف الدولہ کے نام سے مشہور تھا چونکہ اس کا چھوٹا بھائی امیر اسمٰعیل پہلے ولیعہد ہو چکا تھا پس سلطنت کی باگ اس کے ہاتھ آئی مگر سلطان محمود نے امیر اسمٰعیل کو لکھا کہ مجھے غزنیں میں سریر آرا ہونے دو

کیوں کہ انصاف کا صوابدید اسی میں ہے اور شرعاً یہ تقسیم جائز ہے۔ بلخ اور خراسان تم لے لو۔ مگر امیر اسمٰعیل نے نہ مانا نوبت لڑائی کی پہونچی بالآخر محمود نے اُسے شکست دی۔ گرفتار کیا اور ایک قلعہ میں قید کردیا اور خود تاج شاہی سر پر رکھکر غزنیں میں جلوس کیا۔

اقبال مندی محمود غزنوی کی قسمت خدا نے زبردست بنائی تھی یہ اس قدر اقبال مند تھا کہ سارے کام اس کے حسب مراد ہوتے تھے۔ جس طرف رُخ کرتا تھا فتحیاب ہوتا تھا۔ سب سے پہلے جو اس کی قسمت نے یاوری کی وہ یہ تھی کہ سال جلوس میں ہی ایک کان خالص سونے کی سیستان میں نکلی یہ کان بصورت ایک درخت کے تھی جس کا دوران تین گز کا تھا۔ یہ کان سلطان مسعود کے زمانہ میں ایک زلزلے کے آنے پر ناپدید ہوگئی۔ یہ وہی سیستان ہے جہاں کا رستم پہلوان شہرۂ آفاق ہے اور فردوسی نے شاہنامہ میں اس کی نسبت صاف لکھا ہے کہ ؎ منش ساختم رستم داستاں ٭ وگرنہ یلے بود درسیستاں۔ اس بادشاہ نے اپنے زمانہ حکومت کے شروع میں ایک نئی بات جو کسی بادشاہ سابق کے وقت میں نہیں ہوئی تھی یہ کی کہ بیش بہا تحائف خلوص نیت کے ساتھ خلیفہ بغداد القادر باللہ عباسی کی خدمت میں روانہ کئے اور معاوضہ میں ایک گراں مایہ خلعت اور خطاب امین الملۃ یمین الدولہ کا حاصل کیا اس سے قبل کبھی کسی خلیفہ نے ایسا اعزاز شاہی کسی والیٔ ملک کو نہیں بخشا تھا۔ اس نے پہلے پہل اپنا خطاب سلطان رکھا کسی اور بادشاہ نے اس سے قبل یہ خطاب اختیار نہیں کیا تھا۔

حملہ آوری بہ ہندوستان جیساکہ ہم تمہید مضمون ہذا میں بیان کر آئے ہیں ہم بعض ان حملوں کا ذکر اس بادشاہ کے کریں گے جو خاص ہندوستان سے تعلق رکھتے ہیں ورنہ ترکستان۔ ماوراءالنہر۔ خراسان۔ خوارزم ہرات۔ بلخ وغیرہ سب مقامات پر اس کے حملے ہوتے رہے ہیں اور سب کے سب اس کے زیرِ فرمان رہے ہیں۔ اگر اس کی تاریخ پوری دیکھی جاوے تو کوئی سال ایسا خالی نہیں ہے کہ جس میں اس کا لشکر رواں دواں نہ رہا ہو۔ ہندوستان میں اس کے حملے تبلیغ اسلام اور کسب غنیمت پر ہمیشہ موقوف رہے ہیں اور اکثر شرک اور بت پرستی کا استیصال مدنظر رہا ہے۔ اس کے

زمانے میں مخبری پر عمل زیادہ تھا۔

سنہ ۳۹۱-۹۲ ہجری مطابق سنہ ۱۰۲۴ء | میں سلطان محمود غزنوی نے ہندوستان پر عزمیت کی اور پشاور آپہونچا راجہ جیپال سے جو پنجاب کا حکمراں تھا جنگ کی تیاریاں کیں اور سنہ ۳۹۲ ہجری میں راجہ جیپال سے لڑائی ہوئی اور راجہ گرفتار ہوا اس جنگ میں پانچ ہزار اس کے سپاہی قتل ہوئے۔ اور سولہ ہزار گرفتار ہوئے لیکن بے انتہا روپیہ لیکر اور نیز جب راجہ جیپال نے باج گزاری اور اطاعت قبول کرلی تو اُس کو اور اور قیدیوں کو رہائی دی گئی۔ لیکن یہ شکست راجہ جیپال کو ایسی شرمناک نظر آئی کہ اُس نے اپنے لڑکے انند پال کو گدی نشین کیا اور خود آگ میں جل کر راہی ملک عدم ہوا۔ محمود حسب معمول بعد فتحیابی کے اپنے وطن غزنین کو لوٹ گیا۔

سنہ ۳۹۲ ہجری میں محمود نے پھر ہندوستان پر حملہ آوری کی اور اس دفعہ انند پال راجہ لاہور نے بڑی فوج جمع کرلی تھی اور راجگان اوجین۔ گوالیار۔ کالنجر۔ قنوج۔ دہلی اور اجمیر نے اپنی اپنی فوجیں راجہ انندپال کی امداد کو بھیجی تھیں۔ یہ معرکہ آرائی بڑی زبردست تھی اور چالیس روز تک برابر طرفین سے جنگ ہوتی رہی مگر فیصلہ کُن جنگ کوئی بھی نہ ہوئی۔ کھگروں نے بھی اپنی مدد پہونچائی تھی اور امداد کی انتہا یہاں تک پہونچی تھی کہ عورتوں نے اپنے زیور تک فروخت کردئے تھے اور اپنے شوہروں کو لڑائی میں راجہ انندپال کی مدد دینے پر مجبور کیا تھا۔ سب سے زیادہ ہمدردی وہی خواہی اس امر سے ظاہر ہوتی ہے کہ محتاج عورتوں نے اپنے چرخہ کی کمائی سے بھی اپنا وہ حصہ زر بھیجا تھا جس کی قیمت کا اندازہ زر میں کرنا ناممکنات سے ہے۔ کھگروں نے اس قدر جوانمردی اور جانبازی کی کہ محمود کے لشکر میں گھس پڑے اور صرف اُن کے ہاتھ سے محمود کے چار ہزار مسلمان سپاہی قتل ہوئے تھے۔ لیکن تقدیر کے کھیل تو نرالے ہوا کرتے ہیں اور ان کو ہم اتفاقات پر حوالہ کردیا کرتے ہیں چنانچہ یہ ناگہانی اتفاق عین معرکہ جنگ میں پیش آیا کہ انند پال کا ہاتھی دفعتاً قابو سے باہر ہوگیا اور بگڑ کر ایسا بے تکا بھاگا کہ کہیں دم نہ لیا۔ فوج کا قیاس ایسی جنگ کی گرماگرمی میں اس کے سوا اور کچھ نہ ہوا کہ راجہ نے گریز کی پھر کیا تھا سب کے پاؤں اوکھڑ گئے اور بھاگا بھاگ مچ گئی۔ اس موقعہ پر عبداللہ طائی کو جو

پھر سالار محمود کا

محمود کا سپہ سالار تھا اُن کے تعاقب کرنے کا موقع ہاتھ آیا۔ وہ وہاں تک اُس کے پیچھا گیا اور آٹھ ہزار انسان تہ تیغ کئے تیس ہاتھی گرفتار کئے اور بے شمار مال غنیمت ہاتھ آیا۔ محمود کے اقبال سے یہاں بھی فتحیابی نصیب کی اور وہ غزنیں لوٹ گیا۔

سنہ [illegible] ہجری میں پھر محمود نے نگر کوٹ کی طرف لشکر کشی کی اور جابجا لوٹ مار کرتا بتخانے توڑتا قلعہ بھیم پر جا پہونچا یہ جگہ اہل ہنود کی ازبس متبرک تھی اور بے شمار دولت و تحائف اور زرِ نقد یہاں کے بتخانے میں چڑھائے جاتے تھے اور بھیم سنگھ کے زمانہ سے جس نے بنیاد اس بت خانہ کی ڈالی تھی اس میں سونا چاندی اور جواہرات جمع ہوتے چلے جاتے تھے۔ محمود نے تین روز تک اُس قلعہ کا محاصرہ کیا تھا جس میں کہ یہ بت خانہ تعمیر تھا۔ جہاں تک تاریخ فرشتہ سے مال غنیمت کا پتہ ملتا ہے وہ حسبِ ذیل تھا۔

اشرفیاں .... سات لاکھ جواہرات ہر قسم کے .... بیس من

خالص سونا .... دو سو من اسلحہ طلائی و نقرہ .... سات سو من

خالص چاندی .... دو ہزار من

محمود یہ سارا مالِ غنیمت کا غزنیں لاد کرلے گیا اور وہاں جاکر بیرون شہر ایک نمایش گاہ قائم کی اور مال غنیمت کو تختوں پر رکھ کرا لیا ترتیب دیا کہ سارے لوگ دیکھیں اسی سلسلہ میں تین روز برابر جشن بھی غزنیں میں ہوتا رہا۔

سنہ ۴۰۲ ہجری میں پھر محمود نے ہندوستان پر حملہ کیا اور تھانیسر پہونچکر بت شکنی اختیار کی ہر چند کہ انند پال راجہ نے محمود کی بڑی خوشامد کی اور بہت کچھ نقد سے معاوضہ کرنا چاہا مگر محمود نے کچھ سماعت نہیں کی اور جواب صاف دیا کہ ہم بت فروش نہیں ہیں۔ راجہ انند پال نے اس موقعہ پر بھی راجواڑوں سے مدد مانگی تھی مگر حسنِ اتفاق کہ اُن کی امداد پہونچنے سے پہلے ہی محمود پہونچ گیا تھا۔ اور تھانیسر کو تباہ کر چکا تھا۔ سارے بُت توڑ ڈالے اور بے شمار زر نقد جواہرات اور ہر قسم کا مالِ غنیمت محمود کے ہاتھ آیا اور راجہ انند پال جس قدر دولت کہ معاوضہ بُت شکنی میں دینا چاہتا تھا اُس سے

تنقید صلائے عام

رسالہ ماہ نومبر ۱۹۲۳ء

× × × × × × × × × × × × × × × ×

"صلائے عام" کی آمد میں ریاض نے بڑے مذاق کا یہ شعر لکھا ہے کہ ؎

جب کہہ کے ریاض اُسنے پکارا سر محفل ؛ بن بن کے کئی آدمی اس نام کے اُٹھے

اپنی قدر کس درجہ بڑھائی ہے کہ بایدوشاید۔ ماشاءاللہ "محشر خیال" میں آپ نے یہ غضب کا لطیفہ لکھا ہے کہ "جب انسان مرتے مرتے بچے تو کہتے ہیں کہ خدا کے گھر سے پھرے" یہ کیا اچھا ثبوت اس بات کا دیا ہے کہ "خدا کے گھر سے انسان کو اپنا گھر پیارا ہوتا ہے" اگر ایسا نہ ہوتا تو حج کرتے ہی بیت اللہ سے حجاج اپنے گھروں کو کیوں لوٹتے؟ تقدیر پر عجیب مدلل مضمون زیب قلم فرمایا ہے۔ آخرش تدبیر کو ہرایا اور تقدیر کو جتایا ہے۔ اس بار جیت کے ہم بھی قائل ہیں۔ مصری فاضل نے عالم اسباب سے مباحثہ کرکے تقدیر کا کھوج کھویا ہے لیکن ہم تو نتیجہ پر پہونچکر اسی عقیدے پر جمے ہوے ہیں کہ تقدیر نہیں تو د کیا عالم اسباب تقدیر سے بیگانہ ہو سکتا ہے؟

مضمون پریشان میں یہ فقرہ انمول ہے کہ "زندگی کو موت سے کچھ تعلق نہیں" لیکن میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ موت تو زندگی پر اُدھار کھائے پھرتی ہے اور ڈھونڈ ڈھونڈ کر زندگی کا شکار کرتی ہے جس سے یہ پایا جاتا ہے کہ زندگی بڑی لذیذ چیز ہے۔

اُردو رسالوں کی بھرمار حشرات الارض سے کم نہیں ہے کہ ادھر پیدا ہوے اُدھر مٹ گئے نہ دنیا میں آتے دیر نہ جاتے دیر۔ چونکہ رائے زنی کا میں بھی مستحق ہوں لہٰذا یہ عرض کرونگا کہ اُردو لٹریچر کے رسالوں کے مرکز تمام ہندوستان کے واسطے صرف دو کافی ہیں ایک دہلی اور دوسرا حیدرآباد دکن۔ یہ تو واقعی نازیبا ہے اور فی الحقیقت ہرگز ترقی زبان اور تحصیل حسن اخلاق کے واسطے کافی نہیں ہے کہ جس کے

جی ہی کو

جی میں آوے ایک رسالہ جاری کر دے۔ میرے خیال میں جو اعتراض رسالہ ترقی حیدرآباد۔ دکن نے کئے ہیں وہ سب حق بہ جانب ہیں۔ مناسب حال تو یہ ہوگا کہ جو رسالہ کوئی صاحب جاری فرماویں وہ دہلی یا حیدرآباد کی کمیٹیوں کی رائے پہلے حاصل کریں۔ مجھے اس کا علم نہیں کہ دہلی میں کوئی کمیٹی ترقی زبان اور تعلیم اخلاقِ حمیدہ کے واسطے مثل حیدرآباد دکن کے قایم ہے یا نہیں اگر نہیں ہے تو خان بہادر صاحب آپ ضرور احباب میں تحریک فرماکر قایم فرمائیں۔ جب ایسی کمیٹیاں کسی رسالہ کو منظور کریں تو شایع کیا جاوے ورنہ واقعی وہی حال اَلّم غلّم کا رہے گا۔ جیسا کہ رسالہ ترقی حیدرآباد نے رقم فرمایا ہے اور نہ ہماری زبان قائم رہے گی نہ لٹریچر میں ترقی ہوگی۔ اور علمِ اخلاق تو بہکا بہکا پھریگا۔ زیادہ کیا عرض کروں۔

بشیر الدین احمد صاحب نے اپنی یاد کی کہانی خوب کہی ہے۔ اور سچا اور اچھا نتیجہ نکالا ہے۔ اس سے تعلیم و تربیت کا انکشاف بوجوہ معقول ہوتا ہے۔ اخلاقی کیفیت پوری پرستی ہے ایک اندھا مشعل ہاتھ میں لئے ہوئے مرگ شاہِ وقت کو سمجھاتا ہے کہ ؎ اگر بادشاہ بابو بیدے ؛ مراسیم و زر تا بہ زانو بدے۔

رباعیات شیخ غلام قادر صاحب بالضرور عمر خیام کی رباعیات کے ہم پلہ ہیں۔ منجملہ اُن نایاب رباعیات کے بیم و امید کو ایک زنجیر میں باندھنا ایک رباعی میں عجب خوبی کے ساتھ بیان فرمایا ہے وہ یہ ہے ؎

خود را کچند پاسبانی کردیم ؛ یکچند بخویش سرگرانی کردیم ؛ از بیم و امید پائے در زنجیریم ؛ در پہلوئے مرگ زندگانی کردیم

ناممکن کو ممکن ثابت کرنا موت و زندگی کو مٹھی میں بند کر لینا ہے۔ شیخ صاحب ممدوح نے اچھی زنجیر میں پاؤں اُلجھایا نہ جائے ماندن نہ پائے رفتن۔

مجھے بھی اِس سے اتفاق ہے جیسا کہ آپ نے صلائے عام از روے واقعات و خیالات کے زیرِ پیشانی تحریر فرمایا ہے کہ" ہماری زبان کی زندگی.... اُردو رسالوں پر منحصر ہے" اور ان میں نثر و نظم دونوں میں اہل سخن اپنے اپنے خیالات کو تحریر فرماتے ہیں اور ایسا ہی ہونا چاہئے مگر یہ ضرور لحاظ رکھنا لازم ہے کہ زبان نہ بہکے۔ مضمون ہوں اور اہل زبان کی قلم ہو۔ فقط۔

مرزا عرفان بیگ۔ آئی ایس او۔ آنریری مجسٹریٹ آگرہ

صلائے عام۔ حضرت ریاض کے اس شعر کی تعریف اور ذی کمال لوگوں نے بھی مجھے

لکھی ہے کہ ؎ جب کہیے ریاض الخ

اُردو رسالوں کی نسبت جو رائے صاحب تنقید نے قایم کی اس سے مجھے کیا اکثر اہل الرائے کو اتفاق ہے۔ نئے رسالے نکالنے سے یہ بہتر ہے کہ جو رسالے اس وقت جاری ہیں انہیں کی قدر کی جائے قدر کرنے کی تدبیر یہ ہے کہ اہل قلم نئی جگہ مضامین بھیجنے کے عوض نیازمندانِ قدیم کو یاد رکھیں بلکہ جیسا مضمون ہو اُسی مرتبہ کے رسالہ میں اشاعت کے لئے بھیجیں: مَیں دیکھتا ہوں کہ والیان ریاست اور ذی مرتبہ اہل سخن کے مضامین و کلام ایسے پرچوں میں چھپ جاتے ہیں جو اُن کے مرتبہ کے شایاں نہیں ؛ دوسرے خریدار جہاں تک ہوسکے قدیم رسالوں کی خریداری پسند کریں ؛

جناب گرامی کے فارسی کلام کی تعریف تحصیل حاصل ہے۔ ان کے کلام پر شعرِ فارسی کو جسقدر ناز ہو تھوڑا ہے ؛ جس رباعی کی تعریف اس تنقید میں ہے یہ میں نے حضرت گرامی کی زبان سے اپنے غریب خانہ پر سنی اور اس مصرع پر لوٹ گیا ع در پہلوے مرگ زندگانی کردیم ؛

تقدیر کے متعلق جو صلائے عام میں مضمون تھا وہ دراصل ایک صاحب کے کلام کا نکلا اس کا ذکر صلائے عام کی ڈاک میں ملاحظہ فرمائے ؎

بل بے اندھیر نہیں سوجھتی راہِ قسمت ؛ ہاتھ پکڑے ہوئے تقدیر لئے پھرتی ہے

وائے قسمت نہیں ملتا کوئی پڑھنے والا

زالِ دُنیا خطِ تقدیر لئے پھرتی ہے

"محشرِ خیال" کا ریویو

مخدوم بندہ۔ تسلیم۔ روزِ محشر کُل کائنات کا نشاں تک مٹا کر ہر چیز کو وجود میں لایا جائے گا۔ اور ہر کسی کو طاقتِ گویائی عطا فرمائی جائے گی۔

ایک خود لفظ "محشر" پھر آپ کا قلم اور آپ کا تخیل۔ اگر گنواروں کے ہاتھ میں بھی لاٹھی کی جگہ قلم نہ دے تو آپ کی پیرانہ سحر بیانی کا جادو ہی کیا۔ اربابِ قلم آپ کی زبان پر مرتے ہیں۔ اصحابِ سخن آپ کے انتخابِ اشعار کی موزونیت کی داد دیتے ہیں۔ اور مجھ جیسے "آپ کی زبان اردو" کی برکت سے دور اُفتادہ آپ کے فلسفیانہ نغمات پر وجد میں آتے ہیں۔

مرنے جینے کا سوال فی الواقعہ خلاقِ عالم نے عجیب بنایا ہے۔ عالمِ وجود میں آکر منزلِ فنا تک جانا لازم و ملزوم ہیں۔ مگر پھر بھی حضرت انسان ہیں کہ اسی سوال میں سب سے زیادہ محو ہیں۔ بزرگوں کا قول ہے۔ کہ جو چیز اٹل ہو۔ اس کا فکر و تردد بے کار ہے۔ مگر نہیں۔ موت اٹل بھی ہے: پھر اس کا خیال فراقِ یار کی لذتوں سے خالی نہیں۔ اور اگر اس کو ایسا ہی خیال کرکے چھوڑ دیا جائے تو بس زندگی کا مزا بھی نہ رہے۔

ابتدا اُسی چیز کی پسندِ خاطر ہوتی ہے۔ جس کی کچھ انتہا ہو۔ اور اگر ابتدا و انتہا میں فرق ہی کچھ نہ رہا۔ تو نہ ابتدا کی اُمیدوں میں راحت اور نہ انتہا کی کامیابی میں مسرت۔ اگر بنا کر بگاڑنے اور پھر بگاڑ کر سنوارنے کا شغل نہ ہوتا۔ تو صانعِ حقیقی کے دائرۂ قدرت کی یہ وسعت کہاں ہوتی۔

بچپن میں جوانی کی تمنا رہتی ہے۔ جوانی کی بے فکری اور عشرت سے پیٹ بھرنے نہ پایا کہ بڑی عمر کی عزت و دولت کی خواہش دامنگیر ہوئی۔ وہاں پہونچے تو لگے دروازے کے خیال سے گھبراہٹ شروع ہوئی۔ بھلا یہ کیوں۔ کسی نے کہا تھا۔ کہ ہاتھ پھیلا پھیلا کر لپکے چلے آؤ۔

اگر وہ بس میں نہ تھا۔ تو اس کو بس میں لانیکا فکر کیوں ہو

کیوں نہ لپیٹ کے تجھ سے سوؤں اے قبر۔ میں نے بھی تو جان دیکے پایا ہے تجھے

جوانی میں بچپن کی یاد فضول۔ اور بڑھاپے میں جوانی کا رونا بے کار۔ قدرت نے ہر رنگ میں الگ مزا رکھا ہے۔ وصل بڑی چیز ہے۔ مگر شوق انتظار کے آگے ہیچ۔ لطفِ صحبت کیسا ہی کیوں نہ ہو۔ تصور کا پلہ بھاری رہے گا۔ کامیابی سب کچھ ہے۔ مگر حسرت کی چاشنی کے آگے کچھ نہیں۔ دقت ہے تو صرف یہ جو چیز میسر ہو اُس کی قدر نہیں۔ اور جو نہ ہو۔ وہ بے کل کئے جاتی ہے۔ فراغت میں قناعت یاد آتی ہے۔ بیوی ہو تو تجرد کے مزے یاد آتے ہیں۔ اور نہ ہو تو زندگی بے کار معلوم دیتی ہے۔ سفر میں ہیں تو گھر یاد آتا ہے اور وطن ہو تو سیاحت کا سودا سمایا رہتا ہے۔ اور تو اور پڑھ جائیں اور دماغ کو سوچنے کی لت پڑ جائے تو جہالت بہتر نظر آتی ہے۔ غرض انتظامِ قدرت کی خوبی یہی ہے کہ جس حال میں جو کوئی ہے خوش بھی ہے اور رنجیدہ بھی۔ کہو تو کوئی اور بھی دو متضاد چیزوں کو اس طرح ملا سکتا ہے۔ یہ آنے جانے کا سلسلہ جب تک دُنیا ہے جاری رہے گا۔ بلکہ ہم خاکی تو اس کے ایسے خوگر ہوئے ہیں کہ عالمِ بقا کا مدام رہنا کچھ اپنی طبائع کے خلاف نظر آتا ہے۔ وہاں جا کر اگر یہ فطرت نہ بدلی تو پھر بڑا ہی حسرت کا ساتھ ہوگا

آپ کے قلم سے بڑھاپے کی شکایت انصاف سے بعید ہے۔ ممکن ہے موجودہ زمانے کی تقلید آپ نے کی ہو۔ لفظ جوانی کو میرے جیسے ناواقف مؤنث کہیں گے۔ اور بڑھاپے کو مذکر۔ اس صورت میں جوانی کو فوقیت دینا ضرور تھا۔ ورنہ اگر بڑھاپا بے کار ہے۔ تو جوانی بالکل ہی فضول ہے۔ دماغ کُل اعضا کا سردار ہے۔ بڑی عمر میں ہی اس کی پختگی اپنے جوہر دکھلاتی ہے۔ ضعیفی میں بعض اوقات جسم جواب دے دیتا ہے۔ مگر جوانی میں بھی سب کچھ ہوتے ہوئے اکثر اس سے کچھ کام نہیں نکلتا۔ بوڑھے جرنیل کی سوچ کام نہ دے۔ تو جوان سپاہی معلوم نہیں کیا کر بیٹھے۔ بڑھاپا آقا ہے۔ جوانی اس کی لونڈی۔ اس کا تجربہ ستون ہے۔ جس پر نظام دُنیا قائم ہے۔ بڑھاپے کی بے سروسامانی کا ذمہ دار عالمِ اسباب نہیں بلکہ ہماری ترقی۔ جوانی کا حُسن بے پایاں۔ اس کے انداز

او پھیے۔ شوقِ محبت جو چاہے کہلوائے۔ مگر بڑھاپے کی نقاہت کے آگے بے کار۔ بیشک اس کی اپنی کشش ہے اور خوب ہے۔ مگر یہاں سوال مقابلے کا ہے۔ آپ کی جوانی کا کسی کو علم نہیں مگر آپ کے بڑھاپے نے جہان کو گرویدہ کر رکھا ہے۔ بڑھاپے سے مقصود بڑی عمر ہے۔ نہ کہ عالمِ بے ہوشی۔ جس سے مرنا بہتر ہے۔

میرے آخری الفاظ سے آپ برہم ہوں گے۔ کہ آج کل کے لونڈے ہر بات میں بحث پر اُتر آتے ہیں۔ مگر جس منزل کی طرف بھاگے جا رہے ہیں اس کے شوق نے اُس کی مخالفت گوارا نہ کی۔ آپ کو ہمارا حصہ بھلا معلوم دیتا ہے اور ہمیں آپ کا۔ جب تک نقطۂ خیال ایک نہ ہو۔ فیصلہ مشکل ہے

ہم تو آپ کے بڑھاپے کی خیر مناتے ہیں۔ خدا آپ کو عرصہ تک سلامت رکھے۔

مجھ سے نہ رہا گیا یہ لکھدیا۔ آپ کی مرضی ہے اس کو چھاپیئے یہ نا چھاپیئے۔ کم از کم خود تو ایک دفعہ پڑھ ہی لیں گے۔ بس میرا مطلب حل ہو جائے گا۔ کیا یہ آپ کی محنت کی کچھ کم داد ہے۔ کہ مجھ جیسے بے مشقوں کو بھی لکھنے کی ہمت پڑی۔

نیاز مند کرامت اللہ (اچیسن کالج لاہور) اتالیق نواب صاحب بہادر ریاست پاٹودی

غزل

مولوی بشیر الدین احمد صاحب تعلقہ دار رئیس دہلی

یہ زندگی نہیں ہے فقط اک وبال ہے
جینا تو جینا مرنا بھی امرِ محال ہے

اسکو غرض ہے کیا کہ وہ پوچھے ہمارا حال
یاں کچھ بنی ہے جان پہ واں کچھ خیال ہے

کھلتا نہیں یہ بھید کہ آخر ہے بات کیا
بے وجہ کیوں عتاب ہے اور کیوں ملال ہے

طفلی سدھاری اور جوانی گزر گئی ہوکو
پیری نہیں ہے آمدِ عہدِ زوال ہے

یہ زندگی بہار ہے بس چند روز کی
کیا اعتبار اس کا سریع الزوال ہے

توبہ کا در کھلا ہے گنہگاروں کے لئے
آمرزگار بھی ہے وہ گر ذوالجلال ہے

کیوں حسن کی صفت نہ بشر کو عطا کرے
پیدا کیا ہے جن نے وہ صاحبِ جمال ہے

مجھ کو تباہ کر کے وہ اب پوچھتے ہیں حال
اچھی ڈھٹائی اُن کی ہے اچھا سوال ہے

وعدے کے ساتھ ساتھ مکرنا بھی شرط ہے
یہ دلبروں میں دیکھئے کیسا کمال ہے

جاں تک دریغ آپ سے ہرگز نہیں مجھے
پھر جاؤں اپنی بات سے میری مجال ہے

زاہد نے منع کر دیا پینا شراب کا
گر مفت کی ملے تو سنا ہے حلال ہے

ہو قدر کیوں نہ ایسے سخنور کی ہر جگہ
بے شک بشیر طوطیِ شکر مقال ہے

نیا سال سگِ زرد برادرِ شغال

اے دل غم جہاں مخور ایں نیز بگزرد ؞ گیتی چو ہست بر گزر ایں نیز بگزرد

ع پھر اُس گزشتہ خواب کا ہم کو خیال ہے ؞

کیوں خوابِ خرگوش میں پڑے ہو سُنو تو سہی کہ شبِ گزشتہ کیا تھا اور آج کیا ہے۔ آپ کو شاید خبر نہیں کہ دُنیا نے کروٹ لی۔ پُرانی دُھرانی کیچلی بدل بدلا کر آج نیا لباس زیبِ تن کیا ہے۔ جوانی جا کر نہیں آتی بڑھاپا آ کر نہیں جاتا۔ رباعی

دنیا ہم نے سرائے فانی دیکھی ؞ ہر چیز یہاں کی آنی جانی دیکھی

جو آ کے نہ جائے وہ بڑھاپا دیکھا ؞ جو جا کے نہ آئے وہ جوانی دیکھی

مگر "سال" کا یہ حال ہے کہ ہر سال پیدا ہوتا ہے چار مہینے بچپنا رہتا اور چار مہینے جوانی اور چار مہینے بڑھاپا۔ بس ختم شد۔ مگر بجائے اِس کے کہ فنا ہو جائے اور مٹ جائے پھر پیدا ہوتا ہے پھر جوان ہوتا ہے پھر بوڑھا ہوتا ہے اور یہ دورِ تسلسل ابدالآباد سے چلا آتا ہے اور چلتا رہے گا جب تک کہ خلاقِ عالم دنیا کو فنا کے ہاتھوں نیست و نابود کر دے۔ میرے مالک کی انوکھی چال ہے۔ بناتا بھی ہے بگاڑتا بھی ہے پیدا بھی کرتا ہے اور مٹاتا بھی ہے۔ کُلَّ یَوْمٍ ہُوَ فِیْ شَاْن کے یہی معنی ہیں۔ ہاں تو شبِ گزشتہ اِدھر بارہ کا گجر بجا اُدھر میاں سنہ تئیس ایسے رفو چکر ہوئے جیسے گدھے کے سر سے سینگ۔ اگرچہ وہ ایک دن نہیں یا دو دن نہیں پورے تین سو کے اُوپر پینسٹھ دن ہم میں پاؤں پھیلا کر رہے سہے اور بڑے تسے اور ہم نے بھی اُن کی پوری طرح غلامی کی کہ ع زمانہ با تو نہ سازد تو با زمانہ بساز۔ مگر بھاگتے بھوت کی لنگوٹی کی طرح ایسے چُپ چپاتے سب کچھ چھوڑ چھاڑ بہ یک بینی و دو گوش سر پر پاؤں رکھ کر بے تحاشا نوک دُم بھاگے کہ مڑ کر دیکھا بھی تو نہیں۔ ہم خوابِ غفلت ہی میں پڑے اینڈ رہے تھے کانوں کان خبر نہ ہوئی صبح سویرے جب

جب اُٹھے تو ہر کہ ومہ کی زبان پر یہ تھا کہ "وہ تو گئے ہلے" اب میں آپ ہی سے پوچھتا ہوں کہ کیا شرافت کا مقتضا یہی تھا؟ کیا یہ صریح بے مروتی نہیں ہے۔ ہے اور ضرور ہے اور یہ ہیچ کھسیت ہے۔ یہ طوطا چشمی کچھ انہیں ذات شریف سے مختص نہیں ع ایں خانہ تمام آفتاب است۔ ٹاپا اٹھاؤ تو سارے کنبے کا کنبہ ہی بھونڈا۔ چو دُم بر داشتم مادہ خر برآمد۔ ان کی گھٹی میں یہ بے مروتی اور سفاکی پڑی ہے۔ آج سے نہیں اُنیس سو بائیس برس سے اِن کی یہی طرز و روش چلی آتی ہے کہ تو چل میں آیا۔ طرفہ یہ کہ آپ صفحۂ تاریخ سے فنا ہو جاتے ہیں اور ایسے غائب غلا ہو جاتے ہیں کہ سوائے مرحوم (گزشتہ) کے آپ کا کوئی نام بھی نہیں لیتا مگر اپنے چرکے لوگوں کے دلوں پر ایسے چھوڑ جاتے ہیں کہ جب تک ہمارے دم میں دم ہے بھلائے نہیں بھولتے۔ یہ حضرت جن کو خدا نے ابھی ابھی دفان کیا ہے ہم غریبوں اور گھائلوں سے کیسے رہے۔ بہتر یہ ہے کہ منہ نہ کھلوایئے گو مگو میں معاملہ رہے اور پردہ ڈھکا رہے تو اچھا ہے ؎

خوشتر آں باشد کہ سرِّ دلبراں ✤ گفتہ آید در حدیثِ دیگراں ؎

وہ عہد توڑے کہ دل جن کے ساتھ ٹوٹ گیا ✤ تمہارے وعدے کا اب اعتبار مشکل ہے

ہم اگر دبی زبان سے بھی حرفِ شکایت زبان پر لائیں تو یہ جلتے جلاتے ایک ایسی زبردست دولتی جھاڑیں گے اور چارج دیتے وقت اپنے نوزائیدہ بھائی کے کان میں خدا جانے جھوٹ سچ کیا کچھ پھونک دیں گے کہ ہماری مٹی پلید ہو جائے گی اور ہم تو پہلے ہی اَدھ موئے ہیں رہا سہا دم بھی نکل جائے گا۔ ع مرا از خیرِ تو امید نیست بد مرساں۔ اگر انہوں نے کہیں یہ کہدیا کہ دنیا کے لوگ بڑے بد ہیں ہمارے ساتھ ان کا سلوک اچھا نہیں رہا تو بیٹا ہم تو مارے پڑے۔ لینا ایک نہ دینا دو آنے والے صاحب (جن سے ہم بڑی بڑی اُمیدیں لگائے بیٹھے ہیں) ہم سے خدا واسطے کا بَیر بغض باندھ لیں گے۔ کر تو خدا کے غضب سے ڈر اور نہ کر تو خدا کے غضب سے ڈر۔ ؎ میر صاحب زمانہ نازک ہے ✤ دونوں ہاتھوں سے تھامئے دستار۔ ہم تو ان کے آباؤ اجداد کے گشتہ ہیں بمصداق ہر کہ آمد برآں مزید کرد۔ دودھ کا جلا چھاچھ پھونک پھونک کر پیتا ہے آپ نے سُنا ہوگا کہ مار گزیدہ از ریسمان می ترسد۔ پھونک پھونک کر

ؔ ؎ دل پہ رہیں گی نقش یہ بے مہریاں تری ✤ جانا اور اس طرح سے کہ مُڑ کر نہ دیکھنا۔

قدم رکھنا ہی مقتضائے وقت و احتیاط ہے ؎

بلا کسی کی طرف آئے رُخ اِدھر ہو جائے ؎ نشانہ ہوں گے ہمیں تیر جس کماں سے چلے

زبردست مارے اور رونے نہ دے زبان سے ہم کچھ نہ کہیں مگر ہمارا دل تو اُن کے جانے سے اللہ خوش ہوا "خس کم جہاں پاک" پاپ کٹا۔ ؎

قاضی بہ شہر آمد و گو تو آں بدر رفت ؎ مارا چہ ازیں قصہ کہ گاؤ آمد و خر رفت

اچھا ہوا خدا نے منہ کالا کیا۔ خدا انہیں پھر نہ لائے اور ان کے کرتوت ایسے ہیں کہ انشاء اللہ سو چھوڑ ہزار دے کے کہتا ہوں کہ بس آ چکے۔ حلوہ خوردن را روئے باید۔ چار دن کی چاندنی پھر اندھیرا ہو چکی۔ بس ٹھنڈی ٹھنڈے سواری بڑھایئے سپے۔ لام۔ زبر چل۔ دال واو پیش دو۔ چل دو۔ کوئی اِکّا دُکّا ان کا ہوا خواہ اگر ہو تو ہمارے فرشتوں کو بھی خبر نہیں وہ یہ سُن رکھیں ؎ آتا ہو تو ہاتھ سے نہ دیجے ؛ جاتا ہو تو اُس کا غم نہ کیجے کہ تیر از کمان جستہ باز نمی آید۔ عمر رفتہ بھی کہیں آتی ہے ؎

رویئے پیٹئے چلّایئے کیا ہوتا ہے ؎ وہی ہوتا ہے جو قسمت کا لکھا ہوتا ہے

ارے میاں! جو گیا سو گیا لعنت بھیجو۔ آنے والے کی خیر مناؤ۔ ہاں تو لیل و نہار کا دور دورہ یہ ہے کہ سنہ تیئس نے ادھر اپنا بوریا بدھنا باندھا اور اُدھر کھٹ سے میاں سنہ چوبیس (خدا ان کی دن دونی رات چوگنی ترقی کرے) آدھمکے ؎ جو کام کیا ہم نے وہ رستم سے نہ ہوگا۔ گو وا کوئی اس طرح سے یاں دھم سے نہ ہوگا۔ خدا کی خدائی میں کیا کمی ہے۔ اِدھر کن کہا اُدھر موجود۔ یہ قدرت کے کھیل ہیں۔ کسی گورنر کی پنج سالہ مدت تھوڑی ختم ہوئی ہے کہ نیا گورنر ٹٹولا جائے۔ پہلے چلے گئے آنے والے ابھی آ ہی رہے ہیں یہاں میدان خالی اور لوگ ہیں کہ چشم براہ آمد آمد کے منتظر۔ آج جہاز میں دیر ہو گئی۔ کل ریل لیٹ گئی۔ یہ اُس قوی قدرت کی گورمنٹ ہے جس کا مالو لاتبدیل لخلق اللہ ہے۔ یہاں دیر سویر کا کیا کام ہے۔ ایک گیا دوسرا سر پر سوار ؎ نہ خواہد ایں چمن از سرو و لالہ خالی ماند ؛ یکے ہمیں رود و دیگرے ہمیں آید۔ اُس کے خزانے میں کس بات کی کمی ہے؟ پل مارنے کی ہوئی جو دیری ؛ سبحان اللہ شان تیری ؛

سنہ ۲۳ میں جو گزرا وہ سب دیکھ چکے۔ سنہ ۲۴ نے جو سرزمین دُنیا خاصکر طبقہ ہندوستان

جنّت نشان کے متعلق اپنی رونق افروزی کا فرمان عطوفت نشان اپنی رعایائے وفادار کی اصلاح کے لئے شایع فرمایا ہے اُس کا خلاصہ ملاحظہ فرمائیے۔ خلاصہ اس لئے کہ فرمان بڑا ہے اور سُننے والوں کو فرصت تھوڑی ؛ اسے آپ سُنیں اور شکریہ بجالائیں ؛

مابدولت واقبال نے آج بتاریخ یکم جنوری دُنیا کا چارج اپنے دستِ قدرت میں لیا۔ ہم کو اپنے ماسبق حکمرانوں یعنی گزشتہ سالوں سے ایک خاص فوقیت اور برتری حاصل ہے کہ ہمارا نام نامی چوبیس ہے یعنی چار دانگ عالم یا ربع مسکوں یا چو کھونٹ میں ہمارا سکّہ رواں ہے علاوہ بریں ہم کو یہ بھی ذاتی تفوّق حاصل ہے کہ اپنے پیش روسے دُنیا کے تخت پر ہم (۱۴۴۰) منٹ زیادہ رونق افروز رہیں گے۔ یہ خاص امتیاز ہم کو خداوند عالم مالک دوجہاں کی بیشی سے بطور اعزازِ خاص اور ہم چشموں میں فخر کے لئے سرافراز ہوا ہے یعنی ہم کو یہ مزید توسیع (Extension) پہلے ہی سے ملی ہے جو ہمارے اور ہماری رعایا برایا کے لئے باعث فخر و مباہات ہے (کہو آمین!) (رعایا دبی آواز سے۔ جی آمین) مابدولت کا نام نامی اور اسم گرامی اب تک سالِ کبیسہ یا لَوند کا سال (رعایا کان کھڑے کرکے سُنا کیا کہا خبیثہ۔ ارے توبہ۔ اللہ تیری پناہ۔ دوسرا شخص نہیں بھئی کبیسہ تم نہ پڑھے نہ لکھے نام محمّد فاضل۔ اچھا بھلا یہ لَوند کیا؟ دوسرا۔ ہاں بھئی یہ تو ہم بھی نہیں جانتے یہاں ہماری عقل بھی چہ کُنم میں ہے۔ ہم جانیں کوئی اُنگریزی لفظ ہوگا) رہا ہے لیکن آج ہم بہ یادگار ہماری تخت نشینی کے اپنا نام لیپ یئر (Leap year) رکھتے ہیں جس کے لفظی معنی کودنے والا سال ہیں۔ (خوشی کے نعرے) اور یہ نیک تفاول ہے یعنی اُچھل کود۔ فرحت و انبساط اور چہل پہل کا سال۔ (سبحان اللہ کیا پیارا نام ہے۔ ارے یارو پھر تو مزے ہیں ہم اس مدّتِ سلطنت میں اُچھلتے کودتے اور مگن رہیں گے۔ خدا ہی کو کنا د۔ مابدولت اپنے پیش رووں کی پالیسی پر سختی سے قایم رہیں گے سرِمو فرق نہ ہوگا (ہاں یہ تو ہم کو پہلے ہی سے معلوم ہے) ہمارے اصولِ موضوعہ یہ ہیں:۔

دن کے بعد رات آئے گی اور رات کے بعد دن (بھئی واہ کیا عجیب بات کہی ہے)۔ ع ایں کار از تو آید و مرداں چنیں کنند۔ سورج اپنے اوقات مقررہ پر نکلے گا اور غروب بھی ہوگا۔ چاند حسبِ معمول چمکے گا اور چھپے

[illegible]

گا بھی (تو اس میں آپ کی کیا کارگزاری ؟ تو ہمارے باوا دادا کے وقت سے ہوتا چلا آیا ہے) جاڑا گرمی۔ برسات حسب معمول ہوں گے (ذرا برسات کے معاملے کو صاف کر دیجئے یہ گمگم کی بات ٹھیک نہیں کہ اس پہ ہماری زندگی کا انحصار ہے۔ رہا جاڑا اور گرمی سنگ آمد وسخت آمد وہ تو ہم چار و ناچار جھیل ہی لیں گے) لوگ پیدا بھی ہوں گے اور مریں گے بھی۔ (سچ کہو) یہ تو ہم پہلے ہی کہہ چکے کہ ہماری پالیسی انتظام کے متعلق ویسی ہی عطوفت آگیں رہے گی جیسی کہ چاہئے لیکن ہم اپنے ماسبق حکمرانوں کی سورج گہن کی پالیسی کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ کیوں کہ آفتاب عالم تاب کا منہ کالا کرنا اور زمین جیسی چھوٹی سی چیز کا اسے تیرہ و تار کر دینا بڑی گستاخی ہے جو دھری جائے نہ اٹھائی جائے۔ چھوٹا منہ بڑی بات۔ کدھر آفتاب کی عظمت کدھر زمین ع چہ نسبت خاک را با عالم پاک۔ زمین کی یہ دست درازی نہایت شرمناک ہے لہذا امسال کوئی سورج گہن نہ ہوگا۔ مگر ایک دم سے اس قاعدۂ مستمرہ کو بند کر دینا ایک غور طلب اور اہم مسئلہ ابد دولت کے زیر غور ہے لہذا اس دست امسال ایک نہیں دو مرتبہ چاند گہن ہوگا اور قسم بخدا ضرور ہوگا۔ میں نے تم لوگوں کو اس کی صحیح صحیح تاریخ بھی بتلا دی ہے اور تم کو زیادہ انتظار کی زحمت نہیں دینا چاہتا وہ ۲۰ر فروری اور ۱۴ر اگست کو ہوگا۔ میرے قول کی تصدیق تم خود مشاہدے سے کر لو گے اور یہ پہلے سے بتلا دینا تم کو تسلیم کرنا پڑے گا کہ میرا معجزہ ہے کہ غیب کی بات میں اس وثوق سے کہہ رہا ہوں۔ میرا دور حکومت ۳۱ر دسمبر کو یقیناً ختم ہو جائے گا اور میرے لئے باعث مسرت ہوگا اگر میں تم کو سال گزشتہ سے بہتر حالت میں چھوڑ جاؤں اور اسی طرح تمہارے گزشتہ سے آئندہ سال بہتری ہوتا رہے۔ تمہاری خوشی عین ہماری خوشی ہے تمہاری فارغ البالی میں عین ہماری مرفہ الحالی ہے مجھکو گورے اور کالے چہرے میں کچھ فرق نہیں یورپین اور نیٹو دونوں میرے لئے برابر ہیں اور دونوں میری دو آنکھیں ہیں ؎ کالے گورے پہ کچھ نہیں موقوف ❊ دل لگانے کا اور ہی ڈھب ہے۔ یاد رکھو کہ شادی نہیں رہتی ہے سدا غم نہیں رہتا ❊ دنیا کا کبھی ایک سا عالم نہیں رہتا ❊ مجھ کو یہ فخر حاصل ہے کہ برٹش گورنمنٹ کا سایہ ہمارے سروں پر ہے میں تم کو نہایت زور سے اپنے دیرینہ تجربہ کی بنا پر کہتا ہوں کہ تم نیک طبع فرماں بردار مطیع و منقاد رعایا بنو اور بادشاہ وقت کے حق میں دعائے خیر کرو۔ تم تو دنیا میں مدتہائے دراز تک رہو گے۔ اور خدا تم کو...

[illegible]

صلائے عام کی ڈاک

× × × × × × × × × × × × × × ×

"آپ کی دفعہ صلائے عام میں نے خوب پڑھا۔ آپ کا مضمون تقدیر کے بارے میں بلکہ یوں کہنا چاہیئے آپ کی رائے تقدیر کے بارے میں بالکل درست ہے" × × ×

× × × × × × × × × × × × × × ×

(صاحب تحریر کو ایک مشکل کام آپڑا جو محض تقدیر پر بھروسہ کرنے سے حل ہوگیا۔ لکھتے ہیں)

"دیکھئے تقدیر ہی کام آئی نہ کہ تدبیر" × × × × × × × × × ×

× × × × × × × "آپ کے رسالہ میں میری سمجھ میں جو شعر آیا اور جس کو پڑھ کر میں پھڑک اٹھا وہ ریاض کا یہ شعر ہے ؎

جب کہہ کے ریاض اس نے پکارا سر محفل ؛ بن بن کے کئی آدمی اس نام کے اٹھے

واقعی خوب سوجھی۔ اور خوب کہا۔

صلائے عام۔ یہ خلاصہ ایک نہایت پاکیزہ مزاج شریف طبیعت شخص کی تحریر کا ہے جو اقبالمندی کے ساتھ علمی لیاقت میں صاحب کمال ہے ؛

یہاں میں اس سے پہلے جناب شمشیر بہادر اخگر کی تحریر کا ذکر کیا چاہتا ہوں کہ ان کو اپنے بیٹے کے غم میں صلائے عام۔ کے مضامین سے بہت تسلی ہوئی تھی ؛

میں خوش ہوں کہ صلائے عام کے مضامین دل و دماغ پر اثر کرتے ہیں۔ دماغ میں جدت اور دل میں تسلی پیدا کرتے ہیں ؎

نہیں ہوتی تو دعا میں نہیں ہوتی تاثیر ؛ اور جو ہوتا ہے تو باتوں میں اثر ہوتا ہے

دادِ صلائے عام

× × × × × × × × × × × × ×

جس وقت نومبر کا صلائے عام میری میز پر آیا۔ اُس وقت کئی رسالے اور وہاں موجود تھے کسی کا ناز کیسا تھا کسی کا انداز کیسا۔ ہر ایک اپنی بہار جُدا گانہ دکھا رہا تھا مضامین درکنار اُن کے مقابلہ میں صلائے عام کے ٹائیٹل پیج کو دیکھتے ہی میری زبان سے بیساختہ نکلا ؎

ترا زیبد شہنشاہی در اقلیمِ دل آرائی ؛ بدیں خوبی و زیبائی بدیں شوخی و رعنائی

پھر جب ورق لوٹا۔ پیرایۂ آغاز پر نظر پڑی تو سبحان اللہ کہیں موتی جڑے تھے۔ کہیں چُنیاں جڑی تھیں۔ ہر ایک مضامین کی سُرخی گویا کسی کے گلے کا چندن ہار تھا ؎

ہوں میں پروانہ مگر شمع تو ہو رات تو ہو ؛ جان دینے کو ہوں موجود کوئی بات تو ہو

خان بہادر صاحب۔ واللہ آپ زبان اُردو کے والی نہیں بلکہ وارث ہیں۔ آپ کا زبان اُردو پر بڑا احسان ہے نرے صلائے عام کو ہی نہیں۔ بلکہ زبان اُردو کو اُردوئے معلےٰ بنانے کی کوشش فرما رہے ہیں۔ اور جو کہہ رہے ہیں اُس کو نبھا رہے ہیں ؛ جیسا طرز بیان صلائے عام نے پایا ہے اِس وقت تک ہمارے دیکھنے میں نہیں آیا ہے۔ اِس کے ہر ہر فقرے میں کوئی بات ہے اور ہر ہر جُملہ میں کرامات ہے کہ دل کشش کئے چلا جا رہا ہے۔ بغیر پورا کئے ہر مضمون کو رہا ہی نہیں جاتا۔ مخصوص آپ کے بیان میں تو بجلی کا اثر ہے۔ گو آپ اپنے کسی مضمون پر اپنا نام لکھنا پسند نہیں فرماتے۔ مگر ہر مضمون خود اپنی شہادت دیتا ہے۔ کہ میں خان بہادر صاحب کے رشحاتِ قلم کا ثمر ہوں۔ خوب کہا ہے ؎

تیرا چُپ چَپ بیہ مٹیناست سالک ؛ اک طرح کا بیاں ہے گویا

"محشرِ خیال" "مضمونِ پریشان" - "تقدیر بھلی ہو یا بُری" دلربائی میں اپنا ثانی نہیں رکھتے ان کی نسبت اتنا کہہ دینا ہی کافی ہے - دوہا

امی ہلاہل مدبھرے سویت شام رتنار ؛ جییت مرت جھک جھک پرت جی چتوت اکبار

کسی شاعر نے اپنے معشوق کی آنکھ کی تعریف میں کہا ہے - یہی اوصاف مدبھرے ماشاء اللہ مضامین صلائے عام میں موجود ہیں -

لفٹننٹ کرنل - ڈی سی فلٹ ایم اے صاحب بہادر جیسے عالم متبحر کی تحریر صلائے عام کی نسبت میں آپ کو تہِ دل سے مبارکباد دیتا ہوں - یہ ہمارے صلائے عام کے عالی پایہ بلند رتبہ ہونے کا بیّن ثبوت ہے - کہ یہاں سے وہاں تک یکتائی کا ڈنکہ بج گیا ع

بزنج بالا کن کہ ارزانی ہنوز

× × × × × × × × × × ×

سید ہاوس جودھپور - یکم دسمبر ۲۳ء　　　سید محمد اسد علی جعفری (ایم - آر - اے - ایس لندن)

غزل جناب مرزا محمد تقی بیگ صاحب مائل دہلوی (نتیجۂ فکر تازہ)

مقتل میں وہ تو آئیں خنجر بدل بدل کر ؛ یارب کہاں سے لاؤں محشر بدل بدل کر

یوں قتل کر رہے ہیں تیور بدل بدل کر ؛ کرتے ہیں وار گویا خنجر بدل بدل کر

ہر سنگ رہ سے پوچھا کوئے بتاں کا رستہ ؛ کن مشکلوں سے پوچھا رہبر بدل بدل کر

اے شوق سجدہ تیری کرتے ہیں آزمایش ؛ وہ آستاں کا اپنے پتھر بدل بدل کر

اتنے تو ہو گئے ہیں مجھسے وہ بے تکلف ؛ لیتے ہیں نام میرا اکثر بدل بدل کر

اللہ ہی بات رکھے اللہ ہی شرم رکھے ؛ فتنے اٹھا رہا ہے محشر بدل بدل کر

آئینہ سامنے ہے خود لطف اٹھا رہے ہیں ؛ زلفیں بنا بنا کر زیور بدل بدل کر

ہم میکشانِ اُلفت کیوں کر نہ رنگ بدلیں ؛ بھیجے ہے چشم ساقی ساغر بدل بدل کر
منظور امتحاں ہے کس سخت جاں کا یارب ؛ مقتل میں دیکھتے ہیں خنجر بدل بدل کر
کیوں کر بُھلاؤں دل سے اِک شوخ فتنہ گر کا ؛ پینا کبھی پلانا ساغر بدل بدل کر
رِلتے ہیں جاکے باہر یہ شیخ اور برہمن ؛ پیتے ہیں میکدہ میں ساغر بدل بدل کر
آنکھوں میں جان و دل میں کعبہ میں بتکدہ میں ؛ جلوے دکھا رہا ہے گھر گھر بدل بدل کر
اب حوضِ میکدہ کا دیکھیے کوئی اُبلنا ؛ ساقی نے نام رکھا کوثر بدل بدل کر
اپنی تو عاشقی کا یہ قصۂ مختصر ہے ؛ ہم جا ملے خدا سے دلبر بدل بدل کر
کیا اہلِ بزم میں ہی آنکھوں میں ہوں کھٹکتا ؛ جو مجھکو دیکھتے ہو تیور بدل بدل کر
ناکامیوں نے میری کیا کیا ہنسی اُڑائی ؛ جب اُس کا دل بنایا پتھر بدل بدل کر
مائلؔ تو ہے سمجھتا گردش کو آسماں کی ؛ ساقی پلا رہا ہے ساغر بدل بدل کر

صلائے عام۔ اس غزل کے ساتھ حضرت مائلؔ کا نوازشنامہ بھی پہونچا۔ نوازشنامہ کا انتخاب تذرِ ناظرینِ صلائے عام ہے؛

× × × × × × × × × × ×

صلائے عام کے دو پرچے وصول ہوئے۔ اُن کی اُردو سے یہ ضرور معلوم ہوا کہ ابھی اہلِ زبان اور قدر شناسانِ اُردو دہلی اور نواحِ دہلی میں باقی ہیں۔ الگ الگ ایک ایک مضمون کی داد دینے کو بہت زمانہ طول طویل چاہیئے: اور حق یوں ہے کہ جو کیفیت صلائے عام کے پڑھنے سے قلب کو حاصل ہوتی ہے وہ زبانِ قلم سے ناممکن سی بات ہے

× × × × × × × × ×

غزل میں "بدل بدل کر" کی تکرار بہت مشکل ہے۔ یہ تکرار آپ نے خوب نباہی اور بڑی خوبصورتی سے ؎ اتنے تو ہو گئے ہیں مجھ سے وہ بے تکلف ؛ لیتے ہیں نام میرا اکثر بدل بدل کر ؛ نام کی کثرت پر لسان الملک حضرتِ ریاضؔ خیرآبادی کے شعر کا مضمون اس سے ملتا جلتا ہے ؎

جب کہہ کے ریاضؔ اُسنے پکارا سرِ محفل ؛ بن بن کے کئی آدمی اس نام کے اُٹھے ؛

حضرت مائلؔ کی غزل کے "بدل بدلکر" لاجواب ہیں اتنے "بدل بدلکر" مجھے بہت پسند آئے ؎

ہر سنگِ رہ سے پوچھا کوئے بتاں کا رستہ ٭ کن مشکلوں سے پوچھا رہبر بدل بدل کر

کوئے بتاں کا رستہ ہر سنگِ رہ سے پوچھنا مشکل نہیں تو اور کیا ہے ؟ اس پر "بدل بدل کر" اور بھی مشکل ہوئی ٭

اے شوقِ سجدہ تیری کرتے ہیں آزمایش ٭ وہ آستاں کا اپنے پتھر بدل بدل کر

شوقِ سجدہ کی آزمایش کے لئے سنگِ آستاں جس قدر بدلے جائیں تھوڑے ہیں ٭

اللہ ہی بات رکھے اللہ ہی شرم رکھے ٭ فتنے اُٹھا رہا ہے محشر بدل بدل کر

فتنوں کی کثرت میں اور وہ بھی "بدل بدل کر"۔ اللہ ہی کے ہاتھ شرم ہے اور محشر میں فقط اللہ ہی سے کام پڑے گا

کیوں کر بھلاؤں دل سے اک شوخ فتنہ گر کو ٭ پینا کبھی پلانا ساغر بدل بدل کر

شوخی کا ثبوت بہت اچھا دیا کہ پینا اور پلانا اس پر ساغر بدل بدل کر۔ اس سے زیادہ اور شوخی کیا ہو سکتی ہے ؟

لڑتے ہیں جا کے باہر یہ شیخ اور برہمن ٭ پیتے ہیں میکدہ میں ساغر بدل بدل کر

میکدہ سے باہر نکل کر شیخ و برہمن لڑتے ہیں اور میکدہ میں ساغر بدل بدلکر ساتھ پیتے ہیں۔ گویا پگڑی بدل بھائی ہیں

اب حوضِ میکدہ کا دیکھے کوئی اُبلنا ٭ ساقی نے نام رکھا کوثر بدل بدل کر

جب ساقی نے میکدہ کے حوض کا نام بدل کر کوثر رکھ دیا تو پھر اس کا اُبلنا واقعی دیکھنے کے لایق سمجھئے ٭

اپنی تو عاشقی کا یہ قصہ مختصر ہے ٭ ہم جا ملے خدا سے دل بر بدل بدل کر

دل بر "بدل بدل کر" خدا سے مل جانا مشکل نہیں کہ صنم پرستی کرتے کرتے خدا پرستی کی سوجھی۔ کہ بقول صوفیے

کرام عشقِ مجازی نے عشقِ حقیقی کو راہ ہے ٭

مائل تو ہے سمجھتا گردش کو آسماں کی
ساقی پلا رہا ہے ساغر بدل بدل کر

یہ شعر غضب کا ہے کہ ساقی کا ساغر بدل بدل کر پلانا گردشِ آسماں سمجھنا چاہیئے ٭ یا یوں سمجھئے کہ نیرنگ روزگار کا

رنگ بدلنا گویا ساقی کا ساغر بدل بدل کر پلانا ہے

جلد ۴

جناب مائل از راہِ کرم اپنا کلام صلائے عام کے لئے بھیجنے کا وعدہ فرماتے ہیں۔ یہی وعدہ لسان الملک حضرت ریاض خیرآبادی نے کیا ہے: اسی طرح حضرت گرامی نے اپنا فارسی کلام بھیجنے کا وعدہ کیا ہے۔ ان ذی کمال شاعروں پہ فارسی اور اُردو کی شاعری کو جس قدر ناز ہو تھوڑا ہے کہ صلائے عام کی رائے میں ان کا کلام حاصلِ شعر و سخن ہے۔

"ماہِ نومبر کا صلائے عام" - (از روے داد)

"حسینانِ معانی کا ایک دل فریب گلدستہ ہے جس کی بوئے عنبر بیز سے دل کی مرجھائی ہوئی کلی کھل گئی۔ روح پھڑک اٹھی۔ شروع میں "پیرایۂ آغاز" کو عطرِ فتنہ کہوں تو کوئی گناہ نہیں۔ سب سے پہلے لسان الملک حضرت ریاض کی گل افشانی "صلائے عام کی آمد" کی سُرخی سے قابلِ دید ہے۔ جس کی سُرخی کا یہ شعر دیکھ کر زبان سے بے ساختہ واہ اور دل سے آہ نکل گئی ؎

یہ چھلکتا ہوا کیا جامِ شراب آتا ہے ۔ اے میں قربان میرا عہدِ شباب آتا ہے

اِس بے نظیر مطلع کا لُطف کچھ اُن کے دلوں سے پوچھیئے جو پناشباب کھو چکے ہیں۔ اِس مضمون کے ختم ہونے پر "محشرِ خیال" خان بہادر کے قلم کا نکلا ہوا مضمون قیامت کا مضمون ہے جس کا سلسلہ خدا کرے قیامت تک نہ ختم ہو۔ تیسرا مضمون "تقدیر بھلی ہو یا بُری" اس عنوان سے لکھا گیا ہے۔ واقعی تقدیر کا مسئلہ نہایت مشکل مسئلوں میں ہے۔ مگر بقول خان بہادر میر ناصر علی صاحب اس مضمون میں نئے رنگ سے دکھایا گیا ہے۔ اس جدت طرازی و معانی آفرینی کی اگر داد نہ دی جائے تو نہایت ہٹ دھرمی ہے۔ "لطفِ زبان" "حسنِ بیان" اُردو لٹریچر کی جان ہے۔ جسے ہم اپنے ناظرین کی ضیافتِ طبع کے لئے صلائے عام سے نقل کرتے

درج کرتے ہیں۔ اُمید تو ہے کہ اس مضمون کو پڑھ کر قارئین کرام نہایت محظوظ ہوں گے"۔[1]

(منقول ڈسٹرکٹ گزٹ۔ گونڈہ)

غزل

حضرت صفدر مرزاپوری

میں کم نہیں کسی صائم کسی نمازی سے ؞ کہ میکدہ میں گزرتی ہے پاکبازی سے
گلہ کچھ اُن سے نہ اُن کی جفا طرازی سے ؞ ملا ہوں خاک میں یاروں کی چارہ سازی سے
زبان منہ میں مرے وہی ہے گالیاں دیکر ؞ مجل ہیں دل میں کچھ اپنی زبان درازی سے
تم آسمان بنے ہو ستا ستا کے مجھے ؞ بلند نام ہوا ہے جفا طرازی سے
نہ پوچھتے مرے دل کو نہ ہاتھ سے جاتا ؞ گلہ ہے مجکو فقط انکی دلنوازی سے
بتوں کی سجدہ گزاری کا ڈھب تھا معلوم ؞ سلیقہ ہمنے یہ سیکھا بڑے نمازی سے
ڈرے گی تم سے قیامت ابھی معاذ اللہ ؞ دکھا دو آنکھ کہ رُک جائے فتنہ سازی سے
نظر نہ ڈال مرے بیشمار جرموں پر ؞ بعید کیا ہے تری شانِ بے نیازی سے
کہیں سے صبح قیامت اُبھر نہیں سکتی ؞ بُری دبی ہے شب ہجر کی درازی سے
یہ کیا ستم ہے کسی طرح تم نہیں ملتے ؞ ملو نہ دل سے ملو تو زمانہ سازی سے
یہ کوئی پھول ہے جو رُک رہے ہیں جسکو کھینگے ؞ وہ سے چلے ہیں مرے دلکو فقرہ بازی سے
ہر ایک بزم میں ہے آج روشنی اس کی ؞ یہ بات شمع نے پائی ہے دلگدازی سے
وہی ہیں حضرت صفدر انہیں کی شہرت ہے ؞ لیے جو سبحہ نظر آتے ہیں نمازی سے

صلائے عام۔ یہ غزل اور "ماہِ نومبر کے صلائے عام کی داد" دونوں حضرت صفدر مرزاپوری کی نظم و نثر کے... نمونے ہیں اور دونوں بہت پاکیزہ۔ یہ ۴ر دسمبر ۱۹۲۳ء کے ڈسٹرکٹ گزٹ گونڈہ سے نقل کئے گئے۔ صلائے عام

[1] تقدیر والا مضمون صلائے عام سے بجنسہ ڈسٹرکٹ گزٹ گونڈہ میں نقل ہو کر شایع ہوا۔

صلائے عام

گو میں اپنی زبان کی شاعری پر فدا ہوں اور سمجھتا ہوں کہ اس سے بہتر اور کسی زبان کی شاعری ہو نہیں سکتی۔ لیکن ہم نے جس قدر نظم میں کمال پیدا کیا نثر میں ہم عاری نظر آتے ہیں۔ قدیم زمانہ میں شاعری پر زور زیادہ اس لئے دیا گیا کہ اُن دنوں کی تعلیم کا مدار زیادہ تر حافظہ پر تھا۔ اور حافظہ کے لئے شعر زیادہ موزوں ہے کہ مختصر الفاظ میں جو مطلب ادا ہو وہ زیادہ یاد رہتا ہے: یہاں تک کہ حساب اور طب اور تاریخ کی اگلی کتابیں بھی اکثر نظم میں لکھی گئیں۔ لیکن دنیا کی زیادہ ضرورتیں نثر کی محتاج ہیں۔ اور بعض کا عقیدہ ہے کہ قوموں کی ترقی اور تہذیب و تعلیم کا تعلق نثر سے زیادہ ہے کہ آج کل کے تجربہ کے موافق جس قدر تہذیب و تعلیم میں ترقی ہو گی اُسی قدر نظم میں کمی اور نثر میں ترقی ہو گی۔ نظم گویا تکلفات میں داخل ہے اور نثر ضروریہ میں۔ میں یہہ نہیں کہتا (اور کہوں تو بے کار ہے) کہ دل و دماغ کو شعر کی ضرورت نہیں۔ کھانے میں مربّے و مٹھائی ذائقہ کے لئے بہت مناسب ہے مگر پرورش کرنے والی غذا غلّہ ہے: شغلِ مے کے ساتھ گزک کا دستور ہے مگر اصل چیز مے ہے۔ شعر سے مضمون میں رونق آجاتی ہے مگر اصل چیز نفسِ مطلب ہے جو نثر میں زیادہ صراحت و تفصیل سے ادا ہو سکتا ہے۔ بہر حال

جو لوگ نظم کی طرف متوجہ ہیں وہ اسی طرح متوجہ رہیں مگر نثر کی طرف جواب تک توجہ میں کمی ہی اس نقص کو پورا کرنا اب بہت ضروری ہے - یورپ کی آج کل کی زبانوں میں شاعری بھی اُن کے مذاق کے موافق خاصی ہے مگر نثر میں وہ ہم سے بہت دور پہونچ گئے ÷ ہندوستان میں ہماری زبان کے اہلِ کمال نے نثر کی طرف بہت کم توجہ کی نظم میں سیکڑوں دیوان لاجواب اِس وقت موجود ہیں مگر نثر میں اعلےٰ لٹریچر کی چند کتابیں جو نظر آتی ہیں سرکاری انعام کے سہارے سے لکھی گئیں یا آپس کی مذہبی عقائد میں اختلاف کی تردید و ثبوت میں لکھی گئیں ÷

بہت بڑا زور اِس وقت انگریزی کتابوں کے ترجمہ پر ہو رہا ہے - یہہ مشغلہ بُرا نہیں مگر انگریزی کے محض ترجموں سے بہت فائدہ متصور نہیں ÷ عورت اگر ترقی کر کے مرد بنا چاہے اور مصنوعی داڑھی مونچھیں لگا لے تو ترقی نہیں صرف تماشا سمجھئے - انگریزی میں لاکھوں کتابیں موجود ہیں انگریزی خواں اصل کے ہوتے نقل (ترجمہ) کو لیکر کیا کریں گے ؟ میں نے دیکھا ہے کہ بازار میں دکاندار خریدار سے پہلے پوچھ لیتے ہیں کہ اصلی چیز چاہئے یا نقلی - اصلی کے سامنے کوئی عقلمند نقلی کو ہاتھ نہیں لگاتا ÷ علاوہ اس کے فرض کیا کہ آپ نے مثلاً انسائیکلو پیڈیا کا ترجمہ انگریزی سے اُردو میں کیا - اس میں ایک صدی سے زیادہ عرصہ لگ جائے گا اس سے تو بہتر ہے کہ آپ اِتنے عرصہ میں انگریزی زبان سیکھ لیں ÷ غیر زبان کے ترجمے سے آپ کی زبان کی ترقی اتنی نہیں ہو سکتی جتنی کہ غیر زبان کی شہرت کو ترجمہ سے فائدہ پہونچتا ہے ÷

اہلِ عرب نے جو یونانی ولاطینی زبان کی کتابوں کے ترجمے اپنی زبان میں کئے اُس
کا سبب یہ تھا کہ اہل عرب مفتوح ملکوں کی زبانوں کو عزّت کی نگاہ سے نہیں دیکھتے تھے۔
ان کی نگاہ میں غیر زبان والے گونگے کہلاتے تھے یعنی عجم جنکو بات کہنے کا شعور نہیں۔
اہل عرب نے جو یونانی ولاطینی کے ترجمے کروائے تو خود وہ زبانیں نہیں سیکھیں غیروں سے
ترجمے کروائے اور ترجمہ کرنے والوں کی مادری زبان عربی نہ تھی۔ اس وجہ سے ترجمے بھی
غلط ہوگئے ؛ اہل عرب کو غیر زبانوں کے سیکھنے کا شوق بالکل نہ تھا۔ صرف چند فنوں کی
کتابیں ترجمہ کرا کے چپ ہوگئے۔ یونانی یا لاطینی کی شعر وسخن کی کتابوں کی طرف نظر اٹھا کر
نہ دیکھا: وہ خوب جانتے تھے کہ غیر زبان کی لٹریچر سے اپنی زبان کو کیا فائدہ ؟

میں پہلے عرض کرچکا ہوں کہ اُردو میں نثر کی کتابیں یا تو سرکاری انعام کے
سہارے سے یا ایک دوسرے کے مذہبی عقایدکے تردید وثبوت میں لکھی گئیں۔ اس
کو پھر صاف کرنا چاہتا ہوں ؛

سرکاری انعام کے سہارے سے اُردو زبان کی کتابیں لکھنی قومی ترقی کے ثبوت
میں داخل نہیں اور اپنے عقائد کی پیچ اور دوسروں کی تردید میں کتابیں جو لکھی جاتی
ہیں ان سے لٹریچر کو بہت فائدہ نہیں۔ بلکہ مذہبی تعصب لٹریچر کے لئے مضر ہے ؛
جس طرح تکرار میں زبان بگڑ جاتی ہے۔ سخت کلامی میں کہہ اُٹھتے ہیں کہ زبان سنبھال کر
بات کرو : مذہبی تعصب میں اور یہی زبان کا خون ہو جاتا ہے ؛

مذہب سے غرض دل دُکھانا مقصود نہیں۔ بلکہ نرم دلی مقصود ہونی چاہئے ؛ مجھ

جیسے گناہگاروں کو مذہب سے غرض یہ ہے کہ مُصیبت میں تسلی ہو۔ مایوسی میں ڈھارس بندھے۔ خوشی میں خوشی زیادہ ہو۔ یہ نہیں کہ زاہدانِ خشک کی طرح ماتھے پر ہر وقت شکن رہے۔ دل کی سختی سے زبان میں سختی آجاتی ہے۔ اور دُہری سختیوں میں انسان گھبرا جاتا ہے ؛

اب وہ ذکر رہ گیا کہ زبان کی ترقی کے لئے پھر کیا کیا جائے ؟ پہلے تو آپ میرا مسلّمہ مان لیں کہ قومی ترقی اپنی زبان کی ترقی کی محتاج ہے۔ اور زبان کی ترقی کا بڑا ذریعہ اس وقت اُردو کے رسالے ہیں ان کی قدر سب سے زیادہ کرنی چاہیئے ؛ رسالے والے اپنے اپنے رسالے زیادہ وقار سے نکالیں۔ رسالوں میں ہر طرح کے رطب یابس مضمون نہ ہوں :۔ اور مضمون نگار اپنے مضامین ذی وقار رسالوں کے سوا ہر جگہ نہ بھیجیں ؛ میں دیکھتا ہوں کہ اکثر ذی مرتبہ مضمون نگاروں کے مضمون معمولی رسالوں میں چھپ جاتے ہیں ؛ ذی مرتبہ مضمون نگار دیکھ لیں کہ یہ رسالہ جس میں مضمون چھپنے کو جاتا ہے اس مرتبہ کا ہے یا نہیں ؟ رسالوں کی تعداد میں تو ترقی خاصی ہے کہ پہلے سے زیادہ نئے نئے رسالے نکلتے ہیں مگر پہلے کی نسبت بند جلد ہو جاتے ہیں۔ میری رائے میں نئے رسالے نکالنے سے پرانوں کی قدر زیادہ کی جائے ؛ میں نے ایک رسالہ میں دیکھا کہ رسالہ کی ضخامت پر فی صفحہ کی لاگت کے حساب سے بازاری نرخ پر سالانہ قیمت قرار دی گئی۔ مضامین کی خوبی اور دماغی محنت و دردسر بالائے طاق رکھا گیا ؛ اتنے کا کاغذ و چھپائی اور ڈاک کا محصول۔ اس سے زیادہ اور کیا چاہیئے ؟ جہاں یہ صورت ہو مضامین کا دردسر بے کار ہے ؛ رسالوں کی زبان میں اپنی زبان کا خیال زیادہ رکھا جائے۔ بے گانہ لب و لہجے اور

ابھی ہماری

اجنبی محاورے اپنی زبان کا لطف کھو دیتے ہیں: اگر آپ دوسری زبان کا کوئی مضمون لکھنا پسند کریں تو اس طرح لکھیں کہ بیگانگی کی بو نہ آئے۔ یہ نہ معلوم ہو کہ ہم کسی غیر سے باتیں کر رہے ہیں یا خود غیر ہو گئے ؎

یہ ممکن نہیں کہ اس مختصر مضمون میں میں زبان کی ساری خوبیاں بیان کر سکوں مگر صلائے عام کا مطمح نظر کم و بیش ایسا ہی ہے جیسا کہ یہاں عرض کیا گیا: اور بار بار عرض کیا جائے گا ؎

آخر میں مجھے صلائے عام کے متعلق بنج میں از رو ئے معاملہ و واقعی صورت کے دو ایک باتیں عرض کرنی ہیں جس کی اطلاع ضروری سمجھتا ہوں کہ اپنا حال بھی بغیر کہے چارہ نہیں۔ خاص کر جب آپ خود نہ خیال کریں ؎

وہ ناتواں ہوں کہ ہوں اور نظر نہیں آتا
مرا بھی حال ہوا ہے تری کمر کا سا

اطلاع

آئندہ کے لئے ضروری اطلاع ہے کہ جو صاحب جنوری سنہ ۲۴ء کے آخر ہفتہ ختم ہونے سے پہلے صلائے عام کی سالانہ قیمت بذریعہ منی آرڈر نہ بھیجیں گے اُن کے نام جنوری کا پرچہ روانہ نہ ہوگا۔

وعدے اور تقاضے دونوں کی تکلیف کا علاج یہی نظر آیا ؎

الٰہی وہ جو وعدے ہیں وفا کس طرح ہووینگے
نہ واں خو یاد آنے کی نہ یاں شیوہ تقاضے کا

جو صاحب اخبار و رسالے بغرض "ریویو اور تبادلہ" بھیجتے ہیں ان کی خدمت میں عرض ہے کہ ریویو اور تبادلے کے انتظار کی تکلیف خواہ مخواہ گوارا نہ فرمائیں۔ اس کا مدار جامع اوراق کی رائے پر ہے۔ شرمندگی اُتارنے کے لئے اور کوئی تدبیر میرے ذہن میں نہیں کہ جہاں مناسب ہوگا اور جس کا ریویو لکھنا یا تبادلہ کرنا منظور ہوگا وہاں صلائے عام بغیر تقاضے خود بخود حاضر ہو جائے گا ؎

جواب نامہ نہ لکھنے سے یہ ہوا ثابت
ارادہ رکھتے ہیں شاید وہ آپ آنے کا

میرے اکثر احباب اپنے حسن ظن سے مجھ سے اپنے نئے رسالوں کے لئے مضامین کے لئے لکھتے ہیں۔ یہ نہیں خیال فرماتے کہ میرے ذمہ صلائے عام کی خدمت کیا تھوڑی ہے؟ جو اس عمر میں مضامین سے میں احباب کی خاطر کر سکوں۔ بلکہ کوئی صاحب اگر صلائے عام کا دردِ سر اپنے ذمہ لے سکیں تو میں کچھ دیگر اس سے اپنا پیچھا چھڑانا

غنیمت سمجھوں۔ بقول جناب رخشاں ؎

پیری و مفلسی میں نہ لو نام مے کا اب
لطف ارتکاب میں ہے نہ اجر اجتناب میں

آپ جانتے ہیں کہ ۱۹۲۳ء کا یہ آخری پرچہ ہے۔ اگلے پرچہ سے نیا سال شروع ہوگا: ۱۹۲۳ء کے صلائے عام کے مضامین اچھے یا برے جیسے تھے نکل گئے۔ اور گو صلائے عام نئے رسالوں میں داخل نہیں جس پر شبہ ہو کہ سینگ کٹا کر بچھڑوں میں داخل ہوا چاہتا ہے مگر از روئے خوبی مضامین و اہتمام جنوری ۱۹۲۴ء سے صلائے عام میں آپ زیادہ ترقی کے سامان ملاحظہ فرمائیے گا۔ سال آئندہ سے آپ بھی اس کی قدر افزائی میں دریغ نہ فرمائیں ؛ سال گزشتہ چلتے وقت نئے سال سے یہ کہہ گیا کہ ؎

جھک جائے تو ذرا تو گلے سے لگائیں ہم
پیدا ہوئے ہیں ہاتھ ہمارے مزار سے

(مجھے امید ہے کہ جنوری ۱۹۲۴ کا پرچہ انشاء اللہ آپ زیادہ پسند فرمائیں گے)

قواعد و مقاصدِ

صلائے عام

خواجہ قمرالدین راقمؔ کا شعر ہے ؎

مقصد تمہارے ہاتھ ہے قسمت خدا کے ہاتھ ✽ جو کچھ خدا سے ہو وہ تمہاری زباں سے ہو

صلائے عام کا بھی یہی عقیدہ ہے کہ کسی ملک و قوم کی ترقی تو پروردگار کے اختیار میں ہے لیکن ترقی کے لئے پہلی شرط اپنی زبان میں کمال پیدا کرنے کی ہے ✽ ضد کی اور بات ہے مگر اس وقت ہندوستان کی زبانوں میں اردو سے بہتر کوئی زبان میری سمجھ میں نہیں آتی جس پر جمہور اہلِ ہند (ہندو ہوں یا مسلمان) دونوں کی زبان کا اطلاق ہو سکے ؎

نغمۂ عشق سے ہیں سُبحہ و زنّار ملے ✽ ایک آواز ہو دو ساز کے ہیں تار ملے

خلاقِ دو عالم کی طرح اردو زبان کی تعریف سب سے پاکیزہ یہ ہے کہ ؎

تجھ سے کوئی آشنا نہوا یا ہو ✽ پر تجھے سب سے آشنا دیکھا

یہ رسالہ اپنی زبان میں اظہارِ کمال کی غرض سے جاری ہے کہ اردو لٹریچر کے لئے ہر طرز لکھنے کا سالہ جمع ہو اور ادائے بیاں میں ہماری زبان اور زبانوں سے اگر بازی لیجا سکے تو کسی زبان سے مرتبہ میں کم نہ رہے ؎

دیکھ کر تجکو مٹے جاتے ہیں دنیا کے حسیں ✽ جمع ہوتا ہے مسالہ تری یکتائی کا

صلائے عام میں ہر طرح کے مضامین نظم و نثر شایع ہوتے ہیں۔ زیادہ تر نثر کہ اس وقت نثر کی ضرورت ہے۔ اور نثر بھی ایسی جس میں زبان کی خوبی و فصاحت کے ساتھ خیال کی پاکیزگی اور نزاکت ضرور ہو ؎

دِل باندھئے تو یار کے کاکل سے باندھئے ✽ بلبل کو باندھئے تو رگِ گل سے باندھئے

صلائے عام اعلےٰ حکام سول و ملٹری افسروں کے امتحان میں گورنمنٹ آف انڈیا

سے منظور ہو چکا ہے۔ ہندوستان کے سوا یورپ کے عالم و فاضل **صلائے عام** کی قدر کرتے ہیں اُردو میں **صلائے عام** کے مضامین کو خاص مرتبہ حاصل ہے ؎

دل پہ تمہارے نقش ہوا ہے بیانِ شوق :: کار قلم دکھاتی ہے میری زبانِ شوق

صوبہ آگرہ و اودھ کے سررشتہ تعلیم کے نصاب میں **صلائے عام** کے مضامین اُردو فائینل ریڈر میں انتخاب کر کے درج کئے گئے اور صاحب پریسیڈنٹ نصاب اُردو نے جب بمبئی گورنمنٹ بمبئی منعقد ہوئی میرے مضامین کو اُردو ریڈروں میں شامل کرنے کے لئے مجھے لکھا ؛

اکثر اصحاب نمونہ کا پرچہ مانگتے رہتے ہیں۔ اوّل تو ایک پرچہ سے **صلائے عام** کا پورا حال معلوم ہونا مشکل ہے۔ دوسرے **صلائے عام** کو جاری ہوئے عرصہ ہو گیا نمونہ بھیجنے کی مجھے ضرورت نظر نہیں آتی ؎

پیری میں بھی بے ولولہ شوق نہیں ہم :: رکھتے ہیں ابھی اِک دلِ ہنگامہ گزیں ہم
شہرت نہیں مجنوں کے برابر یہ مسلم :: پر کوئی نہ جانے ہمیں ایسے بھی نہیں ہم

صلائے عام کی قیمت پیشگی چھ روپئے سالانہ ہے۔ چھ مہینے سے کم کی خریداری منظور نہیں ہو سکتی ؛ قیمت بذریعہ منی آرڈر عنایت فرمائی جائے۔ مضمون نگار **صلائے عام** کی قیمت سے بری نہیں : نہ یہ ضرور ہے کہ ہر مضمون خواہ مخواہ شایع کیا جائے ؎

کس قدر ہے فرق یوسف میں اور اپنے یار میں :: گھر خریدار اس کے آئیں وہ بکے بازار میں

جو مضمون شایع نہ ہو سکیں اُن کے واپس کرنے کا ذمہ نہیں : جامعِ اوراق کو مضمون میں کمی بیشی کا اختیار ہے ؛

پچھلے پرچوں کی قیمت بشرط دستیابی ایک روپیہ فی پرچہ ؛

صلائے عام کا پتہ اسقدر کافی ہے کہ :

دہلی۔ فراشخانہ : مکان میر ناصر علیخاں بہادر ؛

حسب الارشاد میر ناصر علیخاں بہادر مطبع ناصری واقع فراشخانہ دہلی میں باہتمام میر احمد چھپا اور شایع ہوا ؛ ؛ ؛

PRINTED AND PUBLISHED BY MIR NÂSIR ALI KHÂN BAHÂDUR (EDITOR) AT THE NÂSRI PRESS, FARRÂSH KHÂNÂ, DELHI.